Scanned with CamScanner

سسپنس ڈائجسٹ

مدیرِ اعلیٰ

عذرا رسول

مدیر

اطہر حسین

نائب مدیرہ

شازیہ حمیر

مارکیٹنگ و
سرکولیشن منیجر

ثمر عباس

0301-2454188

07 انشائیہ — جون ایلیا
ایک دردمند کا کلام جو دھیان دے کر سنا جانا چاہیے

08 آپ کے خط — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پُرخلوص مشورے

12 ظالم مظلوم — زویا صفدر
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

31 دوسرا موقع — عائشہ نصیر
لوگوں کی گمشدہ چیزیں ڈھونڈنے کی ماہر لڑکی کی مہم جوئی

44 رمز شناس — نازیہ کامران کاشف
خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمز شناس کی سنسنی خیز داستان

69 فراڈیا — کرن نعمان
غریب سے امیر ہو جانے والے نوجوان کا انوکھا اتفاق

72 ختم شد — مرزا امجد بیگ
روزگار کے نام پر لوگوں کو لوٹنے والے مجرم کی مکاریاں

جلد 54 • شمارہ 12 دسمبر 2025 • زرِ سالانہ 3000 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 200 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

95 **کُند ذہن** — عبیدی بخاری
کُند ذہن سمجھے جانے والے ایک بچے کی ذہانت کا احوال

108 **محفلِ شعر و سخن** — قارئین
آپ کے ہاتھوں ہی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

111 **راز** — ایم اور اجیرت
ماضی میں بُرے تجربات سے گزرے ایک شخص کی کہانی

118 **جنگ باز** — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
معاشرتی اصولوں اور رسم و رواج کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم کرنے والا ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

141 **مصور** — ہیاطن برسلوی
تخیلاتی محبت میں مبتلا ایک مصور کی داستان

151 **بازی** — محمد فاروق انجم
دوسرے کی رقم سے جوا کھیلنے والے نوجوانوں کی روداد

163 **فراموش** — لبنیٰ خان
ریٹائرمنٹ ہوم میں زندگی کے آخری ایام گزارنے والوں کی کتھا

171 **شاہ شجاع کرمانی** — ضیا تسنیم بلگرامی
ایک [illegible] کے دلچسپ اور ایمان افروز واقعات

179 **گمشدہ** — صبا منزل
ایک دکھیاری ماں کے نوجوان بیٹے کی نشے میں مبتلا ہونے کی داستان

183 **بے زبان** — صائمہ دانش
ایک بے زبان جانور کی اپنے مالک سے وفاداری کا قصہ

194 **دیس پردیس** — ناصر سلطان اختر
دلوں میں امنگ آنکھوں میں سہانے خواب سجائے پردیس میں قسمت آزمانے والوں کی داستان

پبلشر و پروپرائٹر: ایشان رسول متنا | اشاعت گراؤنڈ فلور C-63 نیز آ ایکس لینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

digest library.com
Scanned with CamScanner

انشائیہ

جون ایلیا

ایک طور

میں گلہ کرتا ہوں، میں لہو میں لتھڑا ہوا گلہ کرتا ہوں۔ زندگی اس شہر میں بری طرح بے حرمت ہوئی ہے۔ خوں ریزی کے ان جانے ہنر مندوں نے اس شہر کی زندگی کو بڑی سفاکی سے تاراج کیا ہے اور اس شہر کا حلیہ بگاڑا ہے اور اس کی راہوں اور اس کے چوراہوں کو بڑی شقاوت سے اجاڑا ہے۔

"جون ایلیا! یہ بات تو تم نے پرسوں بھی کہی تھی اور کل بھی۔"

"ہاں، یہ بات میں نے پرسوں بھی کہی تھی اور کل بھی۔ اور یہ بات میں آج بھی کہہ رہا ہوں، کل بھی کہوں گا، پرسوں بھی کہوں گا اور کہتا ہی رہوں گا اس لیے کہ جو کچھ تھا، وہ ہے اور جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ ہوئے جا رہا ہے۔ مجھے اس شہر کے شہریوں کے دکھ جھیلنے کی نوکری ملی ہے۔ اگر اس نوکری سے میرا دل اچاٹ ہوگا تو میں اپنے آپ کو حرام خور سمجھوں گا۔ یہ نوکری پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ نے مجھے بڑی بڑی سفارشوں کے بعد دی ہے۔

"ہاں، میں اس شہر کے وجود کے سڑے ہوئے زخموں کا، پھپھوندے ہوئے پھوڑوں کا نوکر ہوں، چاکر ہوں۔ اور یہ نوکری، یہ چاکری میرے لیے بڑی عزت کی نوکری اور بڑے فخر کی چاکری ہے کہ اس کی کوئی تنخواہ نہیں ہے۔ کیا میں زخموں سے، اپنے ہی زخموں سے تنخواہ لوں گا؟ کیا میں پھوڑوں سے، اپنے ہی پھوڑوں سے روزینہ طلب کروں گا؟"

"تم جو ہو یعنی تم! تم بھی عجب ہو اور تمہارا روگ بھی عجب ہے۔"

"ہاں، میں بھی عجب کوئی ہوں اور میرا روگ بھی عجب کچھ ہے۔ مجھے اپنے اس روگ کی پہچان نے دل اور دماغ کی جو صحت بخشی ہے، وہ میری روح کا بہت ہی بڑا ابتلا ہے۔ میں اپنی روح کے اس ابتلا سے کسی طرح بھی نجات نہیں پا سکتا۔"

"تم اپنی روح کے اس ابتلا سے کسی طرح بھی نجات نہیں پا سکتے! آخر ایسا کیوں ہے؟"

"ایسا یوں ہے کہ یہ ابتلا میرا، میرا ہی نہیں ہمارا مقسوم ہے۔ یا یوں کہہ لو کہ یہی میری بود و نبود ہے۔ ہماری بود و نبود ہے۔

"لوگو! کیا تم نہیں جانتے، کیا تم میری یہ بات نہیں مانتے کہ میں تم میں ایک عمر سے بڑی اذیت ناکی کے ساتھ تڑپایا گیا ہوں۔ پر کسی کے نہ جاننے اور نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے اور ایسا تو ہونا ہی تھا۔ مجھے تو اپنے لہو سے اپنے زخموں کو دھونا ہی تھا۔ پر میں ہوں کون؟ یعنی یہ کہ میں ہوں کون، میں کوئی بھی تو نہیں ہوں۔ یعنی یہ کہ تم، یعنی یہ کہ میں۔ ہاں، میں اور تم!

"میں اپنے آپ پر اور اس شہر کے شہرۂ آفاق شہریوں پر صبح سے شام تک اتنی بار ہنستا ہوں، اتنی بار ہنستا ہوں اور اتنی بار روتا ہوں، اتنی بار روتا ہوں کہ بس۔ کیا ہماری سرنوشت ایسی نہیں ہے کہ اس پر بار بار ہنسا اور بار بار رویا جائے؟"

"ہاں، تمہاری سرنوشت ایسی ہی ہے کہ اس پر بار بار ہنسا اور بار بار رویا جائے۔"

ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں اپنے ہونے کا ایسا بھگتان بھلا کس گروہ نے بھگتا ہوگا جیسا بھگتان تم نے بھگتا۔ مجھے تمہارا ہونا، ہر لحظہ ہونا بہت ہی اولوالولگا ہے، بہت ہی اولوالولوک ہوا اور ہر گز نہیں ہو۔

کھڑکی کے باہر رات بلا کی اندھیری ہے۔ جانے اس وقت کیا بجا ہوگا! وقفے وقفے سے گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ہم ان آوازوں کو اپنے وجود کا لحن کیوں نہ جانیں۔ اپنی نمود کا آہنگ کیوں نہ گردانیں؟ اے گروہ! اگر تیری تہذیب کے سب سے بڑے نواگر امیر خسرو اس لحن اور اس آہنگ کو سنتے تو کتنے چاؤ سے سر دھنتے!

"اس شہر کا چارہ گر کون ہے اور تیماردار کون؟"

"اس شہر کا چارہ گر کون ہے اور تیماردار کون..... یہی تو کہا نا تو نے؟"

"ہاں، میں نے یہی کہا اور اپنی اس کہن کو سہا۔"

اس شہر کا کوئی چارہ گر نہیں ہے، کوئی تیماردار نہیں ہے۔ دوسرے شہر اس شہر کی حالت پر بس ترس ہی کھا سکتے ہیں اور اس کے سوا بھلا وہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟ سو وہ ترس کھا رہے ہیں۔ اے ترس کھانے والو! میں تم سے اس شہر کی حالت پر بہت زیادہ ترس کھانے کی بھیک مانگتا ہوں۔ یہ شہر اپنے ہونے کے جس عذاب میں مبتلا ہے، اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ پر اس کا اندازہ لگانا اس ملک کی ہر بستی اور ہر شہر کا فرض ہے۔ یہ شہروں کا شہر ہے۔ یہ کسی ایک زبان بولنے والے گروہ کا شہر نہیں ہے۔ یہ تو برادریوں کی برادری کا شہر ہے۔

"اے شہر! یرمیاہ نبی نے یروشلم کا مرثیہ کہا تھا۔ میرا سینہ بھی دکھ سے بری طرح بھرا ہوا ہے۔ میرے پپوٹے بھی سوج گئے ہیں۔ تیری راتیں مجھے بڑی بے رحمی سے جگاتی ہیں۔ تیرے دن مجھے جان لیوا اذیت سے ہلکان رکھتے ہیں۔ تیری گلیاں، تیرے راستے اور تیرے چوک میرے خون سے لتھڑے ہوئے ہیں۔ میرا خون میں نہایا ہوا بدن جگہ جگہ پڑا ہوا تڑپ رہا ہے، میں جگہ جگہ دم توڑ رہا ہوں۔ آخر میں اپنی لاشیں کہاں کہاں سے اٹھاؤں؟

"میں تجھے پھر سے تازہ دم دیکھنا چاہتا ہوں۔ تجھے ایک نئے انداز کی زندگی سے آراستہ دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں۔ مجھے ایک بات کہنی ہے۔ میری اس بات کو دھیان دے کے سننا اور وہ یہ کہ زندگی ایک طور کا نام ہے۔ نفس کے ایک طور کا نام ہے۔ تو بہت ہارا ہارا ہے پر دیکھنا نفس کے اس طور کو کبھی نہ ہارنا۔" ☆☆

Scanned with CamScanner

قارئین کرام!
السلام علیکم!

دسمبر 2025ء کا سسپنس آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ انگریزی سال اپنے اختتام کو ہے۔ ہر سال اپنے دامن میں کچھ اچھی تو کچھ غمگین یادیں چھوڑ جاتا ہے اور ہم پھر سے امید لگائے سوچتے ہیں کہ آنے والا کل اپنے جلو میں ڈھیروں خوشیاں لے کر آئے گا..... کیونکہ امید اگر چھوٹ جائے تو کچھ باقی نہیں رہتا۔ رواں سال میں بہت سے سانحات ہوئے جن میں سرفہرست فلسطین پر اسرائیلی بربریت ہے۔ فلسطین میں ظلم کی جو داستان رقم کی گئی، وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ امریکی صدر کی جانب سے سیز فائر کی کوششیں کی گئیں اور سیز فائر ہوا بھی مگر اسرائیل نے ہٹ دھرمی دکھاتے ہوئے پھر سیز فائر کی خلاف ورزی کی جس پر پوری دنیا کی خاموشی ایک المیہ ہے۔ کہیں سے کوئی صدائے حق بلند نہ ہوئی اور اسرائیل کھلم کھلا خون کی ہولی کھیل رہا ہے۔ اسی طرح کی بربریت سوڈان میں بھی دیکھنے کو ملی جہاں معدنیات کے حصول کے لیے معصوم لوگوں کا قتلِ عام کیا جا رہا ہے۔ شہریوں کو زندہ جلایا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ خواتین و بچے بھی محفوظ نہیں۔ اب تک متعدد افراد لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ خوراک و ادویات کی قلت ہے۔ اگر عالمی برادری نے فوری اقدامات نہ کیے تو انسانی المیہ مزید سنگین ہو سکتا ہے جو پورے خطے کے امن و استحکام کے لیے خطرہ بن جائے گا۔ ادھر مملکتِ پاکستان میں مہنگائی کا جن بے قابو ہوا جا رہا ہے۔ اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں اضافے سے غریب عوام کے لیے دو وقت کا کھانا مشکل ہو گیا ہے۔ اربابِ اختیار کو چاہیے کہ ملکی ترقی کے ساتھ ساتھ عوام کی خوشحالی کے لیے بھی اقدامات کریں کیونکہ غربت کی چکی میں پسے لوگ دلبرداشتہ ہو گئے ہیں، انہیں کوئی مسیحا نظر نہیں آتا۔ ایسے میں ان کی دادرسی بہت ضروری ہے۔ 25 دسمبر کو بانی پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح کا یومِ پیدائش جوش و جذبے سے منایا جائے گا۔ بانیِ پاکستان کی انتھک جدوجہد اور ہمارے اسلاف کی قربانیوں کی بدولت ہمیں آزاد ریاست ملی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آج جو ہم آزاد وطن میں سانس لے رہے ہیں، اس کی خوشحالی کے لیے اجتماعی یا انفرادی..... جو کر سکتے ہیں کریں۔ اللہ پاک ہمارے وطن کو قائم و دائم رکھے، آمین۔ اس دعا کے ساتھ چلتے ہیں خطوط کی محفل کی جانب جہاں قارئین کے خط ہمارے منتظر ہیں۔

✠ دانیال حسن چغتائی کی حاضری، کہروڑ پکا ضلع لودھراں سے۔ ''دو تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر بزم کے سب دوستوں کو سلام۔ سرورق پر موجود خاتون خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات و احساسات چہرے پر طاری کیے نظر آئیں۔ ''انشائیہ'' میں جون ایلیا نے بالکل درست اس بات کی نشاندہی کی کہ جب ہم اندھیرے میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں تو اپنی پہچان بھلا بیٹھتے ہیں۔ پہچان کسی کی پہلی شناخت ہوتی ہے۔ خطوط کی محفل میں نگاہِ حسیب، رفعت مقصود اور روبینہ اشعر کے خطوط نمایاں رہے۔ ''عالمِ مظلوم'' زویا صفوان کے قلم سے ماضی کا سحر خیز فسانہ تزک و احتشام سے جاری ہے۔ ظلم کی ایک حد ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ فنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھولن دیوی کی زندگی کے واقعات بہت لرزہ خیز ہیں کہ عورت جب انتقام پر اتر آئے تو سب کچھ فنا کر دیتی ہے۔ ہندو معاشرت کا مکروہ چہرہ بھی سامنے آ رہا ہے۔ ''تلاش'' دانش مرزا کی انگریزی قالب سے اردو میں ڈھالی گئی تحریر اور بالکل انہوں نے درست کہا کہ محبت ایک ایسی چیز ہے کہ اگر محبوب زندہ نہ بھی رہے تو اس کا خیال ہر لمحے ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ یہی جیسنفر کے معاملے میں ہوا اور آخر کار اس کا شوہر حقیقت تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔ نازیہ کامران کا شف کی ''رمز شناس'' بہت عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس قسط کے آخر میں بہت سے اندازے لگے ہیں لیکن دیکھتے ہیں کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ ''قصۂ ناتمام'' پاکستانی پس منظر کی نعمان اسحاق کے قلم سے لکھی تحریر۔ زندگی اتنے امتحان لیتی ہے کہ سارے چونچلے بھلا دیتی ہے۔ ''چہرہ دست'' قانون، جرم و سزا کی دنیا کی کہانی جسے حسام بٹ نے اپنے مخصوص انداز سے تحریر کیا۔ ''زندگی'' اے آر راجپوت کے قلم سے لکھی نسوں خیز تحریر جس میں فرد احبت کی تلاش میں پہلے اپنے استاد فیور سے مایوس ہوئی تو پھر فرحان جیسے سیماب صفت نے عورت کو حاصل کرنے کا روایتی انداز اپنایا۔ آخر کار وہ شاہ جہاں کی زندگی میں تو آئی لیکن اپنی ہی بے وقوفی سے اپنا ہی آشیانہ برباد کر بیٹھی۔ شعر و سخن کی محفل میں سبھی خطوط کا انتخاب بہت شاندار رہا۔ عیوق بخاری کا شمار سسپنس ڈائجسٹ کے مستقل قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ ''دائیں ہاتھ کا کھیل'' میں وہ اتحاد و اتفاق کی برکت کو عمدگی سے کہانی کے انداز میں پیش کرتی نظر آئیں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی ''جنگ باز'' کی 45 ویں قسط کے ساتھ جلوہ افروز نظر آئے۔ چار سال سے قارئین کو ایک کہانی کے ساتھ باندھ کر رکھنا آسان نہیں ہوتا لیکن ڈاکٹر صاحب نے بہت عمدگی سے یہ کر دکھایا ہے۔ اس پر ان کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ ''جال'' لبنیٰ خان کی تحریر جسے کرسس، ہالووین اور اس سے متعلقہ معاملات سے جوڑا گیا ہے۔ انگریزی کا یہ اردو ترجمہ ہے لیکن اس کو مزید

digest library.com

Scanned with CamScanner

بہتر ہونا چاہیے تھا کیونکہ بہت سی اصطلاحات سمجھنے میں مشکل کا سامنا رہا۔ مہوش اسد شیخ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ اپنی کہانی ''ناداں'' میں انہوں نے بالکل درست نشاندہی کی کہ جس طرح ہم انسان اپنے خواب رکھتے ہیں اسی طرح اس دنیا میں اور بھی بہت سی مخلوقات ہیں ان کے بھی خواب ہوتے ہیں، ان کی بھی زندگی کا سلسلہ ہوتا ہے۔ بہرحال مادرانی انداز کی خوبصورت تحریر رہی۔ ''بارش کا قید خانہ'' عثمان ذوالفقار کی ترجمہ کردہ تحریر اور اس بات کی آئینہ دار رہی کہ ہر چیز کی زیادتی انسان کو پسند نہیں آتی۔ اعتدال میں ہی معاملے کو رہنا چاہیے۔ تاریخ کے صفحات میں سے ضیا تسنیم بلگرامی اس بار ''شاہ شجاع کرمانی'' کے حالاتِ زندگی کے ساتھ نظر آئے۔ یہ بہت اہم سلسلہ ہے جو تاریخ کے شائقین کے لیے بہت خاصے کی چیز ہے۔ جاوید بسام ترجمہ نگاری کی دنیا کا بہت بڑا نام اور اس بار وہ اپنی کہانی ''سحر طراز'' کے ساتھ نظر آئے۔ مسٹر کارل اور جیکسن کی کہانی ابتدا میں تو نارمل سی لگی لیکن جیسے جیسے واقعات آگے بڑھتے چلے گئے تو پھر ماضی میں کردہ جرم کی کڑیاں بھی ساتھ ساتھ ملتی چلی گئیں اور اس سے یہ بات ایک بار پھر واضح ہوئی کہ مجرم چاہے اپنی شناخت بدل لے نام بدل لے لیکن وہ بچ نہیں سکتا۔ ''انہونی'' عمران قریشی کی لکھی گئی تحریر۔ یہ بھی سسپنس کے مستقل قلم کاروں میں شامل ہیں۔ ڈائجسٹ کے گولڈن پیج پر ''دیس پردیس'' کے نام سے ناہید سلطانہ اختر کی تحریر اور اس طرح کی کہانیاں جنوبی پنجاب کے دیہی علاقوں میں اکثر مل جاتی ہیں کہ جن میں رجب جیسے نوجوان محبت حاصل کرنے کی کوشش میں یا تو جان سے ہاتھ گنوا بیٹھتے ہیں یا کسی المیے کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس سب میں ان کی مخالف ان کی غربت ہوتی ہے۔ اس ماہ کا تبصرہ مکمل ہوا۔ زندگی باقی، ملاقات باقی۔ سانسوں نے مہلت دی تو انہی صفحات پر دسمبر کے شمارے کے تبصرے کے ساتھ ملاقات ہوگی۔''

❁ سیدہ روبینہ شاہین رولی، تھل ساؤتھ پنجاب سے حاضر خدمت ہیں۔ ''سردی بڑھ گئی ہے یعنی دسمبر آنے والا ہے اور ہم حیران ہو رہے ہیں کہ وقت کتنی جلدی گزر رہا ہے۔ نومبر کا شمارہ اپنی تمام تر دلچسپیوں کے ساتھ ہاتھ میں ہے۔ راولپنڈی سے طویل عرصہ غیر حاضر رہنے والے نگاہ حسیب کی حاضری زوردار رہی۔ خوبصورت تبصرہ لکھ کر کرسی صدارت پر براجمان ہو گئے۔ صدرِ محفل بننے پر مبارک باد۔ رفعت مقصود صاحبہ اخوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ ایک اور نام اور شہر محفل میں شامل ہو گیا ہے۔ نام اور شہر تو لکھا ہی رفعت صاحبہ نے، تبصرہ بھی بہت اچھا لکھا ہے، ویل ڈن۔ روبینہ کراچی والی کا تبصرہ پڑھا جو دعا اور امید سے بھرپور تھا۔ آمین کہتے ہیں۔ روبینہ اشعر کے ساتھ ہی سیتا شاہ بھی اللہ کے حضور رحمت مانگتی نظر آئیں اللہ ان کی دعا کے ہر حصے کو شرفِ قبولیت بخشے۔ سید محی الدین اشفاق نے درست کہا کہ بدترین سیلاب کا سامنا کرنے کے بعد بے چینی محسوس ہوتی ہے۔ انجم فاروق ساحلی کی مختصر سی حاضری بھی اچھی لگی۔ عون احمد نے شمارہ وقت پر ملنے کا حق ادا کر دیا اور بہت اچھا تبصرہ لکھا۔ ملک وحید کی حاضری بھی خوب رہی۔ کہانیوں میں نعمان اسحاق ''قصۂ ناتمام'' عادل وہادیہ کی معاشی بدحالی نے افسردہ کیا لیکن دونوں کا ایک دوسرے کی مدد کرنا اچھا لگا۔ عیوق بخاری کی تحریر ''دائیں ہاتھ کا کھیل'' مزیدار تحریر رہی۔ لبنیٰ خان کی ''جال'' عمدہ تحریر تھی۔ چالاکی کے باوجود مجرم پکڑا گیا۔ ناہید سلطانہ اختر کی ''دیس پردیس'' کے سارے کردار دلچسپ لگ رہے ہیں۔ دیکھتے ہیں رجب علی پیسا کمانے میں کب اور کیسے کامیاب ہوتا ہے۔ ملک صفدر حیات کی ''چیرہ دست'' اور عمران قریشی کی ''انہونی'' بہترین کہانیاں ثابت ہوئیں۔ اشعار سارے اچھے تھے لیکن کراچی سے شاہدہ جنید کا بھجوایا گیا شعر پسند آیا۔ حنا حیات، سرگودھا والی کی کترن خوب رہی۔ نیک خواہشات کے ساتھ۔''

❁ سید محی الدین اشفاق کا خط فتح پور، لیہ سے۔ ''نومبر کا سسپنس ڈائجسٹ ہمیشہ کی طرح خوبصورت و دلچسپ تحاریر سے مزین ہے۔ خطوط کی محفل میں پہلی ملاقات نگاہ حسیب صاحب سے ہوئی۔ دیکھیں سرا اس محفل میں آتے ہی آپ کو صدارت مل گئی۔ رفعت مقصود نے اپنا نام و شہر بتا دیا، چلو اب تبصرہ شائع کرنے میں ''نامعلوم'' کا تجسس ختم ہو گیا۔ روبینہ اشعر کی مبارک باد والا تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ سیتا شاہ کی دعا پر دل کی گہرائیوں سے آمین۔ سیدہ روبینہ شاہین رولی نے اپنی غیر حاضری کو محسوس کر لیا، بہت اچھا کیا۔ جتنی بھی مصروفیت ہو، مطالعے اور ڈائجسٹ پر تبصرے کے لیے وقت نکالنا چاہیے۔ انجم فاروق ساحلی صاحب اللہ آپ کو لمبی عمر دے۔ یقین ہے کہ آپ کی تحاریر پڑھنے کو ملیں گی۔ روشنیوں کے شہر سے عون احمد نے بڑا اچھا تجزیہ لکھ کر بھجوایا۔ ملک وحید کی سستی میں بھی حاضری پسند آئی۔ زویا صفوان کی ''ظالم مظلوم'' کا چوتھا حصہ پڑھا، کہانی بڑے دلچسپ انداز میں چل رہی ہے۔ مہوش اسد شیخ کی ''ناداں'' اچھی تحریر تھی۔ جرم و سزا پر مبنی ''جال'' میں لبنیٰ خان نے بڑے خوبصورت انداز میں تمام کرداروں سے انصاف کرتے ہوئے وہ انجام دکھایا ہے جو قاری دیکھنا چاہتا ہے۔ عیوق بخاری کی تحریر ''دائیں ہاتھ کا کھیل'' دلچسپ و سبق آموز کہانی ہے۔ عمران قریشی کی ''انہونی'' واقعی انہونی ہی تھی۔ ام النجابت اور پھر فیصلہ کرنے میں جلد بازی نے کیا کچھ کر دیا۔ باقی کہانیاں، اشعار اور کترنیں سب زبردست رہا۔ کتاب سے محبت اور کتاب کے فروغ کے لیے دعاگو۔''

❁ روبینہ اشعر، کراچی سے تبصرہ کر رہی ہیں۔ ''نومبر کا شمارہ حسبِ معمول جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل پسند آیا جس پر ایک حسینہ جھکی نگاہوں کے ساتھ مسکراتی ہوئی اچھی لگی۔ فہرست پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے جون ایلیا کے پُرمغز انشائیے ''پیچان'' سے مستفید ہوئے۔ خطوط

Scanned with CamScanner

کی محفل میں ایڈیٹر صاحب ملکی و عالمی حالات پر سیر حاصل گفتگو کرتے نظر آئے۔ محفل میں نگاہ حسیب کو طویل غیر حاضری کے بعد اپنے شاندار اور مفصل تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر براجمان دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مبارک باد قبول کریں۔ دیگر احباب میں رفعت مقصود کی حاضری بھی خوب رہی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے زویا صفوان کی ''ظالم مظلوم'' کا پہلا حصہ بھی زبردست رہا۔ پھولن دیوی اب اپنے اوپر کیے گئے ظلم کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ دانش مرزا کی تحریر ''تلاش'' متاثر کن تحریر تھی۔ پسند آئی۔ نازیہ کامران کاشف کے قلم کا جادو ''رمز شناس'' کے لویں حصے میں بھی سر چڑھ کر بولا۔ نعمان اسحاق کی ''قصہ ناتمام'' میں معاش کی خاطر دست طلب کرنے والے نوجوان کی بے بسی پڑھنے کو ملی۔ کہانی پسند آئی۔ ملک صفدر حیات کی ''چیرہ دست'' زبردست تحریر تھی۔ اے آر راجپوت کی ''زندگی'' کچھ خاص نہیں لگی۔ فروا کی آزمائش پر شاہ زیب بلاوجہ اتنا جذباتی ہو گیا کہ اسے طلاق دے دی۔ عیوق بخاری کی ''دائیں ہاتھ کا کھیل'' ہلکے پھلکے انداز میں لکھی گئی تحریر پسند آئی۔ لبنیٰ خان کی تحریر ''جال'' اچھی رہی۔ مہوش اسد شیخ کی تحریر ''تاوان'' زبردست رہی۔ واقعی کبھی کبھی انجانے میں کی گئی غلطیاں ناقابل معافی جرم بن جاتی ہیں اور اس کا بھاری تاوان ادا کرنا پڑتا ہے۔ محمد عثمان ذوالفقار کی ''بارش کا قید خانہ'' عمدہ تحریر رہی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر ''شاہ شجاع کرمانی'' میں دلچسپ اور ایمان افروز واقعات پڑھنے کو ملے۔ دوسرے حصے کا انتظار ہے۔ جاوید بسام کی تحریر ''سحر طراز'' میں دولت کے لالچ میں جادو کا سہارا لینے والے ایک شخص کا عبرت اثر انجام پڑھنے کو ملا۔ عمران قریشی کی ''انہونی'' اچھی تحریر تھی۔ ناہید سلطانہ اختر کی ''دیس پردیس'' عام فہم انداز میں لکھی گئی دلچسپ تحریر تھی۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ غزل شعر و سخن خوب سجی رہی۔ کترنوں کا انتخاب بھی اچھا رہا۔''

❁ رفعت مقصود، سیالکوٹ کینٹ سے چلی آ رہی ہیں۔ ''نومبر کا سسپنس ڈائجسٹ دیر سے ملا۔ سرورق کی لڑکی متوسط طبقے کی لگ رہی تھی۔ اداریہ غزہ کے متعلق تھا، غزہ میں واقعی بہت ظلم ہو رہا ہے۔ آپ کے خط میں سب کے خطوط اچھے تھے۔ اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ جون ایلیا صاحب کا انشائیہ ''پہچان'' قارئین کو اپنے حق خودارادی کی پہچان اور غلامی سے بچنے کا درس دے رہا تھا۔ زویا صفوان کی ''عالم مظلوم'' میں پھولن دیوی اور لڑکیوں پر ظلم نے دکھی کر دیا۔ ناہید سلطانہ اختر کا ناول دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کہانی کے اختتام میں ''جاری ہے'' نے بے مزہ کر دیا۔ دانش مرزا کی کہانی ''تلاش'' میں اس نے مجرم کی بیٹی کو تلاش کر لیا۔ ''رمز شناس'' کی قسط نمبر نو بھی اچھی ہے۔ نعمان اسحاق کی کہانی ''قصہ ناتمام'' اچھی رہی۔ ملک صفدر حیات کی کہانی ''چیرہ دست'' میں بیچارے متین سے زمین کی ملکیت چھیننے کے لیے اسے چودھری نے قتل کروا دیا۔ ملک صفدر حیات جیسے تھانیدار سے وہ بچ نہیں سکا۔ محفل شعر و سخن میں اشعار اچھے تھے۔ عیوق بخاری کی کہانی ''دائیں ہاتھ کا کھیل'' اچھی لگی۔ عیوق بخاری مصنف یا مصنفہ ہیں؟ (محترمہ یا مصنف ہیں) ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے ناول ''جنگ باز'' کی پینتالیسویں قسط بھی اچھی ہے۔ مہوش اسد کی ماورائی کہانی ''تاوان'' میں قبیلے نے جنوں کے بچے کو جان کر تو زخمی نہیں کیا تھا جو وہ دشمن بن گئے۔ بارش کا قید خانہ، شاہ شجاع کرمانی کا واقعہ، سحر طراز اور انہونی اچھی کہانیاں تھیں۔ کترنیں بھی سب اچھی تھیں۔''

❁ عون احمد کا انتظار، ملیر کراچی سے۔ ''ہر ماہ رسالے کا بڑی بے صبری سے انتظار ہوتا ہے لیکن یہ انتظار بہت طویل نہیں ہونے پاتا۔ اس مرتبہ بھی رسالہ وقت پر ہمارے ہاتھ میں موجود تھا۔ انشائیہ پڑھا۔ جون ایلیا صاحب کی برسوں پرانی باتیں آج بھی صادق آتی ہیں۔ معلوم نہیں حقیقی تبدیلی کب ظہور میں آئے گی۔ آخری صفحات میں ناہید سلطانہ اختر کو دیکھ کر اچھا لگا۔ ''دیس پردیس'' کہانی پڑھ کر واقعی لطف آ گیا۔ ''عالم مظلوم'' پڑھی۔ پھولن، دکرم ملاح کے ساتھ ہے۔ عالموں کے حساب کا وقت قریب ہے۔ ''رمز شناس'' بہت توجہ اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ تمام ادوار بھرپور دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اب باری آتی ہے ''جنگ باز'' کی۔ عبدالرب بھٹی، سہراب کے لیے نت نئے چیلنجز لا کر سامنے رکھتے ہیں۔ دیکھیے سہراب کہاں تک کامیاب رہتا ہے ان چیلنجز کو پورا کرنے میں۔ نومبر کے سسپنس میں جو کہانی ہمیں سب سے زیادہ پسند آئی وہ نعمان اسحاق کی ''قصہ ناتمام'' تھی۔ محبت و ایثار کے جذبے سے گندھی کہانی کا تاثر بڑا ابھرپور رہا۔ حسام بٹ ''چیرہ دست'' لے کر آئے۔ جہانگیر کی جہانگیر نے سارا معاملہ منٹوں میں حل کر دیا۔ کمال ہے انسپکٹر صاحب کی۔ عمران قریشی اس مرتبہ انہونی لے کر آئے۔ واقعی یہ انہونی ہی ہوئی ورنہ جیل سے واپس آ کر وہ اپنی ملیحہ زندگی بھی گزار سکتا تھا۔ اے آر راجپوت کی کہانی میں ساپوں کا انتظار یا وہ تذکرہ ہوا کہ آس پاس سرسراہٹ محسوس ہونے لگی۔ اس پر تبصرہ رہنے دیتے ہیں کہیں صورت حال گمبھیر نہ ہو جائے۔ عیوق بخاری ''دائیں ہاتھ کا کھیل'' لے کر آئے۔ اکرام کی چھوٹی سی نیکی نے پوری بستی کی حالت تبدیل کر دی۔ روحانی کہانی کا تذکرہ تو رہ ہی گیا۔ شاہ شجاع کرمانی کے حالات دلچسپی سے پڑھ رہے تھے کہ ''باقی آئندہ'' دیکھ کر رکنا پڑا۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ مکمل حالات پڑھنے کو ملیں گے۔ ہر مہینے سسپنس پڑھ کر تبصرہ لکھنے کی عادت سی بن گئی ہے۔ آپ لوگ ہر ماہ محنت سے ہمارے لیے رسالہ ترتیب دیتے ہیں تو اس کے بارے میں رائے آپ تک پہنچنی چاہیے۔''

❁ سیتا شاہ، لیرہ فاری خان سے رقمطراز ہیں۔ ''ماہ نومبر کا شمارہ ابتدائی تاریخوں میں ہی مل گیا۔ ٹائٹل اچھا تھا، سرسری نظر دیکھا اور خطوط کی محفل میں جا ملا۔ رفعت مقصود کی حاضری خوب رہی۔ روبینہ اشعر ہمیشہ کی طرح جاندار تبصرہ کرتی نظر آئیں۔ سیدہ

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

الدین اشفاق اور سیدہ روبینہ شاہین روبی بھی سیلاب متاثرین کے لیے دعا کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے پیارے وطن کو قدرتی آفات سے محفوظ رکھے (آمین)۔ انجم فاروق ساحلی صاحب کی تحریر کا تو ہمیں بھی انتظار ہے، تبصرہ اچھا تھا۔ ملک وحید کی دعاؤں پر آمین، تبصرہ پسند آیا۔ عون احمد، ملیر سے اپنی حاضری کی خوشی منا رہے تھے، تبصرہ دلچسپ تھا۔ اب ذکر کہانیوں کا۔ زویا صفوان کی "عالم مظلوم" اچھی جا رہی ہے۔ ویسے پھولن دیوی کی داستان ناول کی صورت میں "دیوی" بہت پہلے پڑھی تھی۔ اب دوبارہ اسی دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں۔ عیوق بخاری کی "دائیں ہاتھ کا کھیل" بہت پسند آئی۔ اکرام اور اس کی بستی والوں نے غربت میں بھی خودداری نہیں کھوئی اور نواب سمیع اللہ نے بھی اچھے طریقے سے احسان کا بدلہ چکا دیا۔ نعمان اسحاق کی "قصہ ناتمام" میں عادل اور ہادیہ نے برے حالات میں بھی ایک دوسرے کی مدد کی۔ اچھی تحریر تھی۔ مہوش اسد شیخ کی "نادان" میں ماورائی مخلوق کے بچوں کے ساتھ اگر نبیلہ کی دوستی دکھائی جاتی تو زیادہ اچھا لگتا۔ بہرحال دلچسپ تحریر تھی۔ اے آر راجپوت کی تحریر "زندگی" میں محبت میں دو بار دھوکا کھا کر فروا کو اچھا ساتھ ملا مگر اس نے اپنی بے وقوفی سے اسے کھو دیا۔ جاوید بسام کی "سحر طراز" اور لبنیٰ خان کی "جال" بھی بہترین تحریریں تھیں۔ "رمز شناس" زبردست چل رہی ہے۔ محفلِ شعر و سخن میں سبھی کے انتخاب اچھے تھے لیکن حمکین تبسم ناز، فیصل آباد کا شعر زیادہ پسند آیا۔ کچھ کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ شمارہ زبردست تھا۔ سسپنس اور اس کی پوری ٹیم کے لیے دعا گو۔"

❁ قیدی نمبر شمیرہ کا تبصرہ، پشاور سینٹرل جیل سے۔ "ماہ نومبر کا شمارہ اسی وقت پڑھ رہا ہوں کیونکہ ہمیں یہاں جیل میں دس دن ایڈوانس ہی مل جاتا ہے۔ انشائیہ میں جون صاحب کی "پہچان" پڑھی۔ حقیقت پسندی تو کوئی جون صاحب سے سیکھے۔ نگاہ حسیب کا تبصرہ اچھا تھا پھر کرسی صدارت بھی نصیب ہو گئی۔ پھر رفعت صاحبہ اور روبینہ صاحبہ کا تبصرہ بھی پڑھا۔ روبینہ اشعر صاحبہ بھی اچھے تبصرے کرتی ہیں اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ہر دفعہ ہی کرتی ہیں۔ ہائے! کاش کبھی میرا بھی تبصرہ شائع ہو اور میں بھی جیل میں ساتھیوں سے فخر سے کہوں کہ کوئی ہے جو قیدیوں سے بھی پیار کرتا ہے (چلیں، اب خوش ہو جائیں، تبصرہ شائع ہو گیا۔ ہمیں جن کا بھی تبصرہ ملتا ہے وہ ضرور شائع ہوتا ہے)۔ دل تو تھا کہ پھولن دیوی کی مظلومیت بھری داستان پڑھوں لیکن "رمز شناس" کہیں اور جانے ہی نہیں دیتی۔ نازیہ کامران صاحبہ نے ایسے انداز میں تحریر کی ہے کہ جیسے جیسے بندہ کہانی پڑھتا ہے، ایسا لگتا ہے تمام مناظر آنکھوں کے سامنے چل رہے ہوں۔ اس تحریر کی جتنی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ زویا صفوان کا اندازِ بیان اچھا ہے۔ پھر دانش مرزا صاحب کی "تلاش" پڑھی۔ بس ایورتج تھی کہانی۔ پھر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی "جنگ باز" پڑھی۔ ہمیشہ کی طرح بھٹی صاحب نے کہانی میں اندازِ بیان ایسا رکھا ہے کہ پڑھنے والے کو احساس نہیں ہوتا کہ وہ تحریر پڑھ رہا ہے یا اس کہانی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ حضرت شاہ شجاع کرمانی کے بارے میں پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ ملک صفدر صاحب کی "چیرہ دست" پیشہ ورانہ زندگی کا عملی نمونہ تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آج بھی پولیس صاف نیت سے کوئی کام کرے تو اسے منطقی انجام تک بلکہ اچھے منطقی انجام تک پہنچا کر ہی دم لے گی۔ باقی کہانیاں ابھی نہیں پڑھیں۔ اچھی ہی ہوں گی لیکن خط لکھنے کی جلدی کی وجہ سے نہ پڑھ سکا۔ ایک درخواست اور ہے کہ براہ کرم کوئی واٹس ایپ نمبر یا ای میل ایڈریس مہیا کر دیں تاکہ ہمارے جیسے لوگ جو آپ کی بزم میں شامل ہونا چاہتے ہیں، وہ آسانی سے شامل ہو جایا کریں (ای میل ایڈریس ڈائجسٹ میں موجود ہے)۔"

❁ ملک وحید کا مختصر نامہ، کراچی سے۔ "نومبر کا شمارہ اکتوبر کے آخری ہفتے میں موصول ہوا۔ ٹائٹل پسند آیا۔ فہرست پر نظر ڈالتے ہوئے جون ایلیا کے انشائیہ پر پہنچے جہاں وہ ہمیں اچھے برے کی پہچان کراتے نظر آئے۔ بخطوط کی محفل میں نگاہ حسیب کو کرسی صدارت کی مبارک باد۔ تبصرہ خوب رہا۔ دیگر احباب میں رفعت مقصود، سیتا شاہ، روبینہ اشعر، سید محی الدین، سیدہ روبینہ شاہین روبی اور انجم فاروق ساحلی کی حاضری بھی اچھی رہی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آخری صفحات پر موجود ناید سلطانہ اختر کی "دیس پردیس" کا پیلا حصہ پڑھا۔ اگلے حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ زویا صفوان کی "عالم مظلوم" میں پھولن دیوی کے حالات پڑھ کر دکھ ہوا۔ نعمان اسحاق کی "قصہ ناتمام" متاثر کن رہی۔ دانش مرزا کی تحریر "تلاش" کچھ خاص تاثر پیدا نہ کر سکی۔ نازیہ کامران کا شف کی تحریر "رمز شناس" کی نویں قسط زبردست رہی۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ ملک صفدر حیات کی "چیرہ دست" جرم و سزا کے گرد گھومتی اچھی تحریر تھی۔ اے آر راجپوت کی کہانی "زندگی" پسند آئی۔ عیوق بخاری کی "دائیں ہاتھ کا کھیل" خوب رہی۔ لبنیٰ خان کی کہانی "جال" متاثر کن تھی۔ مہوش اسد شیخ کی "نادان" پسند آئی۔ محمد عثمان ذوالفقار کی "بارش کا قید خانہ" منفرد رہی۔ ضیا تسلیم ہلگرامی کی تحریر "شاہ شجاع کرمانی" پسند آئی۔ جاوید بسام کی کہانی "سحر طراز" زبردست رہی۔ عمران قریشی کی "انہونی" نے متاثر کیا۔ محفلِ شعر و سخن میں اشعار اور کترنوں کا انتخاب بھی اچھا رہا۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

امتیاز احمد، بھالیہ۔ ناہید یوسف، اسلام آباد۔ راحیل علی، کراچی۔ اعجاز احمد، گجرات۔ محمد حسین، لیاقت آباد (کراچی)۔ احسان اللہ، بھکر۔ فہیم شوکت، میانوالی۔

⌘⌘

Scanned with CamScanner

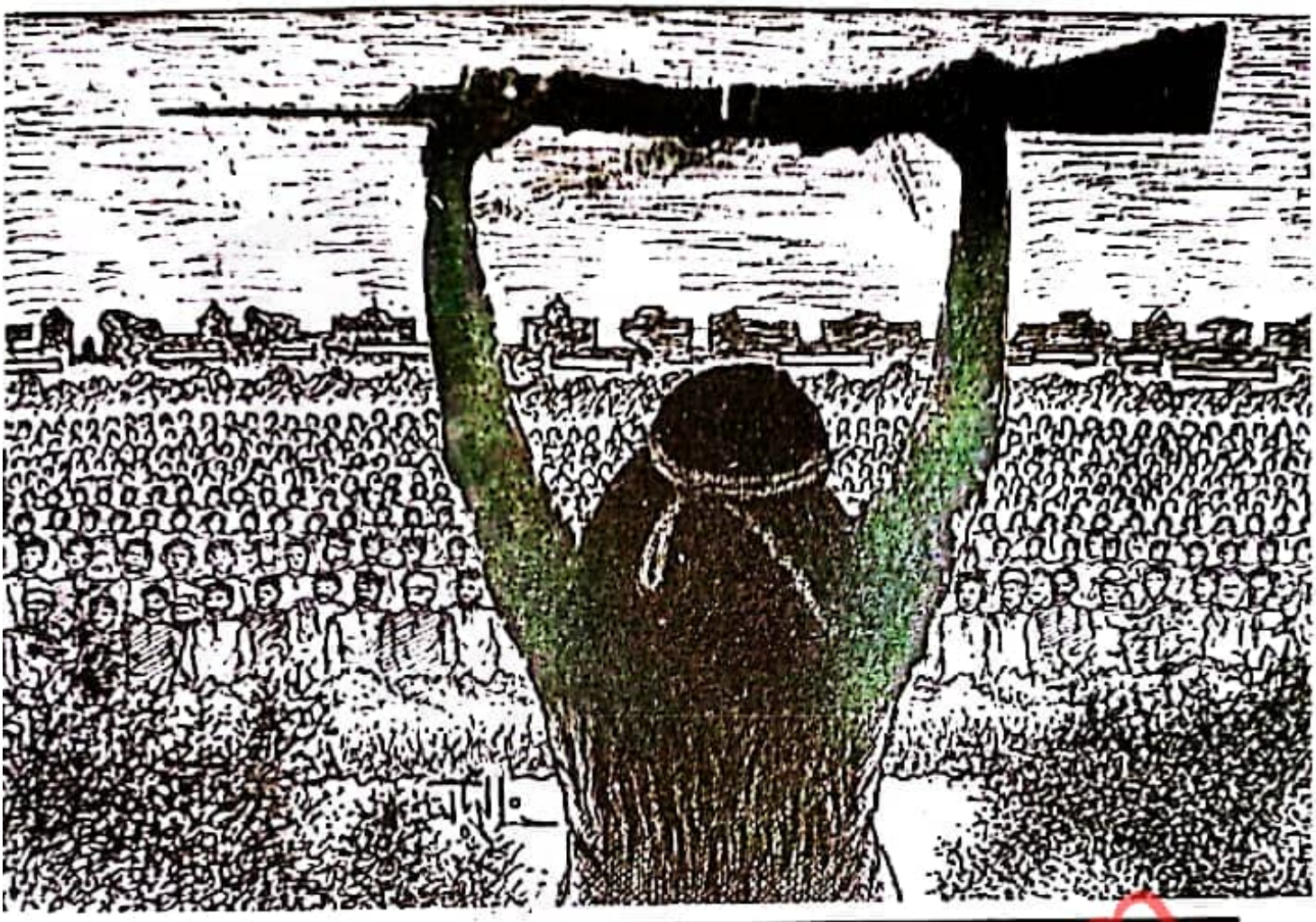

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

ظالم مظلوم

زویا صفوان

پانچواں حصہ

تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو مظلوم بھی ظالم بن جاتا ہے لیکن... اس کی شخصیت کے کئی روپ بھی سامنے آتے ہیں... جسے دنیا دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے... وہ معصوم بچی جسے اپنے بھگوان سے چھوٹا سا شکوہ تھا کہ اسے حُسن کی ذرا سی خیرات سے بھی ترسا دیا... معمولی شکل و صورت کی حامل یہ بچی آگے چل کر کیا قیامت برپا کر سکتی ہے کسی کو خبر نہ تھی... تاریخ میں اس ہستی کا نام پھولن دیوی کے نام سے رقم ہے جسے زمانے کے ظلم و ستم نے اس راہ کا مسافر بنا دیا جہاں بچے اپنے بچپن کو بہت پہلے خیرباد کہہ دیتے ہیں... اس نے بھی بہت چھوٹی عمر سے گرم سرد موسموں کا مقابلہ کیا اور ساتھ ہی آنکھوں میں بسنے والے خوابوں کی بھی حفاظت کرتی رہی... اور جب ظلم حد سے سوا ہوا تو اس بچی نے پھولن دیوی کا روپ دھار لیا۔

digest library.com

Scanned with CamScanner

گولیوں کی تڑتڑاہٹ، ساتھیوں کے للکارے اور پانی کی مخصوص پرشور آواز اعصاب شکن تھی۔ پھولن کو اپنی زندگی کا اختتام قریب تر دکھائی دے رہا تھا۔ اسی لمحے اس کے پردۂ تصور پر ایک چہرہ ابھر آیا۔

حیران کن طور پر یہ چہرہ اس کے والدین، بہن بھائی یا وکرم کا نہیں تھا۔ یہ شبیہہ اس شخص کی تھی جس سے وہ انتہائی حد تک نفرت کرتی تھی۔ اس شخص نے ایک سیدھی سادی، قدرے کم عقل لڑکی کی زندگی کا دھارا ہی تبدیل کر دیا تھا۔ پھولن کے وجود میں مزاحمت کی ایک شدید لہر اٹھی۔

''میادین! میں تیری جان لیے بغیر نہیں مروں گی۔ تجھے اپنے کرموں کی سزا تو پانی ہی ہوگی۔''

اس خیال نے پھولن کی تمام تر یاسیت پل بھر میں ہی ہوا کر دی۔ اس نے اپنی ''تیراکی'' کی صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے دریا کے مخالف سمت تیرنا شروع کر دیا۔ وکرم اور دیگر ساتھیوں نے بھی یادگار مزاحمت کی۔ نتیجتاً وہ پولیس کا گھیرا توڑتے ہوئے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ دریا سے نکلتے ہی وہ کئی گھنٹے بھاگتے رہے تاکہ پولیس ان کا سراغ کھو دے۔

اگلے تین روز نہایت کٹھن تھے۔ اشیائے خورونوش بالکل ندارد تھیں۔ وکرم، پھولن کے لیے سخت تشویش مند تھا۔ اس نے ایسے حالات کا پہلی بار سامنا کیا تھا۔

''تم ٹھیک ہو نا پھولن؟'' وہ گاہے بہ گاہے اس سے استفسار کرتا۔

''بالکل ٹھیک ہوں۔'' پھولن ہر بار مسکرا کر جواب دیتی۔

''یہ جیون بہت مشکل ہے۔''

''میرے پہلے جیون سے زیادہ مشکل نہیں ہے وکرم!'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا یہ سب برداشت کر لو گی؟'' وکرم نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''جب وہ سب برداشت کر لیا تھا تو یہ بھی کر لوں گی۔''

''دل سے کہہ رہی ہو یا مجبوری سے؟'' اس نے پھولن کی آنکھوں میں جھانکا۔

پھولن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ اپنی دلی کیفیات بیان کرنے سے قاصر تھی۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ عزت، توجہ اور محبت ملی تھی۔ اپنے تشنہ وجود کو ان جذبات سے سیراب کرتے ہوئے وہ ہر کٹھنائی سہنے کے لیے تیار تھی۔ وہ کسی بھی لمحے خود کو مردوں سے کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''چنتا نہ کرو وکرم! میں کسی بھی سے تمہاری کمزوری نہیں بنوں گی۔ پھولن دیوی تمہاری شکتی بن کر رہے گی۔'' وہ ایک عزم سے گویا ہوئی۔

وکرم کے چہرے پر آسودہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

☆☆☆

جنگل کے اس دور افتادہ کونے میں روپوشی کے دوران پھولن زندگی کے نئے مطالب سے آشنا ہو رہی تھی۔ وکرم اور اس کے ساتھی موسیقی بجاتے، گانے گاتے اور بے ہنگم رقص کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتے۔ ان لمحات میں انہیں دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ ان کے شکم میں بھوک و پیاس کی وجہ سے کس قدر اینٹھن موجود ہے۔

دھیرے دھیرے پھولن ان کی زندگیوں کے مخفی گوشوں سے آشنا ہونے لگی۔ ان میں اکثریت نے یہ زندگی بحالتِ مجبوری منتخب کی تھی۔ ماضی قریب میں کسی نے خاندانی جھگڑوں کے مظالم سہے تھے تو کوئی زمین کے تنازعے میں پھنس گیا تھا۔ البتہ ایک بات ان سبھی میں مشترک تھی۔ انہیں قانونی اداروں کی جانب سے انصاف نہیں مل پایا تھا۔ اپنی استدعا تھانے لے جانے کی صورت میں ہر بار ذلت، رسوائی اور بہیمانہ تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے ملزم انہی کے سامنے سفاکی سے قہقہے لگاتے۔ نتیجتاً وہ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔

ڈاکا زنی کی مسافت اختیار کرنے کے بعد وہ اپنے ملزمان سے انتقام لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ دولت بھی گویا گھر کی باندی بن گئی تھی لیکن اس کے باوجود وجود میں ایک تشنگی برقرار تھی۔ وہ اپنے اہلِ خانہ اور قریبی رشتوں سے بہت دور ہو گئے تھے۔ بچاؤ اور بقا کے لیے دن بھر جنگل میں روپوش رہتے اور رات سفر میں بیت جاتی۔ وہ کسی تہوار، ولادت، شادی یا مرگ کے موقع پر اپنوں کے ساتھ شریک ہونے سے قاصر تھے۔

پھولن، وکرم کی ہمراہی میں خوش رہنے کے باوجود اپنی روح و قلب میں ایک تشنگی محسوس کرتی تھی۔ مولہ، دیوی دین، رکمنی، چھوٹی، شیو نارائن اور بھوری کی یاد دل میں چٹکیاں بھرتی تھی۔ اس گروہ میں تنہا عورت ہونے کے باعث ہر معاملے میں احتیاط درپیش رہتی۔ رفع حاجت، غسل اور اپنے کپڑوں کی دھلائی کے لیے الگ تھلگ گوشے تلاش کرنے پڑتے۔ اس کٹھنائی کے باوجود انتقام کی حدت اسے کسی نہ کسی طور متحرک ہی رکھتی تھی۔

Scanned with CamScanner

کچھ روز بعد ایک مخبر کی جانب سے اطلاع ملی کہ اس کے گاؤں کا ایک امیر آدمی غریبوں سے سخت مزدوری کروانے کے بعد اجرت ادا کرنے میں کوتاہی برتتا ہے۔ اس کی سرکوبی بے حد ضروری ہو چکی تھی۔ وکرم کی پیشانی پرشکن ہوگئی۔ اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پھولن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم بھی ہمارے ساتھ ہی رہو گی۔"

پھولن نے بلا تامل اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد وکرم اپنے دیگر ساتھیوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"تم میں سے کوئی بھی اکیلا نہیں رہے گا۔ دو، دو کی ٹولی بنا لینا۔ واردات کے دوران کسی کو اپنے قریب نہ آنے دینا۔ اگر تم یا تمہارا کوئی ساتھی خطرے میں ہو تو سیٹی بجا دینا۔ سیٹی کی آواز سنتے ہی دوسرے ساتھی اپنا ہر کام روک کر وہاں چلے آئیں گے۔"

گروہ کے سبھی ساتھی پرجوش دکھائی دینے لگے۔ اس شام مطلوبہ منزل پر پہنچتے ہی وکرم ایک بلند چبوترے پر کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں عقاب کی سی چمک تھی۔ وہ پھولن سے کہنے لگا۔

"میں جو بھی بتایا کروں، اسے سبھی کو بتانا ہے۔"

پھولن نے شدومد سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"سردار کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ واردات کے دوران کسی اونچی جگہ پر کھڑا رہے۔ اس طرح وہ گاؤں پر نظر رکھنے کے علاوہ اپنے ساتھیوں کو بھی کنٹرول کر لیتا ہے۔" اس نے بتایا۔

"کٹ.....نر.....ول؟" وہ الجھی۔

وکرم کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ تعلیم یافتہ اور انگریزی شناس تھا۔ اس کی زبان سے انگریزی کا کوئی نہ کوئی لفظ پھسل ہی جاتا۔ دوسری جانب پھولن بنیادی تعلیم سے ہی بے بہرہ تھی۔

"سمجھ جاؤ گی۔ دھیرے دھیرے سب سمجھ جاؤ گی۔" وہ مسکرایا۔ "ہوائی فائر کروا بھی۔"

پھولن نے فی الفور حکم کی تعمیل کر دی۔ وکرم نے اہل علاقہ کو یہ "اشارہ" دینے کے بعد میگافون میں کہا۔

"دولت مندوں نے غریبوں کا جیون نرک بنا رکھا ہے۔ ہم ان سے اسی پاپ کا بدلہ لینے آئے ہیں۔ میں وکرم ملاح ہوں اور میرے ساتھ پھولن دیوی ہے۔"

"یہ کیا کر رہے ہو، انہیں ہمارا نام کیوں بتا رہے ہو؟" وہ گڑبڑا گئی۔

"ڈاکا ڈالتے سے ہمیشہ یہ بتایا جاتا ہے کہ سزا کے اور کس کی طرف سے دی جا رہی ہے۔" اس نے بتایا۔

اہل علاقہ خوف و سراسیمگی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ ہر جانب گولیوں، بھگدڑ اور افراتفری کا مخصوص شور تھا۔ گروہ کے پندرہ آدمی گاؤں میں داخل ہوگئے۔ باقی ماندہ نگرانی کے لیے کھیتوں میں پھیل گئے۔

"کیا تم اسے سزا بھی دو گے؟" پھولن نے استفسار کیا۔

"بالکل دوں گا۔" اس نے قطعیت سے جواب دیا۔

"لوٹ مار کے بعد سزا دینا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔"

اسی اثنا میں گروہ کے ساتھی اس معتوب شخص کو گھسیٹتے ہوئے ایک میدان میں لے آئے اور اس پر بے دریغ لاٹھیاں برسانے لگے۔ پھولن حیرت و تجسس سے یہ مناظر دیکھ رہی تھی۔ اس واردات کے اختتام پر انہیں ڈھیروں سونا، چاندی اور دولت حاصل ہوئی تھی۔ وکرم کے اشارے پر ساتھیوں نے ہوائی فائرنگ کا آغاز کر دیا۔

"آج ہم بابا گھنشیام سے ملنے جائیں گے۔" وکرم نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔

"کیا تم اس سے ہاتھ ملانا چاہتے ہو؟" وارے لال چونکا۔

"ہاں، اس سے ہمیں کسی کے ساتھ کی بہت ضرورت ہے۔" اس نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔

وارے لال نے ایک توقف کے بعد تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

بابا گھنشیام ایک طویل قامت اور تنومند شخص تھا۔ وہ اپنے سر کے کیس سفید پگڑی میں چھپا کر رکھتا۔ اس کے دہشت ناک حلیے سے قطع نظر ذہین آنکھوں میں بے حد گہرائی تھی۔ پھولن اس کے دبنگ انداز گفتگو سے بہت متاثر ہوئی۔

"تم ان کے ساتھ کیا کر رہی ہو؟" اس نے شفقت سے استفسار کیا۔ "کیا انہوں نے تمہیں زبردستی اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے؟"

"نہیں۔ میرا اپہرن ہوا تھا لیکن اب میں اپنی مرضی سے ان کے ساتھ رہ رہی ہوں۔" پھولن نے بتایا۔

بابا گھنشیام نے وکرم کی جانب دیکھا اور تحمیر لہجے میں کہنے لگا۔ "اس لڑکی کا ڈکیتوں کے گروہ میں کوئی کام نہیں ہے۔ اسے واپس گھر بھیج دو۔"

"نہیں بھیج سکتے۔" اس نے گہری سانس لی۔ "پھولن کے وہاں بہت دشمن ہیں۔ پولیس بھی انہی لوگوں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ وہ اسے وہاں دیکھتے ہی گرفتار کر لیں گے۔"

digest library.com

Scanned with CamScanner

''تو اس کی ضمانت کا بندوبست کرواتے ہیں۔'' گھنشیام نے حتمی انداز میں کہا۔

وکرم کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی جانب معنی خیزی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم نے بابا گھنشیام سے ہاتھ ملالیا ہے۔ اس خوشی میں کم از کم دو ڈاکے تو ماریں گے۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں کالپی کا رخ کرنا چاہیے۔'' وارے لال نے تجویز دی۔ ''پولیس کو بھی تو اپنی منہ دکھائی کروانی چاہیے۔''

وکرم نے فی الفور اس تجویز پر عمل کی ہامی بھرلی۔ اگلے دونوں ڈاکے یادگار ثابت ہوئے۔ پھولن نے وکرم کے ایما پر پولیس اہلکاروں کے لیے میگافون میں خوب دشنام طرازی کی۔ اس امر سے اسے دلی سکون و اطمینان نصیب ہوا تھا۔ روح پر لگے گھاؤ کی ٹیسوں میں ہلکی سی کمی اسی عمل کے اعادہ پر مجبور کرنے لگی۔ اس نے خود کو ذہنی طور پر اسی راہ کی مسافت کے لیے آمادہ کرلیا تھا۔

☆☆☆

پھولن کو وکرم کے ساتھ رہتے ہوئے تین ماہ کا عرصہ بیت گیا تھا۔ اس دورانیے میں اس کی ظاہری ہیئت، عادات واطوار اور بود و باش مکمل طور پر تبدیل ہوچکی تھی۔ وکرم نے اس کے بال مردانہ انداز میں کٹوا دیے تھے، وہ انہی کی طرح لباس پہنتی تھی۔ جنگلوں میں روپوشی کے لیے بھاگتے بھاگتے اس کے پاؤں سخت ہوچکے تھے۔ اس نے غیر اختیاری طور پر وکرم ہی کے لب و لہجے کو اپنالیا تھا۔

تاریک شب میں کھلے آسمان تلے وکرم کے پہلو میں لیٹے وہ اپنے ماضی کے شب و روز یاد کیا کرتی۔ انہی لمحات میں اسے احساس ہوا کہ وہ روٹیاں پکانا، کنوئیں سے پانی بھرنا، چکی پیسنا، مویشیوں کو چارا کھلانا اور گھر کے دیگر کام کاج بھول چکی ہے۔ اب زندگی کے سکھائے گئے نئے اسباق ازبر رہنے لگے تھے۔ وہ بہ آسانی رائفل صاف کرکے اس میں گولیاں بھرلیا کرتی تھی۔ اس تبدیلی کے علاوہ وہ گروہ کے لوگوں کو سمجھنے اور پرکھنے لگی تھی۔

اس گروہ کا اہم رکن ''مادھو'' بہت کم گو تھا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت کتابیں پڑھنے میں صرف کرتا تھا۔ وکرم کا چچازاد ''بھرت'' اور ''رگھوناتھ'' بہت شریر طبیعت کے مالک تھے۔ اس دورانیے میں پھولن کو علم ہوگیا تھا کہ بھرت کی ان شرارتوں میں گہری اداسی پنہاں ہے۔ ایک روز وہ دریا کے کنارے بیٹھی خاموشی سے لہروں کا کھیل دیکھنے میں مگن تھی۔ اس کی ذہنی رو اپنے اہلِ خانہ کی جانب مبذول تھی۔ اسے بھرت کی آمد کا اندازہ ہی نہ ہوسکا۔ وہ پریشانی کے عالم میں جنگل کی زمین پر کچھ تلاش کررہا تھا۔

''کیا ہوا ہے، کچھ ڈھونڈ رہے ہو کیا؟'' پھولن نے اسے مخاطب کیا۔

''ہاں۔ اب مل گئی۔'' اس نے اطمینان کی سانس بھری۔

''کیا کھو دیا تھا؟'' اسے حیرت ہوئی۔

''تمہاری زبان۔'' بھرت نے زوردار قہقہہ لگایا۔

پھولن جھینپ کر خاموش ہوگئی۔

''اتنی چپ کیوں رہتی ہو، پریوار یاد آتا ہے کیا؟'' اس نے ایک توقف کے بعد دریافت کیا۔

''ہاں۔ سب بہت یاد آتے ہیں۔ اپنے بھی اور دشمن بھی۔'' پھولن کے جبڑے بھنچ گئے۔

''دھیرج رکھو۔ ہم سب تمہارا انتقام لیں گے۔'' اس نے تسلی دی۔

''نہیں۔ میں اپنا انتقام خود ہی لوں گی۔ میں ان سب لوگوں کو ان کے کیے کی سزا ضرور دوں گی۔'' پھولن کا تنفس غیر متوازن ہونے لگا۔ اس نے اپنے اعصاب مجتمع کرتے ہوئے ایک توقف کے بعد کہا۔

''تم یہاں کیوں آئے تھے؟''

''بھاگ کھینچ لایا بس۔'' بھرت نے کندھے اچکائے۔

''کیا تمہیں بھی پولیس نے مارا پیٹا تھا؟'' وہ جھرجھرائی۔

''ہاں۔ بہت زیادہ۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''لیکن غلطی بھی میری ہی تھی۔ پہلے پہل میں سوئے ہوئے لوگوں کے اوپر سے کمبل اٹھا کر بھاگ جاتا تھا، پھر میں نے اپنی غربت سے لڑنے کے لیے آس پاس کے گاؤں سے سائیکلیں چوری کرنا شروع کردیں۔ میری واردات کا طریقہ بھی بہت مختلف تھا۔ میں کسی غریب، اپاہج یا بیمار مسافر کا سوانگ بھر کر راستے میں کھڑا ہوجاتا۔ کوئی نہ کوئی سائیکل سوار مجھے اپنے ساتھ بٹھالیتا۔ کچھ دور جاتے ہی میں پیشاب آنے کا بہانہ کرکے کھیتوں میں چلا جاتا۔ اس دوران سائیکل سوار بھی اسی کارن وہاں چلا آتا تھا۔ میں کھیتوں سے ترنت نکل کر سائیکل پر سوار ہوتا اور بھاگ جاتا۔ اس طرح میں نے سو سائیکلیں چوری کرلی تھیں۔ پھر میں پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے مار مار کر میرا بھرتا بنادیا۔ بھرت کا بھرتا بن گیا۔ ہے نا مزے کی بات؟''

پھولن اس کے اندازِ گفتگو پر بے اختیار مسکرا اٹھی۔

Scanned with CamScanner

digest library.com

بھرت چند اثانے کے لیے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بعد سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"یہاں موجود سبھی لوگوں کی آتما گھائل ہے۔ اس کے باوجود ہم ہنستے، گاتے اور ناچتے کودتے ہیں۔ اپنا یہ وکرم کتابیں پڑھتا رہتا ہے لیکن اس کے اندر بھی ایک "یدھ" چلتا ہے۔ میں تم سے یہی کہنا چاہتا ہوں میری بیٹی! اپنے درد اور تکلیف کو کمزوری اور نراشا نہ بننے دو۔ اسے اپنا ہتھیار بناؤ۔ عالم کا سرونا ش کرنے میں سپھل رہو گی۔"

بھرت کی اس بات نے پھولن کے ذہن میں سوچ کا ایک نیا در یچہ وا کر دیا۔

☆☆☆

بابا گھنشیام سے الحاق زیادہ طویل المیعاد ثابت نہ ہوا تھا۔ وکرم اور گھنشیام نے باہمی رضامندی سے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اتر پردیش کے مختلف حصوں میں الگ الگ کام کریں گے۔ شومئی قسمت وکرم کے حصے میں آنے والے علاقے میں پھولن کا گاؤں بھی شامل تھا۔ وہ اپنے والدین اور بہن بھائی سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئی۔ وکرم نے اپنے ایک مخبر کو حالات سے آگاہی کے لیے وہاں روانہ کر دیا۔

مخبر کی واپسی پھولن کے لیے بہت اعصاب شکن ثابت ہوئی۔ اس کی زبان سے برآمد ہونے والے الفاظ سماعت کو لہولہان کر رہے تھے۔

"وہاں حالات بہت خراب ہیں۔ دیوی دین تو چارپائی سے لگ چکا ہے۔ بیماری کے کارن کام پر بھی نہیں جا پاتا۔ گھر میں ایک پھوٹی کوڑی موجود نہیں ہے۔ پولیس والے ہر دوسرے تیسرے روز چلے آتے ہیں۔ گھر والوں کو ڈرانے، دھمکانے کے بعد کھانے پینے کا معمولی سا سامان بھی اٹھا لے جاتے ہیں۔"

"گاؤں والوں کا دیوہار کیسا ہے؟" وکرم نے دریافت کیا۔

"وہ اپنے جیون میں مست ہیں۔" مخبر نے بتایا۔ "آج گاؤں میں کوئی میلا ہے، سب وہیں مصروف ہوں گے۔ مجھے مولہ بہن نے بتایا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی میلے میں نہیں جائے گا۔"

پھولن نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ اس نے حتمی انداز میں وکرم سے کہا۔ "میں اپنے پریوار سے آج رات ہی ملنا چاہتی ہوں۔"

وکرم نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا اور اندھیرا ہوتے ہی پھولن کو لیے گاؤں روانہ ہو گیا۔ گاؤں کے مخصوص راستے، گلیاں، در و دیوار کی سوندھی خوشبو پھولن کو بے کل کر رہی تھی۔ ان کے گھر کے آنگن میں قدم رکھتے ہی مولہ سراسیمہ ہو گئی۔ اسے وکرم کے لباس سے مغالطہ ہوا تھا کہ پولیس اہلکار ایک بار پھر انہیں ہراساں کرنے کے لیے وہاں چلے آئے ہیں۔

"اماں! میں ہوں پھولن۔" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

والدہ کی دید نہایت کربناک تھی۔ مولہ کی صحت میں تنزلی، چہرے کی جھریاں اور سیاہی دیکھ کر پھولن کے وجود میں انگارے دہکنے لگے۔ اسی اثنا میں دیوی دین بھی وہاں چلا آیا۔ اس کی متورم آنکھیں، کپکپاتے ہاتھ اور شکستہ چال نے وکرم کا دل بھی دکھ سے بوجھل کر دیا۔ دیوی دین نے بیٹی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

یہ جذباتی تلاطم تھمتے ہی پھولن نے مولہ کو دو سو روپے تھماتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس ابھی اتنے ہی پیسے ہیں۔ انہیں رکھ لو۔"

"مجھے یہ پیسے نہیں چاہئیں۔ تم ہمارے پاس لوٹ آؤ۔" مولہ نے اس کا چہرہ اور نقوش ٹٹولے۔

"میرے واپس آنے پر کیا پولیس تم لوگوں کا پیچھا چھوڑ دے گی؟" وہ تلخی سے مستفسر ہوئی۔

دیوی دین نے وکرم کی جانب متنفر نگاہوں سے دیکھا اور تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "تو نے بہت غلط کیا۔ ہمارا جیون برباد کر دیا۔ بھگوان تجھے برباد کر دے گا۔"

"نہیں باپو!" پھولن نے فوراً ٹوکا۔ "وکرم نے تو ہر جگہ میری رکھشا کی ہے۔ ہم دونوں نے بیاہ کر لیا ہے۔"

مولہ اور دیوی دین اس انکشاف پر ساکت رہ گئے۔

"ہم سے غلطی تو ہوئی ہے۔" وکرم نے اعتراف کیا۔ "ہمیں پھولن کے بارے میں غلط بتایا گیا تھا۔ کسی نے پرانی دشمنی نکالی تھی۔"

"لیکن وکرم نے اس غلطی کا پرائشچت بھی کیا ہے۔" پھولن نے فوراً لقمہ دیا۔ "یہ میرا اصل رکھشک ہے۔"

مولہ نے اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور تلخی انداز میں کہنے لگی۔ "میری بچی کا یونہی خیال رکھنا۔ اس نے جیون میں بہت دکھ اٹھائے ہیں۔"

وکرم نے جھکتے ہوئے ان دونوں کے قدم چھو لیے۔ پھولن کے وجود میں شدید اضطراب ہلکورے لے رہا تھا۔ وکرم نے اس کی کیفیات بھانپتے ہوئے گاؤں کے میلے میں روانگی کا فیصلہ کر لیا۔

میلے کا ماحول نہایت پرشور اور پررونق تھا۔ تمام تر اہلِ علاقہ ایک بڑے سے چبوترے کے گرد بیٹھے دکھائی

Scanned with CamScanner

دے رہے تھے۔ یہ منظر دیکھتے ہی پھولن کی نگاہیں اذیت سے جلنے لگیں۔ اس کے پردۂ تصور پر اپنے والدین کی بے بسی اور کسمپرسی جھلک دکھانے لگی تھی۔ وہ کسی اچھوت کی طرح اپنے بنیادی سہولتوں سے محروم گھر میں دبکے تھے۔ اس کی جلتی نگاہیں میادین کو تلاش کرنے لگیں۔

احاطے میں قدم رکھتے ہی وکرم کے ساتھیوں نے حسب روایت ہوائی فائر کردیے۔ تمام تر مجمعے میں سراسیمگی پھیل گئی۔ پھولن نے میگافون تھاما اور تنفر سے نصف درجن سے زائد گالیاں دیتے ہوئے کہنے لگی۔

''جہاں ہو وہیں بیٹھے رہو ورنہ بھون کے رکھ دوں گی۔'' پھولن دیوی کی آواز اور دید نے انہیں حیرت و بے یقینی سے ساکت کردیا۔

''تم.....؟ تم تو مولہ اور دیوی دین کی بیٹی ہو نا؟'' ایک عمر رسیدہ شخص نے اپنی چندھیائی آنکھوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ میں وہی ہوں..... پھولن دیوی..... ایک غریب ملاح کی بیٹی۔''

پھولن کے اعتماد اور شرارے برساتی آنکھوں نے انہیں مزید خوفزدہ کردیا۔ میادین کے معدے میں شدید اینٹھن پیدا ہونے لگی۔ اس نے اپنے منتشر اعصاب پر قابو پاتے ہوئے قریب و جوار کا جائزہ لیا اور مختلف افراد کی آڑ لیتا ہوا کسی محفوظ گوشے کی تلاش کرنے لگا۔

''تم ہماری بیٹی جیسی ہو پھولن! ہم نے تمہارے ساتھ کچھ بھی غلط نہیں کیا۔'' ایک اور شخص گھگیایا۔

پھولن کے ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے وکرم کی جانب دیکھا اور قطعیت سے کہنے لگی۔

''مجھے میادین چاہیے۔''

وکرم کی پیشانی پر شکن ہوگئی۔ اس کے اشارے پر مادھو اور بھرت تمام دیہاتیوں کو ایک قطار میں کھڑا کرنے لگے۔ اگلے چند ہی لمحوں میں ان سبھی کو اندازہ ہوگیا کہ میادین وہاں سے فرار ہوچکا ہے۔ پھولن طیش سے بل کھا کر رہ گئی۔ وہ بلا سوچے سمجھے میادین کے گھر کی جانب بڑھ گئی۔ وکرم تیز قدموں سے چلتا اس کے عقب میں لپکا اور دایاں بازو سختی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔ کہنے لگا۔

''ہوش میں آؤ پھولن!''

''میں اس کمینے کو زندہ نہیں چھوڑ سکتی۔ میرے پریوار کی تباہی کی شروعات اسی شخص نے کی تھی۔'' وہ سرد مہری سے اسے دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

''تم ایک ڈکیت ہو پھولن!'' وکرم نے اسے حقیقت آشنا کرنا چاہا۔ ''اور ہر ڈکیت کچھ نیتیوں کا پابند ہوتا ہے۔''

''کیسے نیتیم؟ میں ایسے کسی پاکھنڈ کو نہیں مانتی۔'' وہ ہٹ دھرمی سے کہنے لگی۔

''تمہارے نہ ماننے کی صورت میں ہمارے راستے الگ ہوجائیں گے۔ اس کے بعد پولیس تمہارا جو حال کرے گی وہ تم بھی جانتی ہو۔'' وکرم نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

پھولن حیرت و صدمے سے اسے دیکھنے لگی۔ وکرم نے ایک توقف کے بعد پھولن کا کندھا تھپتھپایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گویا ہوا۔

''میں تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں کہ کوئی بھی ڈکیت اپنے پریوار کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ایسا کرنے سے وہ ہماری برادری کا حصہ نہیں رہتا۔''

''تو کیا میں یہاں اتنی دور آنے کے بعد خالی ہاتھ واپس چلی جاؤں؟'' وہ چیخ گئی۔

''نہیں۔ میں تمہاری بھاونائیں سمجھتا ہوں۔ میادین سے انتقام لینے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ مجھے تم ہی نے ایک بار بتایا تھا کہ اس کی بیوی کے بھائی مان سنگھ نے تمہیں بہت نقصان پہنچایا تھا۔'' وکرم نے رسان سے کہا۔

''ہاں، وہ تھانے میں آکر پولیس والوں کو اکساتا تھا کہ پھولن پر جتنا من چاہے اتیاچار کریں۔'' پھولن کے ایک اور زخم میں ٹیس ابھری۔

''ہم اسے اپنا نشانہ بنائیں گے۔'' وکرم نے معنی خیزی سے اسے دیکھا۔

پھولن کے انداز میں واضح بے دلی تھی۔ وہ میادین کو ہی آتشِ انتقام میں سوختہ کرنا چاہتی تھی۔ وکرم نے ایک گہری سانس لی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''میرا وشواس کرو۔ مان سنگھ کو نشانہ بنا کر تم میادین کا جیون نرک بنادو گی۔ وہ ہر روز ایک نئی موت مرے گا۔''

''تم مجھے تسلی دینے کے لیے ایسا کہہ رہے ہو؟'' وہ ٹھٹکی۔

''نہیں۔'' اس نے قطعیت سے جواب دیا۔ ''مان سنگھ اس کی چہیتی بیوی کا بھائی ہے۔ تم اسے نقصان پہنچاؤ گی تو اس کی بہن اپنی بھاونائوں سے مجبور ہوکر پتی کا جینا حرام کردے گی۔ میادین کا جیون اس سنسار میں ہی نرک ہوجائے گا۔''

پھولن کی آنکھوں میں ایک چمک ابھر آئی۔ اسے وکرم کی بات سمجھ آگئی تھی۔

Scanned with CamScanner

''لیکن اسے یہاں کیسے بلائیں گے؟'' وہ الجھی۔

اگلی صبح وکرم نے اپنے ایک ساتھی کو مان سنگھ کے گھر روانہ کردیا۔ اس شخص نے اسے پولیس کی جانب سے جنگل کے باہر ملاقات کا فرضی پیغام دینا تھا۔ وکرم کا یہ منصوبہ کامیاب رہا۔ مان سنگھ نہایت اہتمام سے تیار ہوکر پولیس سے ملاقات کے لیے آیا اور اپنے سامنے پھولن کو دیکھتے ہی حواس باختہ ہوگیا۔

''تم..... یہاں؟ تم..... تو.....'' ہتھیار بدست پھولن کو دیکھتے ہی اس کی سٹی گم ہونے لگی۔

''ہاں، میں..... پھولن دیوی۔ یہاں..... تیرے سامنے موجود ہوں۔'' وہ ہر ایک لفظ چباتے ہوئے گویا ہوئی۔

''میں نے کچھ نہیں کیا..... میں تو نردوش ہوں۔'' مان سنگھ مدد طلب نگاہوں سے قرب وجوار میں دیکھنے لگا۔

''ہاں، ہاں۔ تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔'' پھولن نے پچکارا۔ ''تم تو بس تھانے میں آکر مجھے ننگی گالیاں دیتے تھے۔ پولیس والوں کی طرف سے میرے ساتھ ہونے والے اتیاچار پر انہیں شاباشی دیتے تھے۔ انہیں یہ بھی کہتے تھے کہ اس کی عزت کے ساتھ جتنا من چاہے، کھلواڑ کرو۔ یہ اسی کام کے لیے ہی پیدا ہوئی ہے۔''

پھولن کے الفاظ کی سنگینی نے مان سنگھ کے اعصاب منتشر کردیے۔ اس کی آنکھوں سے خوف ودہشت کے آنسو بہہ نکلے۔ یہ منظر دیکھتے ہی وکرم اور اس کے سب ساتھی قہقہہ بار ہوگئے۔

''مجھے شما کردو پھولن! مجھ پر دیا کرو۔'' وہ اس کے سامنے جھک گیا۔

پھولن نے اس کے چہرے پر ایک ٹھوکر رسید کردی۔ وہ ایک جھٹکے سے زمین بوس ہوگیا۔

''میں بھی ایسے ہی روتی تھی، اسی طرح سب کی بنتی کرتی تھی۔ میری کسی نے ایک بھی نہیں سنی۔'' پھولن غرائی۔

مان سنگھ کے بدن میں لرزش پیدا ہوگئی۔ وکرم نے پھولن کو مخصوص اشارہ کرتے ہوئے اسے موت سے ہمکنار کردینے کا عندیہ دے دیا۔ اسی لمحے پھولن کے دل ودماغ پر ایک خوف وگریز غالب آگیا۔ کسی جاندار کو گولی مار دینے کا احساس اسے وحشت زدہ کرنے لگا تھا۔ وکرم نے سخت نظروں سے اسے گھورا اور دوٹوک کہنے لگا۔

''گولی چلاؤ پھولن! اگر آج تم نے اسے چھوڑ دیا تو باقی دشمنوں پر اپنا خوف کھودوگی۔''

پھولن لمحہ بھر کے لیے حزبذب ہوئی اور اس کے بعد رائفل سونت کر مان سنگھ کے لرزیدہ بدن میں ایک گولی داغ دی۔ اس کے بعد فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ گروہ کے سبھی ساتھیوں کی فائرنگ نے مان سنگھ کا جسم چھلنی کردیا تھا۔ اس کا سفید لباس خاک اور لہو سے اپنا اصل رنگ کھو بیٹھا تھا۔ وکرم نے روایت کے مطابق اس کی جیب میں ایک پرچی رکھ دی۔

''کیا لکھا ہے تم نے؟'' وہ متجسس ہوئی۔

''پھولن دیوی کی طرف سے پولیس کے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ۔ یہ تو ابھی بس شروعات ہے۔'' اس نے محظوظ ہوکر بتایا۔

''بس اتنا ہی؟'' پھولن بدمزہ ہوئی۔

''ارے نہیں بھئی۔ پولیس والوں کے لیے ''پیار'' بھرے شبد بھی لکھے ہیں۔'' وہ مسکرایا۔

پھولن کے چہرے پر آسودہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

''میں نے تمہارے گھر میں ایک سندیس بھیج دیا ہے۔ وہ شام کو چنے کی فصل میں ہم سے ملنے آئیں گے۔ اس کے بعد انہیں یہ جگہ چھوڑنا ہوگی۔'' وکرم نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

پھولن نے خالی الذہنی کے عالم میں سر اثبات میں ہلادیا۔

☆☆☆

اس شام چنے کی فصل میں پوشیدہ پھولن سخت اضطراب میں مبتلا تھی۔ اسے اپنی اوائل عمری سے ملنے والی دھتکار، نفرت اور جبر زدہ شب وروز یاد آرہے تھے۔ میادین کا تصور رگ وپے میں حشر پیدا کرنے لگا۔ اس بے کلی میں مان سنگھ کا لہولہان وجود کیف وسرور کی سی کیفیت سے دوچار کردیتا تھا۔ چند لمحوں کے بعد اسے بھرت کی تشویش زدہ آواز نے چونکا دیا۔ وہ وکرم سے مخاطب ہوکر کہنے لگا۔

''یہ مولہ بہن کے ساتھ کون لوگ آرہے ہیں؟''

اس اطلاع نے وکرم اور پھولن کے وجود میں سنسنی پیدا کردی۔ انہیں مخبر کی جانب سے خبر مل چکی تھی کہ پولیس نے مان سنگھ کے قتل کی پاداش میں پھولن کی گرفتاری پر انعامی رقم کا اعلان کیا ہے۔

مولہ کے عقب میں پچاسیوں اہل علاقہ اور ان کے سرکردہ ''سرپنچ'' کو دیکھتے ہی پھولن بھنا کر رہ گئی۔ وہ تنتاتی ہوئی فصل سے باہر نکلی اور مولہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''اماں! یہ کس کی برات لے کر آئی ہو اپنے ساتھ؟''

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

''پھولن! یہ سب اپنے ہی لوگ ہیں۔ تم سے ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ بیٹی کے تیور دیکھ کر بوکھلا گئی۔

پھولن نے خشونت زدہ نظروں سے ان ''اپنے'' لوگوں کو دیکھا۔ ان کے فربہ وجود، جھاڑی نما ڈاڑھیوں اور بے چین نگاہوں سے واضح عیاں تھا کہ وہ محض ہتھیاروں کے خوف سے وہاں آئے ہیں۔

''یہ تمہیں اپنے لگتے ہیں؟'' اس نے تاسف سے مولہ کو مخاطب کیا۔

مولہ بیٹی سے نگاہیں چرا کر رہ گئی۔

''یہ اپنے لوگ اس وقت کہاں تھے جب مجھے تھانے میں بند کر کے اتیاچار کیا جاتا تھا۔ ان اپنوں نے اس سے کوئی گواہی کیوں نہ دی جب مجھ پر چوری کا آروپ لگایا گیا تھا۔ تمہارے ان اپنے لوگوں نے ٹھاکروں کو مجھے روندنے سے منع کیوں نہ کیا؟'' پھولن کی آواز طیش و صدمے سے پھٹنے لگی تھی۔

''ہمیں شما کردو..... ہم پر دیا کرو..... ہم تو نردوش ہیں۔'' مجمعے سے متفرق آوازیں ابھریں۔

پھولن تنفر سے سر جھٹک کر رہ گئی۔ وکرم کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے سرپنچ کو گھورتے ہوئے کہا۔

''تم ایک دُشٹ آتما ہو۔ پھولن کے اپہرن کے لیے بابو گجر سنگھ کو تم ہی نے سندیس بھیجا تھا۔ اب یہاں معصوم بنے کھڑے ہو۔''

''نہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ کسی نے میرا نام استعمال کیا ہوگا۔'' وہ گھگیا گیا۔ ''میں نردوش ہوں۔''

''ہمیں اپنی سیوا کا موقع دو بیٹی! ہم تم سب کو بھوجن کی دعوت دینے آئے ہیں۔'' پنچایت کے ایک اور عمر رسیدہ رکن نے کہا۔

پھولن ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وکرم کی نگاہوں میں سوچ کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ دعوت کا ذکر سنتے ہی بھرت اور مادھو کی گویا رال ٹپکنے لگی تھی۔ وکرم نے پھولن کا ہاتھ نرمی سے دبایا اور نگاہوں کے خفیف اشارے سے آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔

پھولن کے لیے تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

☆☆☆

گاؤں کی سرحد میں قدم رکھتے ہی پھولن کو ایک واضح تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ علاقے کا ہر ایک فرد اس کے قدموں میں بچھنے کے لیے تیار تھا۔ یہ صورتِ حال اسے کراہت میں مبتلا کر رہی تھی۔ اسے اپنی تمام تر کم عقلی اور ناسمجھی کے باوجود اس بات کا بخوبی ادراک تھا کہ یہ ''عزت'' اور ''خوف'' وکرم کی ہمراہی اور ہتھیاروں کی موجودگی کا شاخسانہ ہے۔ وہ بے نیازی سے چلتی ہوئی اپنے گھر کی جانب بڑھ گئی۔

''ہم دیوی دین کے گھر میں ہی بھوجن کریں گے۔ سب بندوبست وہیں کر لینا۔'' وکرم نے سرپنچ کو مخاطب کیا۔

''حویلی میں چلے آتے تو شوبھا بڑھ جاتی۔'' وہ منمنایا۔

''اپنی لگائی کو تھوڑی دیر کے لیے یہاں بھیج دینا۔ گھر کی صاف ستھرائی کروانی ہے۔'' پھولن نے سرد مہری سے کہا۔

''میں کسی نہ کسی سیوک کو بھیج دیتا ہوں۔'' سرپنچ گڑبڑا گیا۔

''جتنا کہا گیا ہے، اتنا ہی کرو۔ سمجھے کہ نہیں؟'' بھرت نے اپنی رائفل سے اس کے کندھے پر ٹھوکا دیا۔

سرپنچ کے چہرے پر زردی کھنڈی دکھائی دینے لگی۔ وہ بوجھل انداز میں چلتا اپنی حویلی کی جانب بڑھ گیا۔ پھولن گھر کے آنگن میں داخل ہوئی ہی تھی کہ اسے عقب سے شور سنائی دیا۔ اسی اثنا میں اسے میادین دکھائی دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھال تھام رکھا تھا۔ پھولن کی آنکھوں سے شرارے لپکنے لگے۔

''دھیرج سے کام لینا۔'' وکرم نے سرگوشی میں متنبہ کیا۔

پھولن نے بے بس اور شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھا اور اسی کے انداز میں کہنے لگی۔

''تمہارے نیم میرنے لیے نہیں ہیں مستانہ! میں ایک ناری ہوں۔''

''تم اب کیول ایک ڈکیت ہو اور تمہیں ہمارے ہر نیم کا پالن کرنا ہوگا۔'' اس نے سختی سے جواب دیا۔

پھولن ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔ اسی لمحے میادین اس کے قریب آ کر قدموں میں تھال رکھے بیٹھ گیا۔ اس تھال میں ڈھیروں روپے موجود تھے۔ پھولن نے اسے ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔ وہ پشت کے بل زمین بوس ہو گیا۔ دیوی دین اور مولہ شدید مضطرب دکھائی دینے لگے۔

''مجھے شما کردو پھولن! مجھ پر دیا کرو۔'' وہ گڑگڑایا۔

''اسی طرح بات کرنا چاہیے ہم ماں بیٹیوں کو گالیاں دے کر چتاؤنیاں دیا کرتا تھا۔'' اس نے دشنام طرازی کرتے ہوئے ایک اور ٹھوکر رسید کی۔

''مجھے شما کردو۔ بھگوان کے واسطے! تمہیں اپنے ماتا

Scanned with CamScanner

digest library.com

پتا کی سوگند ہے۔ مجھ پر دیا کرو۔" وہ اس کے قدموں سے لپٹ گیا۔

"میری بچی! یہ میرے پریوار کا حصہ ہے۔ اسے شما کردے۔" دیوی دین نے بیٹی کو مخاطب کیا۔

پھولن حیرت و صدمے سے اپنے والدین کو دیکھنے لگی۔

"کس مٹی سے بنے ہو تم لوگ؟" وہ چلائی۔

"ہم نے اسی گاؤں میں رہنا ہے۔ پریوار کے ورودھی بن کر برادری تھوتھو کرے گی۔" مولہ نے بھی التجا کی۔

پھولن کے ذہن میں ایک آتش فشاں ابلنے لگا۔ اس نے اپنی رائفل سونت کر میادین کے سر پر تان دی۔ اسی لمحے فضا میں ناگوار بدبو کا احساس غالب آگیا۔ وکرم نے چونک کر میادین کی جانب دیکھا جس کا زیریں لباس بیک وقت تر اور زرد دکھائی دے رہا تھا۔ وکرم اور دیگر ساتھیوں نے کراہت سے منہ پھیر لیا۔

"دیا کرو پھولن! یہ پیسے کم ہیں تو میں اور دینے کے لیے تیار ہوں۔ اپنی جائداد بھی دینے کے لیے تیار ہوں۔" اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"جائداد تو تمہیں دینی ہوگی۔ دیوی دین کے حصے کی زمین واپس کرو۔" وکرم نے لقمہ دیا۔

"میں اتنی زمین لے کر کیا کروں گا؟ میرے لیے تو پانچ بیگھے بھی بہت ہیں۔" دیوی دین نے سادگی سے کہا۔

پھولن ایک بار پھر طیش سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم بھول رہے ہو باپو! اس نے تمہارے" اسی بیگھے" زمین پر قبضہ کیا تھا۔" وہ ہر ایک لفظ چباتے ہوئے گویا ہوئی۔

دیوی دین نظریں چرا کر رہ گیا۔ مولہ کی بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی۔ پھولن نے تاسف سے انہیں دیکھا اور ہونٹ بھینچ کر کہنے لگی۔

"تم دونوں کائر ہو۔ تمہارے اندر اپنا ادھیکار لینے کی بھی ہمت نہیں ہے۔ تم جیسے کائر لوگوں کی سنتان میری طرح اتیاچار سہتی ہے۔ مجھے یہ رائفل اس حرام خور پر نہیں بلکہ تم دونوں پر چلانی چاہیے۔"

دیوی دین نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

"زمین کے پکے کاغذ لے کر آؤ۔ زمین شیو نارائن کے نام ہوگی۔" پھولن ایک توقف کے بعد کہنے لگی۔

میادین کے چہرے پر امید کی چمک ابھر آئی۔

"پھولن دیوی کی جے..... پھولن دیوی کی جے۔" بیگھے سے صدا آتے ہی سبھی افراد ہم آواز ہو گئے۔

دیوی دین اور مولہ کے بدن سنسنا گئے۔ انہیں بیٹی کے اس "دبدبے" پر بے حد فخر محسوس ہو رہا تھا۔ والدین کی ان کیفیات کو نظر انداز کرتے ہوئے پھولن کی نگاہیں وکرم پر مرکوز تھیں جو یک ٹک تھال میں موجود رقم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجب چمک لہرا رہی تھی۔ پھولن کے دل میں ایک خلش چٹکی بھرنے لگی۔

"کیا وکرم یہ سب پیسوں کے لیے کر رہا ہے؟ میں اس پر بھروسا کر کے کوئی غلطی تو نہیں کر رہی؟" اس کے ذہن میں ایک بدگمان سوچ ابھری۔

☆☆☆

گاؤں سے واپسی کے بعد وہ ایک بار پھر جنگل میں پناہ گزین ہو چکے تھے۔ وکرم اور پھولن کے رشتے میں ایک کھنچاؤ اور گریز در آیا تھا۔ ان کی باہمی گفتگو بالکل موقوف تھی۔ کچھ روز بعد وکرم ایک عجب اضطراب اور عجلت میں دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے چند ایک بار پھولن سے بات کرنے کی کوشش کرنی چاہی لیکن اس کی بدگمانی ختم ہو کے ہی نہ دے رہی تھی۔ ایک روز وکرم علی الصباح ہی کہیں روانہ ہو گیا۔ پھولن کے دل پر بوجھ مزید بڑھ گیا۔ وہ ایک درخت تلے سر پیٹ کر اٹھ بیٹھ گئی۔ دل و دماغ پر تلخ یادیں حملہ آور ہونے لگی تھیں۔ اس کے بعد اہل خانہ کی یاد دل میں چٹکیاں بھرنے لگی۔ میادین اور سرپنچ کا تصور رگیں چٹخانے لگا۔

ان خیالات میں الجھے اسے وارے لال کی آمد کا احساس ہی نہ ہو سکا۔

"کیا بات ہے پھولن! ایسے کیوں بیٹھی ہو؟" اس نے نرمی سے کہا۔

"کچھ نہیں چاچا!" وہ گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

"سوچ رہی ہوں، کاش! اس روز تھوڑی سی ہمت کر لی ہوتی۔ بندوق کا ایک گھوڑا ہی تو دبانا تھا۔ اس کے بعد میادین کسی شمشان میں چتا پر لیٹا ہوتا۔"

"اچھا! اس کے بعد کیا ہوتا؟" وارے لال نے رسان سے کہا۔ "تمہارے ماتا پتا کو کوئی پانی کا گھونٹ بھی نہ پوچھتا۔ بہن کے لیے کسی لڑکے کا رشتہ نہ آتا۔ بھائی کو کوئی کام ملتا نہ ہی اسے برادری سے کسی لڑکی کا ہاتھ دیا جاتا۔ رکمنی اور چھوٹی کے پتی بھی انہیں چھوڑ دیتے۔ ان سب کا جیون ایک نرک بنا دیا جاتا۔ کیا تمہارا دل خوش رہ پاتا؟ کیا انہیں ان جنگلوں میں اپنے ساتھ لیے پھر سکتی ہو؟"

پھولن نے ہونٹ بھینچتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

وارے لال لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور ایک توقف سے

Scanned with CamScanner

گویا ہوا۔
''میں نے تمہیں ہمیشہ اپنی بیٹی کی طرح ہی سمجھا ہے۔ اس ناتے میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔''
پھولن ابھی ہونق لگا ہوں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔
''میں مستانہ کو بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ دل کا بالکل بھی برا نہیں ہے۔ تم دونوں کی بول چال کیوں بند ہے؟'' اس نے دریافت کیا۔
''اسے میادین کا وہ پیسا نہیں لینا چاہیے تھا۔'' پھولن نے خفگی سے جواب دیا۔
''کیا تم جانتی ہو کہ آج وہ کہاں گیا ہے؟'' وارے لال نے کہا اور اس کے ردِعمل کا انتظار کیے بغیر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ''وہ کان پور جیل سے سری رام اور لالہ رام کو لینے گیا ہے۔ ان کی ضمانت کے لیے اسی ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ میادین کے وہ پیسے انہی کی ضمانت میں کام آئیں گے۔''
''یہ لوگ کون ہیں؟'' وہ مضطرب ہوئی۔
''سری رام، وکرم کا گرو ہے۔ ان دونوں کی ملاقات جیل میں ہی ہوئی تھی۔ اسی نے وکرم کو ڈکیتی کے گر سکھائے ہیں۔ وکرم اسے بہت مانتا ہے۔'' وارے لال بھی الجھا ہوا تھا۔
اسی اثنا میں بھرت اور مادھو بھی وہیں چلے آئے۔ ان کے چہرے بھی اترے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔
''مستانہ یہ سب کیا کر رہا ہے؟'' بھرت نے شکوہ کیا۔
''وہ سردار ہے۔ ہم اسے کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔'' وارے لال نے کندھے اچکائے۔
مادھو نے اضطراب سے پہلو بدلا اور سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ''سری رام اس کا گرو ہے۔ ان دونوں نے جیل میں بہت اچھا سے گزارا۔ مستانہ اسے جیل سے آزاد کروا رہا ہے۔ یہ سب تو ٹھیک ہے۔ اب اس شخص کو یہاں لانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا مستانہ یہ بات نہیں جانتا کہ ٹھاکر اور ملاح کبھی اکٹھے نہیں رہ سکتے؟''
''سری رام اور لالہ رام ٹھاکر ہیں کیا؟'' پھولن کی دھڑکنیں منتشر ہوئیں۔ اعصاب پر خوف، وحشت، نفرت اور طیش بیک وقت حملہ آور ہوئے تھے۔
''ہاں، دونوں بھائی ایک نمبر کے.....'' وارے لال نے بے دریغ دشنام طرازی کی۔
''بس یوں سمجھ لو کہ بابو گبر سنگھ کا دوسرا روپ ہیں۔'' بھرت نے تنفر سے کہا۔
''لیکن یہ باتیں وکرم کو کون سمجھائے؟'' مادھو نے سر جھٹکا۔ ''وہ تو اس کی بھگتی میں اندھا ہو چکا ہے۔''
پھولن کا دل کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ وارے لال نے ایک توقف کے بعد انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم سب اپنے کام سے کام رکھنا بس۔ مستانہ کو میں سمجھاتا رہوں گا۔''
''میں نے ایک بات سوچی ہے۔'' بھرت نے پہلو بدلا۔ ''سری رام کے آنے پر ہم میں سے کوئی نہ کوئی پھولن کے آس پاس ہی رہے گا۔ ہم میں سے کوئی بھی اسے اکیلا نہیں چھوڑے گا۔''
''یہی ٹھیک رہے گا۔'' مادھو نے تائید کی۔
پھولن کی بے چینی سوا تر ہونے لگی۔ اس کی چھٹی حس کسی خطرے کا عندیہ دے رہی تھی۔ اسے اب شدت سے وکرم کی واپسی کا انتظار تھا۔

☆☆☆

سری رام اور وکرم کی آمد دوپہر کے بعد ہوئی۔ وکرم نے فی الفور ایک درخت تلے دری نما کپڑا بچھایا اور نہایت تکریم سے اسے وہاں بٹھا دیا۔ گروہ کے ساتھی اس کا فدویانہ انداز دیکھ کر کڑھ رہے تھے۔
''یہی تمہارا استھان ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آج سے تم ہمارے سردار ہو۔''
سری رام رعونت سے وہاں براجمان ہو گیا۔ وکرم عجلت میں اپنے مخصوص مقام کی طرف بڑھا اور پھولن سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔
''جلدی آؤ، تمہیں سری رام کو نمسکار کرنا ہے۔ اس کے پاؤں چھو کر آشیرواد لینا۔''
پھولن چار و ناچار اٹھی اور اس کے ہمراہ چل دی۔ اسے دیکھتے ہی سری رام کی آنکھوں میں مخصوص چمک ابھر آئی۔ پھولن اس چمک سے بخوبی واقف تھی۔ اس کے دل میں ناگواری کی لہر اٹھی اور وہ تنفر سے سر جھٹک کر رہ گئی۔
''یہ کون ہے مستانہ؟'' سری رام نے وکرم کو مخاطب کیا۔
''یہ پھولن ہے۔'' وکرم نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے سری رام کی قدم بوسی کا عندیہ دیا۔
''اچھا..... تو یہ ہے پھولن۔'' سری رام نے سرتاپا اسے گھورا۔ ''یہ یہاں سبھی کی ''لگائی'' ہے؟''
پھولن اس لغو گوئی پر طیش سے بل کھا کر رہ گئی۔ اس کے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ اس سرخ بالوں اور لہو رنگ آنکھوں والے شخص کے چہرے پر نفرت سے تھوک دے لیکن وکرم کے بشرے سے جھلکتی عقیدت جز بز کرنے لگی تھی۔

Scanned with CamScanner

digest library.com

سری رام کے تاثرات اور اس معنی خیز جملے پر وارے لال چند قدم آگے بڑھ کر وکرم کے پہلو میں آ کھڑا ہوا۔ مادھو اور بھرت نے بھی اپنی رائفلیں مضبوطی سے تھام لی تھیں۔

"یہ میری بیٹی ہے۔" وارے لال نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"ناری سے صرف لگائی کا ہی سمبندھ نہیں ہوا کرتا۔" مادھو نے بھی اسی انداز میں کہا۔ "پھولن ہماری بہن سمان ہے۔"

سری رام کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں۔ وکرم نرمی سے گویا ہوا۔ "پھولن میری پتنی ہے۔"

"کب ہوا یہ بیاہ؟" وہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔

"جب مستانہ نے بابو گجر سنگھ کی ہتھیا کی تھی۔" وارے لال نے فی الفور جواب دیا۔ "وہ پھولن پر بری نظر رکھتا تھا۔ مستانہ نے اس کی ہتھیا کر کے بیاہ کر لیا۔"

پھولن توصیفی نظروں سے وارے لال کی سمت دیکھنے لگی۔ سری رام ناگواری سے منہ بنا کر رہ گیا۔

"لالہ رام نہیں آیا تمہارے ساتھ؟" وارے لال نے وکرم کو مخاطب کیا۔

"ایک دو روز میں آ جائے گا۔" وکرم نے بتایا۔

"میں اب آرام کرنا چاہتا ہوں۔" سری رام نے جماہی لی۔

وکرم نے اسے قورا مخصوص مقام تک پہنچا دیا۔ پھولن اس کی تابعداری اور انداز خدمت پر کلس رہی تھی۔

"تم نے اس کے چرن چھونے میں اتنی دیر کیوں کی؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ اس کو نمسکار کرنا ہے۔" وکرم نے شکوہ کیا۔

"وہ شخص مجھے اپنی آنکھوں سے بے لباس کر رہا تھا اور تم چاہتے ہو کہ میں اس کے چرن چھولوں؟" پھولن بھڑکی۔

"وہ میرا گرو ہے۔ مجھے اس کے سامنے شرمندہ نہ ہونے دینا۔" اس نے تنبیہ کی۔

"وہ کیول ایک ٹھاکر ہے۔" پھولن نے رکھائی سے کہا۔

"پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔" وہ زچ ہوا۔ "ہر ٹھاکر ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔"

"کمال ہے۔ تمہیں اس کی نگاہوں میں وہ اشلیتا کیوں نہیں دکھائی دے رہی جو مجھے محسوس ہوئی ہے؟" پھولن وحشت زدہ ہونے لگی۔

"یہ سب تمہارا وہم ہے۔" اس نے سر جھٹکا۔

"وہم نہیں، حقیقت ہے۔" پھولن مصر رہی۔

"سری رام ایک بہت اچھا انسان ہے۔ تم اس کے بارے میں غلط سوچ رہی ہو۔" وہ بھی ہٹ دھرم تھا۔

"میں نے یہ اشلیل چمک پتی لال سے لے کر ہر اس ٹھاکر کی آنکھوں میں دیکھی ہے جو میرے ہی گھر میں میرے ساتھ پاپ کیا کرتے تھے۔" پھولن نے کرب سے کہا۔ "میں اس چمک کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"ایسا نہیں ہے پھولن! ہم دونوں نے جیل میں بہت اچھا سے گزارا تھا۔ اس نے ہی مجھے یہ سب کچھ سکھایا ہے۔" وکرم نے اس کا دفاع کیا۔

"وہ جیل تھی۔ وہاں اچھا بن کر رہنا اس کی مجبوری تھی۔ اب وہ آزاد ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ تم نے اسے سردار بنا کر اپنے ہاتھ خود ہی کاٹ لیے ہیں۔" پھولن تاسف سے اسے دیکھنے لگی۔

وکرم حیرت سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ پھولن نے پہلی بار اس قدر بحث کی تھی، بصورت دیگر وہ خاموشی سے اس کی ہر بات تسلیم کر لیا کرتی تھی۔

"وہ میرا گرو ہے۔ اسے سردار بننے کا ادھیکار ہے۔" وہ رکھائی سے گویا ہوا۔

"میں بہت چھوٹے دماغ اور کم عقل کی مالک ہوں وکرم! میں نے یہ سنسار بھی زیادہ نہیں دیکھا لیکن ایک بات تو بچپن سے ہی جانتی ہوں۔ شیر اور بکری کبھی ایک گھاٹ پر اکٹھے پانی نہیں پی سکتے۔ غرور اور نفرت ان ٹھاکروں کے خون میں شامل ہے۔" پھولن نے بوجھل انداز میں کہا۔

"یہ تمہارا واہم ہے۔ سری رام نے اپنی غلطی کی معافی مانگ تو لی تھی۔ اب ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔" وکرم مصر تھا۔

پھولن کی آنکھوں میں آنسو نمی در آئی۔ وہ اس شخص کو قائل کرنے میں ناکام تھی۔ اس پر مستزاد اپنا دل کھول کر بھی نہ دکھا سکتی تھی۔ پھولن دیوی ہوش سنبھالتے ہی جبر، نفرت، استحصال اور ناانصافی کا ایندھن بنی رہی تھی۔ وکرم اور اس کے گروہ کے روپ میں پہلی مرتبہ محافظ رشتے نصیب ہوئے تھے۔ وہ انہیں کھو دینے کی بالکل متحمل نہ تھی۔

"تمہیں سری رام کی عزت کرنی ہے۔ مجھے کسی بھی شکایت کا موقع نہ دینا۔" وکرم نے اسے خیالات میں غرق دیکھ کر کہا۔

پھولن خاموشی سے آنکھوں پر بازو رکھے لیٹ گئی۔

☆☆☆

اگلے کچھ روز میں پھولن، وارے لال، بھرت اور مادھو کے بھی خدشات مجسم ہو گئے تھے۔ سری رام نہایت

Scanned with CamScanner

کینہ پرور، متہم مزاج، متعصب اور چھوٹی ذہنیت کا حامل شخص تھا۔ اسے احساس برتری کے آسیب نے بھی مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ گروہ کے ملاح ساتھیوں سے اہانت آمیز انداز تخاطب ایک معمول بن چکا تھا۔ اسی دوران لالہ رام نے بھی ان کے ساتھ شمولیت اختیار کرلی۔

لالہ رام کی شخصیت بڑے بھائی سے بالکل متضاد تھی۔ اس کے بال اور رنگت سیاہ، قامت کوتاہ اور جسم قدرے فربہ تھا۔ وہ سری رام سے بالکل نہ دبتا اور اس کی کسی بھی بے ہودہ گوئی یا غلطی کی صاف گوئی سے سب کے سامنے ہی نشاندہی کردیا کرتا۔ نتیجتاً سری رام کی بدمزاجی میں مزید اضافہ ہوجاتا۔

دھیرے دھیرے گروہ کا ماحول یکسر تبدیل ہوگیا۔ بھرت اور مادھو کی شرارتیں سنجیدگی اور تناؤ میں ڈھل چکی تھیں۔ سری رام کسی بھی ملاح رکن کو دشنام طرازی کرتے ہوئے اپنے پاس طلب کرلیتا۔

''درخت کے پیچھے وہ حصہ صاف کرکے آؤ۔'' اس نے ایک روز کمار کو حکم دیا۔

کمار کا چہرہ اہانت سے سرخ ہوگیا۔ اسے علم تھا کہ سری رام کچھ دیر قبل ہی رفع حاجت سے فراغت پاکر آیا ہے۔

''میں یہ کام بالکل نہیں کروں گا۔'' وہ جز بز ہوا۔

''یہ تمہارے سردار کا حکم ہے۔'' سری رام چلایا۔

کمار بے نیازی سے ایک جانب دیکھتا رہا۔ اسی اثنا میں وکرم بھی وہاں چلا آیا۔ سری رام نے اسے دیکھتے ہی پینترا بدل لیا۔

''میں تمہارے کہنے پر یہاں آیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میرے ساتھ یہ سب ہوگا۔ تمہارے ساتھی میری کوئی بات ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔'' وہ مسکین صورت بنائے کہنے لگا۔

''ایسا بالکل نہیں ہے۔ تم ہمارے سردار ہو اور یہ سب تمہاری بات مانیں گے۔'' وکرم نے خشمگیں نگاہوں سے کمار کو گھورا۔

''تو پھر تم ہی اس کی بات مانو۔ میں اس کا کوئی کام نہیں کروں گا۔'' کمار پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

سری رام کے چہرے پر آزردگی چھا گئی۔ وہ شکوہ کناں نظروں سے وکرم کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اپنے کپڑے دھونے کا کہہ دیا تو یہ سب سنا کر چلا گیا۔''

''میں دھو دیتا ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔

''رہنے دو۔ تمہاری لگائی کو اچھا نہیں لگے گا۔ وہ پہلے ہی مجھے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتی ہے۔'' سری رام نے ایک اور وار کیا۔

''وہ ناسمجھ ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔'' وکرم نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

''اس کا بھی دوش نہیں ہے۔ وہ سردار کی لگائی تھی۔ تم نے سرداری مجھے دے دی۔ اب وہ غصہ تو کرے گی ہی۔'' اس کی آنکھوں میں جلن اور تپش تھی۔

وکرم بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

پھولن، سری رام کی غلیظ نگاہوں سے شدید کوفت میں مبتلا رہنے لگی تھی۔ اس کی مخصوص نسوانی حس بھانپ گئی تھی کہ وہ اسے پامال کرنا چاہتا ہے۔ دوسری جانب سری رام بھی اس کے گریز اور بے نیازی سے تلملاہٹ کا شکار ہوچکا تھا۔ وہ اسے زچ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا۔ وارے لال جیسے جہاندیدہ شخص سے یہ بات پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس نے ایک روز پھولن سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''تو نے وکرم کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی؟'' وہ مستفسر ہوا۔

''وہ اپنی بھگتی میں اندھا ہوچکا ہے چاچا! کچھ سننے یا سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔'' پھولن آزردگی سے کہنے لگی۔

''مسیا بڑھتی ہی جارہی ہے۔'' اس نے پیشانی مسلی۔

''اس راکھشس کا اپائے ضروری ہوگیا ہے۔ ہر سے اپنی سرخ آنکھوں سے گھورتا ہی رہتا ہے۔'' وہ تنفر سے سر جھٹک کر رہ گئی۔

''تجھے ایک بات سمجھانا چاہتا ہوں۔'' وارے لال نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کے سامنے وکرم کے آگے پیچھے نہ ہوا کر۔''

پھولن الجھ کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''بات سیدھی سی ہے۔'' اس نے ایک توقف کے بعد سلسلۂ کلام کا دوبارہ آغاز کیا۔ ''مرد پیٹ کی بھوک تو برداشت کرلیتا ہے لیکن ناری کی بھوک کبھی برداشت نہیں کرپاتا۔ سری رام تم پتی پتنی کا پریم اور ایک دوسرے کے لیے خیال دیکھ کر جلن کا شکار ہوتا ہے۔''

پھولن کے فہم میں یہ نکتہ سما گیا۔ اس نے تاسف سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

Scanned with CamScanner

digest library.com

"باقی ساتھی بھی بہت اکھڑے اکھڑے دکھائی دینے لگے ہیں۔" اس نے اپنا مشاہدہ بیان کیا۔

"ہاں، وہ اس کی سرداری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہمارے لوگوں میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ وہ وکرم سے علیحدگی کا سوچ رہے ہیں۔" وارے لال نے بتایا۔

پھولن کی تشویش دوچند ہوگئی۔ اس کے خدشات بہت تیزی سے درست ثابت ہو رہے تھے۔ گروہ کے سبھی عمر رسیدہ افراد سری رام کی لغو گوئی سے دلبرداشتہ ہو کر علیحدگی کا فیصلہ کر چکے تھے۔

"وہ مجھے بھی اپنے ساتھ ہی چلنے کا کہہ رہے ہیں۔" وارے لال نے انکشاف کیا۔

پھولن کا اضطراب مزید بڑھ گیا۔ وہ خونخوار نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"چنتا نہ کر۔ میں نے انہیں منع کر دیا ہے۔" اس نے پھولن کی کیفیت بھانپ لی۔ "وکرم میرا بھتیجا ہے۔ اس سے نادانی کر رہا ہے لیکن میں اسے کیسے چھوڑ دوں؟"

پھولن نے ممنونیت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

☆☆☆

سری رام اور پھولن میں چوہے بلی کا کھیل شروع ہو چکا تھا۔ سری رام کی نگاہیں ہر وقت اسی کے تعاقب میں رہتی تھیں۔ پھولن ان نگاہوں کی مخصوص چبھن اور منعکس ہونے والے ہر ایک رنگ سے بخوبی واقف تھی۔ اس کی رگوں میں شرارے لپکنے لگتے۔

"ہے بھگوان! تو آخر کیا چاہتا ہے؟" وہ آسمان کی سمت نظریں اٹھائے جھنجلا کر کہتی۔ "تجھے مجھ سے کیا بیر ہے؟ میرے جیون میں شانتی کیوں نہیں رہنے دیتا؟ میادین اور گاؤں کے ٹھاکروں سے مکتی ملی تو اب ایک اور ٹھاکر میرے سر پر لا کھڑا کیا ہے۔ تو نے مجھے آخر کس مٹی سے بنایا ہے؟ اس سنسار کے سبھی ٹھاکر میرے ہی پیچھے کیوں پڑے ہیں؟ مجھے شانتی سے جینے کا ادھیکار کیوں نہیں ہے؟"

پھولن کے ان سوالات اور شکوؤں کا کہیں کوئی جواب نہ تھا۔ وہ سری رام کی نگاہوں کا رخ پھیر سکتی تھی نہ ہی وکرم کو اس کے ہاتھ سے آگاہ کر پا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے سری رام مزید کھل کھیلنے لگا۔ اس نے گروہ میں اپنے ساتھی بھرتی کرنے کا آغاز کر دیا۔ یہ سبھی نو وارد ٹھاکر برادری سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ ان کی آمد نے وکرم کے ساتھیوں کے لیے عرصۂ حیات مزید تنگ کر دیا۔ احساسِ برتری کے نشے میں چور یہ ٹھاکر انہیں گالیاں دیتے، تحقیر آمیز القابات سے پکارتے اور غیر اخلاقی افعال کے لیے مجبور کرتے۔

سری رام بھی وکرم کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پھولن کے آس پاس منڈلانے لگتا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اپنی مونچھوں پر تاؤ دینے لگتا تھا۔ پھولن نے چند روز اسے نظر انداز کیا۔ اس کے بعد مونچھیں کاٹ دینے کے جوابی اشارے کر دیتی۔ سری رام کی تلملاہٹ اس کے دل میں ٹھنڈک پیدا کر دیتی تھی۔

کچھ روز بعد پھولن اپنے مخصوص مقام پر بیٹھی موجودہ حالات و واقعات پر غور کر رہی تھی کہ اسے اپنے قریب ہی فائر کی آواز نے بدکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی نگاہوں نے سری رام کو فوراً تاڑ لیا۔ وہ رائفل ہاتھ میں لیے مکروہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا حرکت تھی؟ تم نے پھولن پر گولی کیوں چلائی؟" کچھ فاصلے پر موجود بھرت تلملاتا ہوا وہیں چلا آیا۔

"اندھے ہو گئے ہو کیا؟" سری رام نے تنفر سے کہا۔ "میں تو پنچھی کا نشانہ لے رہا تھا۔ ہاتھ پر کیڑے نے کاٹ لیا تو نشانہ چوک گیا۔"

"سب جانتا ہوں کہ تجھے کون سا کیڑا کاٹ رہا ہے۔" بھرت نے طیش سے جواب دیا۔

اسی اثنا میں سری رام کے دائیں پاؤں کے عین قریب دھماکے نے اسے چونکا دیا۔ کچی زمین پر گولی کا نشان واضح دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے.....؟" اس نے پھولن کے لیے تحقیر آمیز القابات استعمال کیے۔

"جنگلی سؤر کا نشانہ لے رہی تھی۔ ہاتھ پر چیونٹی نے کاٹ لیا تو نشانہ چوک گیا۔"

پھولن کے بے دھڑک انداز پر بھرت جھوم کر رہ گیا۔ سری رام کینہ توز نظروں سے اسے دیکھتا ہوا لوٹ گیا۔

"اس حرام خور کی حرکتیں بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ وکرم کو جانے کیوں اس پر اتنا وشواس ہے۔" بھرت نے تاسف سے کہا۔

"برے سے کے ساتھی ہمیشہ یونہی یاد رہتے ہیں۔ انسان ان کی کوئی برائی دیکھ ہی نہیں پاتا۔" وارے لال بھی وہیں چلا آیا۔ کمار اور مادھو بھی اس کے ہمراہ تھے۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ وکرم ہمارے آدھے ساتھیوں کے چلے جانے پر نراش ہے۔ اسے دھچکا لگا ہے۔" پھولن نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

"ناری کے سامنے ناک نیچے ہونے کا ڈر ہو تو مرد

Scanned with CamScanner

یونہی کرتا ہے جو وکرم کر رہا ہے۔" وارے لال گمبھیر انداز میں کہنے لگا۔ "وہ چھوٹا بچہ یا ناسمجھ نہیں ہے۔ اسے بھی سری رام کی حرکتیں کھٹکنے لگی ہیں لیکن تیرے سامنے ناک نیچی نہیں ہونے دینا چاہتا۔"

"لیکن ہمارے ساتھ کیوں ایسا کر رہا ہے؟" کمار زچ ہوا۔ "ہم تو اس کے ساتھی ہیں۔ ہمیں ہی اس کے سامنے نیچا دکھا دیتا ہے۔"

"سری رام بہت مکار ہے۔ اس نے وکرم کو پوری طرح اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے لیکن تم چنتا نہ کرو، میں اسے سمجھاتا رہوں گا۔" وارے لال نے دلاسا دیا۔

"میں نے تو کچھ اور ہی سوچا ہے۔" مادھو نے اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے لب کشائی کی۔ "وکرم نے سری رام کو سردار بنا دیا ہے۔ ہمیں اس کی سرداری بالکل سویکار نہیں ہے۔ ہم اپنا سردار خود چن لیتے ہیں۔"

پھولن حیرت سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ دیگر افراد کی بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو مادھو؟ یہ نہیں ہو سکتا۔" بھرت نے کہا۔

"ہمارا نیا سردار "پھول سنگھ" ہوگا۔" اس نے بھرت کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پھولن کی جانب دیکھا۔

پھولن اس انداز تخاطب پر ششدر رہ گئی۔ وہ آگہی کے لمحات تھے۔ پھولن کو پہلی بار علم ہوا کہ ان ساتھیوں نے اس کی مردانہ وار کوششوں اور لگن کو احسن انداز میں قبول کر لیا ہے۔ وہ اسے کمزور ناری کے بجائے اپنی ہی طرح ایک باہمت اور جنگجو مرد تسلیم کرنے لگے تھے۔

"بس تو پھر طے ہوا۔" کمار نے کہا۔ "ہم پھول سنگھ کے ہی حکم کا پالن کریں گے۔"

"سردار پھول سنگھ کی جے ہو..... سردار پھول سنگھ کی جے ہو۔" بھرت پرجوش ہوا۔

وارے لال کے لبوں پر مطمئن مسکراہٹ رینگ گئی۔

☆☆☆

سری رام کی لہو رنگ آنکھیں پھولن پر ہی مرکوز تھیں۔ وہ بارش سے بچاؤ کے لیے ایک درخت تلے سمٹی بیٹھی تھی۔ سری رام اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا اس کے پاس پہنچ گیا۔

"کیسی ہو بہن جی؟" اس نے پھولن کا سرتاپا جائزہ لیا۔

پھولن نے بے نیازی سے منہ پھیر لیا۔

"کیا کر رہی ہو یہاں؟"

"تمہاری اماں کے بیاہ کی تیاری۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

سری رام کا چہرہ سیاہ پڑنے لگا۔

"بہت زبان چلاتی آتی ہے تجھے حرافہ!"

پھولن کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

"تو..... ملاح کی بیٹی! خود کو سمجھتی کیا ہے؟" اس نے بے دریغ گالیاں دیں۔ "اب ڈکیتوں کی سرداری تجھ جیسی..... کرے گی؟"

پھولن کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ اس کا پرسکون انداز سری رام کو سلگا رہا تھا۔ وہ طیش سے بے قابو ہونے لگا۔

"تو گندی نالی کا ایک کیڑا ہے۔ میں نے تجھے تیری اوقات نہ دکھائی تو کہنا۔" اس کی دشنام طرازی بھی جاری تھی۔

"اگر میں گندی نالی کا کیڑا ہوں تو تجھے اس کیڑے کے لیے اتنی بھوک کیوں ہے؟ اصل گندگی تو تیرے اندر چھپی ہے۔" پھولن نے دوبدو جواب دیا۔

"وکرم کو چھوڑ کر میری لگائی بن جا۔ میں تجھے سونے میں تول دوں گا۔" اس نے یکدم پینترا بدلا۔

"پتی بدلنے کا کھیل تیرے پریوار میں ضرور کھیلا جاتا ہوگا۔ مجھے کبھی کوئی ایسی سیکھ نہیں ملی۔" پھولن بھڑک گئی۔

"اچھی طرح سوچ لے۔" وہ خباثت سے مسکرایا۔ "تجھے عیش اور آرام سے رکھوں گا۔"

"وکرم یا دارے لال سے مشورہ کر کے بتاتی ہوں۔" اس نے سنگین لہجے میں کہا اور تیزی سے اس سمت پلٹ گئی جہاں وکرم اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔

پھولن کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی سری رام نے جست لگائی اور بہ آواز بلند چلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"تجھے شرم آنی چاہیے پھولن دیوی! وکرم تجھ سے کتنا پریم کرتا ہے اور تو اس سے بے وفائی کر کے میرا بستر گرم کرنا چاہتی ہے۔ چھی..... چھی! ایسی عورت ہے تو؟"

پھولن اس الزام تراشی پر دنگ رہ گئی۔ اسے ساکت ہوتے دیکھ کر سری رام اپنی آواز پست کرتے ہوئے غرایا۔

"اگر تو نے میری بات نہ مانی تو میں وکرم اور سب کو یہ بتا دوں گا کہ پھولن دیوی کے شریر پر کہاں اور کتنے نشان یا تل ہیں۔ پھر کس کس کو وشواس دلاتی رہو گی کہ تمہارا مجھ سے کوئی سمبندھ نہیں ہے۔"

پھولن کی رنگت متغیر ہو گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی ہزار ہا کوششوں کے باوجود شیطان صفت سری رام اسے لباس تبدیل کرتے یا دریا میں اشنان کرتے تاک چکا ہے۔

پھولن کی خاموشی محسوس کر کے وہ معنی خیزی سے ہنسنے لگا۔

Scanned with CamScanner

''وکرم کے کان بھرنے سے پہلے سوچ لینا کہ وہ سب سے زیادہ وشواس مجھ پر کرتا ہے۔ وہ کبھی میرے خلاف نہیں جائے گا۔ میں اسے گھمانا اچھی طرح جانتا ہوں۔''

پھولن کو اپنا وجود کسی منجدھار میں گھرا محسوس ہونے لگا۔

☆☆☆

وکرم کھلے آسمان تلے لیٹا ستاروں کی ٹمٹماہٹ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس کے وجود میں مہیب سناٹا پھیلا تھا۔ دل و دماغ میں شدید کشمکش برپا تھی۔ وہ اپنے قرب وجوار کے ماحول میں تناؤ سے آزردہ رہنے لگا تھا۔ اسے اپنے ساتھیوں سے اس غیر ذمے داری کی توقع ہی نہ تھی۔ اس کا گمان تھا کہ وہ سبھی سری رام کی سرداری بخوشی قبول کرلیں گے لیکن نتیجہ متضاد برآمد ہوا۔ ادھیڑ عمر ساتھیوں کی علیحدگی اور بقیہ ماندہ کی بے اعتنائی اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کررہی تھی۔ مخبر کی اطلاعات پر ڈاکا زنی بھی میکانکی انداز میں ہی عمل میں آتی۔ ان سب حالات وواقعات میں واحد مثبت بات یہی تھی کہ پولیس اہلکاروں کے لیے وکرم ملّاح اور پھولن دیوی کا نام ایک ہوا بننے لگا تھا۔ ان دونوں کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر انعامی رقم میں بھی اضافہ ہوچکا تھا۔

انہی خیالات میں مگن وکرم، سری رام کی آمد پر چونک گیا۔ سری رام کے چہرے پر گہری سنجیدگی دکھائی دے رہی تھی۔

''تو یہاں لیٹا ہے، میں تجھے کب سے تلاش کررہا ہوں۔'' اس نے وکرم کو مخاطب کیا۔

''کوئی کام تھا کیا؟'' وکرم نے بے دلی سے جواب دیا۔

''تو نے میرے سکھائے ہوئے گر ضائع ہی کردیے۔''

سری رام نے تاسف سے سر ہلایا۔

وکرم کی انا اور عزتِ نفس پر یکلخت ضرب لگی۔ وہ غیر ارادی طور پر تن گیا۔

''میرے سر پر کسی بھی ڈاکو سے زیادہ انعام ہے۔ پولیس میری گرفتاری کے لیے بوسونگھتی پھر رہی ہے۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے۔'' اس نے سر جھٹکا۔ ''تو نے یہاں کا ماحول دیکھا ہے؟ تیرے لونڈے اس لونڈیا کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ اسے پھول سنگھ کہتے ہیں۔ کیا پتا وہ لونڈیا ان میں سے کتنوں کا بستر بھی گرم کردیتی ہو۔''

سری رام کی اس بات پر وکرم بھڑک گیا۔

''پھولن کے بارے میں ایک شبد نہیں سنوں گا۔ وہ میری پتنی ہے۔ اسے مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔''

''تیری پیٹھ پیچھے یہاں بہت کچھ ہوتا ہے بھولے ملّاح!'' اس نے تنفر سے کہا۔

''میں نے کہا نا، پھولن کے بارے میں ایک شبد نہیں سنوں گا۔'' وکرم نے سختی سے متنبہ کیا۔

''جب پانی سر سے اوپر ہوجائے گا تو خود ہی عقل ٹھکانے آجائے گی۔'' سری رام نے کندھے اچکائے۔

اس کے جاتے ہی وکرم بے قراری سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دل و دماغ میں شدید جھکڑ رواں تھے۔

''یہ سب کیا ہورہا ہے؟'' اس نے اپنے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ ''کہیں میں اس پر وشواس کرکے غلطی تو نہیں کررہا؟''

''سری رام ایک اچھا انسان ہے۔'' دماغ نے فوراً

خطرناک عورت

پاگل خانے کے کمروں کا چکر لگاتے ہوئے نفسیات کی طالبہ نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''ہائے اللہ! آپ نے اس عورت کی صورت دیکھی تھی۔ بڑی کینہ پرور لگتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب! کیا یہ عورت خطرناک ہے؟''

ڈاکٹر بولا۔ ''ہاں، خاصی خطرناک۔''

لڑکی نے پوچھا۔ ''تو پھر آپ نے اسے اتنی آزادی کیوں دی ہوئی ہے؟''

ڈاکٹر بیزارگی سے بولا۔ ''دینی ہی پڑتی ہے۔''

لڑکی نے پھر حیرت سے پوچھا۔ ''وہ کیوں، کیا وہ آپ کے اختیار میں نہیں ہے؟''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''نہیں، میں اس کے اختیار میں ہوں۔ وہ میری بیوی ہے۔''

استاد اور شاگرد

افلاطون کے سامنے جب کوئی پیچیدہ مسئلہ آتا تو وہ جس حالت میں بھی ہوتا، اسی حالت میں مجسمے کی مانند جامد ہوجاتا۔ اس حالت میں کوئی اس سے کلام نہ کرسکتا تھا حتیٰ کہ جب وہ خود مسئلے کا حل تلاش کرلیتا تو انگڑائی لیتا اور منہ سے عجیب وغریب آوازیں نکالتا۔

افلاطون کا شاگرد ارسطو جب کسی مسئلے پر سوچ بچار کرتا تو کمرے کا دروازہ بند کرکے کمرے میں چکر لگانے لگتا اور جو چیز اس کے سامنے آتی، اسے پیر سے ٹھوکر لگا دیتا۔ خواہ وہ چیز کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہو۔ جب تک وہ اس مسئلے کا حل تلاش نہ کرلیتا، وہ ایسا ہی کرتا رہتا۔

(مرسلہ: ناہید یوسف، اسلام آباد)

digest library.com

تاویل دی۔ ''اس نے ہمیشہ میرا بھلا ہی چاہا ہے۔ جیل میں بھی کئی بار میری رکھشا کی۔ وہاں کتنے ہی خراب لوگ ایسے تھے جو مجھ سے اشلیل سمبندھ بنانا چاہتے تھے۔ سری رام ہر جگہ میری ڈھال بنا رہا۔ وہ غلط کیسے ہوسکتا ہے؟''

اس کشمکش اور الجھن میں غلطاں وکرم کو ایک مخبر کی آمد نے چونکا دیا۔

''کل گاؤں میں ایک بیاہ ہے۔ کسان بہت غریب ہے۔ اسے تمہاری سہائتا کی ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں گہنے اور کچھ پیسے دے دوں گا۔'' وکرم نے خود کو پرسکون کرتے ہوئے جواب دیا۔ اسی اثنا میں پھولن بھی وہاں چلی آئی۔

''آپ بھی بیاہ میں ضرور آنا۔ لوگ آپ دونوں سے بہت پریم کرتے ہیں۔'' مخبر نے التجا کی۔

پھولن نے مسکرا کر تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ ایسے غریب کسانوں کی بیٹیوں کے لیے حتی الامکان مالی مدد کرویا کرتی تھی۔ اسے رکمنی، رام کماری اور اپنی شادی کے لیے جہیز کی تیاری کے سبھی کٹھن مراحل یاد تھے۔ وہ ان دیہاتیوں کو دیوی دین اور مولہ جیسے مصائب سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔

''اس بار بھی کنیا دان میں ہی کروں گی۔'' اس نے اعتماد سے جواب دیا۔

وکرم اس کے چہرے اور آنکھوں کی چمک دیکھ کر ایک بار پھر الجھن میں مبتلا ہوگیا۔

☆☆☆

اگلے روز شادی میں شرکت کے لیے وہ سبھی نہایت مسرور تھے۔ سری رام اور لالہ رام بھی خاصے پرجوش دکھائی دے رہے تھے۔ ان سب نے منقسم ہوکر سفر کا فیصلہ کیا تھا تاکہ کسی بھی ناگہانی کی صورت میں دوسری ٹولی کمک فراہم کرسکے۔

گاؤں کی بیرونی سرحد پر وکرم کو ایک پھل فروش دکھائی دے گیا۔ اس کے پاس سرخ میٹھے تربوزوں کی قاشیں ان کا دل للچانے لگی تھیں۔

''بہت پیاس لگ رہی ہے۔'' اس نے وارے لال سے مخاطب ہوکر کہا۔

وارے لال نے اثبات میں سر ہلا کر اپنی رضامندی کا عندیہ دے دیا۔

''تم یہیں رکو، میں بس ابھی آتا ہوں۔'' سری رام نے رفع حاجت کا مخصوص اشارہ کیا اور عجلت میں کھیتوں کی جانب بڑھ گیا۔

پھولن اور وکرم میٹھے تربوزوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔ اسی لمحے فضا دھماکوں سے گونج اٹھی۔ وکرم لڑکھڑا کر زمین بوس ہوگیا۔ پھولن کے لبوں سے ہذیانی چیخ برآمد ہوئی۔ وارے لال بھی لمحہ بھر کے لیے متوحش ہوگیا تھا۔ وکرم کا بدن لہو اگلنے لگا تھا۔

''یہ اسی راکھشس نے کیا ہے۔ وہ حرام خور اسی لیے کھیتوں میں گیا تھا۔'' پھولن چلائی۔

بارود کی مخصوص بدبو اسے مزید ہذیان زدہ کررہی تھی۔ اسی لمحے سری رام بھی بوکھلاہٹ میں نمودار ہوگیا۔

''کیا ہوا ہے، یہ گولیوں کی آواز کیسی تھی؟'' وہ ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ سب تیرا ہی کیا دھرا ہے.....!'' پھولن نے نازیبا کلمات استعمال کیے۔

''زبان سنبھال کر بات کر۔'' وہ چلایا۔ ''میں ان کھیتوں میں تھا۔''

دھماکوں کی اس آواز سے اگلی ٹولی کے افراد بھی وہیں چلے آئے۔ صورت حال کا جائزہ لیتے ہی وکرم کے ساتھیوں کی آنکھوں میں لہو اتر آیا۔ انہوں نے فوری طور پر اپنے ہتھیار سونت لیے۔ دوسری جانب سری رام کے ساتھی بھی خونخواری پر مائل تھے۔

وکرم، وارے لال کا سہارا لے کر بدقت اٹھا اور پھولن سے مخاطب ہوکر اذیت سے کہنے لگا۔ ''تم خاموش رہو۔ میں اس سے خود ہی بات کروں گا۔''

پھولن نے اس کا بازو سختی سے دبوچ لیا۔

''دیکھ رہے ہو وکرم! تمہاری پتنی کیا آروپ لگا رہی ہے؟'' سری رام نے ناگواری سے کہا۔

''آروپ نہیں ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے تمہیں۔'' وکرم کی آنکھوں اور لہجے میں شکستہ اعتبار کی کرچیاں تھیں۔

''اب تم بھی اسی کی بھاشا بول رہے ہو۔'' اس کی ناگواری میں اضافہ ہوا۔

''اپنی بندوق سامنے لاؤ۔ اس میں دو گولیاں کم ہوں گی۔'' وکرم نے اس کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔

اس کے ہم نوا بھی ہنوز نشانے کی زد میں تھے۔ سری رام کی رنگت متغیر ہوگئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ساتھیوں کو پسپائی کا عندیہ دیا اور برق رفتاری سے فرار ہوگیا۔

''یہ تم نے کیا، کیا مستانہ! اسے جانے کیوں دیا؟''

Scanned with CamScanner

بھرت جھنجلایا۔

وکرم نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پھل فروش کو مخاطب کیا۔ ”کسی بیل گاڑی کا بندوبست کرو۔ ابھی گاؤں جاؤ، سے بہت کم ہے۔“

پھل فروش خوفزدہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

”تمہارا تو بہت خون بہہ رہا ہے۔ اس زخم پر کپڑا باندھ لو۔“ اس نے اپنی قمیص اتار کر اس کی جانب بڑھادی۔

وارے لال نے قمیص پھاڑ کر پہلے اس کے زخموں کا جائزہ لیا۔

”گولیاں ذرا سا اوپر لگتیں تو اس کا بچنا مشکل تھا۔“ وہ ہونٹ کچلنے لگا۔ ”گہنوں اور پیسوں کی پوٹلی کمار کو دے دو۔ وہ ہماری طرف سے بیاہ میں دے دیں گے۔ لڑکی والوں کو ناراض نہیں ہونا چاہیے۔“ وکرم نے پھولن کو مخاطب کیا۔

کمار اور بقیہ ماندہ افراد اس فیصلے پر جز بز دکھائی دینے لگے۔

”وکرم ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ وارے لال نے ان کی کیفیات بھانپ کر انہیں مخاطب کیا۔ ”دیہاتیوں میں اس کا نام اور ساکھ خراب نہیں ہونی چاہیے۔“

کچھ ہی دیر میں پھل فروش بیل گاڑی لے آیا۔ اس کے پاس کپڑے کے تھیلے میں کچھ سامان بھی تھا۔

”اپنے کپڑے بدل لو۔ اس وردی میں ترنت پہچان لیے جاؤ گے۔“ اس نے وارے لال کو مخاطب کیا۔

وکرم کی نگاہوں سے ممنونیت جھلکنے لگی۔ پھل فروش نے بروقت اقدام کیا تھا۔ وہ ان تینوں کے لیے مناسب دیہاتی لباس لے آیا تھا۔ کھیتوں کی آڑ میں ساڑی پہنتے ہوئے پھولن کا ذہن چکرا رہا تھا۔ وکرم سے دوری کا احساس رگیں چٹخانے لگا۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ وکرم کا وجود اس کے لیے کس قدر ناگزیر ہے۔ وہ اپنی سانسیں بھی اسے دان کردینے کے لیے تیار تھی۔

وارے لال نے کسی نہ کسی طور وکرم کا لباس تبدیل کیا اور وہ تینوں بیل گاڑی میں سوار ہوگئے۔

”اس حالت میں کسی بس کی سواری بھی نہیں ملے گی۔“ وارے لال مضطرب ہوا۔

”ٹیکسی دیکھ لینا کوئی۔“ وکرم نقاہت سے کہنے لگا۔

پھولن متوحش نظروں سے اس کے زیریں بدن کو دیکھنے لگی۔ پھل فروش کی دی گئی قمیص کے علاوہ جوتے بھی لہو سے بھیگ چکے تھے۔

”میرے پاس ایک کمبل رکھا ہے، اسے اپنے شریر کو لپیٹ لو۔“ گاڑی بان نے انہیں مخاطب کیا۔ ”اس طرح کسی ٹیکسی میں سرکھشت سفر ہوجائے گا۔“

وارے لال کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ اس نے فی الفور اسے عملی جامہ پہنادیا۔ پھولن اضطراب سے وکرم کے بال سہلانے لگی۔ اس کی رنگت میں ٹھنڈی زردی ان دونوں کو ہی تشویش زدہ کررہی تھی۔

☆☆☆

وکرم کا علاج ہمالیہ سر کرنے سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوا تھا۔ قریبی شہر میں کسی بھی ڈاکٹر کے پاس جراحی کے اوزار موجود نہ تھے۔ اسپتال لے جانے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”اس کا خون مسلسل ضائع ہورہا ہے۔ کہاں لے کر جائیں اسے؟“ پھولن وحشت میں مبتلا ہونے لگی۔

”میری ایک اور ڈاکٹر سے بات ہوئی ہے۔ وہ اسے پولیس کیس کہہ کر علاج نہیں کرنا چاہتا۔“ وارے لال بے بسی سے کہنے لگا۔

”جھانسی چلو۔“ وکرم نے بدقت کہا۔

”تم رام پال کے پاس جانا چاہتے ہو؟“ وارے لال چونکا۔

وکرم نے اثبات میں سر ہلادیا۔ رام پال اس کا چھوٹا بھائی تھا۔

”جھانسی تو دوسرے راجیہ میں ہے۔ وہاں جانے میں بہت سے لگے گا۔“ وہ الجھا۔

”یہاں سے کوئی مدد نہیں ملے گی، الٹا پولیس تک بات پہنچ جائے گی۔“

وکرم کی اس حقیقت بیانی پر وارے لال نے اس کی سیاہ پڑتی رنگت کو دیکھا اور سفر کے لیے ہامی بھرلی۔ پھولن کو ہر ایک لمحہ صدیوں پر محیط محسوس ہورہا تھا۔ جھانسی پہنچنے اور رام پال سے ملاقات تک وکرم کی حالت مزید خراب ہوچکی تھی۔ رام پال نے بمشکل ایک ڈاکٹر کا بندوبست کیا جو ایک لاکھ روپے کے عوض اس کی جراحی کے لیے راضی ہوا تھا۔ اس ڈاکٹر کے سامنے یہ کہانی تراشی گئی تھی کہ سفر کے دوران لوٹ مار میں مزاحمت کے نتیجے میں ڈاکوؤں نے گولیاں چلادی تھیں۔ ڈاکٹر نے زیادہ کریدنے کی ضرورت محسوس نہ کی اور ایک طویل جراحی کے بعد بدن سے گولیاں نکال کر خون کی کئی بوتلیں بھی لگادیں۔

”اسے کب تک ہوش آئے گا؟“ وارے لال نے دریافت کیا۔

Scanned with CamScanner

"ہوش میں آنے کے بعد بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ابھی ایک ٹکڑا شریر میں ہی موجود ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا اور ایک توقف کے بعد کہنے لگا۔

"پھولن کون ہے؟ وہ بے ہوشی سے پہلے اسی کا نام پکار رہا تھا۔"

"اس کی پتنی ہے۔"

"ویسے کیا اتفاق ہے۔ اسی نام کی ایک ڈکیت بھی کافی چرچا میں ہے۔ سنا ہے پولیس نے اس پر دس ہزار روپے انعام رکھا ہے۔"

وارے لال مضطرب ہوگیا۔

"ہم اپنے مریض کو کب تک لے جاسکتے ہیں؟" اس نے موضوع گفتگو تبدیل کرنا چاہا۔

"میں نے بتایا ہے نا، ابھی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اتنی دیر میں باقی رقم کا بھی بندوبست کرلو۔"

کچھ گھنٹوں بعد وکرم کی حالت قدرے سنبھلی محسوس ہونے لگی البتہ چہرے پر نقاہت نے ڈیرے جما لیے تھے۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر کو ہم پر شک ہوگیا ہے۔" پھولن نے کہا۔

"کیا اس نے تمہیں کچھ کہا ہے؟" وکرم تشویش مند ہوا۔

"وہ پلو کی اوٹ سے کئی بار میرا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرچکا ہے۔"

"مجھ سے بھی کافی سوال کررہا تھا کہ گولیاں کیسے لگیں، کتنے ڈاکو تھے، یہ درگھٹنا کہاں پیش آئی؟ اخبار میں تو کہیں کوئی چرچا نہیں ہے۔" وکرم نے دھیرے دھیرے بتایا۔

"مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ پولیس کو خبر نہ کردے۔" پھولن اپنے ہونٹ کچلنے لگی۔

"اتنا بے وقوف نہیں ہے۔ اپنا حساب چکتا کرکے ہی کچھ کرے گا۔" وکرم نقاہت سے مسکرایا۔

"باقی پیسوں کا کیا ہوا؟" پھولن نے دریافت کیا۔

"رام پال انتظام کررہا ہے۔" وارے لال نے بتایا۔

"اس دوران پولیس کو خبر ہوگئی تو؟" وہ وحشت زدہ تھی۔

"تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔ پولیس آئی بھی تو مجھے ہی گرفتار کرے گی۔ ہم تینوں کی گرفتاری بہت مشکلیں کھڑی کردے گی۔" وکرم نے ایک توقف کے بعد کہا۔

"بالکل نہیں۔ میں تمہارے پاس ہی رہوں گی۔" وہ اپنی کیفیات بیان کرنے سے قاصر تھی۔

وکرم سے لمحہ بھر دوری بھی اسے آزار میں مبتلا کردیتی تھی۔ شکستگی، یاسیت اور خوف سینے میں گھٹن پیدا کرنے لگتی۔ اس گھٹن کے زیر اثر سانس لینا بھی دوبھر ہوجاتا تھا۔

"ہمیں اپنے لیے کوئی نیا ٹھکانا تلاش کرنا ہوگا۔" وارے لال نے حتمی انداز میں کہا۔

"ابھی کچھ دن ہمیں کہیں چھپ کر ہی رہنا ہوگا۔" وکرم کی نگاہوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ "میری رام پال سے بات ہوئی تھی۔ وہ ایک عارضی ٹھکانے کا بندوبست کردے گا۔"

"ہمیں پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ رام پال ایک سادھارن اسکول ماسٹر ہے۔ وہ یہ بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔" پھولن نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

اگلے نصف گھنٹے کی باہمی گفتگو کے نتیجے میں وہ اس فیصلے پر پہنچے کہ وارے لال کسی ٹھاکر کا بھیس اختیار کرنے کے بعد پھولن کے ہمراہ اس کے آبائی گاؤں جائے گا جہاں اس نے اپنے عزیز و اقارب کے پاس خطیر رقم بطور امانت رکھوائی تھی۔

"اس کے بعد اپنے ساتھیوں کو بھی یہیں لے آئیں گے۔" پھولن مصر ہوئی۔

"بالکل نہیں۔ ان سب کا ایک ساتھ سفر خطرناک ہوسکتا ہے۔ ابھی پیسوں کا بندوبست کرو۔" وکرم نے ڈپٹ کر کہا۔

پھولن اس تجویز پر عمل کے لیے بدقت راضی ہوئی۔

وہ خدشات سے پُر سفر کے بعد وکرم کے گاؤں پہنچے تو مختلف مقامات پر چوکسی سے کھڑی ہتھیار بدست پولیس کی دیدنے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔

"مجھے کچھ گڑبڑ محسوس ہورہی ہے۔" پھولن کا دل بیٹھنے لگا۔

وارے لال کی جہاندیدہ نگاہوں میں بھی خدشات سرسرا رہے تھے۔ وہ ایک پھل فروش کے پاس جا کھڑا ہوا۔ مختلف پھلوں کے بھاؤ تاؤ کرتے اس نے پولیس کی موجودگی کا محرک کھوج لیا تھا۔ پھل فروش نے نہایت آزردگی سے بتایا۔

"وکرم ملاح گولیاں لگنے کے بعد مارا گیا ہے۔ پولیس نے اس کی لاش کا کریا کرم کردیا ہے۔"

یہ خبر سنتے ہی پھولن کے اعصاب شل ہوگئے۔ اسے زمین و آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔

(جاری ہے)

ماخذات

میں ہوں پھولن دیوی، از: پھولن دیوی

digest library.com

Scanned with CamScanner

دوسرا موقع

عائشہ لمیر

قسمت کبھی کبھی انسان کو ایسے موڑ پر لا کھڑا کرتی ہے کہ وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا... وہ بھی ایسی ہی صورتِ حال کا شکار تھی... اسے کسی کے چوری شدہ زیورات واپس لانے تھے جو کبھی اسی نے چوری کیے تھے... قسمت نے اسے کوئی زخم دینے کے بجائے اپنی غلطی کو سدھارنے کا ایک دوسرا موقع دیا تھا... اب وہ کامیاب ہوتی یا ناکام... یہ تو اس کی کوشش پر منحصر تھا۔

لوگوں کی گمشدہ چیزیں ڈھونڈنے کی ماہر لڑکی کی مہم جوئی

digest library.com

قسمت کبھی کبھار نہایت ظالم معشوقہ ثابت ہوتی ہے اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ زخم دینے کے بجائے دوسرا موقع دے کر آزماتی ہے۔ ایسا ہی ہوا اس دن جب ایلانور لنڈسے نے مجھ پر دباؤ ڈال کر اپنے زیورات واپس دلوانے کی درخواست کی جو غلطی سے جو جول اس کے چوری ہو گئے تھے۔

میرا نام نیتا برنیٹ ہے۔ میں گمشدہ چیزیں ڈھونڈنے میں ماہر ہوں، معاوضے کے عوض۔ ظاہر ہے، میرا مقصد ان

Scanned with CamScanner

لوگوں کی مدد کرتا ہے جنہیں کسی ایسے شخص نے لوٹا ہو جس پر وہ حد سے زیادہ بھروسا کرتے تھے۔ میں اپنے کام میں اس لیے اچھی ہوں کیونکہ میں خود بھی اس تجربے سے گزر چکی ہوں۔ میں نے دھوکا دیا بھی اور کھایا بھی۔

میں نے یہ فن ایک ایسے شخص سے سیکھا جو اس میدان کا کھلاڑی تھا اور اپنی زندگی کے اس باب سے جو سب سے بڑا سبق میں نے حاصل کیا، وہی سبق آج میرے موجودہ پیشے کی بنیاد تھا..... کہ ایک کامیاب فریب کار کبھی کبھی خود بھی شکار بن سکتا ہے۔

جیسے ایک ماہر جادوگر یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ چونکہ اسے تمام کرتبوں کا علم ہے، اس لیے کوئی دوسرا جادوگر اسے دھوکا نہیں دے سکتا۔ اسی طرح ایک پکا فریب باز بھی ان نشانیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے جو دراصل اسی طرح کے فریب کا حصہ ہوتی ہیں جنہیں وہ خود بڑی مہارت سے رچاتا ہے۔

ہیری ولسن..... جادو اور فریب کا ماہر۔ اس نے مجھے چوری کرنا سکھایا۔ پھر اس نے میرا دل چرا لیا اور پھر میرا پیسا۔ ہمارے مشترکہ لوٹ کے مال میں سے تقریباً دس برس کا میرا حصہ۔

بدلے کی آگ میں جلتے ہوئے میں نے اسے ڈھونڈنے میں بہت وقت اور توانائی صرف کی اور جب آخرکار اسے ڈھونڈ لیا اور اس سے اپنا حق واپس لینے کی کوشش کی تو اس نے مجھے ایک بار پھر دھوکا دینے کی کوشش کی۔ اس بار تو اس نے مجھے تقریباً مروا ہی دیا تھا۔ آخرکار میں نے اسے مات تو دے دی مگر اپنے نقصان کا بہت معمولی سا حصہ ہی واپس لے سکی۔

یہ سارا تجربہ اتنا تلخ، اتنا ذلت آمیز تھا کہ اس نے میرے اندر سے "کھیل" کے لیے باقی ماندہ محبت بھی ختم کر دی۔ البتہ اس ساری جدوجہد نے مجھے یہ ضرور سکھا دیا کہ ان لوگوں کو کیسے تلاش کیا جائے جو خود کو دنیا کی نظروں سے چھپانا چاہتے ہیں۔ اور پھر میں نے اپنے اس پیشے کو دوبارہ زندہ کیا جسے میں ہیری سے ملنے سے پہلے اپنائے ہوئے تھی یعنی..... پیانو بجانے کا کام مگر اس بار کسی عالی شان مشرقی ساحلی ہوٹل میں نہیں بلکہ بیٹن روج کے ایک معمولی چرچ میں۔ وہی شہر جہاں ہیری میرا حصہ چرا کر چھپا بیٹھا تھا۔

میں اب ایک بالکل مختلف زندگی گزار رہی تھی۔ بیٹن روج میں قیام نے میرے لیے کئی نئے دروازے کھولے اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ بہت جلد میری زندگی ایک نیا رخ لینے والی ہے۔

ایک دن کوائر کی ریہرسل ختم ہونے کے بعد سنگرز میں سے ایک عورت میرے پاس آئی۔ وہ لولی ہوئی آواز میں اپنی کہانی سنا رہی تھی کہ کس طرح اس کی برسوں پرانی ایک سہیلی اچانک اس کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی تھی اور اس سے کچھ دن کے لیے ٹھہرنے کی جگہ مانگنے لگی۔ اسے ترس آ گیا اور اس نے اسے اپنے گھر میں قیام کی اجازت دے دی مگر دوسرے دن جب وہ کام سے لوٹی تو اس کی سہیلی اس کا سب کچھ لوٹ کر غائب ہو چکی تھی۔

میرا ماضی اس عورت کے علم میں نہیں تھا۔ وہ تو بس کسی کو اپنا دکھ سنانا چاہتی تھی اور میں محض رسمی دلاسا دینے ہی والی تھی کہ اچانک مجھے احساس ہوا، شاید قسمت مجھے تلافی کا ایک موقع دے رہی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ شاید میں مدد کر سکتی ہوں۔

اور اس کے بعد جب میں نے اس کی زیادہ تر جمع پونجی اسے واپس دلوا دی تو جو سکون مجھے محسوس ہوا، وہ ناقابلِ بیان تھا۔ پہلی بار لگا جیسے میں اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کر رہی ہوں۔ میں نے خود سے وعدہ کیا کہ اگر دوبارہ کبھی موقع ملا کہ میں کسی کی مدد کر سکوں تو میں ضرور کروں گی۔

یوں بات پھیل گئی۔ جلد ہی دوسروں نے بھی مدد مانگنا شروع کر دی۔ یہاں تک کہ مجھے چرچ کی نوکری چھوڑنی پڑی کیونکہ ہر دن کوئی نہ کوئی نیا کیس میرے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ ہر نئے شخص کے ساتھ میں نے یہ جانا کہ ماضی میں میرے جیسے لوگ..... ہیری اور میں، دوسروں کو کتنی تکلیف دیتے تھے اور میرا ضمیر دن بہ دن زیادہ بے چین ہوتا گیا۔

اسی لیے جب ایلانور لنڈسے میرے پاس آئی تو میں تذبذب میں پڑ گئی۔ وہ مجھے اچھا خاصا معاوضہ دینے کو تیار تھی مگر میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ چاہتی کیا ہے۔ کیا واقعی کوئی اس کے زیورات چرا کر لے گیا تھا یا وہ مجھ سے وہ چیز واپس مانگ رہی تھی جو کسی اور کی ملکیت بن چکی تھی؟

اس کی کہانی کچھ زیادہ ہی مانوس لگی۔ ایک شخص گورڈن رابسن جس نے اس سے محبت کے نام پر سب کچھ ہتھیا لیا تھا۔ شاید یہ سچ تھا اور شاید وہ صرف پچھتاوے کا شکار تھی۔

میں نے ایسے کئی لوگوں کو دیکھا تھا۔ ایک خاص عمر اور دولت کے حامل..... جو اپنی کھوئی ہوئی جوانی واپس پانے کے لیے کم عمر ساتھیوں کے ساتھ جڑ جاتے تھے۔ وہ

Scanned with CamScanner

ان پر تحفے لٹاتے اور رشتہ ختم ہونے پر احساسِ جرم میں جلنے لگتے۔ اب اگر میں کسی سے وہ چیز چھینوں جس پر اس کا قانونی حق ہو تو یہ میرے اس ماضی سے کچھ مختلف نہ ہوتا جسے میں بھولنا چاہتی تھی۔

ایلانور بولی۔ ''دیکھو نینا! میری مالی حالت بہت خراب ہے۔ مجھے وہ زیورات واپس چاہئیں۔ ان کی قیمت چار لاکھ ڈالرز سے کچھ زیادہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جو مجھے دوالیا ہونے سے بچا سکتی ہے۔ میں ایک رئیل اسٹیٹ ڈیل میں حصہ لے رہی ہوں۔ مجھے یہ زیورات بطور ضمانت رکھوانے تھے تاکہ قرض مل سکے۔ اگر وہ ڈیل کامیاب ہو جائے تو میں نہ صرف خود کو سنبھال لوں گی بلکہ اپنے بیٹے کی بیماری پر تحقیق کے لیے عطیات دینا بھی دوبارہ شروع کر سکوں گی۔ وہی بیماری جس نے میرا بچہ مجھ سے چھین لیا تھا۔''

میں نے نرمی سے کہا۔ ''مجھے آپ کے نقصان کا افسوس ہے مس لنڈ سے! مگر جو آپ کا حال ہے، مجھے پھر بھی ایک بات صاف کرنی ہے۔ یہ زیورات دراصل آپ ہی کے ہیں نا؟ کیونکہ میں کسی کی مدد کے نام پر چوری نہیں کر سکتی۔''

وہ سیدھی ہو کر بیٹھی اور ہلکی سی ترچھی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ ''مجھ سے چوری کرنا تمہیں ٹھیک لگا لیکن میری خاطر کچھ واپس لینا تمہیں جرم لگ رہا ہے؟''

میرے دل کی دھڑکن ایک لمحے کو رک گئی۔ یہ میرے پرانے پیشے کا پیشہ ورانہ خطرہ تھا کہ کبھی نہ کبھی قسمت مجھے میرے ہی کسی پرانے شکار کے سامنے لا کھڑا کرے۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ آج وہ دن نہ ہو اور چہرے کے تاثرات قابو میں رکھتے ہوئے ہلکے لہجے میں بولی۔ ''کیا ہم پہلے کبھی مل چکے ہیں؟''

وہ ہلکے سے مسکرائی۔ ''فیصلہ تم خود کر لو۔''

اس نے میز پر رکھی بھاری سی مٹیلا فائل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کھولو، دیکھ لو اندر کیا ہے۔''

میں نے لفافہ کھولا۔ اندر تصویروں کا ایک بنڈل تھا۔ سب سے اوپر والی تصویر میں ایلانور ایک خوبصورت معمر شخص کے بازو میں بازو ڈالے کھڑی تھی۔ وہی شخص جس کی فریم شدہ تصویریں اس کے پیچھے بک شیلف پر رکھی تھیں۔

اس نے تصویر پر انگلی رکھی۔ ''نام..... میرا مرحوم شوہر۔''

ہر تصویر میں وہ دونوں شام کے کسی شاندار موقع پر قیمتی لباسوں میں ملبوس نظر آ رہے تھے۔ مہنگے زیورات چمک رہے تھے۔ وہی زیورات جنہیں وہ ''چوری شدہ'' کہہ رہی تھی۔

آخری تصویر میں شرکائے محفل کے پیچھے پس منظر میں ایک اور چہرہ جھلک رہا تھا۔ ایک عورت جس نے سستا سا سلیولیس گاؤن پہنا ہوا تھا اور جو ایک گرینڈ پیانو پر کسی نغمے میں گم بیٹھی تھی۔

وہ عورت میں تھی۔

میری پرانی زندگی کی ایک جھلک۔

وہ دن جب میں اور ہیری اپنا ''میوزیکل ایکٹ'' دکھا کر مشرقی ساحل کے مہنگے ریزورٹس میں رئیسوں کی جیبیں ہلکی کرتے تھے۔

ایلانور نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''تمہیں یہاں بلانے سے پہلے میں نے تمہاری مکمل جانچ کروائی تھی کیونکہ تمہارا کام قانون کے ذرا مشکوک ایریا میں آتا ہے اور میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی کہ بعد میں تم یہ سب میرے خلاف استعمال کرو۔ میرے ایک دوست فرانسس بروز نے تمہاری بڑی تعریف کی تھی کہ تم ایک فرشتہ ہو مگر فرانسس سادہ دل ہے، اس لیے مجھے خود دیکھنا پڑا۔''

اس نے وہ تصویر دکھائی جس میں، میں پیانو بجا رہی تھی۔

''سوچا تھا اگر تم میری چھان بین میں صاف نکلیں تو یہ تصویریں دکھا دوں گی۔ ثبوت کے طور پر کہ واقعی وہ زیورات میرے پاس تھے مگر کل جب میرے تفتیش کار نے تمہاری نگرانی کی تصویریں لا کر دیں تو میں نے دیکھا کہ تم اس کی تصویروں میں بھی ہو اور میری پرانی تصویروں میں بھی۔''

میرے اندر شرم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے قابل نہیں رہی۔

''میں اب وہ عورت نہیں ہوں جو تم ان تصویروں میں دیکھ رہی ہو۔ جس آدمی کے ساتھ میں کام کرتی تھی، ہم بہت پہلے الگ ہو چکے ہیں۔ اس نے میرے ساتھ وہی کیا جو ہم نے تمہارے ساتھ کیا تھا اور میں سچ میں شرمندہ ہوں۔ اگر وہ پیسا میرے پاس ہوتا تو میں خود تمہیں واپس کر دیتی۔''

ایلانور کی مسکراہٹ میں ہلکی سی کڑواہٹ تھی۔

''تم نے شاید سوچا ہوگا کہ میں اور میرا شوہر سادہ لوح بوڑھے ہیں مگر ایسا نہیں تھا۔ کاروبار میں ہم سخت مزاج تھے مگر ذاتی زندگی میں ہم ہمیشہ خدا ترسی سے کام لیتے اور کبھی کبھار یہی ہمدردی ہمیں تم جیسے لوگوں کے سامنے کمزور کر دیتی تھی۔''

میرا سر جھک گیا۔ شرمندگی اتنی تھی کہ زمین پھٹ جائے اور میں غائب ہو جاؤں۔ ''مس لنڈ سے! مجھے بہت افسوس ہے، میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ.....!''

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

"رکو۔" اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "یقین رکھو، میں نے تمہیں برسوں پہلے ہی معاف کر دیا تھا اور ویسے بھی چور کو پکڑنے کے لیے چور سے بہتر کون ہو سکتا ہے؟ تم ہی تو اس کام کے لیے بہترین ہو۔"

میرا سر آہستہ سے اوپر اٹھا۔ میری شرمندگی سے بھری صورت دیکھ کر ایلانور کی تنگ ہونٹوں والی مسکراہٹ ایک شرارتی قہقہے میں بدل گئی۔ سچ پوچھیں تو اگر حالات الٹ ہوتے تو مجھے بھی شاید اتنی سخاوت نہ آتی۔ میرے لیے اس میں ایک سبق بھی چھپا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔" میں نے میز کے پار اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میرے لیے یہ کیس کسی سنہری موقع سے کم نہ تھا۔ اپنے پرانے قرض کا بوجھ اپنے ضمیر سے اتارنے کا ایک موقع۔

"بہت خوب! مجھے یہی امید تھی کہ تم ساتھ دو گی۔"

اس کی زیورات پہنی ہوئی تصویروں کا کوئی قانونی ثبوت تو نہیں بنتا تھا مگر اس کا مقصد اور میرے پرانے گناہ معاف کرنے کی اس کی رضا..... یہی کافی تھا کہ میں اس کو شک کا فائدہ دوں۔ اتنا خطرہ مول لینے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوا۔

"تمہیں کیسے یقین ہے کہ اس نے اب تک وہ زیورات بیچ نہیں دیے ہوں گے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے کہا۔ "لیکن ان میں کچھ پتھر کافی بڑے ہیں۔ اگر ایک سے زیادہ قابل خریدار مل جائیں تو بولی لگ سکتی ہے اور انہیں اچھا دام مل جائے گا۔ ورنہ اسے بھاری نقصان پر بیچنا پڑے گا۔ وہ کوئی روشن دماغ اسکالر تو نہیں مگر ہوشیار... ضرور ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ وہ انہیں اپنے پاس رکھے گا جب تک صحیح طریقے سے بیچنے کا بندوبست نہ کر لے۔"

"کیا تم نے اپنی انشورنس کمپنی یا پولیس سے رابطہ کیا؟"

"میرا بیمہ کار دعویٰ مسترد کر چکا ہے کہ میری سیکیورٹی نااہل تھی اور پالیسی کی شرائط کی خلاف ورزی ہوئی۔ میں اپیل کروں گی مگر یہ وقت لے گا اور چونکہ مجھے شک ہے کہ گورڈن لوزیانا سے فرار ہو چکا ہے۔ پولیس کہتی ہے کہ دوسری ریاستوں کی قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں شاید ایف بی آئی تک شامل ہوں گی اور یہ سارے اقدامات ہفتے یا مہینے کھا جائیں گے۔ تب تک اس کے پاس زیورات بیچنے کے لیے بہت وقت ہوگا۔ پولیس اسے جیل میں تو ڈال سکتی ہے مگر انصاف مجھے میرے زیورات واپس نہیں دے سکتا اور وہ بھی اس وقت تک جب تک میں قرض کا بندوبست کر سکوں۔"

"مس لنڈسے! میں کچھ واپس لانے کی گارنٹی نہیں دے سکتی اور وہ بھی کسی مخصوص مدت میں۔" میں نے کہا۔

"میں یہ سب سمجھتی ہوں۔" وہ ہاتھ ہلا کر بے پروائی سے بولی۔ "مگر تم ہی میری آخری امید ہو۔ چلو پھر تمہاری فیس پر بات کرتے ہیں۔"

میں نے اگلے نصف گھنٹے اس سے کئی سوالات پوچھے۔ ایسے جو اس کے اس بددیانت ساتھی اور گمشدہ زیورات تک پہنچنے میں مدد دے سکتے تھے۔ اس کے پاس صرف ایک واضح تصویر تھی جس میں وہ نہ ہیٹ پہنے ہوئے تھا، نہ دھوپ کا چشمہ۔ وہ کہتی تھی کہ وہ شخص مغربی ٹیکساس کا ہے مگر لہجے اور چند اشاروں سے اسے یقین تھا کہ وہ دراصل البامہ سے تعلق رکھتا ہے۔

کچھ چالاکی اور کچھ پرانے رابطوں کے استعمال سے..... ایک ایسے شخص سے مدد لے کر جو کبھی ہیری اور میرے ساتھ چند وارداتوں میں شریک رہ چکا تھا، میں نے آخر اس ٹھگ کو ڈھونڈ نکالا۔ میرے ذرائع کے مطابق وہ امیر بیواؤں کے قیمتی زیورات ہتھیانے میں خاص مہارت رکھتا تھا مگر اپنی لوٹی ہوئی دولت بیچنے کے لیے اسے اکثر کسی کی مدد درکار ہوتی تھی۔

ایلانور اپنے اندازے میں کچھ غلط نہ تھی کہ وہ جنوبی علاقے سے ہے مگر اس کی شناخت پوری طرح غلط نکلی۔ اس کا اصل نام جیفی تک گرا تھا اور بیواؤں سے دولت اینٹھنا اس کا واحد دھندا نہیں تھا۔ فریب کے وقفوں میں وہ ایک چکنائی بھری کینٹین میں ایپرن اور کاغذی ٹوپی پہنے، ویٹر بن کر چھپ جاتا تھا۔ وہ بھی جارجیا کے کسی دیہی قصبے میں۔

☆☆☆

"فلیٹ سٹی ڈائنر" دراصل فلیٹ سٹی کے اندر نہیں تھا بلکہ اس کے بالکل کنارے پر، جارجیا کے مشرقی حصے میں ایک چھوٹے سے قصبے میں تھا۔

ڈائنر کا مالک ڈیل کروڈن ہر نئے آنے والے کو فخریہ بتایا کرتا تھا کہ اس کا ڈائنر شہر کی حدود سے صرف چند قدم باہر ہے۔ پارکنگ میں لگا بورڈ اعلان کرتا تھا۔

"آپ کے آبائی ڈائنر کے سب سے قریب ترین ریستوران میں خوش آمدید!"

میں کاؤنٹر پر بیٹھی اپنا لنچ ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ ڈیل اپنی اسی بات کو مختلف انداز میں دہراتا جا رہا تھا۔

میں نے اس کی خود ستائشی پر بس سرسری انداز میں سر

Scanned with CamScanner

بلایا۔ اس کی سستی کولون کی مہک اور خود پسندی کا احتراج میرا دل متلا رہا تھا۔

"ہم اپنے پائی ہر اس پھل سے بناتے ہیں جو چار جیا کی زمین میں اگتا ہے اور ایش پیپر؟ ان میں اتنی مرچ ڈالتے ہیں کہ مرچ اگانے والے کسان بھی ہمارے آرڈر پورے نہیں کر پاتے۔"

ڈیل ایک سرخ چہرے والا بے قرار سا آدمی تھا۔ مبالغے کا جیسے اسے جنون تھا مگر ماننا پڑتا کہ اس کے کھانے واقعی اپنے نام کے مطابق تھے۔ پائی گھوڑے کی نعل کی شکل کی تھی اور ایش پیپر میں اتنی مرچیں تھیں کہ ایک لقمہ لیتے ہی منہ میں جیسے دھماکا ہو جائے۔ میری آنکھوں سے پانی بہہ نکلا اور میں سوچنے لگی کہ شاید میرے مسوڑھے کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے۔

"کہاں جا رہی ہو اب؟" وہ کاؤنٹر پر جھک کر بولا، مجھے پچھلے کئی منٹوں میں ایک بار پھر جانچتے ہوئے۔

"ایمرجنسی روم۔ اگر گاڑی چلا سکی تو۔" میں نے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اصل میں کچھ دن یہاں آس پاس رکنے کا ارادہ ہے۔"

"یہاں تمہارا کوئی جاننے والا ہے؟"

"نہیں، میں ایک فری لانس صحافی ہوں۔ چھوٹے قصبوں کی زندگی پر فیچر اسٹوریز لکھ رہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایسے مقامات کے بارے میں جہاں عام سیاح نہیں پہنچتے۔ بس امید ہے کہ آرڈی کلچر والے کسی بڑے میگزین کو وہ کہانیاں بیچ سکوں۔"

ڈیل نے فوراً جوش سے کہا۔ "تو تم بالکل ٹھیک جگہ آئی ہو۔ میرے پاس تو ایسی ایسی کہانیاں ہیں کہ سن کر حیران رہ جاؤ گی۔" اس کی نظریں میری گردن سے اوپر اٹھ کر میری آنکھوں میں آ کر رک گئیں۔ "بتاؤ تو، تم کس قسم کا مواد ڈھونڈ رہی ہو کیونکہ گرافٹن کاؤنٹی کے بارے میں جو کچھ جاننے کے قابل ہے، وہ سب مجھے معلوم ہے۔"

"قدرتی نظارے، الوکھے میلوں ٹھیلوں کی باتیں یا کسی بھولی بسری تاریخی شخصیت کے پرانے گھر۔ ایسی چیزیں جنہیں دیکھنے کے لیے لوگ یہاں آنے پر مجبور ہو جائیں۔ محض لوک کہانیوں سے کچھ مختلف۔"

درحقیقت میں ایسی چیزیں ڈھونڈ رہی تھی جو مجھے یہاں اجنبی رہتے ہوئے آزادانہ حرکت کی اجازت دیں، بغیر کسی شک کے۔

وہ بولا۔ "ہم..... ایسی تو کوئی خاص چیز نہیں۔" پھر

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

سرد ٹھنڈی ہواؤں کی تیزی
نومبر کے شمارے کی دل آویزی

اولین سوغات

سکھ بھی دیتا ہے، دکھ بھی دیتا ہے، روآشنا کر دینے والی دولت کا شاخسانہ جس نے بڑی آسانی سے زندگی کو درد شعلہ مثال بنا دیا تھا، اسما قادری کی سنسنی خیز داستان

سربکف

ماضی کی دھندلی پرچھائیوں کے تعاقب میں دوڑتے بھاگتے کردار کی پُراسرار داستان.....

طاہر جاوید مغل کے قلم سے

دہر

قدم قدم پر بڑھتی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے والے ایک دلیر نوجوان کی کوچہ گردی

حسام بٹ کے قلم سے سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

پبلا رنگ

ہر کھیل میں جیت اور ہار ہوتی ہے، جو جیتا وہی سکندر کہلاتا ہے..... فتح و شکست کے ایک ایسے ہی کھیل کی روداد۔ محمد فاروق انجم کے قلم سے

دوسرا رنگ

آزادی کو قائم دائم رکھنے کے لیے کی جانے والی ہوشربا سازشوں کا سنسنی خیز احوال..... مظہر حسین کا کمال

چٹی نکتہ چٹی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

اچانک اس کے چہرے پر شوخ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''جب تک تم خود فلیٹ سٹی ڈائنر کو ہی کوئی ''کشش'' نہ کہو۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''وہ تو پہلے ہی میری فہرست میں ہے۔''

ڈیل نے کندھے اچکائے۔ ''ویسے ایک جگہ ہے جو تمہیں پسند آسکتی ہے..... کیٹر ڈل۔ مرویل کے پاس ہے، پرانی اناج کی چکی۔ اس کا بڑا سا لکڑی کا پانی کا پہیا اب بھی لگا ہوا ہے۔ ہم اسے ''ڈیڈ مین ویل'' کہتے تھے۔ جب ہم نوعمر تھے تو اس پر چڑھ کے جھیل کی طرف نیچے آتے تھے۔ ہمت آزمانے کا طریقہ تھا۔ دیکھنے کے لیے کون آخر تک بیٹھا رہتا ہے۔ اب بھی نوجوان جمعے اور ہفتے کی شاموں میں وہاں اکٹھے ہوتے ہیں۔ تم چاہو تو ان پاگل لڑکوں کی تصویریں کھینچ لینا، جست لگانے سے ذرا پہلے..... یقیناً کسی میگزین میں چھپ سکتی ہیں۔''

''زبردست لگتا ہے۔ وہاں کیسے جایا جائے؟'' میں نے اپنی چھوٹی نوٹ بک کھولی اور اس کا بتایا ہوا راستہ لکھنے لگی۔ اسی دوران کاؤنٹر اور کچن کے بیچ چھوٹی سی کھڑکی سے حرکت نظر آئی۔

میں ٹھٹک گئی۔ کچن کے پچھلے دروازے سے جینی تک گرا اندر آرہا تھا۔ ایلانور کے زیورات اڑانے والا شخص۔ اس کے کندھے پر تولیا پڑا تھا۔ ہاتھ خشک کرتے ہوئے وہ سیدھا اودن کے پاس گیا اور پائیوں کی ٹرے اندر رکھ دی۔ اس کا چہرہ نرم، ذرا سوجا ہوا سا تھا جیسے وہ آدمی جو جوانی کی ساحلی پارٹیاں چالیس کے بعد بھی چھوڑ نہیں پاتے۔

میں نے تیزی سے نظریں پھیر لیں۔ ''میں تمہارے ڈائنر کا ایک فیچر بھی شامل کرنا چاہوں گی۔ یہ جگہ خاصی دلکش ہے اور سفر ناموں میں کھانے کا ذکر ہمیشہ قارئین کو کھینچ لاتا ہے۔''

ڈیل فوراً خوش ہوگیا۔ ''تو کیا تم میرا بھی انٹرویو لوگی؟''

''یقیناً جگہوں کے ساتھ شخصیات کا ذکر ضروری ہوتا ہے۔ تم اور تمہارا باورچی دونوں۔ کیا وہی اس شاندار کھانے کا خالق ہے؟''

ڈیل نے فخر سے کہا۔ ''جینی! ہاں، کہتے ہیں نا کھانا پکانا ایک آرٹ ہے اور بیکنگ ایک سائنس۔ تو وہ لڑکا ناشتے کا ماہر ہے اور بیکنگ کا آئن اسٹائن۔''

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ جینی ایک چھوٹے بلو ٹارچ سے کریم برولے کی چینی پگھلا کر اسے سنہری کر رہا تھا۔

''دلچسپ لگتا ہے۔'' میں نے ہلکی جماہی روکتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں مگر کل کسی وقت بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔''

اصل بات یہ تھی کہ میں حد درجہ تھک چکی تھی۔ پچھلی رات شریو پورٹ سے بغیر رکے ڈرائیو کرتے ہوئے صبح فلیٹ سٹی پہنچی تھی۔ میں ہمیشہ کرائے کی گاڑی چلاتی اور اس پر جعلی نمبر پلیٹ لگا دیتی تاکہ دشمن میرا پیچھا کر کے میری گاڑی سے بھی بھی مجھے ٹریس نہ کر سکیں۔ جب میں شہر کے اکلوتے موٹیل میں چیک ان کر کے پہنچی تو رات کے قریب نو بج چکے تھے مگر میں سیدھی کام پر لگ گئی۔

جب بھی میں کسی نئے ہدف کے قریب جاتی، میرا پہلا کام یہی ہوتا کہ انہیں اس کا پتا نہ چلے کہ ان کی نگرانی ہو رہی ہے۔ اسی طرح ان کے قدرتی انداز عمل، حفاظتی غفلت اور روزمرہ معمولات جانچ میں آتے اور موقع کے دروازے خود بخود کھل جاتے۔ لہٰذا میں نے ڈائنر بند ہونے تک اسے چوکنا نگاہ سے دیکھنے کی جگہ تلاش کر لی۔ ڈیل وقتِ مقررہ پر گھر چلا گیا مگر جینی صفائی کر کے رکا اور پھر سائڈ دروازے کی دہلیز پر بیٹھ گیا۔ سگریٹ جلایا اور ستاروں کو دیکھنے لگا۔

جب وہ ڈائنر سے روانہ ہوا، میں نے اس کا پیچھا کیا اور اس کے گھر تک پہنچ گئی۔ محلے کی حالت دیکھ کر مجھے لگا وہ یا تو چوری کا پیسا فوراً برباد کر دیتا ہے یا کسی بری گھڑی کے لیے بچا رہا ہے۔ وہ ایک چھوٹے افسردہ سے لکڑی کے گھر میں رہتا تھا جس کا رنگ اڑ چکا تھا اور کچھ کھڑکیوں کی سلاخیں غائب تھیں۔ گھر سڑک سے پیچھے تھا، اسٹریٹ لائٹ کی ماند روشنی سے بھی دور۔ اس نے اپنی گاڑی ایک الگ گیراج میں کھڑی کی جو بٹی ہوئی دو ٹریک ڈرائیوے کے آخر میں تھی۔

جب اس کے گھر کی آخری لائٹ بھی بجھ گئی تو میں وہاں سے نکل آئی اور کافی دیر گاڑی میں گھومتے پھرتے گزار دی۔ شہر کی ترتیب سمجھنے اور وہ راستے معلوم کرنے میں جو مجھے کسی تعاقب کرتی کار سے چھٹکارا دلوانے کے کام آئیں۔ جب میں کسی اجنبی علاقے میں کام کر رہی ہوتی ہوں تو ماحول کی سمجھ بہت ضروری ہوتی ہے۔ اگر کسی مقامی جاننے والے کا پیچھا کرنا پڑے تو میں نہ صرف راستوں کا متبادل جاننا چاہتی تھی بلکہ چھپنے کی کچھ جگہوں کا علم ہونا بھی ضروری تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر میں کچھ دیر کے لیے نظر سے اوجھل رہ سکوں۔

ایک مختصر سی نیند کے بعد میں جلدی اٹھ گئی۔ انہی راستوں پر دوبارہ گاڑی چلا کر دن میں اس علاقے کی ساخت دیکھی اور جب ایک گھنٹے بعد میں نے ڈائنر میں قدم رکھا تو میں تھکن سے چور تھی اور جانتی تھی کہ مجھے فوراً ایک

Scanned with CamScanner

digest library.com

بھرپور نیند کی ضرورت ہے کیونکہ آج رات مجھے پھر دیر تک جاگنا تھا۔ میں نے ڈیل کا شکریہ ادا کیا اور مل کے بارے میں اس کے بتائے گئے ٹائم پر لوٹنے کا وعدہ کیا۔

اس رات..... قریب دس بج رہے تھے جب پچھلی رات کی طرح جینی سائڈ دروازے سے باہر آیا اور قدیچے پر بیٹھ گیا۔ اسی زرد بلب کی روشنی میں جو دروازے میں لٹکا ہوا تھا۔ اس نے ایک سگریٹ جلایا۔ دوسرے سگریٹ کے بعد اس نے ڈائنر بند کیا اور گاڑی میں آ بیٹھا۔

میں نے اسے ایک بلاک تک جانے دیا پھر گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔ کل رات کی طرح آج رات بھی اس کے گھر کی لائٹس آف ہونے کے بعد میں نے ایک گھنٹا انتظار کیا۔

جب واقعی اس کے سونے کا یقین ہو گیا تو میں جھٹ سے اپنی گاڑی سے اتری اور اس کی گاڑی کا لاک سلیم جم کی مدد سے کھول کر اندر گھس گئی۔

گاڑی کی چھت والی لائٹ بند کر کے میں نے پوری تسلی سے تلاشی شروع کی۔ اسپیئر ٹائر تک جھاڑا۔ یہاں تک کہ سائڈ کے پینل بھی کھول ڈالے۔ فیکٹری سے لگائے گئے بیج بڑے طاقتور روبوسٹینوں سے کس کر لگائے جاتے ہیں۔ انہیں عام اسکرو ڈرائیورز سے کھولنا خاصا محنت طلب کام ہوتا ہے اور اکثر بیج کے سروں پر نشان چھوڑ دیتا ہے مگر یہاں تو وہ بھی صاف تھے۔ پھر بھی چونکہ کوئی چالاک چور بدل کے نئے بیج لگا سکتا تھا اس لیے میں نے دھیان سے ہر بیج پر نظر دوڑائی۔ آخر میں کچھ نہ ملا۔ گرمی اور حبس نے جان نکال دی تھی۔ اگر ڈیوزات جینی کی گاڑی میں تھے تو وہ کسی ایسی جگہ چھپائے گئے تھے جو میرے تصور سے بھی باہر تھی۔

تھکن سے چور، پسینے میں شرابور، میں رات کے تین بجے کے قریب موٹیل واپس آئی۔ سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر پہنچی تو ریلنگ سے حسب عادت پارکنگ لاٹ پر ایک نظر ڈالی۔ بظاہر کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

☆☆☆

سورج ابھی پوری طرح نکلا بھی نہیں تھا کہ ڈائنر کے باہر گاڑیوں کی قطار لگ چکی تھی۔ میں نے مشکل سے ایک خالی جگہ دیکھی تو گاڑی پارک کی۔ وہیں ڈیل کو دیکھا جو سیاہ پک اپ سے اتر کر سبزی کے ڈبے اٹھائے اندر جا رہا تھا۔ دو راتوں سے تقریباً جاگتے رہنے کے بعد دماغ جیسے بوجھل تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی برتنوں کی کھنک اور گاہکوں کی باتوں کا شور مجھ پر ٹھنڈے پانی کی بالٹی کی طرح گرا۔ کاؤنٹر پر بس ایک اسٹول خالی تھا، میں جا بیٹھی۔ تھوڑی دیر بعد ڈیل کچن کے دروازے سے نکلا اور کاؤنٹر کے پیچھے آ گیا۔ اس نے مجھے دیکھا تو چہرے پر مسکراہٹ آئی مگر کل والی گرم جوشی مفقود تھی۔ شاید بھرے ڈائنر میں وہ کھل کر بات نہ کر پا رہا ہو۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم لکھاری بھی اتنی صبح جاگ جاتے ہو۔" اس نے گرم کافی کا کپ میرے سامنے رکھا۔

میں نے سر ہلایا۔ "جگہیں دن کے مختلف اوقات میں الگ مزاج رکھتی ہیں۔ ٹریول میگزین والے اصلی رنگ ڈھنگ ڈھونڈتے ہیں اور صبح کے وقت کسی جگہ کا اصل چہرہ دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔"

"تو طے کر لیا کہاں کہاں دیکھنے جانا ہے؟"

"ابھی نہیں۔ تم جس مل کا ذکر کر رہے تھے، وہ تو دیکھنی ہے۔ باقی شاید شہر کے وزیٹر سینٹر سے کچھ بروشرز اور نقشے لے لوں پھر منصوبہ بناؤں گی۔"

وزیٹر سینٹر والا حصہ سچ تھا، باقی سب جھوٹ۔

میں دراصل صرف یہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ جینی واقعی کام پر ہے تاکہ میں اس کے گھر کی تلاشی سکون سے لے سکوں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی چاہتی تھی کہ میرے کپڑوں اور بالوں میں ڈائنر کے کھانے کی خوشبو رچ جائے تاکہ اگر اس کے گھر کوئی کتا یا حساس ناک والا شخص ہو تو میری بُو خیز مانوس نہ لگے۔

میں ابھی اپنی گھڑی ہوئی کہانی میں کچھ مزید اضافہ کرنے ہی والی تھی کہ دماغ کے کسی کونے میں سے ایک مدھم سی آواز ابھری جیسے نیند زدہ دماغ اچانک کوئی خبر دینے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ دماغ میں جیسے بجلی سی کوند گئی۔

کل رات موٹیل واپس آ کر جب میں نے پارکنگ لاٹ پر ایک نظر ڈالی تھی، اس وقت دیکھی ہوئی ایک چیز اب ڈائنر کے باہر نظر آ گئی۔ وہی گاڑی..... سیاہ پک اپ جس کے بڈ پر سرخ دھاریاں تھیں۔ عین ویسی ہی ایک گاڑی کل رات موٹیل کے پارکنگ ایریا میں بھی کھڑی تھی، بالکل وہاں جہاں میں نے اپنی گاڑی روکی تھی۔

شاید یہ اتفاق ہو..... یا شاید نہیں۔

ممکن ہے وہی گاڑی ہو اور ڈیل وہاں آیا ہو..... اور یہ سوچ واقعی پریشان کن تھی کہ وہ میری نگرانی کر رہا ہو۔

میرا تجربہ چیخ چیخ کر خبردار کر رہا تھا کہ اب ہر قدم

Scanned with CamScanner

سنبھل کر رکھوں۔ مجھے یاد آیا میرے ایک پرانے واقف کار نے متنبہ کیا تھا کہ جینی اکیلا نہیں ہوگا۔ اس کے پاس کوئی ایسا شخص ضرور ہوگا جو ایلانور کے زیورات بیچنے میں اس کی مدد کر رہا ہو۔ اگر وہ شخص ڈیل ہی ہو؟

اور وہ یہ سوچ رہا ہو کہ کہیں میں ان کے پیچھے لگ کر کوئی سراغ تو نہیں لگا رہی؟

میں نے نظریں اپنے کافی کے کپ پر جما دیں اور تب تک چہرہ بے تاثر بنانے کی کوشش کی جب تک اندر کی گھبراہٹ ختم نہ ہو گئی۔ اوپر دیکھا تو ڈیل کی آنکھوں میں ایک سرد، پرکھتی ہوئی چمک تھی۔ وہی نظروں کی کرختگی جو اکثر شک کی علامت ہوتی ہے۔

''کیا بات ہے مس برنیٹ! آج تو جیسے زبان گنگ ہو گئی تمہاری؟'' اس نے ہلکے طنز سے کہا۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کچھ ایسا کیا ہو جس سے شک پیدا ہوا ہو لیکن اگر واقعی وہ مجھے شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا تو شاید یہ اس کا فطری عدم اعتماد ہو، کسی بھی اجنبی پر۔ بہرحال جب تک اصل صورت حال واضح نہ ہو، کوئی بھی قدم محفوظ نہیں تھا۔

مجھے اسے بہکانا تھا تاکہ اس کے دماغ میں جو بھی شک پیدا ہوا ہے، وہ کسی اور سمت مڑ جائے۔ میں نے اشارے سے اسے قریب بلایا جیسے کوئی راز کی بات کرنے والی ہوں پھر آہستہ سے کہا۔

''جب میں ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں آئی، تو دیکھا تم اپنی پک اپ سے پیچھے مال اتار رہے تھے اور اتفاق سے وہ گاڑی بالکل ویسی تھی جیسی کل رات میرے موٹیل کی پارکنگ میں کھڑی تھی، جب میں رات کے آخری پہر وہاں پہنچی تھی۔''

''اچھا.....!'' وہ سیدھا ہوا۔ تاثرات پل بھر میں بدل گئے۔

میں نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''کیا ہوا مسٹر ڈیل! اب آپ کی زبان کہاں گئی؟''

وہ کچھ لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''تم کافی تیز عورت ہو۔''

میں نے شانے اچکائے۔ ''اکیلی عورت انجان راستوں پر سفر کر رہی ہو تو یہ خوبی پیدا کرنی ہی پڑتی ہے اور کل جب میں پہلی بار یہاں آئی تھی تو تمہاری نظریں مجھ سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔'' میری نگاہ اس کی انگلی میں چمکتے شادی کے چھلے پر جا ٹھہری پھر دوبارہ اس کے چہرے پر اٹھی۔

''تم سیدھی بات کرتی ہو، گھما پھرا کے نہیں۔'' اس نے بظاہر ہنستے ہوئے کہا مگر آنکھوں کا تناؤ اور پھیلے نتھنے کچھ اور کہہ رہے تھے۔ وہ ناراض تھا اور شاید تھوڑا خوفزدہ بھی۔

میں تھوڑا جھک کر پھر سے بولی۔

''ایک بات طے کر لیتے ہیں۔ تم وعدہ کرو کہ میرے پیچھے منڈلانا چھوڑ دو گے اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ یہیں سب کے سامنے کھڑے ہو کر تم سے اونچی آواز میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ تم کل رات میرے موٹیل کے کمرے کے باہر کیوں منڈلا رہے تھے؟'' میں کپ لہراتے ہوئے پیچھے ہٹی اور کافی کا ایک گھونٹ لیا۔

''ٹھیک ہے مس! سمجھ گیا۔''

وہ میری نظروں سے دور ہو گیا۔ اس کا بچنے والا انداز بتا رہا تھا کہ میں نے اسے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہی وہ موقع تھا جب میں جینی کے ساتھ اس کے شریک جرم ہونے کی سچائی معلوم کر سکتی تھی۔

''چلو دوبارہ انٹرویو کی بات کریں۔ کب آؤں اور ڈائسز کے بارے میں تفصیل لوں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''جیسا کہ کل بتایا تھا، دوپہر کے بعد یہاں رش کم ہو جاتا ہے۔ تین بجے ٹھیک رہے گا؟''

''زبردست۔'' میں نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں اندر اور باہر سے کچھ تصاویر لوں گی اور تمہارا اور تمہاری ٹیم کا ایک گروپ شاٹ بھی۔ پائی اور ایش پیز کی ٹرے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے، مضامین کے لیے۔''

''شاید، شاید۔'' وہ بولا۔ جب وہ پاس تھرو کھڑکی سے کچن کی طرف مڑا تو میں نے اس کے چہرے پر خوف کی ایک خفیف سی لہر دیکھی۔ اگر پہلے والی شک کی جھلک کافی نہ تھی کہ وہ اور جینی ایک ہی چھتری تلے ہیں تو تصاویر کی بات پر اس کی بے چینی نے وہ شکوک واضح کر دیے۔ شاید وہ واقعی سمجھتا ہو کہ میں ایک صحافی ہوں، وہ کسی صورت جینی کی تصویر منظرِ عام پر لانا نہیں چاہتا ہوگا جسے ان کا کوئی ناراض شکار دیکھ لے اور فلیٹ سٹی کا رخ کرے۔

جب وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہوا تو میں نے ایسے برتاؤ کیا جیسے میں نے کچھ بھی مشکوک نہیں دیکھا۔

''ڈیل! سچ بتاؤ۔ کیا یہاں مجھے کچھ اچھا کھانے کو مل جائے گا؟ میں بھوکی ہوں۔''

''دیکھتا ہوں کیا، کیا جا سکتا ہے۔'' وہ میلے میرے ہاتھ میں ٹھونس کر کسی اور گاہک سے بات کرنے چلا گیا۔

میں نے جینی کے گھر سے ایک گلی دور گاڑی روک دی

Scanned with CamScanner

digest library.com

اور پیڑوں کے بیچ ایک راہ بناتے ہوئے اس کے صحن کی حد تک پہنچی، کتے کی موجودگی سے چوکنا ہو کر۔ اگر گھر میں کتا ہوتا تو مجھے حکمت عملی بدلنی پڑتی مگر پچھواڑے کے دروازے تک آتے آتے کسی کتے کے آثار نظر نہیں آئے۔ نہ فضلہ، نہ کھانے یا پانی کے کٹورے، نہ ہی کوئی بھونکنے کی آواز۔

اپنے مخصوص انداز میں لاک کھول کر میں کچن میں بیٹھ کر ہو کر آنکھیں اور کان، ماحول کے مطابق ڈھالنے لگی۔ اس کے بعد اندر داخل ہو کر ایک ابتدائی جانچ شروع کی۔ کچن اور راہداری کے علاوہ پورے گھر میں قالین تھا۔ اس لیے میں نے پہلے اپنے جوتے تبدیل کر کے اس کی الماری سے ایک جوڑی پہنی تاکہ قالین پر اجنبی جوتوں کے نشانات نہ رہ جائیں۔

اس کے بڑے جوتوں میں چلتے ہوئے میں نے لیونگ روم سے آغاز کیا۔ جینی گھر صاف ستھرا رکھتا تھا مگر اتنا گرد و غبار ضرور تھا کہ چیزوں کو اصل جگہ واپس رکھنے میں مجھے احتیاط برتنی پڑی۔ میں نے صوفوں کو جھکایا، گدوں اور کشنز کو ٹٹولا پھر نیچے قالین کے کناروں میں چھپی جگہیں ڈھونڈیں۔ میز کے لیمپ کے نیچے بھی دیکھا۔ اس وقت جب میں اس کی الماری کے ہر کپڑے کی جیب کھنگال رہی تھی، میں نے باہر کی سمت سے آوازیں سنیں۔ معلوم نہیں کون سا دروازہ کھلا یا کتنے لوگ اندر آئے تھے۔ اس لیے میں نے الماری کا دروازہ اسی حالت میں کھینچ لیا جیسے میرے داخل ہونے سے پہلے تھا اور انتظار کرنے لگی۔ قدموں کی آواز اب ایک شخص کے آنے کا پتا دے رہی تھی۔ ہال وے کے لکڑی کے فرش پر اسنیکرز کی آواز۔ قدم جب بیڈروم کے قالین پر پہنچے تو خاموش ہو گئے۔ الماری کے دروازے کی کھلی درز سے میں نے جھانکا تو جینی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔

وہ آتے ہی پلنگ پر گرا تھا۔ پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں اس کے خراٹے ائرکنڈیشنر کی مدھم گونج کے ساتھ مل کر ایک تسلی بخش تال بنا گئے۔

اور میں خود کو ڈانٹنے لگی کہ میں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ وہ درمیانی وقفے میں گھر آ سکتا ہے۔ صبح سے رات تک لگاتار کام نہیں کرے گا۔

چونکہ میرے پاس ڈائنز میں فرضی انٹرویو کے لیے کافی وقت تھا، میں نے اس وقت جب وہ گہری نیند میں تھا دوبارہ اس کے کپڑوں کی تلاشی شروع کر دی۔ میں نے فرش کو بھی چھان مارا کہ کوئی خفیہ سوراخ تو نہیں۔ کچھ نہ ملا اور چونکہ اس دور کے بیشتر گھروں میں الماریوں کی چھت میں ایک تنگ رسائی کے چینل ہوتے ہیں۔ میں نے پین لائٹ اوپر ڈال کر دیکھا پھر بھی کچھ نہیں ملا۔

اسی وقت ایک زوردار خرخراہٹ نے میرا دل دھڑکا دیا۔ میں نے روشنی بجھا دی اور انتظار کرنے لگی۔ گدا چُرمرایا جب جینی نے اپنی پوزیشن بدلی۔ اس کی بے چین کروٹیں مجھے وارننگ دے رہی تھیں کہ مزید قسمت آزمائی صحیح نہیں۔

میں نے اس کے جوتے اتارے، اپنے جوتے بیگ میں رکھ لیے اور دروازہ آہستگی سے کھولا۔ پردوں سے چھن کر آنے والی مدھم روشنی میں، میں جینی کے بے ترتیب پڑے وجود کے پاس سے گزری، خیال رکھتے ہوئے کہ اپنے قدم انہی جوتوں کے نشانوں کے اوپر رکھوں جو اس نے قالین پر بنائے تھے۔

پچھلے دروازے سے باہر نکل کر میں نے ایک گہری سانس لی اور گاڑی تک پہنچتے پہنچتے میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایلانور کی قیمتی چیزیں خفیہ طور پر واپس حاصل کرنے کی امید اب چھوڑ دینی چاہیے۔ چاہے مجھے پورا دن بھی مل جاتا، تب بھی شاید وہ چھپی ہوئی جگہ نہ ملتی۔ گھر میں اتنی جگہیں تھیں جہاں کوئی چھوٹا سا زیور یا خزانہ چھپایا جا سکتا تھا اور اگر وہ چیز کسی بینک لاکر میں رکھی گئی تھی تو میں خود اسے حاصل کرنے کی کوشش کر کے بھی کامیاب نہ ہو پاتی۔ خاص طور پر ایلانور کی مقررہ مدت تک۔ چنانچہ جب آسان جگہیں چھانٹ چکی تھی اور وقت تیزی سے گزر رہا تھا تو میں نے طے کیا کہ اب معاملہ زبردستی ہی آگے بڑھانا ہوگا۔ اگرچہ یہ زیادہ محفوظ ہوتا کہ میں زیورات لے کر غائب ہو جاتی، اس سے پہلے کہ چور کو خبر ہوتی کہ اس کے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے۔

مجھے اپنے پرانے استاد ہیری ولسن کی بات یاد آئی۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ عام سمجھ کے برخلاف صرف گھوڑے کو پانی تک لے جانا ہی نہیں بلکہ اسے پینے پر مجبور کرنا بھی ممکن ہے۔ گھوڑے کو "پانی کے گھاٹ" تک لانا تو آسان تھا۔ اس کے لیے کسی عادت یا کمزوری کا سہارا کافی تھا۔

اور مجھے بخوبی پتا تھا کہ جینی کی کون سی عادت مجھے اس سمت لے جا سکتی ہے۔

مشکل مرحلہ یہ تھا کہ اسے کیسے مجبور کروں کہ وہ خود اپنی چھپائی ہوئی جگہ ظاہر کر دے۔ یعنی اسے اس دھوکے میں ڈالنا کہ وہ اپنے خزانے کی حفاظت کر رہا ہے جبکہ دراصل وہی اپنے نقصان کا دروازہ کھول رہا ہوگا۔

یہی تو فریب کاری کی اصل لذت تھی۔

Scanned with CamScanner

میں نے موٹیل سے چیک آؤٹ کیا اور ڈائنر کی طرف روانہ ہوگئی۔ کل کی طرح آج بھی وہاں گاہک بہت کم تھے۔ ڈیل کاؤنٹر صاف کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر خوش دکھائی دیا۔

اس نے تولیا پھینکا، ایپرن سیدھا کیا اور بولا۔

"دوپہر بخیر، مس برنیٹ!"

میں نے سر ہلایا۔ "کیا آپ کے پاس اب بھی میرے لیے وقت ہے؟"

"جی بالکل، ادھر آجائیں۔"

ہم کونے کے ایک بوتھ میں بیٹھ گئے۔

میں نے سوالات شروع کیے۔ وہ اتنا دلچسپ انٹرویو تھا کہ ایک لمحے کو مجھے واقعی افسوس ہوا کہ کاش میں واقعی کسی ٹریولی میگزین کی رپورٹر ہوتی۔

"کیا میں وہ جگہ دیکھ سکتی ہوں جہاں یہ سب جادو ہوتا ہے؟"

وہ مجھے کچن میں لے گیا جہاں ایک اور ملازم دوپہر کے بعد کی صفائی میں مصروف تھا۔ میں نے اپنا بیگ فرش پر رکھا۔ جب ہی میز کے پائے کے پاس جمع میل کچیل میں کوئی چھوٹی سی غیر معمولی چیز نظر آئی۔

میں نے کیمرا نکالا اور تصویریں لینے کا بہانہ کیا۔

"چلیے، آپ کی چند تصویریں باہر بھی ہوجائیں۔"

میں نے اسے اور اس کے ساتھی کو پائی کی ٹرے تھامے ہوئے فوٹو لیے پھر ڈائنر کے دروازے پر اور پارکنگ لاٹ کے بڑے سائن کے نیچے تصویریں کھینچیں۔

جب میرا کام ختم ہوگیا تو وہ خود مجھے گاڑی تک چھوڑنے آیا۔

"ڈیل! تمہاری مدد کا شکریہ۔ اب میں کیٹرزویل جا رہی ہوں۔ وہی جگہ جہاں وہ پانی کا پیتا ہے جس کا تم نے ذکر کیا تھا۔ اس کے بعد میں ایک بلوگر اس بینڈ کے بارے میں معلومات لوں گی۔ سنا ہے وہ ہر جمعے کی شام ٹیلنٹرڈ میں پرفارم کرتے ہیں۔"

ڈیل مسکرایا۔ "ہاں بالکل۔ خبردار رہنا۔ وہ عورتیں ایسا بہاتی ہیں کہ ہوش اڑا دیتی ہیں۔"

میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ "پھر اس کے بعد سیدھا فلوریڈا کے ساحلی علاقے کی طرف جا رہی ہوں۔"

وہ بولا۔ "اپنا خیال رکھنا اور اگر وہ آرٹیکل واقعی چھپ جائے تو مجھے ضرور بتانا، میں دس کاپیاں خریدوں گا۔ ایک فریم کرکے ریستوران میں لگا دوں گا۔" وہ ہاتھ ہلا کر اندر لوٹ گیا۔

میں نے بیگ اگلی نشست پر پھینکا اور گاڑی چلا کر اس جگہ پہنچی جو میں نے اپنی آمد کی پہلی رات ہی چھپنے کی جگہ کے طور پر چن رکھی تھی۔ درختوں کے سائے تلے جگہ لمبا ٹھنڈی تھی مگر ہوا کے باوجود گرمی سے دم گھٹ رہا تھا۔

کچن کے دورے کے دوران میز کے پائے کے ساتھ جو چھوٹی سی چیز میری نظر میں آئی تھی، اس نے میرے شک کو یقین میں بدل دیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ ایلاور کے زیورات یہیں کہیں موجود تھے اور غالب امکان یہ بھی تھا کہ اب بھی ہوں۔ شاید کسی بدلے ہوئے روپ میں۔

ڈائنر جیسی پیچیدہ عمارت میں ان کی جگہ تلاش کرنا تقریباً ناممکن تھا مگر میرے منصوبے کی کامیابی اصل میں مقام پر نہیں بلکہ انسان کی عادت پر منحصر تھی۔

میں نے اس ننھے سے سنہری ذرّے کو اپنی ہتھیلی پر رکھا۔ سوئی کی نوک کے برابر ایک گول سا ذرہ جو میں نے میز کے پائے سے نکالا تھا۔ یہ اسی قسم کا ذرہ تھا جو دھات کے پگھلنے سے بنتا ہے۔ جب کسی دھات پر تیز شعلہ براہِ راست لگے، بالکل ویسے جیسے میں نے جینی کو اس کریم بروٹے پر جلتی ٹارچ پھیرتے دیکھا تھا۔ ممکن تھا کہ اس نے زیورات میں سے پتھر الگ کرکے سونا پگھلا دیا ہو تاکہ بعد میں الگ بیچ سکے۔ میں نے رات کے لیے اپنا سامان تیار کیا اور دوپہر کا باقی وقت گاڑی میں نیم بیداری کی حالت میں، جھلستی ہوئی گرمی میں گزار دیا۔

نو بج کر پندرہ منٹ پر میری کلائی کی گھڑی کا الارم بجا تو میں چونک کر جاگی۔ پسینے سے بھیگے ہوئے میرے کپڑوں سے لاکر روم کے تولیوں جیسی بو آرہی تھی اور منہ کے اندر خشکی سی تھی جیسے روئی چبالی ہو۔ میں نے چند بسکٹ اور نیم گرم سافٹ ڈرنک کے چند گھونٹ لیے اور پھر گاڑی لے کر جینی کے گھر کے سامنے سے گزری۔ گیراج خالی تھا اور گھر میں کوئی لائٹ نہیں جل رہی تھی۔ میں سیدھی ڈائنر کی طرف بڑھ گئی۔

ریستوران کے اگلے حصے میں اندھیرا تھا مگر کچن کی کھڑکی سے مدھم روشنی جھلک رہی تھی۔ جینی کی گاڑی پچھلی طرف پارک تھی۔ پورے احاطے میں بس وہی ایک گاڑی تھی۔ میں نے اپنی گاڑی اسی جگہ روکی جہاں پچھلی دو راتوں سے نگرانی کے لیے کھڑی کرتی آئی تھی اور عمارت کے سائے میں دبے قدموں آگے بڑھی۔

میں نے رومال کے کونے سے دروازے کے پاس والا بلب کھول دیا تاکہ وہ حصہ مکمل اندھیرے میں ڈوب

Scanned with CamScanner

digest library.com

جائے اور میں لفٹ آگے بڑھ کر اس فون بوتھ تک پہنچی جو عمارت کے اگلے کونے کے قریب تھا۔

ایک پاؤں سے بوتھ کے سلائڈ ہونے والے دروازے کو بند ہونے سے روکتے ہوئے میں نے فون ونڈ سیٹ کان کے ساتھ رکھ لیا اور اپنے آپ کو ہاتھ سے ہوا دیتے ہوئے بیٹھ گئی۔ شکر تھا کہ چھت میں لگے چھوٹے سے بلب کی مدھم روشنی نے زیادہ کیڑے مکوڑوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کیا تھا۔ چند منٹ تک میں سڑک پر آتی جاتی اکا دکا ٹریفک کو دیکھتی رہی اور شہر کی رات کی آوازیں سنتی رہی پھر میرے پیچھے کہیں ڈائنر کا سائڈ والا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا۔ بوتھ کے شیشے کے پینل میں مجھے جینی کا سایہ نظر آیا۔ وہ اندر کی روشن جگہ سے باہر نکلا اور دروازہ بند کرتے ہی اندھیرا واپس لوٹ آیا۔ میں نے کی پیڈ پر چند ہندسے دبائے اور پھر رک کر سنا۔ سگریٹ کے پیکٹ کی وہ مانوس آواز جو جینی کے ہاتھ کی ہتھیلی سے ٹکرا کر بار بار گونج رہی تھی۔

"ہیلو میں ہوں۔" میں نے فون پر کہا۔ میری پیٹھ ڈائنر کی طرف تھی اور آواز معمول سے کچھ اونچی۔ "سنو، ڈیل! وہ اپنے سامان کے بدلے اچھی خاصی رقم دینے کو تیار ہے۔" میں لمحہ بھر کو رکی پھر آواز ذرا دھیمی کر لی۔

"اس کا غصہ صرف یہ نہیں ہے کہ اسے لوٹا گیا۔ ان میں کچھ چیزیں جذباتی اہمیت بھی رکھتی ہیں اور اس کے انشورنس والوں نے بھی انعام رکھا ہے۔ اگر تم صحیح طریقے سے یہ معاملہ نمٹا لو گے تو تم اس معاملے میں سے ایسے نکل سکتے ہو جیسے مکھن میں سے بال۔" میں نے پیشانی سے پسینا پونچھا اور بوتھ کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"نہیں ڈیل! تم سنو، مجھے نہیں لگتا کہ تم سمجھنے کی کوشش بھی کر رہے ہو۔ یہ کوئی سودے بازی نہیں ہے۔ یہ میرا تم پر احسان ہے۔ تم مال واپس کرو، باقی میں سنبھال لوں گی۔ ویسے بھی تمہارے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔"

میں نے ریسیور کان سے ہٹا کر ایک لمبی جھنجلاہٹ بھری سانس خارج کی اور پھر اپنی بات دوبارہ شروع کی۔

"تم مجھے ست کر سکتے ہو مگر تم مجھے روک نہیں سکتے۔ میں بہت عرصے سے اس دھندے میں ہوں اس لیے تمہیں بتا دوں کہ جن خریداروں کو تم جانتے ہو، ان میں سے کئی لوگ مجھے بھی جانتے ہیں اور ان میں سے بہت سوں پر اب بھی میرے احسانات ہیں۔ تو اگر تم میرے پاس سے گزرے بغیر وہ پتھر بیچنے کی کوشش کرو گے تو یقین مانو پکڑے جاؤ گے۔" میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ جینی میری باتیں سن رہا ہے یا نہیں۔

میں نے چند لمحے کی خاموشی اختیار کی جیسے دوسری طرف کی بات سن رہی ہوں پھر کہا۔

"اچھا، یہ تو تم نے آج بھی کہا تھا کہ تم مال لے آؤ گے لیکن جب میں آئی تو تم غائب ہو گئے۔ کیا آج رات کچھ مختلف ہوگا؟ ٹھیک ہے۔ ایک گھنٹا، اسی جگہ جہاں ہم پہلے ملے تھے مگر خدا کی قسم اگر اس بار تم نے مجھے چکر دیا تو میں تمہیں عبرت کا نشان بنا دوں گی۔"

میں نے فون کو کریڈل پر زور سے پٹخا پھر سڑک پار کر کے اپنی گاڑی کی طرف دوڑ پڑی لیکن ایک نظر میں ہی میں نے دیکھ لیا تھا کہ جینی عجلت میں اٹھ کر ڈائنر کا سائڈ دروازہ کھولتے ہوئے نہایت تیزی سے اندر جا گھسا۔

میں نے گاڑی پچاس گز آگے ایک چھوٹے شاپنگ سینٹر کے لاٹ میں پارک کی، اپنا بیگ اٹھایا اور تیزی سے واپس ڈائنر کی طرف دوڑی اور کچن کی کھڑکی تک پہنچ کر میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اندر جھانکا۔

جینی ایک بڑے کمرشل فریج کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ اس کے پاس کئی پلاسٹک کے فوڈ کنٹینرز فرش پر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ نچلی شیلف کے پیچھے ہاتھ گھسا کر ایک پائی نکالتا اور انہیں ایک پلاسٹک کے تھیلے میں ڈال دیتا۔ اپنا کام کرنے کے بعد اس نے فریج بند کر کے تھیلے کا منہ باندھا اور اسے کندھے پر ڈال کر دروازے کی طرف مڑا۔

مگر دروازہ کھلتے ہی میں اس کے استقبال کو موجود تھی۔ جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، میں نے اسے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اس کے چہرے پر ایک زبردست مکا مارا۔ وہ پیچھے کو لڑکھڑایا۔ میں اپنے جسم کی پوری طاقت سے اسے دھکیل کر گرانے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ شاید اس کا دماغ بالکل ہی کام کرنا بند کر چکا تھا کیونکہ جب میں نے اسے الٹا کر کے اس کے ہاتھ پیچھے باندھے تو اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

"یہ دیکھ رہے ہو؟" میں نے اپنے بیگ سے مرچ اسپرے نکالا اور اسے اس کے چہرے سے چند انچ کے فاصلے پر رکھ دیا۔

وہ کراہتے ہوئے پیٹ کے بل پڑا لمبی لمبی سانسیں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں تم سے کچھ سوال کروں گی۔ اگر مجھے لگا کہ تم

Scanned with CamScanner

جھوٹ بول رہے ہو تو میں اسے استعمال کرنے سے بالکل نہیں ہچکچاؤں گی۔"

میں نے تھیلا کھولتے ہوئے اس میں سے پائی نکالی، اسے ہاتھ میں مسل کر توڑا تو اس کے اندر سے خوبصورت کشن کٹ روبیز نکلے۔

"کیا باقی پتھر بھی انہی پائیز میں ہیں؟"

"ہاں۔" اس کی آواز بمشکل نکلی۔

میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کے اس کا سر اپنی طرف گھمایا۔ "میں نے تمہیں ایک بار ڈھونڈ نکالا ہے تو میں دوبارہ بھی ڈھونڈ سکتی ہوں۔ اگر تم نے جھوٹ بولا اور مجھے دوبارہ آنا پڑا۔" میں نے سر جھکا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ "آخری موقع ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ سونا بھی اسی میں ہے؟"

اس بار اس نے صرف سر ہلایا۔ میں نے بیگ میں سے ایک مڑا ہوا موزہ نکالا اور جینی کے منہ میں زور سے ٹھونس دیا۔

وہ تڑپنے اور کسمسانے لگا تھا مگر مجھے اطمینان تھا کہ نہ تو اس کا دم گھٹنے والا ہے اور نہ ہی وہ چلا کر کسی کو متوجہ کر سکے گا۔ میں نے لائٹس بند کیں اور اندھیرے میں باہر نکل آئی۔

یہاں کی گرمی واقعی جان لینے والی تھی، اس لیے گاڑی سے نکلتے ہوئے میں نے کھڑکیاں کھلی چھوڑ دی تھیں۔ اسی لیے مجھے گاڑی میں بیٹھنے تک ڈیل کی گھٹیا کولون کی مہک محسوس نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی کھڑکیاں بند کر دیں، ائر کنڈیشن ری سرکیولیٹ کر رہا تھا، تب ہی مجھے احساس ہوا کہ گاڑی میں، میں اکیلی نہیں ہوں۔

"ڈیل! مجھے معلوم ہے تم یہاں ہو۔ بہتر ہے کہ تم خود سامنے آجاؤ۔"

اس کے بھاری جسم نے پچھلی سیٹ کے فرش سے اٹھ کر پیچھے کے شیشوں سے جھلکنے والی اسٹریٹ لائٹس کو ڈھک دیا۔

"اسے دھیان سے دیکھنا۔" اس نے گن اٹھا کر ایسے رکھی کہ میں اسے دیکھ سکوں۔

گن دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے کوشش کی کہ بے پروائی کا تاثر دوں۔ "مجھے ذرا تجسس ہے۔ بتانا پسند کرو گے، تمہیں مجھ پر کب شک ہوا؟"

"پہلی ہی رات تقریباً اندازہ ہو گیا تھا۔" وہ بولا۔

"جب تم ڈائنر سے نکلیں، میں نے اپنے ایک کزن کو فون کیا، تھوڑی شیخی بگھارنے کے لیے کہ شاید میرا ریسٹورنٹ تمہارے میگزین کے آرٹیکل میں چھپنے والا ہے۔ اس نے مجھے ایک بات یاد دلائی جو تمہارے لیے دلچسپ ہو سکتی تھی۔ اسی لیے جب ریسٹورنٹ بند کیا تو سیدھا تمہارے موٹیل آیا تاکہ تمہیں وہ بات بتا دوں۔"

"تو تم کال کر سکتے تھے نا؟"

ہنکارا بھرتے ہوئے اس کے چہرے پر وہی ہوس بھری مسکراہٹ آئی جو اس نے پہلی ملاقات میں بھی چھپانے کی زحمت نہیں کی تھی۔

"اگلی لائٹ پر باہیں مڑ جانا۔ خیر، میں تمہارا انتظار کرتے کرتے گاڑی میں ہی سو گیا اور جب جاگا تو تمہاری گاڑی تب بھی واپس نہیں آئی تھی۔ رات کے اس پہر یہاں دیکھنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا اور جو کچھ ہوتا بھی ہے وہ اس قسم کا نہیں ہوتا کہ تم جیسی لڑکی اس سے مزے لے سکے۔ تو میں نے سوچا کہ شاید تم وہ نہیں ہو جو خود کو بتا رہی ہو اور شاید تم کسی اور وجہ سے یہاں ہو۔"

"تو تم نے اسی وقت مجھے بے نقاب کیوں نہیں کیا؟"

"میں تقریباً کر دیتا مگر جینی اتنا بھی بیوقوف نہیں جتنا لگتا ہے۔ عام طور پر اس وقت تک نہیں بتاتا کہ اس نے زیورات کہاں چھپائے ہیں جب تک میں کسی خریدار کو بولی کے لیے تیار نہ کر لوں۔ تو دل میں آیا کہ جب تم وہ چیزیں جینی سے چھینو گی تو میں اسے تم سے چھین لوں گا۔"

میں نے رئیر ویو مرر میں اس کی شیطانی مسکراہٹ دیکھی۔ "یہ سب تم دونوں کی شراکت کو تباہ نہیں کر دے گا؟"

"نہیں مس.....! وہ اور میں....." اس نے گن کی نال اپنے سینے پر چبھوئی۔ "ہم دونوں کا مستقبل روشن ہے۔ یہ تو بس ایک موقعے کی بات ہے جس سے میں فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ جینی کو کبھی پتا نہیں چلے گا کہ جب تم نے اس سے وہ مال چھینا تو بعد میں ان کا کیا ہوا اور اگر تمہاری لاش ملتی بھی ہے تو ایسا کوئی نہیں ہوگا جو اسے ہم سے جوڑ سکے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے پھر گن سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

ایسے لوگ مجھے ہمیشہ بے چین کرتے تھے جو گن کو بھی ہاتھوں کی طرح اشاروں کے لیے استعمال کرتے۔ اگر گولی چل جاتی تو؟

"اور چونکہ مجھے اس وقت پیسوں کی کوئی خاص ضرورت نہیں تو میں ان ننھے ننھے گینوں کے اس چھوٹے سے ڈھیر پر آرام سے بیٹھ سکتا ہوں پھر کبھی ایک ایک کر کے باہر نکال دوں گا، جب مجھے ضرورت ہوگی۔" وہ آگے جھکا۔ "اور ویسے جو تم نے اس فون بوتھ میں پر فارم کیا تھا، وہ تو قابلِ دید تھا۔ تمہیں تو ہالی وڈ میں ہونا چاہیے۔"

Scanned with CamScanner

digest library.com

"کیا واقعی؟" میں نے مصنوعی جوش سے کہا۔

"بتاؤ تو سہی۔" اس بار اس نے گن میرے کندھے میں چبھوئی۔ "تمہیں کیسے پتا چلا کہ جینی نے وہ چیزیں ڈائنر میں چھپا رکھی ہیں؟"

"مجھے نہیں پتا تھا۔" میں نے سپاٹ انداز میں کہا۔ "میں پہلے ہی اس کی کار اور گھر کھنگال چکی تھی۔ ڈائنر بس منطقی اگلا قدم تھا مگر ڈائنر بھی اتنا بڑا ہے کہ میں اکیلے نہیں ڈھونڈ سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے وہ فون بوتھ والا ڈراما کیا۔"

"تقریباً چار میل آگے دائیں طرف ایک کنکریلی سڑک ہے، سات میل کے نشان کے فوراً بعد۔ اس میں مڑ جانا۔" اس نے ہدایت دی۔

میں نے رفتار بڑھائی، سامنے سڑک اور آئینے میں دیکھتے اور ڈیل کے بیچ توجہ بانٹتے ہوئے۔ مجھے یہ شاہراہ اچھی طرح معلوم تھی۔ پہلی رات میں نے اسی راستے کو بچ نکلنے کے لیے آزمایا تھا۔

"تم پولیس نہیں ہو نا؟ کوئی باؤنٹی ہنٹر ہو تم؟" وہ کہہ رہا تھا۔

"بس تمہاری طرح ایک چور ہوں۔" میں نے جھوٹ بولا تاکہ اپنے کلائنٹ کو کسی ممکنہ بدلے سے بچا سکوں۔ "مگر میں اپنے اصولوں پر چلتی ہوں کیونکہ ہم پولیس کو شامل نہیں کر سکتے۔ میرے انشورنس کمپنیوں میں رابطے ہیں۔"

آئینے میں، میں نے دیکھا کہ ڈیل کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ کوئی بڑی بات نہیں مگر جب ہر لمحہ قیمتی ہو تو فرق پڑ سکتا ہے۔ میں نے آگے اور پیچھے ٹریفک چیک کی، کچھ نہ تھا اس لیے رفتار پچپن میل فی گھنٹا برقرار رکھی اور ڈیل کو چھیڑنے کا فیصلہ کیا۔

"تم سمجھتے ہو کہ یہ کام کر کے بچ جاؤ گے؟"

"میں پہلے ہی بچ چکا ہوں۔" اس نے غرور سے کہا۔

میں نے سر ہلایا۔ "میں کوئی شوقیہ چور نہیں۔ آج صبح جب میں ڈائنر سے نکلی تو میں نے اپنے انشورنس والے دوست کو فون کر کے بتا دیا کہ تم اس سازش کا حصہ ہو۔ ایک بات بتاؤں تمہیں؟ میں عام طور پر کھلاڑیوں کو فوراً پہچان لیتی ہوں۔ تمہاری شمولیت نے مجھے دھوکا دیا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ تم جیسے دیہاتی سے بھی کوئی سرپرائز آئے گا۔"

"اچھا، ایک بات بتاؤ۔" اس نے چلا کر کہا۔ "جینی کے ساتھ کیا معاملہ تھا۔"

"بہت خاص۔" میں ہنسی۔ "تمہیں کیا لگتا ہے، میں اس رات کہاں تھی جب تم میرے موٹیل کے اردگرد میری بو سونگھ رہے تھے اور مجھے اس کے گھر کی تلاشی لینے کا موقع کیسے ملا؟"

اس کے چہرے پر توہین کی سرخی چھا گئی۔ یقیناً یہ سوچ کر ہی کہ میں نے جو موقع اسے نہیں دیا، وہ جینی کو دے دیا۔

"تمہیں یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ اس کی سانس بھاری ہوئی، بالکل کسی ایسے بیل کی طرح جو حملے کے لیے تیار ہو۔ آئینے میں، میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ غصے کا طوفان ابھر رہا تھا اور چہرے پر زخم خوردہ انا کی جھلک نمایاں تھی۔

"وہ گھٹیا گھمنڈی انسان تو بس ایک دو نمبر ٹھگ ہے۔" اس نے چلا کر کہا۔ "دماغ تو سارا میرا چلتا ہے۔"

اس بار اس نے جیسے ہی گن کی نال اپنے سینے پر رکھ کر دکھائی، میں نے بریک دبا دیا۔ وہ سیٹوں کے درمیان آگے کو لڑھک آیا۔ میں نے کہنی سے اس کی ناک پر زور سے وار کیا۔ وہ چلایا اور میں نے وہی ضرب دوبارہ لگائی، گاڑی گیئر شفٹ پارک میں ڈالتے ہوئے۔ اس اثنا میں اس کی گن فرش پر گر چکی تھی۔ میں نے فوراً اسے اٹھا کر دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کی طرف تان لیا۔

"اترو۔ صرف دائیں ہاتھ سے دروازے کا لاک کھولو اور باہر نکلو۔ ابھی کرو۔"

جیسے ہی ڈیل میری گاڑی سے لڑکھڑاتا ہوا باہر گرا، میں نے جتنی تیزی کی قانون اجازت دیتا تھا، اتنی تیز رفتاری سے گرافٹن کاؤنٹی اور جارجیا کی سرحدیں پیچھے چھوڑ دیں۔ البامہ پہنچنے کے بعد ہی مجھے اتنا محفوظ محسوس ہوا کہ میں نے اپنی گاڑی کی اصلی نمبر پلیٹ دوبارہ لگا دی اور شریوپورٹ کی طرف رخ کیا۔

برمنگھم میں ایک دن آرام کرنے کے بعد میں نے ایلانور کو فون کر کے بتایا کہ میں نے اس کے زیورات واپس حاصل کر لیے ہیں۔ اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا اور آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے جب میں نے اس کے گھر پہنچ کر اس کا مال اس کے حوالے کیا۔

اور اسی لیے میں نے فیصلہ کیا کہ میں یہ سلسلہ جاری رکھوں گی۔ اس کیس میں پہلی بار مجھے کسی ایسے انسان کا قرض چکانے کا موقع ملا جسے میں نے نقصان پہنچایا تھا۔ جذباتی انعام بہت زیادہ تھا۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہوگا اور اس حوالے سے میں خوش قسمت تھی۔

***

Scanned with CamScanner

رمز شناس

نازیہ کامران کاشف

قسط نمبر: ۲۵

وہ صدیوں پر محیط ایک ایسا گہرا راز تھا جس کی جڑیں ہندوستان کی سرزمین سے لے کر مصر اور انگلستان تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان جڑوں میں علم کا ایسا خزانہ دفن تھا جسے صدیوں کوئی تلاش نہ کرسکا... مگر کوئی ایسا بھی تھا جسے اس خزانے کی تلاش تھی۔ یہ بھی کائنات کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھانے کی اس رمز شناس کی ایسی کوشش تھی جس نے ان سوئی ہوئی شیطانی قوتوں کو گہری نیند سے جگادیا تھا، جن پر قابو پانا کسی عام انسان کے لیے ناممکن تھا مگر علم کی معراج پر پہنچ کر اس نے ان پُراسرار علوم کو عام کرنے کی ناقابلِ فراموش داستان رقم کردی اور اس نے تاریخ کے اوراق پر انہیں عبرت کا نشان بنادیا... صدیاں گزرتی رہیں اور ایک بار پھر اٹھارویں صدی کے اوائل میں ان قوتوں نے سر اٹھایا... مگر کیا مصر کے عیار ابیب، انگلستان کے آرتھر اور ہندوستان کے کاویہ سے... مقابلہ کرنا آسان تھا...؟ ہاں عشق اور فرض کے درمیان اسے ہی کامیابی حاصل ہوئی جو سارے بھید جان گیا تھا۔

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی گتھیاں سلجھانے والے

ایک رمز شناس کی سنسنی خیز داستان

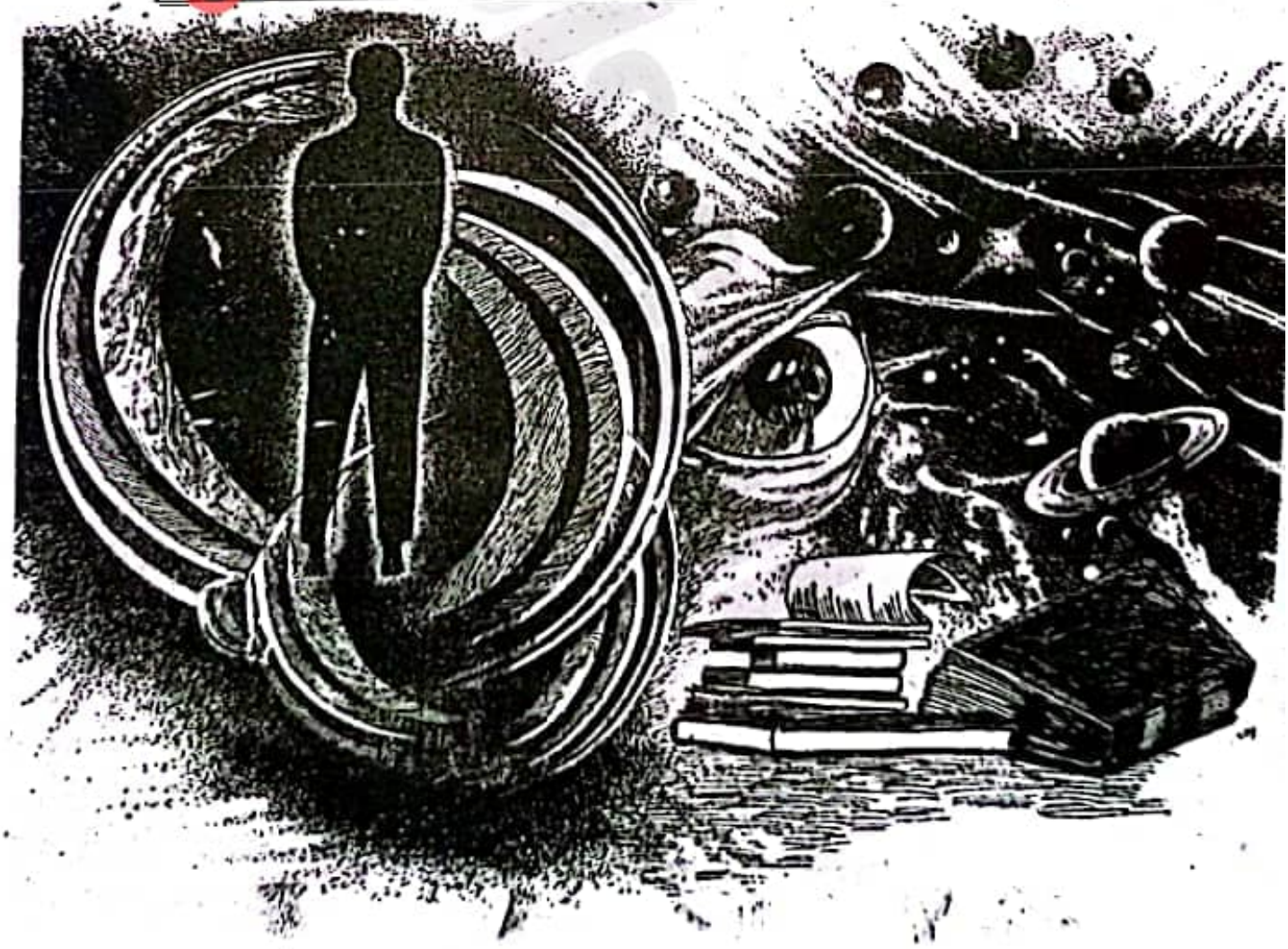

digest.library.com

Scanned with CamScanner

Year 1773

راج گڑھ۔ ہندوستان

امرتا اپنے کمرے میں غصے سے ٹہل رہی تھی۔ اس کا وہ شاندار کمرا تو چلنے کے بعد اس قابل ہی نہ رہا تھا کہ وہ دوبارہ اس میں سو سکتی، لہٰذا اس کمرے کی مرمت اور سجاوٹ کے مکمل ہونے تک اسے مہمان خانے میں قیام کرنا تھا۔

مہا پوجا کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ صبح ہوتے ہی مہا پوجا کے فوراً بعد راج گرو کے آشیرواد کے ساتھ ہی رتناوتی اور کادیہ کے ویواہ کا اعلان کر دیا جاتا۔ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا تھا کہ سب کے لیے یقین کرنا مشکل تھا۔

کہاں تو رتناوتی آنے والے تمام رشتوں کو ٹھکرا دیتی تھی مگر کادیہ کے لیے فوراً راضی ہو گئی تھی۔ امرتا کا خون یہ سن کر مزید کھول گیا تھا کہ رتناوتی اپنی جھوٹی بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس اژدہے کے چنگل میں پھنس گئی تھی اور کادیہ نے جان پر کھیل کر رتناوتی کو اس اژدہے سے بچایا تھا۔

ہمیشہ کی طرح خود کو بہادر اور نڈر ثابت کرنے اور پتا جی کی نظروں میں اپنے آپ کو سب سے برتر ثابت کرنے میں وہ ایک بار پھر سے کامیاب رہی تھی مگر اس کی اس کامیابی کا سہرا امرتا کی بیوقوفی کے سر تھا۔

نہ وہ اژدہا اس کے کمرے میں آتا، نہ ہی وہ مدد کے لیے پکارتی اور نہ ہی رتناوتی مہمانوں کے سامنے یہ ناٹک کرتی۔ محل میں نہ کسی نے رویندر کی بہادری کا تذکرہ کیا تھا، نہ ہی کسی کو اس کی فکر تھی۔ بس چاروں طرف رتناوتی اور کادیہ کے نام کے ڈنکے بج رہے تھے۔

شکنتلا اسے سنانے کے بعد سے خاموشی اختیار کر چکی تھیں اور مسلسل اپنے کمرے میں بند تھیں۔ ایسے میں نیند کس کو آتی۔ بالآخر تھک ہار کر وہ مسہری پر بیٹھ گئی۔ یہ سب سوچنے سے وہ صرف خود کو ہی ہلکان کر رہی تھی۔ اس وقت اسے ٹھنڈے دماغ سے سوچنا تھا۔ اسے عقل استعمال کرنے کی ضرورت تھی۔

اچانک اس کا دھیان اس اژدہے پر گیا۔ وہ چونک پڑی۔ اژدہا اس کے کمرے میں آیا کہاں سے تھا؟ اس بات پر تو اس نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس کے کمرے میں کوئی ایسی کھڑکی نہیں تھی جہاں سے اتنا بڑا اژدہا اندر داخل ہو جاتا۔

اس کے ذہن میں قلعے سے جڑی وہ تمام باتیں گھوم گئیں جنہیں وہ محض قصے اور کہانیاں سمجھتے تھے۔ یعنی یہ قلعہ اور یہ محل واقعی شراپت تھے؟

اگر ایسا تھا تو اس محل میں ہونے والی ہر گھٹنا کا کارن وہ شراپ ہی ثابت ہوتا اور اگر ایسا نہیں تھا تو وہ خود اس محل کے لیے شراپ بننے والی تھی۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''روپا کو پیغام بھجواؤ کہ صبح مہا پوجا کے بعد ہمارے سامنے حاضر ہو۔'' اس نے کمرے میں کھڑی کنیز کو مخاطب کیا۔

''جی راج کماری!'' وہ حکم بجا لاتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''ہماری زلفیں کھول کر انہیں سلجھاؤ۔ ہم سونا چاہتے ہیں۔'' اس نے وہاں کھڑی دوسری کنیز کو مخاطب کیا اور وہ حکم کی تعمیل میں لگ گئی۔

امرتا نے نیم دراز ہو کر اپنی آنکھیں موند لیں۔ اسے اب صبح ہونے کا انتظار تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح قلعے کی رونق دیکھنے والی تھی۔ وہ سب سورج نکلنے سے پہلے ہی اٹھ کر مہا پوجا کی تیاری شروع کر چکے تھے۔ مہا پوجا کے فوراً بعد کادیہ اور رتناوتی کی سگائی کی رسم ادا کی جاتی۔ بالآخر سب کو محل سے نکلنے کا حکم ملا اور وہ سب منہ اندھیرے محل سے پیدل ہی راج مندر کی طرف چلنے لگے۔ سورج دیوتا کو نمسکار کرنے کے بعد پوجا شروع ہو جاتی، اس کے بعد جنتا میں اناج اور کپڑوں کی تقسیم کی جاتی اور پھر دربارِ عام کا اعلان کیا جاتا۔ شاہی پریوار محل لوٹ آتا جہاں کادیہ اور رتناوتی کی سگائی کے بعد جنتا میں مٹھائی تقسیم کی جاتی۔

رتناوتی نے خاص تیاری کی تھی۔ اس نے لال رنگ کی ساڑی زیب تن کر رکھی تھی اور اپنے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ آج اس نے اپنے بناؤ سنگھار پر بھی خصوصی توجہ دی تھی اور شاہی زیورات بھی پہن رکھے تھے۔ وہ کسی اپسرا کا روپ دھارے کادیہ کے دل پر بجلیاں گرا گئی تھی۔ کادیہ کی آنکھوں میں اس کے لیے ستائش اور محبت صاف نظر آ رہی تھی۔ شکنتلا خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں مگر مان سنگھ کی پتنی ہونے کے ناتے انہیں اس پوجا میں شامل ہونا ہی تھا۔ لہٰذا وہ مجبور تھیں۔

وہ سب راج مندر پہنچے تو پنڈت جی دوسرے پنڈتوں کے ساتھ باہر ہی کھڑے تھے۔ سورج نکلنے والا تھا لہٰذا وہ سب فوراً ہی سورج نمسکار کے لیے کھڑے ہو گئے۔ پنڈت جی نے انہیں پوجا کی تھالیاں تھمائیں۔ ان سب نے راج پنڈت کی پیروی کرتے ہوئے وہ تھالیاں سروں سے

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

اونچی کیں اور سورج کی طرف منہ کر کے آنکھیں بند کرلیں۔

اس نے قلعے کی حدود میں قدم رکھا تو آدیش کو اپنا منتظر پایا۔

"نمستے گرو جی! آپ کا سواگت ہے۔" وہ پہرے داروں کے ہمراہ انہیں ساتھ لیے راج مندر کی طرف بڑھ گیا۔

وہ راج مندر کے قریب پہنچے تو سورج نکلنے میں بس چند ہی لمحے رہ گئے تھے۔

"ٹھہرو، ہم سورج نمسکار کرلیں۔" وہ چلتے چلتے اچانک رکا اور آنکھیں بند کر کے کھڑا ہوگیا۔ آدیش نے بھی راج گرو کی پیروی کرنا مناسب سمجھا۔

سورج کی روشنی محسوس کر کے سنگھیا نے اپنی آنکھیں کھولیں اور ہاتھ جوڑے ہوئے ہی راج مندر کی طرف پلٹا۔

"جے ماں کالی!" اس نے مندر کی طرف منہ کر کے یہ الفاظ دہرائے اور اپنے جڑے ہوئے ہاتھ نیچے کرلیے مگر ہاتھ نیچے کرتے ہی اس کی نظر سندرتا کی اس دیوی پر پڑی جس کا سونے جیسا سراپا اس کے بدن پر لپٹی وہ لال ساڑی بھی چھپانے میں ناکام رہی تھی۔

وہ بنا پلکیں جھپکائے اسے تک رہا تھا۔ اسی لمحے اس دیوی نے بھی اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کی نظریں سنگھیا کی نظروں سے ٹکرائیں۔ سنگھیا کے اندر آگ بھڑک اٹھی۔

"حضور! راج گرو آچکے ہیں۔" آدیش نے جلدی سے آگے بڑھ کر مان سنگھ کو مطلع کیا۔

وہ سب سنگھیا سے آشیرواد لینے کے لیے آگے بڑھ چکے تھے مگر وہ وہیں کھڑی رہی۔ کچھ تھا جو بہت الگ تھا۔ اسے راج گرو کو دیکھ کر عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اس کی چھٹی حس شروع سے ہی تیز رہی تھی، جبھی تو وہ محبت کے پردے میں لپٹے ان سوتیلے رشتوں کے دلوں کا حال بن کہے جان جایا کرتی تھی۔ اس وقت بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

گرو جی کا ذکر سنتے ہی اس کے ذہن میں ہمیشہ ایک بوڑھے شخص کا خاکہ ابھرتا تھا اور یہی خاکہ اس نے اپنے پرکھوں سے سن بھی رکھا تھا مگر یہاں اس کے سامنے ایک پینتیس چھتیس سالہ شخص کھڑا تھا جس کا حلیہ بھی راج گرو کے بیان کردہ حلیے سے یکسر مختلف تھا اور اس کی آنکھیں..... ان آنکھوں میں عجیب سا سحر تھا۔

سنگھیا نے سب کو آشیرواد دینے کے بعد دوبارہ اس پر نظر ڈالی۔ وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تھی بلکہ غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"گرو جی! آپ کا یہاں آنا ہمارے لیے سوبھاگیہ کی بات ہے۔ اس شبھ موقع پر آپ کا آشیرواد مل جائے تو ہمارے جیون سپھل ہوجائیں گے۔" مان سنگھ کے لہجے میں گرو جی کے لیے مان ہی مان تھا۔

"رتناوتی! یہاں آؤ۔ گرو جی سے آشیرواد لو۔" پاروتی نے اسے پیچھے کھڑے دیکھ کر پکارا۔

"گرو جی! یہ میری سپوتری رتناوتی۔" مان سنگھ نے جلدی سے اس کا تعارف کروایا اور رتناوتی کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔

"ہم خود آشیرواد دے دیتے ہیں۔" سنگھیا سنجیدگی سے کہہ کر آگے بڑھا۔ اس کے پیروں میں موجود کڑے اس کے چلنے سے آواز پیدا کرنے لگے۔

رتناوتی کو بے چینی نے گھیرا۔ اس نے راج گرو کو آگے بڑھتے دیکھ کر پرنام کے لیے ہاتھ جوڑ دیے۔

وہ اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اس کے وجود سے دھیمی سی ایک مہک اٹھ رہی تھی۔ شاید سورگ کا راستہ اس کی زلفوں سے ہو کر نکلتا تھا۔ وہ سندرتا کے سب سے اونچے تخت پر براجمان تھی۔ سنگھیا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ آشیرواد طویل ترین ہوگیا تھا۔ اس کا ہاتھ رتناوتی کے سر سے ہوتے ہوئے اس کے کاندھے تک آیا۔ اس کے ہاتھ نے رتناوتی کی صراحی دار گردن کو چھوا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹی۔ سب قریب پہنچ چکے تھے۔ شاید کسی نے محسوس نہیں کیا تھا۔ راج گرو، مان سنگھ کی سنگت میں راج مندر کے اندر داخل ہوگئے۔ وہ اپنی گردن کو چھونے لگی۔

"کیا ہوا..... آپ اندر کیوں نہیں جارہیں؟" کاویہ اس کے قریب رکا۔

وہ چونک پڑی اور ہلکا سا مسکرا کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

پوجا شروع ہوچکی تھی۔ پوجا کے بعد ایک بار پھر سب نے راج گرو سے آشیرواد لیا مگر اس بار رتناوتی کو ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا تھا جیسا اس لمحے محسوس ہوا تھا۔ اس کی بے چینی کسی حد تک ختم ہوچکی تھی۔

راج گرو سب کو آشیرواد دے رہے تھے۔ جتنا ان کے ہاتھ چھونے کو بے تاب تھی۔

جب تک وہ لوگ مندر میں رہے، راج گرو نے ایک بار بھی اس پر نظر نہیں ڈالی۔ مان سنگھ نے اناج اور کپڑے کی تقسیم شروع کروائی اور آدیش کو پرجا کو بھوجن پروسنے کی تلقین کر کے راج گرو کی طرف بڑھے جو اب راج پنڈت سے بات کررہے تھے۔

"گرو جی! ہمارے مشیرِ خاص آدیش نے آپ سے

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

محل میں ہونے والی گھٹنا کا ذکر کیا ہوگا؟ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے شبھ چرن ہمارے محل کی چوکھٹ کو چھوئیں تاکہ محل میں موجود بری شکتیاں نشٹ ہو جائیں اور آپ کے ساتھ بیٹھ کر بھوجن کرنے سے ہمارا اناج بھی پوتر ہو جائے۔ ساتھ ہی آپ کے آشیرواد سے ہم راجپوتوں کے راج کمار کا دیہ پرتاپ سنگھ کی سگائی اپنی سپوتری رتنا وتی سے طے کر دیں گے۔" وہ درخواست کر رہے تھے۔

سنگھیا نے ان کی بات سن کر پہلے کادیہ اور پھر رتنا وتی پر نظر ڈالی جو ایک دوسرے کو نظروں کے ذریعے پیغام دینے میں مشغول تھے۔

اس نے بغیر کچھ کہے مان سنگھ کو سر کے اشارے سے ان کے ساتھ چلنے کا اشارہ دیا۔ وہ جلدی سے اپنے پریوار کی طرف بڑھے اور محل پہنچنے کی ہدایت کی۔

پوجا ختم ہو چکی تھی اور بھوجن کھلتے ہی مندر کے سامنے رش بڑھ جاتا لہٰذا اب وہاں رکنا مناسب نہ تھا۔

وہ سب ایک ساتھ محل پہنچے۔ محل کے داخلی راستے پر پہنچ کر مان سنگھ نے سنگھیا سے پہلے قدم اندر رکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ خاموشی سے قدم اندر رکھ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ سب بھی اس کی پیروی کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

محل کے باورچی ان کے آنے کی خبر سن کر جلدی جلدی کھانا پروسنے کا انتظام کرنے لگے۔ آج ناشتے پر پہلے سے زیادہ اہتمام کیا گیا تھا۔ لہٰذا جب تک ناشتا لگتا، مان سنگھ، راج گرو کے سنگ محل کے ہر کونے کو پوتر کرنے کی نیت سے ان کے ساتھ ہو لیے جبکہ باقی سب اپنے کمروں کی طرف چل دیے۔

امرتا جو بہت دیر سے اپنے جذبات پر قابو رکھے ہوئے تھی، کمرے میں پہنچ کر غصے سے زیورات اتار کر پٹخنے لگی۔ اس سے رتنا وتی کا وہ لال گلال چہرہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"راج کماری! روپا آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتی ہے۔" اچانک ایک کنیز نے اندر آ کر اسے خبر دی۔

"بھیجو اندر۔" وہ گہری سانس لے کر سیدھی ہو بیٹھی۔ روپا کو اسی نے پیغام دے کر بلوایا تھا۔ وہ مان سنگھ کی رقاصہ خاص تھی اور اس کے لیے قلعے میں الگ سے حویلی بھی مختص کی گئی تھی۔ اس کے حسن اور اداؤں کے قصے سارے راج میں مشہور تھے۔ وہ اکثر زنان خانے کا دل بہلانے کے لیے بھی بلوائی جاتی تھی۔ وہ جوان تھی، حسین تھی اور لطیفہ گوئی کا فن بھی خوب جانتی تھی۔ اسے سب کو اپنی مٹھی میں کرنا آتا تھا اسی لیے اب تک اس کی جگہ کوئی نہیں لے پایا تھا۔ امرتا سے اس کی خاص دوستی تھی۔ وہ اکثر اس کے کمرے میں پائی جاتی اور قصے کہانیوں سے اس کا دل بہلاتی، انعام و اکرام سمیٹتی اور چلی جاتی۔ امرتا کو چونکہ ریاستی معاملات میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لہٰذا وہ فارغ وقت میں یہی سب کرتی رہتی۔

"پرنام راج کماری! کہیے، داسی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ میں تو خود آپ کے ساتھ ہونے والی گھٹنا کا سن کر حاضر ہونے والی تھی مگر محل کے دروازے کل رات ہم پر بند تھے۔" روپا کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی خوشامدی لہجے میں بولی۔

"آؤ روپا! یہاں بیٹھو، میرے ساتھ۔" امرتا نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور مسہری پر اپنے قریب اس کے لیے جگہ بنائی۔

"راج کماری! میں آپ کے چرنوں کی دھول..... آپ کے ساتھ بیٹھنے کی گستاخی نہیں کر سکتی۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

"تمہاری جگہ یہاں ہی ہے۔ تم ہمارے لیے خاص ہو روپا! اس محل میں تمہارے علاوہ ہے ہی کون جو ہمیں سنتا اور سمجھتا ہو۔" امرتا دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

"کون مورکھ ہے جس نے آپ کے اس سندر چہرے سے مسکان غائب کرنے کی گستاخی کی راج کماری؟" روپا کو تو جیسے موقع مل گیا تھا۔

"وہی بتانے کے لیے تمہیں بلوایا ہے۔ آؤ، ادھر بیٹھو۔" امرتا سنجیدہ لہجے میں بولی اور پھر اپنے دل کا حال اسے کہہ سنایا۔

"راج کماری! آپ حکم کریں۔ روپا آپ کی خوشی کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔" وہ پختہ تھی، کم ذات تھی۔ راج گھرانے کے فیصلوں پر انگلی اٹھانا یا کسی ایک کی طرف ہو کر راج گھرانے کے کسی دوسرے فرد کے بارے میں غلط الفاظ منہ سے نکالنے کی سزا جانتی تھی۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ محل کی ہر دیوار کے ایک نہیں، سو کان تھے۔ اس کی ساری ہمدردیاں امرتا کے ساتھ تھیں مگر وہ رتنا وتی کے بارے میں منہ سے کچھ الٹا سیدھا نکال کر پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔

امرتا نے اس کے اندر داخل ہوتے ہی تمام کنیزوں کو کمرے سے جانے کا اشارہ کر دیا تھا مگر بات شروع کرنے سے پہلے اس نے پھر بھی چاروں طرف دیکھ کر اچھی طرح

Scanned with CamScanner

digest library.com

تسلی کی۔

"تم نے مجھے ناگ دیوتا کے مندر میں بیٹھنے والے ایک یوگی کے بارے میں بتایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے پاس ایسا زہر ہے جو اگر کسی کو پلایا جائے تو اسے بخار آتا ہے اور تین چار دن بعد اس انسان کی مرتیو ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ کوئی طبیب بھی اس زہر کی پہچان نہیں کر سکتا اور اسے بیماری کی موت قرار دیتا ہے۔" وہ رازداری سے بولی تو جواہار روپا کے چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کے آثار ظاہر ہوئے۔

"ڈرو مت، تمہارا نام گپت رہے گا۔ بدلے میں، میں تمہیں سونے چاندی سے نہلا دوں گی۔" امرتا نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے یقین دلایا۔

"مگر..... مگر راج کماری! آپ کو وہ زہر کس لیے چاہیے؟" روپا نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے یہ زہر کس لیے چاہیے۔ تمہارا کام ہے مجھ تک وہ زہر پہنچانا۔ اسے کیسے استعمال کرنا ہے، یہ میرا کام ہے۔ کوئی تمہیں اس کا دوش نہیں دے گا، نہ ہی تمہارا کہیں نام آئے گا۔" امرتا سنجیدگی سے بولی۔

"اگر مہاراجا حضور کو خبر ہو گئی تو.....؟" روپا تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

"کون بتائے گا انہیں..... تم؟ نہیں نا؟ تمہارے بعد یہ راز صرف اور صرف میرے سینے میں دفن ہو گا اور میں تمہیں کسی کو زہر دینے کا نہیں کہہ رہی۔ میں تمہیں صرف زہر خرید کر لانے کا کہہ رہی ہوں اور تم خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ طبیب اس زہر کی پہچان نہیں کر سکتے تو پھر پریشان کیوں ہوتی ہو۔ راج گھرانے میں اگر کوئی بیمار ہو کر مرا بھی تو تم پر کوئی کیوں شک کرے گا؟" امرتا مسکراتے ہوئے بولی۔

"لیکن....." روپا سے یہ بات ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ یہ لو..... تمہیں میری یہ مالا بہت پسند ہے نا۔ اسے میری طرف سے تحفہ سمجھ کر رکھ لو اور میرا کام ہونے کے بعد تم میرے زیورات میں سے جس بھی زیور پر ہاتھ رکھو گی، وہ تمہارا ہو گا۔ اس کے علاوہ انعام الگ ملے گا۔" امرتا نے فوراً اپنے گلے میں پہنی قیمتی موتیوں کی مالا اتار کر روپا کی ہتھیلی پر رکھی اور اس کے دونوں ہاتھ بند کر دیے۔ روپا بے بسی سے امرتا کو دیکھنے لگی۔

"تم اب بھی سوچ میں گم ہو؟ تم میرے لیے صرف ایک چیز خرید کر لا رہی ہو، وہ بھی میری اچھا پر۔ اس میں کیا شک ہے؟ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم کسی کو زہر دو۔ ٹھیک ہے مت لاؤ، میں خود چلی جاؤں گی ناگ دیوتا کے مندر۔ مجھے سمجھ لینا چاہیے کہ اس محل میں کوئی بھی میرا وفادار نہیں۔"

امرتا ناراضگی سے بولی جبکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اسے قلعے سے باہر جانے کی اجازت نہیں ملے گی اور اگر اجازت مل بھی جاتی تو اس کے ساتھ پہرے دار اور کنیزیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ ان میں سے کون اس کا وفادار تھا اور کون نہیں، یہ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ چاہ کر بھی ناگ دیوتا کے مندر میں بیٹھے یوگی سے وہ زہر نہیں خرید سکتی تھی۔ اول تو اسے اس مندر کا پتا معلوم نہیں تھا اور دوسرا وہ مندر جنگل کے کسی کونے میں واقع تھا۔

"راج کماری! آپ..... آپ ناراض مت ہوں۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔ مجھے بس تین دن کا سمے دیں۔ آج رات کی محفل نمٹا کر میں کل ہی مشیر جی سے تین دن کی رخصت لوں گی۔ ناگ دیوتا کے مندر تک پہنچنا کٹھن کام ہے۔ وہ راستہ آپ کے لیے سُرکشت نہیں۔ میں لے آؤں گی مگر آپ اس کم ذات پجنی پر رحم کیجیے گا۔ میرا نام نہ آنے پائے۔" وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

"تم چنتا مت کرو۔" امرتا نے اسے تسلی دی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

روپا اسے پرنام کر کے خاموشی سے باہر نکل گئی۔ امرتا بستر پر دراز ہو گئی۔ اس کے چہرے پر مکمل اطمینان تھا۔ اب بس اسے روپا کے لوٹنے کا انتظار تھا۔ اسی لمحے کنیز نے اسے ناشتا لگنے کی اطلاع دی۔ اس نے اٹھ کر اپنے بال سنوارے اور شاہی تناول خانے کی طرف چل دی۔ وہاں اس کا سارا پریوار خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ اس کی طبیعت پر چھائی کدورت دور ہو چکی تھی۔ لہٰذا وہ بھی چہرے پر مسکراہٹ سجائے سب کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی۔

رتنا دیوی کے پاس اب چند ہی دن رہ گئے تھے۔ وہ چاہ کر بھی کادیہ کی ڈولی میں نہیں بیٹھ سکتی تھی کیونکہ وہ تو بہت جلد ایشور کے پاس پہنچنے والی تھی۔

ناشتے کے فوراً بعد مان سنگھ اور پرتاپ سنگھ نے کادیہ اور رتنا دیوی کی سگائی کا اعلان کیا۔ دونوں پریواروں کے درمیان انگوٹھیوں کا تبادلہ ہوا اور کادیہ کی سنگت میں رتنا دیوی، سنگھیا سے آشیرواد لینے کے لیے آگے بڑھی۔ راج گرو کا آشیرواد خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ابھی وہ سنگھیا سے آشیرواد لینے کے لیے چند قدم ہی دور تھے کہ اچانک انہیں پاروتی کی

چیخ سنائی دی۔ ان دونوں نے بے اختیار ہی پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ پاروتی چیختے ہوئے اوپر کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ سب نے ان کے اشارے کی سمت نظریں دوڑائیں۔ چھت پر لٹکا شیشے کا فانوس ٹوٹ کر نیچے گر رہا تھا۔

قریب تھا کہ وہ فانوس کادیہ اور رتناوتی کو چھلنی کر دیتا، اچانک کادیہ کے قریب کھڑے پرتاپ سنگھ نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

لمحوں میں جیسے سب کچھ بدل گیا تھا۔ ایک زوردار چھناکا ہوا اور چاروں طرف کانچ کے باریک ٹکڑے اڑنے لگے۔ وہ سب ان کانچ کے ٹکڑوں سے خود کو بچانے کی کوشش میں کمرے سے باہر کی طرف دوڑے۔ رتناوتی کو کسی نے کھینچ کر اس فانوس کے نیچے دبنے سے بچایا تھا اور اب وہ ان مضبوط بازوؤں کے حصار میں اپنی آنکھیں بند کیے کانچ کے ٹکڑوں سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی حفاظت کے تحت اسے بچانے والا اپنی پشت گرتے ہوئے فانوس کی طرف کر کے کھڑا ہو گیا تاکہ کانچ کے ٹکڑے اگر اڑ کر اس تک پہنچیں بھی تو اس کی پشت میں ہی پیوست ہوں، رتناوتی ہر حال میں محفوظ رہے۔ چند لمحوں بعد کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔

رتناوتی نے اس کے سینے میں چھپا اپنا چہرہ الگ کر کے آنکھیں کھولیں۔

وہ اسے محو ہو کر تک رہا تھا۔ اس کی خوشبو کو محسوس کر رہا تھا۔

رتناوتی کو جھٹکا لگا۔ وہ تیزی سے اس سے دور ہوئی۔ وہ کادیہ نہیں، سنگھیا تھا۔ رتناوتی نے پرتاپ سنگھ کو کادیہ کو کھینچتے اور کمرے سے ساتھ لے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اتنی افراتفری مچی تھی کہ سب کو لگا رتناوتی بھی باہر نکل چکی ہو گی۔

وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کا سحر رتناوتی پر طاری ہونے لگا۔ وہ اتنی دیر سے راج گرو کے سینے سے لگی کھڑی تھی، اس احساس نے اس کے گال خفت سے سرخ کر دیے تھے۔

اچانک وہ سب دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے۔ کادیہ اور مان سنگھ دوڑتے ہوئے اس کی طرف آ رہے تھے۔ باقی سب بھی فرش پر پھیلے کانچ کے ٹکڑوں سے بچتے بچاتے ان کی طرف بڑھنے لگے۔

"رتناوتی! تم ٹھیک تو ہو نا؟ ہمیں لگا، تم باہر نکل چکی ہو۔ تمہیں چوٹ تو نہیں لگی نا؟" مان سنگھ فکرمندی سے بولے۔ کادیہ بھی پریشانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ مان سنگھ کے سینے سے لگ گئی۔ اس وقت اسے چند لمحوں کی تنہائی چاہیے تھی۔ وہ سب راج گرو کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ شاید ان کے چمتکار کی وجہ سے کانچ اڑ کر رتناوتی تک نہیں پہنچے تھے۔ رتناوتی نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ کسی نے اسے راج گرو کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔

محل کے خادم صفائی میں مصروف ہو چکے تھے۔ مان سنگھ تمام مرد حضرات کے ساتھ دربار میں چلے آئے۔

"حضور! میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ ہر شبھ موقعے پر کوئی نہ کوئی گھٹنا گھٹ رہی ہے۔" آدیش پریشانی سے بولا۔

"یہ گھٹنا ایک حادثہ بھی ہو سکتی ہے۔ میری موجودگی میں کوئی شکتی قلعے کے اندر داخل نہیں ہو سکتی۔" سنگھیا بارعب مگر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"گرو جی! شما چاہتا ہوں، میرا وہ مطلب نہیں تھا۔" آدیش کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ راج گرو کی شکتیوں پر شک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"آدیش! خاموش رہو۔ گرو جی! ہم آپ کے احسان مند ہیں کہ آپ ہمارے محل تک آئے۔ کیا آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ جگہ شراپت ہے؟" مان سنگھ کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"جو تھا، پرکھوں کا وہم تھا۔ حادثے ہیں، شراپ نہیں۔" سنگھیا اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"مگر گرو جی! ہم نے اپنی آنکھوں کے سامنے اس اژدہے کو کمرے سے غائب ہوتے دیکھا تھا۔" پرتاپ سنگھ بھی ہر بار نئی آفت دیکھ کر پریشان ہو چکے تھے۔

"آس پاس جنگل ہے۔ علاقہ جنگلی جانوروں سے بھرا پڑا ہے۔ برسوں سے یہ قلعہ ان کا گھر تھا، وہ اپنا حق جتانے کے لیے اتنے جتن تو کریں گے۔ میں اب چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"گرو جی! آپ آج رات محل میں ہی قیام کر لیں اور ہمیں سیوا کا موقع دیں۔" رویندر بھی بول پڑا۔

"نہیں، میری تپسیا محلوں میں پوری نہیں ہو سکتی۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"آدیش! گرو جی کو شاہی سواری میں ان کی کٹیا تک پہنچا کر آؤ۔" مان سنگھ فوراً ہی آگے بڑھے۔

"نہیں، میں سواری استعمال نہیں کرتا۔" اس کے قدم باہر کی طرف بڑھے۔

"گرو جی! کادیہ کو آپ کا آشیرواد نہیں ملا۔" اچانک پرتاپ سنگھ کو یاد آیا کہ آشیرواد کی رسم تو رہ ہی گئی تھی۔

Scanned with CamScanner

سنگھیا خاموشی سے پلٹا اور کادیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

''کادیہ! گرو جی سے آشیر واد لو۔'' پرتاپ سنگھ نے اسے اشارہ کیا۔ کادیہ چلتا ہوا سنگھیا کے قریب آیا اور اس کے چرن چھونے لگا۔

سنگھیا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سب حیرت سے یہ منظر دیکھنے لگے۔

چند لمحوں بعد سنگھیا نے اپنی آنکھیں کھولیں اور بغیر کچھ کہے تیزی سے دربار سے باہر نکل گیا۔ کادیہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ جب تک گرو جی کا ہاتھ اس کے سر پر رہا، وہ نیچے ہی جھکا رہا تھا۔

''گرو جی نے کچھ کہا کیوں نہیں؟'' پرتاپ سنگھ، مان سنگھ کی طرف دیکھ کر بولے۔

''ان کا آشیر واد ہی کافی ہے۔ ایشور کی کرپا رہی کہ گرو جی گھنٹا کے وقت محل میں موجود تھے اور ہم کسی بڑے نقصان سے بچ گئے۔ کادیہ اور رتناوتی محفوظ ہیں اور ان کی سگائی انجام پا چکی ہے۔'' مان سنگھ بولے۔

انہوں نے اب شراپ کی جگہ گھنٹا کا شبد استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ سب نے ان کی بات کی تائید میں سر ہلایا۔

سنگھیا کے قدم تیزی سے قلعے کے آہنی دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک وہ چلتے چلتے رکا اور محل کی طرف پلٹا۔ رتناوتی اپنی کھڑکی میں کھڑی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے پلٹتے دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئی اور جلدی سے اپنے کمرے کی کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔ سنگھیا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ سونے کی یہ دیوی اس کے دل مندر میں براجمان ہو چکی تھی اور اس کی پوجا کی اجازت وہ اب کسی کو نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے خود سے ایک وعدہ کیا اور قلعے کے آہنی دروازے کو پار کر گیا۔

سنگھیا راج جیسی شکتیاں حاصل کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اسے ان شکتیوں کا استعمال کرنا اچھی طرح آتا تھا اور رتناوتی کو حاصل کرنے کے لیے وہ ان شکتیوں کے استعمال میں ہر حد سے گزرنے والا تھا۔

☆☆☆

Year 1773

قاہرہ۔ مصر

ابو ہریرہ نے عشا کی نماز پڑھ کر سلام پھیرا تو فرات قبیلے کے سردار ارامان انتظار کرتے نظر آئے۔

''السلام علیکم!'' ابو ہریرہ نے ادب سے انہیں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! کیسے ہو ہریرہ؟'' وہ شفقت سے مسکرائے۔

''الحمد للہ اجی، حکم کیجیے۔'' وہ جانتا تھا کہ اگر ارامان خود یہاں تک آئے ہیں تو خاص بات ہی ہو گی۔

''کل رات ہم نے عیاد سے ملاقات کی اور اسے اس کی ذمے داری سونپنے کی کوشش کی۔ وہ گھبرا گیا ہے۔'' وہ مسکرائے۔

''اسے تھوڑا وقت لگے گا۔ یہاں نیا ہے، قدم جمالے گا تو ذمے داری بھی قبول کر لے گا۔'' ابو ہریرہ ان کی بات سن کر مسکرایا۔

''وقت ہی تو نہیں ہے ہمارے پاس۔ وہ یہاں ذمے داری سنبھالے گا تو تم سفر کر سکو گے۔ وہاں حالات تیزی سے خراب ہو رہے ہیں۔ ہم کسی اور کو نہیں بھیج سکتے اس لیے عیاد کے معاملے میں جلدی سے کام لینا پڑ رہا ہے ورنہ ہم اسے وقت دیتے۔'' ان کے لہجے سے فکرمندی جھلک رہی تھی۔

''کیا وہاں کوئی اور نہیں جا سکتا؟ میرا مطلب، میرے پہنچنے تک؟'' ابو ہریرہ نے ان کی پریشانی محسوس کر لی تھی۔

''اگر ایسا ہوتا تو مجھے اتنی جلدی نہ ہوتی۔ کچھ جگہیں ہمارے قبضے میں ہیں، کچھ پر ان کا قبضہ ہو چکا ہے۔ جیسے انسانوں کے لیے کچھ حدود ہیں، ویسے ہی ہمارے لیے بھی ہیں۔ جہاں ہمارا زور نہیں چلتا، وہاں اشرف المخلوقات کی ضرورت پڑتی ہے۔'' ارامان بولے۔

digest library.com

Scanned with CamScanner

"ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟" ابو ہریرہ بولا۔ جواباً انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہ ذمے داری صدیوں سے آپ کے پاس ہے۔ آپ تھکے نہیں؟ پہرے داری سے لے کر پہرے داروں کی تلاش اور پھر ان کو ذمے داری سونپنا..... یہ تھکا دینے والا عمل ہے۔" ابو ہریرہ بولا۔

"نیکی اور بدی کی جنگ تو دنیا کے قیام سے چلی آ رہی ہے۔ میرا حصہ صرف اتنا ہے کہ میں نے نیکی کو چنا ہے تو مجھے ذمے داری بھی نبھانا ہے۔ ہم اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ ہاں، اس ذمے داری کو اٹھانے کی اہم وجہ یہ ہے کہ یہ سب میری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ اگر ہم بروقت اقدامات نہ کرتے تو بڑی تباہی پھیلتی۔ بدی کے کارندے بھی خاموش نہیں بیٹھتے۔ اس لیے پچھلے کچھ سالوں میں ان تین علاقوں سے ان کی کارروائیوں کی خبریں زیادہ آ رہی ہیں لہٰذا وہ علاقے زیادہ توجہ طلب ہو چکے ہیں۔" ارامان بولے۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ عیاد صحیح انتخاب ہے۔ مجھے امید ہے وہ جلد ہی اپنی ذمے داری قبول کر لے گا۔ میں سفر کی تیاری کر چکا ہوں۔ آپ کی طرف سے اشارہ ملتے ہی روانہ ہو جاؤں گا۔" ابو ہریرہ نے ارامان کو تسلی دی۔ ارامان خدا حافظ کہہ کر ہوا میں تحلیل ہو چکے تھے۔ ابو ہریرہ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

☆☆☆

Year 1773

اسکاٹ لینڈ

اسکاٹ لینڈ کو آج صبح سے ہی بادلوں نے ڈھک رکھا تھا۔ دن میں بھی رات کا گمان ہو رہا تھا۔ مسلسل برستی بارش نے موسم کو مزید سرد اور اداس کر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آسمان بھی ان کے غم میں برابر کا شریک ہو۔

وہ سب اس وقت اسکاٹ لینڈ سمیٹری میں موجود تھے جہاں مسز مارتھا کی آخری رسومات ادا کی جا رہی تھیں۔ ان کے دونوں بیٹے بمع اپنے اہل و عیال غم سے نڈھال ایک طرف کھڑے آنسو بہا رہے تھے مگر ان سے زیادہ آرتھر کی حالت خراب تھی۔ اسے وہ منظر کیسے بھول سکتا تھا۔

وہ موم بتی لے کر نیچے اترا تو اسے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ وہ سیدھا دروازے کی طرف چل پڑا مگر اس سے پہلے کہ وہ دروازے تک پہنچتا، اسے مسز مارتھا موم بتی تھامے کچن سے باہر نکلتی نظر آئیں۔ کچن چونکہ باہری دروازے کے قریب ہی تھا لہٰذا آنے والے کا سامنا پہلے ان سے ہوا تھا۔

آرتھر نے موم بتی کی روشنی میں آنے والے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ کوئی عورت تھی جس کے لمبے کھلے بال اس کے چہرے پر پڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، مسز مارتھا عین اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

"لڑکی! کون ہو تم اور یہ دروازہ کیسے کھولا تم نے؟" وہ موم بتی اونچی کر کے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگیں مگر اچانک ہی اس عورت نے اپنے ہاتھ آگے کیے تھے اور "کڑچ" کی ایک آواز کے ساتھ مسز مارتھا فرش پر ڈھیر ہو چکی تھیں۔ یہ سب اس قدر اچانک ہوا تھا کہ آرتھر کو کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ وہ عورت اس کارروائی کے فوراً بعد غائب ہو چکی تھی۔ آرتھر ہذیانی انداز میں چلاتا ہوا مسز مارتھا کی طرف بڑھا تھا۔ ان کی گردن پیچھے کی طرف موڑ کر توڑی گئی تھی۔ انہیں شاید پلکیں جھپکانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ ان کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ وہ منظر اس قدر خوفناک تھا کہ آرتھر جیسا مضبوط اعصاب کا بندہ بھی اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔

اگر اس دن الیگزینڈر اس کے ساتھ نہ ہوتا تو شاید وہ کبھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو پاتا۔ الیگزینڈر نے کیا بھاگ دوڑ کی..... ازابیلا کب وہاں آئی..... اس سے کیا تفتیش کی گئی اور مسز مارتھا کے بیٹے کب آئے؟ اسے کچھ خبر نہ تھی۔ ہوش آیا تھا تو آج جب وہ سب کے ہمراہ سیاہ لباس میں سیاہ چھتری تھامے، آنسوؤں اور بارش کے قطروں میں دھندلاتے اس منظر کو جہاں مسز مارتھا کا تابوت قبر میں اتارا جا رہا تھا، اپنی آنکھوں میں مقید کر رہا تھا۔ ازابیلا اور الیگزینڈر اس کے ساتھ ہی کھڑے تھے۔ آج اس کی دوسری ماں بھی اس سے چھین لی گئی تھی۔ وہ بھی اس سفاکی کے ساتھ۔

جس جس نے بھی مسز مارتھا کی لاش دیکھی، وہ خوفزدہ ہو گیا۔ ان کی گردن سیدھی نہیں کی جا سکی تھی اور وہ اسی طرح قبر میں اتار دی گئیں۔

مسز مارتھا کی آخری رسومات کے بعد وہ سب سمیٹری سے باہر نکل آئے۔ مسز مارتھا کے بیٹے، آرتھر سے مل کر ان کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے باقی رشتے دار بھی ایک ایک کر کے روانہ ہو گئے مگر وہ تینوں وہیں کھڑے رہے۔ ازابیلا کے والد اور جینیفر بھی ان کے ساتھ ہی کھڑے رہے۔

Scanned with CamScanner

digest library.com

"آرتھر! تم اپنا سامان لے کر ہمارے گھر منتقل ہو جاؤ۔ میں ایک کمرا تمہارے لیے تیار کروا دوں گا۔" ازابیلا کے والد نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔ وہ جانتے تھے کہ مسز مارتھا کے بیٹے اس گھر کو بیچنا چاہتے ہیں۔

"آپ کا بہت شکریہ..... مگر میں یہ نہیں کر سکتا۔ میں رہائش کا انتظام کر لوں گا۔" آرتھر نے ان کی پیشکش فوراً ہی مسترد کی۔

"میں جانتا ہوں تم کر لو گے مگر میں ایک بیٹے سے محروم ہو جاؤں گا۔ میری بات مان لو، فی الحال جب تک کہیں اور انتظام نہیں ہو جاتا۔" وہ شفقت سے بولے تو جواباً ازابیلا نے بھی اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔ اس لمحے اسے مسز مارتھا سے ہونے والی اپنی آخری گفتگو یاد آئی۔ اس کی آنکھیں ایک بار پھر بھیگنے لگیں۔ اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ الیگزینڈر ہونٹ بھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک تو وہ اپنی کوشش میں ناکام رہا تھا اور دوسری طرف اس نے آرتھر کو ازابیلا کے مزید قریب کر دیا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا تمہیں کہ اپنے مقصد پر توجہ دو۔ جلد بازی تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ دیکھو تم نے کیسا گڑھا کھودا ہے اپنے لیے۔ اس غلطی سے تم سب کی نظروں میں بھی آ سکتے ہو۔" اس کا ہمزاد اسے مسلسل لعنت ملامت کرنے میں مصروف تھا۔

"بکواس بند کرو۔" وہ اندر ہی اندر غرایا۔

"چلو، گھر چلیں۔" ازابیلا نے آرتھر کو مخاطب کیا۔

"آپ لوگ چلیں، میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔" اس وقت وہ کچھ دیر اکیلے بیٹھنا چاہتا تھا۔ ازابیلا کے والد نے اس کی بات سمجھ کر ازابیلا کو اشارہ کیا۔ وہ اپنے والد اور جینیفر کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

"آرتھر! مجھے بھی اجازت دو۔ میں چکر لگاتا رہوں گا۔" ان کے جانے کے بعد الیگزینڈر نے بھی جانے کی اجازت طلب کی۔

"بہت شکریہ الیگزینڈر! اگر تم نہ ہوتے تو میں شاید اپنے حواس کھو دیتا۔ ان تین دنوں میں تم نے میرے اور مسز مارتھا کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ میں تمہارا شکر گزار رہوں گا۔" آرتھر مشکور لہجے میں بولا۔

"یہ تو میرا فرض تھا آرتھر! مجھے بہت افسوس ہے مسز مارتھا کی موت کا۔ تم اپنا خیال رکھو اور خود کو اس کیفیت سے جتنا جلدی ممکن ہو، آزاد کرو۔ وہ بہتر جگہ پر ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ میں ملاقات ہوگی۔" وہ اسے تسلی دے کر آگے بڑھ گیا۔

آرتھر دھندلاتی آنکھوں کے ساتھ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر سڑک پار کر کے سمیٹری کے سامنے موجود پارک میں چلا آیا۔ بارش کی وجہ سے پارک خالی پڑا تھا۔ وہ چھتری تھامے ایک گھنے درخت کے نیچے بنی بینچ کی طرف بڑھ گیا۔ بارش ہلکی ہو گئی تھی۔ اس نے چھتری کو ایک طرف رکھا اور خود اس بینچ پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ شاید اس کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔ اسے سب کی موجودگی میں اس طرح کھل کر رونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ کافی دیر رونے کے بعد اس کے دل کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ اس نے آنسو پونچھے اور اپنی پشت بینچ سے ٹکا لی۔ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونک کر پلٹا۔

فادر تھامس کالے رنگ کا رین کوٹ پہنے اس کے پیچھے کھڑے تھے۔ وہ اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"فادر! آپ..... یہاں؟" وہ حیرت سے بولا۔

فادر کے پیچھے ہی ان کے دو مددگار بھی موجود تھے۔ وہ دونوں بھی رین کوٹ پہنے ہوئے تھے۔

"بیٹھو۔" انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنے مددگاروں کو وہاں سے تھوڑا دور جا کر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ مددگار کچھ دور رکھی بینچ کی طرف چل پڑے۔

وہ خاموشی سے ان کے ساتھ ہی اس بینچ پر بیٹھ گیا۔

"مجھے افسوس ہوا مسز مارتھا کے بارے میں سن کر۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔ جواباً آرتھر نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"اس طرح کے کیسز میرے پاس ہی آتے ہیں۔ ان کی لاش کے طبی معائنے کے وقت میں جراح کے ساتھ ہی تھا۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ رسومات کے وقت متاثرین کے خاندان کو پریشان نہ کریں لہٰذا میں ان کی تدفین کا انتظار کر رہا تھا۔ تم نے اچھا کیا جو کھل کر رو لیے۔ اس سے دل اور دماغ پر پھیلی دھند چھٹ جاتی ہے اور ہر منظر واضح ہو جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم میرے سوالات کے جواب دینے کے قابل ہو چکے ہو۔" وہ سنجیدگی سے بولے تو جواباً آرتھر نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"کیسے کیسز؟ مگر میں تو صرف ان کا کرائے دار تھا۔ ان کے بیٹے موجود ہیں یہاں۔ میں آپ کی ان سے ملاقات کروا سکتا ہوں فادر!" آرتھر بولا۔

"ایسی اموات جن میں کسی آسیب کی شمولیت کا شک ہو اور پھر اس نے پہلی بار اس علاقے کا رخ کیا ہو تو اس

Scanned with CamScanner

کیس میں میری شمولیت ضروری ہو جاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان کی موت کے وقت تم ان کے ساتھ موجود تھے، نہ کہ ان کے بیٹے۔ میں کافی دیر سے آس پاس موجود تھا، بس سب کے جانے کا انتظار کر رہا تھا اور تمہیں تھوڑا وقت بھی دینا چاہتا تھا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

"جی، آپ پوچھیں جو پوچھنا چاہتے ہیں۔" وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"تم نے اپنے بیان میں یہ کہا ہے کہ وہ کوئی عورت تھی۔ قانون ساز ادارے اس عورت کی تلاش میں ہیں اور مسز مارتھا کی گردن پر بھی نکیلے ناخنوں کے نشانات ملے ہیں مگر میں اور تم یہ بات جانتے ہیں کہ وہ کوئی عورت نہیں تھی۔ کیا تم اس آسیب کا حلیہ بتا سکتے ہو؟" وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"اس کا قد لمبا تھا اور لمبے کالے بالوں نے اس کے چہرے کو ڈھک رکھا تھا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں دیکھ سکا۔" آرتھر یہ بول کر خاموش ہو گیا۔

"یہ باتیں تو تم نے دورانِ تفتیش بھی بتائی ہیں مگر میں کچھ اور جاننا چاہتا ہوں۔ تم ایگزارسزم کی تعلیم حاصل کر رہے ہو اور پہلا پڑاؤ پار کر چکے ہو۔ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ تم منفی توانائی کی پہچان کر سکتے ہو پھر تم نے اس کی آمد کو محسوس کیوں نہیں کیا؟" وہ بولے۔

"میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ مجھے ایک ہی وجہ سمجھ آئی ہے اور وہ یہ کہ میرے ساتھ بچپن سے ایسے واقعات ہوتے ہیں اور ان دنوں میں جس کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا، اس میں موجود آسیب مجھے وقتاً فوقتاً اپنی جھلک دکھانے آتے رہے۔ شاید یہ میری ہی وجہ سے ہوا ہے۔" آرتھر نے خود کو موردِ الزام ٹھہرایا۔

"کیا ہوتا ہے بچپن سے اور کون سی کتاب ہے وہ؟" فادر تھامس اس کی بات سن کر چونک پڑے۔

جواباً اس نے بچپن میں پیش آنے والے واقعات اور اس کتاب کے بارے میں تمام تفصیلات اور اس سے جڑے واقعات ان کے گوش گزار کر دیے۔

"ہم..... مگر ابھی تم نے کہا کہ جس آسیب کے بارے میں تم پڑھتے ہو، وہی تمہیں اپنی جھلک دکھانے آتا ہے۔ تو کیا تم اس عورت کے بارے میں پڑھ رہے تھے؟" فادر تھامس معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔

"نہیں..... میں نے ایسے کسی آسیب کے بارے میں نہیں پڑھا اور اس دن مجھے کوئی منفی توانائی محسوس تک نہیں ہوئی تھی۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"کیا میں وہ کتاب دیکھ سکتا ہوں؟ اور تمہارے کمرے کا جائزہ بھی لینا چاہتا ہوں۔" فادر تھامس بولے۔

"جی..... ابھی؟ مگر اب وہاں مسز مارتھا کے بیٹے موجود ہیں۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"ہاں، ابھی۔ ان سے اجازت لینا میرا کام ہے۔ چلو، ان کے گھر تک میری راہنمائی کرو۔" وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

آرتھر فادر تھامس اور ان کے مددگاروں کے ہمراہ چرچ کی بگھی میں سوار ہو کر مسز مارتھا کے گھر پہنچا۔ ان کے بیٹوں سے افسوس کرنے اور اجازت طلب کرنے کے بعد وہ آرتھر کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ اس رات کے بعد گھر نہیں لوٹا تھا اور چرچ میں ہی سو رہا تھا۔ آج رات تک اسے ویسے بھی یہ کمرا خالی کر دینا تھا۔ اس کا سامان جوں کا توں پڑا تھا۔

فادر تھامس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ آرتھر نے جلدی سے آگے بڑھ کر فرش پر بچھا بستر سمیٹ لیا اور میز پر رکھی کتاب فادر تھامس کو تھمائی۔

ان کے مددگار کمرے کا تفصیلی جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ فادر تھامس کتاب کھول کر دیکھنے لگے۔

"آپ بیٹھیں، فادر!" آرتھر نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ہم..... اس کتاب میں تو ایسے کسی آسیب کا ذکر نہیں جو انسان کی گردن مروڑ دیتا ہو۔ کتاب میں جگہ جگہ ناخنوں کے نشانات ہیں جو کہ غیر انسانی ہیں جس کا مطلب یہی ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ مگر یہ تمہیں نقصان پہنچانے نہیں آتے رہے بلکہ اپنی جھلک دکھا کر غائب ہوتے رہے۔ وجہ یہی ہے کہ تم بچپن میں اس تجربے سے گزر چکے ہو تو ایک طرح سے تم ان کے مدار میں داخل ہو چکے ہو۔ تمہاری تعدد (فریکوئنسی) ان کی تعدد (فریکوئنسی) سے مل جائے تو وہ تمہیں نظر آ جاتے ہیں۔ حیرت ہے کہ تب بھی تمہیں اس عورت کی آمد محسوس کیوں نہ ہو گی۔ اب تو مسئلہ زیادہ گمبھیر ہو چکا ہے۔" وہ کتاب بند کر کے ہونٹ کاٹتے ہوئے بولے۔

آرتھر نے کندھے اچکائے۔ اس کا دماغ تو ویسے ہی تین دن تک سن رہا تھا اور نہ وہ خود ان معاملات پر غور کرتا۔

"فادر! کمرا ٹھیک ہے بالکل۔" اچانک ان کے ساتھ آنے والے مددگار بولے۔

"ٹھیک ہے۔ تم باقی گھر کا جائزہ لو۔" وہ انہیں

Scanned with CamScanner

digest library.com

ہدایت دے کر پلٹے اور اچانک ان پر نظر پڑی۔

"یہ بلسٹرم نے ابھی لپیٹ کر اوپر رکھا ہے؟ تم اس دن زمین پر کیوں سو رہے تھے؟ کیا تمہارے کمرے میں بیڈ موجود ہے؟" وہ آرتھر سے بولے۔ ان کے مددگار کمرے سے باہر جا چکے تھے۔

"فادر! اس رات الیگزینڈر بھی میرے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ بیڈ پر سو رہا تھا۔" آرتھر نے عام سے انداز میں اس کا ذکر کیا مگر فادر تھامس کے لیے یہ بات عام نہیں تھی۔

"الیگزینڈر؟ وہی جو اوّل درجے پر آیا ہے؟ وہ کیوں آیا تھا یہاں؟ میرا مطلب، کوئی خاص وجہ؟" انہوں نے بھی عام انداز اختیار کرلیا۔

"میں نے اسے رکنے کو کہا تھا۔ ازابیلا کے گھر ہماری دعوت تھی اور جہاں الیگزینڈر رہتا ہے، وہاں رات دیر تک کے لیے آسانی سے سواری نہیں ملتی۔ لہٰذا وہ دعوت کے بعد یہاں رک گیا تھا۔" آرتھر بولا۔

"ایسی کون سی جگہ ہے یہاں جہاں سواری نہ ملتی ہو؟ خیر، اگر وہ یہاں تھا تو اس نے بھی کچھ محسوس نہیں کیا؟ یہ کیسے طالب علم تیار کر رہے ہیں ہم جو پہلے درجے پر آکر بھی مثبتی اثرات کو محسوس نہیں کر پاتے؟" وہ بے یقینی سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"نہیں فادر..... آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ وہ تو بہت قابل ہے۔ آپ کو یاد ہے، آپ نے ایک لیکچر کے دوران پیٹر بیلسفیلڈ کا ذکر کیا تھا جنہوں نے مشہور کتاب Confessions of Warlocks and Witches لکھی تھی۔ وہ الیگزینڈر کے پڑکھوں میں سے ہیں۔ شاید دادا کے پردادا..... ان کا خاندان تو برسوں سے اس ریسرچ پر کام کر رہا ہے اور اسی کو لے کر آگے بڑھ رہا ہے۔" آرتھر بولا تو فادر تھامس یہ سن کر بری طرح چونکے۔

"کیا.....؟ تمہیں یہ بات کس نے بتائی؟" وہ سنجیدگی سے بولے۔

"خود الیگزینڈر نے..... بلکہ وہ تو ایگزارسزم پریکٹسز کا حصہ بھی رہا ہے۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں لیکچر کے بعد اس کے گھر چلا کروں تاکہ میں بھی اس ریسرچ سے مستفید ہو سکوں مگر افسوس کہ میں جا نہیں سکا۔ مسز مارتھا یہاں موجود نہیں تھیں اور وہ اپنے گھر کی ذمے داری میرے حوالے کر کے گئی تھیں۔ میں نے سوچا تھا ان کے آنے کے بعد اور امتحانات سے فارغ ہو کر ضرور جاؤں گا۔" آرتھر افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

فادر تھامس ایک دم سے خاموش ہو گئے۔

الیگزینڈر ریڈنگ وہ نہیں تھا جو نظر آتا تھا۔ انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ آرتھر کو وہ منفی اثرات یا تو ابھی یوں محسوس نہیں ہوئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ الیگزینڈر ایگزارسزم پریکٹسز کا حصہ ہونے کی وجہ سے آرتھر سے زیادہ تجربہ کار تھا اور دوسری اہم بات یہ کہ جب وہ ایگزارسزم کرتا جاتا تھا اتنی وسیع معلومات [illegible] نوٹ میں داخلے کر یہ سب سیکھنے کے پیچھے کیا مقاصد ہو سکتے تھے۔ پیٹر بیلسفیلڈ کا خاندان کوئی عام خاندان نہیں تھا۔ دنیا بھر میں اس خاندان کے لوگ آکلٹ سائنسز کے حوالے سے مختلف مناصب پر فائز رہے تھے اور سب ہی اپنے میدان میں ماہر تھے مگر الیگزینڈر کی شخصیت اس لیے بھی مشکوک ہو چکی تھی کہ اس نے اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح شہرت اور عہدوں سے دوری اختیار کی اور خود کو کم علم ظاہر کر کے اس چیز کی تعلیم حاصل کر رہا تھا جو خون بن کر ان کی رگوں میں دوڑتی تھی۔

پیٹر بیلسفیلڈ کے خاندان کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ آکلٹ سائنس اور اس کے حوالے سے لی گئی ریسرچ کا ایک بڑا حصہ ان کے خاندان کی کوششوں پر ہی مشتمل تھا۔ درحقیقت آکلٹ سائنس ان کی جاگیر تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس ریسرچ کے کئی مخفی حصے بھی تھے جن تک صرف اسی خاندان کے افراد کی رسائی تھی۔

"ہمم..... متاثر کن۔ چلو، اب ہمیں اجازت دو۔ یہاں تو ایسا کچھ نہیں جس کی وجہ سے مشکوک ہوا جائے۔ مجھے امید ہے کہ کل سے تم انسٹی ٹیوٹ میں حاضر ہو گے۔ دو دن کی غیر حاضری کے دوران تم نے اہم لیکچرز چھوڑ دیے ہیں۔ بہرحال یہ لیکچرز تو تمہیں دوبارہ مل جائیں گے مگر اب ہم ایگزارسزم پریکٹسز کی طرف بڑھ رہے ہیں تو تم تینوں کا حاضر رہنا ضروری ہے۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولے اور الیگزینڈر کا ذکر گول کر دیا۔

"جی فادر! میں کل سے حاضر رہوں گا۔" وہ فرمانبرداری سے بولا۔

"اور ہاں، ہماری اس ملاقات اور گفتگو کا ذکر تم نے کسی سے بھی نہیں کرنا۔ میں اسی لیے سیمٹری میں بھی سب کے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے تو آرتھر نے ان کی بات سمجھ کر سر ہلا دیا۔

ان کے جانے کے بعد آرتھر نے اپنا سامان سمیٹا اور مسز مارتھا کے بیٹوں سے آخری ملاقات کر کے ازابیلا کے

Scanned with CamScanner

گھر چلا آیا۔ اسے وہ کمرا اور گھر کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ وہ وہاں زیادہ رکنا نہیں چاہتا تھا۔

ازابیلا کے والد نے اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا اور اسے اس کا کمرا دکھایا۔ وہ یہاں آ تو گیا تھا مگر جانتا تھا کہ اس کا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ اس نے ارادہ کرلیا تھا کہ آنے والے ہفتے میں وہ اپنے لیے کہیں اور رہنے کا انتظام کرلے گا۔ اتنی جلدی دوسری جگہ ملنا ناممکن تھا، تب تک اس کا یہیں رہنا بہتر تھا۔ اس کے آنے سے ازابیلا بہت خوش تھی اور اس کا خاص خیال رکھ رہی تھی۔ اسے مسز مارتھا سے کی گئی باتیں یاد تھیں۔ وہ ازابیلا کے جذبات کو محسوس کرنے لگا۔ اسے جیون ساتھی کی نظر سے دیکھنے لگا۔ یہ جذبات اس کے لیے بھی نئے تھے لہٰذا وہ کوئی فیصلہ لینے سے پہلے خود کو وقت دینا چاہتا تھا اور پھر خود ہی ازابیلا کا ہاتھ مانگ لیتا۔

اس نے اگلے ہی دن سے انسٹی ٹیوٹ جانا شروع کردیا۔ ازابیلا اور وہ ایک ساتھ ہی جاتے تھے مگر واپسی پر وہ الیگزینڈر کے ساتھ رک جاتا کیونکہ ان کے ذمے اب فادر تھامس کے کاموں کی ذمے داری بھی تھی۔

وہ انتظامیہ سے تمام معلومات لے کر ان کے لیکچرز کا نظام الاوقات تیار کرتے، ان کی کتابوں کو ترتیب دیتے اور ان کے ضروری کاغذات کی نقل تیار کرنے بیٹھ جاتے۔

انہیں بہت کچھ سیکھنے کو مل رہا تھا۔ انہیں یہ ذمے داری نبھاتے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ فادر تھامس اپنے کام سے کام رکھنے والے استاد تھے۔ وہ ان دونوں کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارتے تھے۔ بس، اگلے لیکچر کا وقت دیکھتے، انہیں کاغذات نقل کے لیے دیتے اور ضروری ہدایات دے کر کمرے سے چلے جاتے مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ فادر تھامس خاموشی سے الیگزینڈر کا مشاہدہ کررہے تھے۔ وہ ان کی نظروں کے حصار میں تھا مگر وہ ان کی سوچ سے زیادہ محتاط تھا۔

ایک ہفتہ گزرنے کے باوجود بھی اس نے اپنی طرف سے انہیں شک و شبے کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ اگر انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے مسز مارتھا کی لاش نہ دیکھی ہوتی تو شاید وہ بھی الیگزینڈر پر شک نہ کرتے اور پھر آرتھر سے گفتگو کے دوران الیگزینڈر کو لے کر ان پر جو انکشافات ہوئے تھے، وہ خطرے کی گھنٹی بجا رہے تھے مگر وہ محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور تھے۔

بالآخر وہ دن آ ہی گیا جب انہیں ایگزارسزم کے تجربے کے لیے فادر تھامس کے ساتھ جانا تھا۔ فادر تھامس نے تین طالب علموں کا انتخاب کرنا تھا۔ باقی سب کی باری بھی کسی نہ کسی دن آ ہی جاتی۔ اسکاٹ لینڈ کے آس پاس کئی گاؤں، دیہات موجود تھے جہاں سے ہر دوسرے تیسرے دن کسی نہ کسی کے آسیب زدہ ہونے کی خبر چرچ پہنچتی تھی۔ لوگ توہم پرست تھے اور پاکی ناپاکی کے طریقوں سے ناواقف تھے۔ سہولیات کا فقدان تھا تو نہانا دھونا بھی انہیں مشقت کی طرح لگتا تھا۔ ایسی صورت میں کوئی شیطان ان پر قبضہ کرلیتا اور چرچ سے رابطہ کیا جاتا۔ یہ آگہی بھی ان کے لیے کافی تھی ورنہ ان سے پہلے گزرے بڑے بوڑھے تو متاثرہ شخص کو جلانے کی تجویز دیتے تھے اور چرچ کو مطلع کیے بغیر ایسا کیا بھی جاتا رہا تھا مگر جب سے قانون ساز اداروں نے سختی کرنا شروع کی تو لوگوں نے اس عمل کو دہرانے سے پرہیز کرنا شروع کردیا تھا ورنہ اس عمل میں شامل تمام افراد کو چوک پر لٹکا کر کوڑے برسائے جاتے تھے۔ وہ اس سخت سزا سے ڈرنے لگے تھے۔

اکثر افراد آسیب کے بجائے بیماری کا شکار ہوتے تھے۔ چرچ کے خدمت گار تشخیص کے بعد انہیں خود ہی طبیب کے پاس لے جاتے اور اگر معاملہ آسیب کا ہی نکلتا تو چرچ کو خط لکھ کر ایگزارسسٹ کو طلب کیا جاتا۔

اس بار بھی انہیں ایک قریبی گاؤں سے کسی چڑیل کے آسیب کے قبضے کی اطلاع ملی تھی اور یہ ذمے داری فادر تھامس کو سونپی گئی تھی۔ وہ تمام طالب علموں کو تو ساتھ لے کر نہیں جاسکتے تھے ورنہ متاثرہ شخص کے کمرے میں رش لگ جاتا۔ لہٰذا وہ اپنے مددگاروں کی صورت میں آکلٹ سائنسز کے طالب علموں میں سے کسی تین کا انتخاب کرتے تھے تاکہ وہ یہ تجربات اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور سیکھیں۔ اس طرح سب کی باری آجاتی تھی۔

اس بار انہوں نے الیگزینڈر، آرتھر اور نکولس کا انتخاب کیا۔ نکولس امتحان میں دوسرے درجے پر آیا تھا اور ہوشیار لڑکا تھا۔

وہ تینوں فادر تھامس کے ساتھ علی الصباح ہی چرچ کی بگھی میں سوار ہوکر مطلوبہ گاؤں کے لیے روانہ ہوچکے تھے۔ تین گھنٹے پر محیط اس طویل سفر کے دوران فادر تھامس نے انہیں تمام احتیاطی تدابیر سے آگاہ کردیا تھا تاکہ وہاں پہنچ کر وقت ضائع نہ ہو اور نہ ہی ان تینوں سے ایگزارسزم کے دوران کوئی بیوقوفی سرزد ہو۔ اس دوران معمولی سی غلطی بھی متاثرہ شخص اور مددگاروں کے لیے جان لیوا ثابت

Scanned with CamScanner

digest library.com

ہو سکتی تھی۔ وہ تینوں ان کی باتیں ذہن نشین کرتے رہے اور خود کو ذہنی طور پر تیار کرتے رہے۔

بالآخر وہ اس گاؤں میں پہنچ چکے تھے جہاں متاثرہ شخص کے موجود ہونے کی اطلاع ملی تھی۔ چرچ کی بگھی متاثرہ شخص کے گھر کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ وہاں اس گاؤں کے چرچ کے فادر پہلے سے فادر تھامس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ وہ تینوں فادر تھامس کے ساتھ بگھی سے نیچے اتر آئے۔

گاؤں کے چرچ کے فادر، فادر تھامس کو متاثرہ شخص کے حالات سے آگاہ کر رہے تھے تاکہ اندر جانے سے پہلے ان کے پاس تمام اہم معلومات موجود ہوں۔ وہ تینوں ایک طرف خاموش کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد فادر تھامس نے انہیں اندر چلنے کا اشارہ کیا اور وہ تینوں فادر تھامس کی پیروی میں متاثرہ شخص کے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔

یہ لکڑی کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا جھونپڑی نما گھر تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی سامنے میز اور کرسیاں رکھی تھیں جہاں ایک پریشان حال عورت بیٹھی تھی اور اس کے ساتھ ایک چھ سالہ بچی بھی موجود تھی۔ ان کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک غریب خاندان ہے۔

"یہ متاثرہ شخص کارٹر کی بیوی ہے۔" گاؤں کے چرچ کے فادر نے اس عورت کا تعارف کروایا تھا۔ فادر تھامس اس سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ اس کے مطابق اس کا شوہر روزانہ جنگل میں بھیڑیں چرانے جاتا تھا مگر تین دن پہلے جب وہ لوٹا تو اس کی حالت خراب تھی اور آہستہ آہستہ اس کی حالت مزید بگڑتی چلی گئی۔ طبیب نے اس کی حالت دیکھ کر چرچ سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا تھا اور چرچ کے مددگاروں نے فوراً ہی ایگزارسسٹ کو طلب کر لیا تھا۔

فادر تھامس نے دھیان سے اس عورت کی تمام باتیں سنیں اور پھر ان تینوں کو اپنے ساتھ اس کمرے میں آنے کا اشارہ کیا جہاں وہ شخص موجود تھا۔ گاؤں کے چرچ کے فادر بھی ان کے ساتھ ہی اس کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ شخص اپنے بستر سے بندھا ہوا تھا اور شاید اس وقت بے ہوش تھا۔ اس کے پاس سے انتہائی شدید بو اٹھ رہی تھی جو اس بات کا ثبوت تھی کہ اس پر واقعی شیطان کا قبضہ ہے۔ وہ تینوں اس طاقتور منفی اثر کو محسوس کر سکتے تھے۔ ان تینوں نے فادر کی دی گئی ہدایات کے مطابق مقدس پانی کی بوتلیں اور پاکٹ سائز بائبل نکال کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیں۔

فادر تھامس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی بائبل کھول کر

استعمال

چند ریٹائرڈ کاروباری حضرات نے علاقے کی ایک چلتی ہوئی شراب کی دکان خریدی اور نئے سرے سے اس کی تزئین و آرائش کے لیے اسے بند کر دیا۔ کافی دن تک یہی معمول رہا کہ وہ دکان میں آتے، دروازے، کھڑکیاں بند رہتیں اور اندر سے کھٹر پٹر کی آوازیں آتی رہتیں۔ آخر کار آوازیں آنا بھی بند ہو گئیں مگر دکان کھلنا شروع نہیں ہوئی۔ ایک روز متوقع گاہکوں کی بے تابی بڑھ گئی اور وہ ہجوم کی صورت میں دکان کے سامنے جمع ہو گئے۔ کسی نے دروازہ بھی کھٹکھٹا دیا۔ چند لمحے بعد کھڑکی کھلی اور ایک ریٹائرڈ بزنس مین نے ناگواری سے باہر جھانکا۔

"جناب! دکان کب دوبارہ کھلے گی؟" مجمعے میں سے کسی نے بہ آوازِ بلند پوچھا۔

"تم سے کس نے کہا کہ یہ دوبارہ کھلے گی؟" بزنس مین نے بیزاری سے کہا۔ "یہ تو ہم نے اپنے لیے خریدی ہے۔"

(مرسلہ: ملک اسلم، لاہور)

آتش فشاں پہاڑ

اس وقت دنیا میں زندہ آتش فشاں پہاڑوں کی کل تعداد 1343 ہے جن میں سے بیشتر آتش فشاں سمندر کی تہ میں لاوا اگل رہے ہیں۔ آتش فشاں پہاڑوں کی سب سے زیادہ تعداد انڈونیشیا میں پائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں دو سو سے زائد آتش فشاں پہاڑ واقع ہیں۔

(مرسلہ: ناہید یوسف، اسلام آباد)

بیس منٹ

گائڈ نے عمارت کے کھنڈرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک دس بج کر دس منٹ پر خوفناک زلزلہ آیا اور چاروں طرف کی عمارتیں تباہ ہو گئیں۔"

"لیکن یہ عمارت کیسے بچی؟" ایک خاتون نے حیرت سے سوال کیا۔

"اس کے ٹاور کی گھڑی بیس منٹ آگے تھی۔" گائڈ نے جواب دیا۔

(مرسلہ: عمران علی، فیصل آباد)

Scanned with CamScanner

پڑھنا شروع کی اور گاؤں کے چرچ کے فادر نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

اس بے ہوش شخص کے جسم میں حرکت کے آثار پیدا ہوئے اور تھوڑی ہی دیر بعد اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ان آنکھوں میں شیطان کی شبیہ تھی۔ وہ فادر تھامس کو دیکھ کر خباثت سے مسکرایا۔

''تم باز نہیں آتے نا، تھامس! تمہارا بہت ذکر ہوتا ہے ہماری محفلوں میں۔'' وہ شخص غیر انسانی آواز میں بولا۔

''پھر بھی تم سب ہمت کر کے موت کا سامنا کرنے آجاتے ہو۔'' فادر تھامس نے اس کی بات کا جواب مسکراتے ہوئے دیا۔

وہ شخص بھیانک آواز میں قہقہے لگانے لگا۔

''تمہیں لگتا ہے کہ تم میرا خاتمہ کر سکتے ہو؟ میں ان میں سے نہیں جو تمہارے قابو آجاتے تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس بار تم موت کا سامنا کر رہے ہو۔'' وہ غرایا۔

''تم سے پہلے آنے والے بھی یہی مذاق کرتے تھے۔ لگتا ہے تمہاری برادری کے پاس لطیفے ختم ہو گئے ہیں۔'' فادر تھامس کے لہجے میں اطمینان ہی اطمینان تھا اور چہرے پر گہری مسکراہٹ۔

ان کی بات سن کر اس شیطان کو آگ ہی تو لگ گئی۔ وہ حملہ کرنے کے لیے ان کی طرف بڑھا مگر زنجیروں میں قید ہونے کی وجہ سے ناکام رہا۔

فادر تھامس اپنی جگہ جمے کھڑے رہے۔ اس پر اسے مزید طیش آیا اور اس نے اپنا منہ کھول کر ایک گندی الٹی ان کی طرف اچھالی۔ وہ تیزی سے اس کے سامنے سے ہٹ گئے مگر الٹی ان کے پیچھے کھڑے نکولس کو بھگو گئی۔

گاؤں کے چرچ کے فادر فوراً آگے بڑھے اور نکولس کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ اس کی ناپاکی اس کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر وہ شیطان کا رڈ کا جسم چھوڑتا تو نکولس کے کپڑوں پر لگی نجاست کی وجہ سے اس پر بھی حاوی ہو سکتا تھا۔ ایگزارسزم کا یہ اصول سب کو پتا تھا، لہٰذا گاؤں کے چرچ کے فادر لمحے کی دیر کیے بغیر نکولس کو کمرے سے لے کر نکل چکے تھے تاکہ وہ خود کو اچھی طرح صاف کر لے۔ نکولس چونکہ ابھی ماہر ایگزارسسٹ نہیں بنا تھا لہٰذا اس کی حفاظت ضروری تھی۔

''وہی پرانے پینترے۔ لطیفوں کے ساتھ یہ کرتب بھی پرانے ہو چکے ہیں۔ تم سے اچھے تو سرکس کے بندر ہیں۔ ارے، تم دونوں نے سرکس دیکھا ہے؟''

فادر تھامس بات کرتے ہوئے اطمینان سے الیگزینڈر اور آرتھر کی طرف پلٹ کر ان سے سوال کرنے لگے۔ ان دونوں نے حیرت سے نفی میں سر ہلایا۔ ایگزارسزم کے دوران بھلا اس بات کا کیا ذکر؟ وہ شیطان بھی خاموش ہو کر فادر تھامس کو دیکھنے لگا۔

''فلپس ایسٹلے نامی ایک شخص نے آج سے پانچ سال پہلے یعنی 1768ء میں لندن میں سرکس نامی تفریحی تھیٹر تشکیل دیا جہاں مختلف کرتب دکھائے جاتے ہیں۔ ضرور دیکھنا، بہت مقبول ہو رہا ہے۔ اس جیسے کئی کرتب دکھانے والے تمہیں وہاں بھی ملیں گے۔ لوگ انہیں دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں۔ آنے والے دور میں یہ سرکس نامی تفریح بہت مشہور ہو گی۔'' فادر تھامس استہزائیہ لہجے میں بولے۔

ان کی بات مکمل ہوتے ہی وہ شیطان پوری قوت سے چلایا اور خود کو زنجیروں سے آزاد کر لیا۔

فادر تھامس نے ان دونوں کو اشارہ کیا اور وہ دونوں تیزی سے بائبل کے مخصوص صفحات باآواز بلند پڑھنا شروع ہو چکے تھے۔

''تمہیں میں کرتب دکھانے والا لگتا ہوں نا؟ چلو، تمہیں تمہاری موت کا کرتب دکھاتا ہوں۔'' وہ ایک ہی جست میں فادر تھامس پر سوار ہو گیا۔

آرتھر تیزی سے آگے بڑھا اور اس شخص کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس شیطان نے اپنا ہاتھ گھمایا تو آرتھر اڑتا ہوا کمرے میں رکھی الماری سے جا ٹکرایا۔

اب وہ شیطان فادر تھامس پر سوار ہو کر ان کا گلا دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''فادر..... فادر تھامس.....! اسے جہنم واصل کریں۔'' الیگزینڈر چلایا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے فادر تھامس کی زبان پر تالا لگ چکا ہو۔ وہ کچھ بول کیوں نہیں رہے تھے؟ یہ شیطان اتنا طاقتور تو نہیں تھا جو وہ اس کا مقابلہ نہیں کر پا رہے تھے۔

اس کے جملے سن کر وہ شیطان الیگزینڈر کی طرف متوجہ ہوا۔

''ٹھہرو، پہلے میں تمہارا انتظام بھی کر دوں۔'' وہ فادر تھامس کو چھوڑ کر الیگزینڈر کی طرف بڑھا۔

الیگزینڈر اپنی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس جیسے بہت سوں سے نمٹ چکا تھا اور اب جبکہ وہ خود شیطان کا شکار

Scanned with CamScanner

digest library.com

تھا تو اس کا ڈرنا بنتا ہی نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر فادر تھامس پر اور دوسری آرتھر پر ڈالی۔ وہ دونوں شاید بے ہوش ہو چکے تھے۔

وہ شیطان اس کے قریب پہنچ کر اچانک ٹھٹکا۔

"تم.....!" وہ الیگزینڈر کو پہچان چکا تھا۔ اس نے پہلے کہ وہ اس کی شناخت کے حوالے سے کوئی بکواس منہ سے نکالتا، الیگزینڈر نے اسے گردن سے دبوچ کر خود سے قریب کرلیا۔

"یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ اور دوبارہ مجھے نظر نہ آنا ورنہ تمہارے بیوی بچوں کو مسخ کر کے تمہیں ہمیشہ کے لیے قید کروادوں گا۔" وہ اس شیطان کی آنکھوں میں دیکھ کر دانت پیستے ہوئے سرگوشی سے بولا اور اسے دیوار سے دے مارا۔ وہ آدمی گر کر بیہوش ہو چکا تھا۔

الیگزینڈر تیزی سے فادر تھامس کی طرف بڑھا اور مقدس پانی چھڑک کر انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ ہوش میں آتے ہی اٹھ بیٹھے۔ الیگزینڈر اب آرتھر کی طرف بڑھ گیا جس کے جسم میں حرکت کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ اسے ہوش دلا کر وہ دوبارہ فادر تھامس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا جو اٹھ کر کھڑے ہو چکے تھے۔

"یہاں کیا ہوا ہے؟" وہ حیرانی سے بولے۔

"فادر! آپ نے ہی تو اسے جہنم واصل کیا ہے۔ یہ آپ پر حملہ کر رہا تھا تو آپ نے اسے ایک جھٹکے سے اچھالا اور یہ دیوار سے جا ٹکرایا اور پھر آپ نے اسے نکلنے کا حکم دیا تو یہ بائبل کی ان مقدس آیات کی تاب نہ لا پایا اور دفعان ہو گیا۔" فادر تھامس اس کی بات سن کر سر کھجانے لگے۔ بہرحال وہ شیطان اس شخص کے جسم کو چھوڑ کر جا چکا تھا۔ فادر تھامس نے تمام احتیاطی اقدامات مکمل کیے اور ڈاکٹر کی بیوی کو کچھ ہدایات دے کر ان کے ہمراہ واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

"تم تینوں بگھی والے کو اپنے اپنے گھر کا راستہ سمجھا دو۔ ہم تمہیں گھر پہنچا کر واپس چرچ چلے جائیں گے۔ اسکاٹ لینڈ پہنچنے تک کافی رات ہو چکی ہوگی۔" اچانک فادر تھامس بولے۔

آرتھر اور نکولس نے بگھی والے کو مطلوبہ راستہ سمجھانا شروع کر دیا مگر الیگزینڈر خاموش بیٹھا رہا۔

"کیا ہوا الیگزینڈر؟ تم راستہ نہیں سمجھا رہے؟" فادر تھامس نے اس سے پوچھا۔

"جی فادر! آپ مجھے چرچ کے پاس ہی اتار دیجیے گا۔ میں وہاں سے خود چلا جاؤں گا۔ میرے گھر کا راستہ تھوڑا مشکل ہے۔ بگھی وہاں تک نہیں جا سکے گی۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کا ہر وہ طالب علم جو میرے ساتھ سفر کرتا ہے، میری ذمے داری ہے اور میں اسے خود اس کے گھر تک چھوڑتا ہوں۔" فادر تھامس بولے۔

"نہیں فادر! آپ کو بلاوجہ تکلیف ہوگی۔ میں چلا جاؤں گا۔" وہ شپٹا گیا۔

"نہیں، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تم بگھی والے کو اپنے گھر کا راستہ سمجھاؤ۔" وہ اٹل لہجے میں بولے تو مجبوراً الیگزینڈر نے بگھی والے کو راستہ سمجھانا شروع کر دیا۔ جو راستہ وہ سمجھا رہا تھا، اس کے مطابق اس کا گھر سب سے پہلے آتا لہٰذا بگھی والے نے بگھی کو اسی راستے پر ڈال دیا مگر مطلوبہ جگہ پہنچنے پر وہ سب حیران رہ گئے۔ وہ قدرے ویران سا جنگل نما علاقہ تھا جہاں سے ایک کچا پکا راستہ جنگل کے اندر تک جا رہا تھا۔

فادر تھامس نے بگھی سے سر باہر نکال کر دیکھا۔

"کہاں ہے تمہارا گھر؟ یہاں تو سارا جنگل ہے۔" وہ حیرانی سے بولے۔

"جی فادر! میں نے کہا تھا نا کہ میرے گھر کا راستہ تھوڑا کٹھن ہے۔ آگے کچا راستہ ہے۔ بگھی وہاں تک نہیں جا پائے گی۔ یہاں سے میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ آپ کا بہت شکریہ۔" الیگزینڈر فوراً ہی بگھی سے اتر گیا۔ وہ بگھی کے واپس جانے تک اسی راستے پر کھڑا رہا۔ بالآخر بگھی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

فادر تھامس نے دیکھا کہ جب تک بگھی اسے نظر آتی رہی، وہ اسی راستے پر کھڑا رہا تھا۔ انہوں نے آرتھر اور نکولس کو ان کے گھروں تک چھوڑا اور پھر چرچ کے بجائے سیدھا انسٹی ٹیوٹ چلے آئے۔ رات گہری ہو چکی تھی اور انسٹی ٹیوٹ میں بس پہرے دار ہی گھوم رہے تھے۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں آئے اور طالب علموں کے متعلق معلومات کے رجسٹر اٹھا کر ان کا جائزہ لینے لگے۔ وہ الیگزینڈر کے گھر کا پتا معلوم کرنا چاہتے تھے۔

بالآخر ان کی نظر اس کے نام پر پڑی۔ اس کے نام کے آگے ہی بنے کے خانے میں ایک غیر معروف سے علاقے کا نام تحریر تھا جس سے وہ انجان تھے۔

"گھر نمبر 4۔" انہوں نے اس کے گھر کا نمبر دہرایا اور اسے ذہن نشین کر لیا۔ رجسٹر بند کر کے وہ آفس میں ہی

Scanned with CamScanner

اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور کرسی کی پشت سے اپنا سر ٹکا لیا۔ آج ان کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ وہ ایگزارسزم کے دوران بے ہوش نہیں ہوئے تھے بلکہ بے ہوش ہونے کا ناٹک کر کے ایگزیبنڈر کی اصلیت جاننا چاہتے تھے۔ ایگزیبنڈر یقیناً کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ اس کے ایک دفعہ کہنے پر وہ شیطان، وکٹر کے جسم کو چھوڑ کر وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ یقیناً وہ ایگزیبنڈر سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ معاملہ اتنا عام نہیں تھا جتنا وہ سمجھ رہے تھے۔ ان کا سامنا شیطان کے بہت اہم پیروکار سے ہونے والا تھا۔ اس کا مقصد جاننا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ نیکی اور بدی کی جنگ شروع ہونے والی تھی۔

☆☆☆

Year 1773

قاہرہ۔ مصر

عیاد کے کمرے کا دروازہ زور زور سے بج رہا تھا۔ وہ تہجد ادا کرنے کے بعد اپنے کمرے میں رکھی اس کتاب کو کھول کر بیٹھ گیا۔ اتنا تو اسے سمجھ آ ہی گیا تھا کہ یہ کتاب اس تک پہنچائی گئی ہے اور اسے نہ چاہ کر بھی کوئی ذمے داری سونپی جا رہی ہے مگر ذمے داری کی تفصیل بیان نہیں کی گئی تھی۔ یہ شمس المعارف کا نادر اور اصل نسخہ تھا جو شاید ابو عباس البونی نے اپنے ہاتھوں سے تحریر کیا تھا۔ اس میں کچھ ایسی معلومات بھی تھیں جو انتہائی نایاب اور حساس نوعیت کی تھیں۔ اگر یہ کتاب کسی غلط انسان کے ہاتھ لگ جاتی تو یقیناً وہ اس کتاب سے بے انتہا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ جہاں وہ اس کتاب کے ملنے پر پریشان تھا، وہیں اس کتاب کا جائزہ لینے کے بعد اسے خوشی بھی ہو رہی تھی کیونکہ یہ کتاب تو علوم کا مجموعہ تھی۔ اس کی زندگی بھر کی پڑھی گئی ساری کتابیں ایک طرف اور اس کتاب میں موجود معلومات ایک طرف تھیں۔ پڑھتے پڑھتے اسے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ فجر کا وقت ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ نماز کے لیے نیت باندھتا، کسی نے دروازے پر دستک دینا شروع کی اور پھر اس دستک میں تیزی آتی گئی۔

وہ پہلے والی دستک کو نہیں بھولا تھا اور دوبارہ کسی سفر پر نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک سفر کا نتیجہ تو وہ شمس المعارف کی صورت میں دیکھ چکا تھا۔ اس نے چند لمحے توقف کے بعد کھڑکی سے باہر جھانکا اور یوسف کو باہر کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

اس نے کتاب کو احتیاط سے کپڑوں کی الماری میں چھپایا اور آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

"عیاد! کہاں رہ گئے تھے تم؟ میں کب سے دروازہ بجا رہا تھا۔" یوسف تیزی سے کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی اور وہ خوفزدہ نظر آتا تھا۔

"میں بس نماز کے لیے نیت باندھنے ہی لگا تھا..... کیا ہوا، تم ٹھیک تو ہو؟" وہ اس کی حالت دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"پانی..... پانی پلاؤ پہلے۔" وہ پھولی سانسوں کے ساتھ اس کے کمرے میں موجود کرسی پر بیٹھ گیا۔

عیاد نے جلدی سے پانی کا گلاس بھر کر اسے تھمایا۔ وہ ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر گیا۔

"اب بتاؤ گے کہ کیا ہوا ہے؟" عیاد اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ..... دجال..... میں نے تمہیں بتایا تھا نا اس کے بارے میں۔ وہ ابھی مجھے ملا تھا۔" یوسف خوفزدہ لہجے میں بولا۔

"ملا تھا..... مطلب؟ کیا اس نے تم سے کوئی بات کی؟" عیاد نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہاں، میں فجر کی نماز کے لیے مسجد جا رہا تھا اور وہ مجھے گلی میں مل گیا۔ اس نے میرے قریب آ کر کہا کہ عیاد سے کہو، اس لڑکی سے دور رہے۔ شکر ہے کہ اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ جیسے ہی وہ وہاں سے گیا، میں سیدھا تمہارے پاس چلا آیا۔" یوسف نے روانی سے ساری بات اس کے گوش گزار کر دی۔

"کیا اس نے تم سے اور بھی کچھ کہا؟" عیاد کو یوسف کی بات سن کر حیرانی ہوئی تھی۔ نہ جانے وہ شخص اس لڑکی کے پیچھے ہی کیوں پڑ گیا تھا اور عیاد کو کیوں اس سے دور رہنے کا کہہ رہا تھا۔ اس کا الیرا سے کیا لینا دینا تھا؟ صاف ظاہر تھا کہ وہ الیرا کی طرف اشارہ کرتا تھا کیونکہ عیاد نے کبھی کسی اور لڑکی کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔

"نہیں، بس یہی کہا۔ عیاد! وہ تمہارے اور الیرا کے بارے میں کیسے جانتا ہے؟ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دے۔" یوسف کے لہجے میں عیاد کے لیے فکرمندی جھلک رہی تھی۔ عیاد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تم اس بات کی فکر مت کرو۔ مجھے خود سے زیادہ الیرا کی فکر ہے کیونکہ وہ شخص بار بار یہی بات کرتا ہے۔" عیاد بولا تو اس کی بات سن کر یوسف بھی چونک پڑا۔

"کیا مطلب، اس نے کسی اور سے بھی یہ بات کی ہے؟" یوسف حیرت سے بولا۔

"ہاں، اب سے کچھ دن پہلے وہ میری کھڑکی کے قریب آ کر بھی یہی بات کہہ کر گیا تھا۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے

Scanned with CamScanner

digest library.com

وہ المیرا کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ نیل نے مجھے بتایا تھا کہ المیرا یہاں کے کسی امیر کی بیٹی ہے تو ظاہر ہے اس طرح کا شخص اس کا رشتے دار تو نہیں ہوسکتا اور مجھے وہ شخص کافی مشکوک اور خطرناک لگتا ہے۔" عیاد نے یوسف کو تفصیل سے آگاہ کیا۔

"عیاد! یہ آدمی بہت خطرناک ہے۔ سارا قاہرہ اس سے خوف کھاتا ہے۔ تم المیرا سے دور رہو۔ ایسا نہ ہو اس کے چکر میں وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچادے۔" یوسف بولا۔

"چاہے جتنا بھی خطرناک ہو، مجھے اس سے ڈر نہیں لگتا۔ ہاں، مگر اس کی سچائی جاننا اب ضروری ہوگیا ہے۔ تم فکر مت کرو، میں بہت جلد اس کی سچائی تک پہنچ جاؤں گا۔ چلو، ایک ساتھ مسجد چلتے ہیں۔ نماز پڑھ کر وہیں سے مکتب چلے جائیں گے اور ناشتا بھی ادریس کے سرائے میں کریں گے۔" عیاد اپنی طرف سے بات ختم کرکے مسکرایا۔ یوسف کو بھی تھوڑا سا اطمینان ہوا۔

ان دونوں نے ایک ساتھ نماز ادا کی اور ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد مکتب آگئے۔ عیاد کی بے چین نظروں کو اب المیرا کا انتظار تھا۔ وہ ناراض ہوکر گئی تھی اور نیل کے مطابق وہ اداس بھی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ المیرا کی محبت کو قبول کرکے اس کے سامنے اقرار کرلے گا۔ یہ سوچ ہی اتنی سرشار کردینے والی تھی کہ اسے ہر چیز اچھی لگ رہی تھی۔

المیرا جس مضمون کو پڑھنے کے لیے آتی تھی، اس سے پہلے ایک اور مضمون کی جماعت لگتی تھی۔ اس نے جلدی جلدی اس جماعت کو نمٹایا اور ایک بار پھر سے خوشبو کا اہتمام کرکے اپنے بال سنوارے اور یوسف کے ساتھ بیٹھ کر اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

المیرا جب سے واپس لوٹی تھی، مسلسل خاموش تھی۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ کسی بھی وقت رو دے گی۔ حلیمہ نے محسوس تو کیا تھا مگر خاموش رہی۔ وہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا انتظار کررہی تھی۔

اس نے رات کا کھانا کھانے سے بھی انکار کردیا تھا اور اپنے کمرے میں بند ہوگئی تھی۔ حلیمہ کے لیے صبورہ نے کچھ کام لگائے تھے لہٰذا وہ جلدی جلدی ان کاموں کو نمٹانے لگی تاکہ المیرا کے سونے سے پہلے اس سے بات کرسکے۔ آخر ایسی کیا بات ہوئی تھی جو المیرا اتنے غصے میں مکتب سے باہر نکلی تھی؟ وہ تو کوئی اہم سوال پوچھنے کے لیے

تیری دید سے تسلی تو ہو نہ سکی ہماری

مکتب میں رکی تھی۔

المیرا کسی کو اپنے دل کا حال کیا سناتی، اسے تو خود پر غصہ آرہا تھا۔ اگر اس کے دل میں واقعی عیاد کے لیے محبت کے جذبات پنپنے لگے تھے تو اسے کیا ضرورت تھی خود سے اظہار کرنے کی۔ عیاد کے رویے کی وجہ سے اسے شدید خفت کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر ہی کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ "ہاں" یا "نہ" تو دور کی بات، اس نے تو شاید اس کی بات کو اہمیت دینا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ المیرا، جس کے لیے مصر کا ہر امیر نکاح کا پیغام بھیجنے کے لیے بے چین رہتا تھا، وہ اتنی بے وقعت ہوگئی تھی کہ اس کے خود اظہار کرنے کے باوجود بھی اس کی محبت کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔

اس وقت بھی وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی انہی سوچوں میں گم تھی۔ اس کا دل بے حد اداس تھا۔ رات ہوتے ہی قاہرہ کے بازاروں کی روشنیاں پوری آب و تاب سے چمکنے لگی تھیں۔ اس کی نظروں نے ان روشنیوں کا احاطہ کیا۔ اسی بازار کے بیچوں بیچ عیاد کا وہ مکتب بھی تھا جہاں داخل ہوتے وقت اسے بالکل بھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنی سب سے قیمتی چیز وہیں چھوڑ آئے گی۔ اس کی آنکھوں

Scanned with CamScanner

سے بے اختیار ہی آنسو بہہ نکلے۔ وہ شام سے ان آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اب لگتا تھا کہ ان پر بند باندھنا بیکار ہے۔

اسے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ وہ کس کے لیے رو رہی ہے اور کیوں رو رہی ہے۔ عیاد کے لیے؟ جس نے اس کی محبت کو شاید ٹھکرا دیا تھا اور اسے یہ غم اتنا شدید لگ رہا تھا کہ اس کا دل یکدم ہی ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

اسی لمحے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے۔

"آجائیں۔" وہ اپنی بھیگی آواز پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

حلیمہ دودھ کا گلاس لیے اندر داخل ہوئی۔ اس نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا لہٰذا صبورہ نے اس کے لیے دودھ کا گلاس بھیجا تھا۔

"المیر! دودھ پی لیجیے۔ آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔" حلیمہ نے اسے پکارا۔ وہ اس کی طرف پشت کیے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

"میرے بستر کے سرہانے رکھ دو۔ میں سونے سے پہلے پی لوں گی۔ جاتے ہوئے دروازہ بند کر دینا۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی مگر حلیمہ اس کی بھرائی ہوئی آواز سن کر چونک پڑی۔ اس نے جلدی سے دودھ کا گلاس ایک طرف رکھا اور اس کے قریب چلی آئی۔

"المیر! کیا ہوا، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ پریشانی سے بولی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس مجھے کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دو۔" یہ جملہ مکمل کرتے ہی وہ دوبارہ سے رو پڑی۔ حلیمہ پریشان ہو گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر جلدی سے اس کے کمرے کا دروازہ بند کیا۔

"المیر! کیا ہوا ہے؟ آپ مجھے بتائیں۔ کسی نے آپ کو پریشان کیا ہے کیا؟ میں خبر لوں گی اس کی۔" وہ فکرمندی سے بولی۔

شاید المیر اکو اسی ہمدردی کی تلاش تھی۔ اس وقت اسے رونے کے لیے کوئی کندھا چاہیے تھا اور حلیمہ کی صورت میں اسے وہ کندھا مل گیا تھا۔ وہ اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ حلیمہ مزید پریشان ہو گئی مگر اس نے اسے رونے دیا۔ اس طرح اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا اور شاید وہ اسے کچھ بتانے کے قابل ہو جاتی۔

جب اس کے رونے میں کچھ کمی آئی تو حلیمہ اسے ساتھ لگائے اس کی مسہری تک چلی آئی اور اسے مسہری پر بٹھا کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ المیر اکا دل بھی ہلکا ہو گیا تھا لہٰذا اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے اپنے آنسو پونچھے۔

"اب مجھے بتائیں کہ کیا ہوا ہے؟" حلیمہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں جو بتاؤں گی اس پر تم یقین نہیں کرو گی اور نہ ہی تمہیں میری بات سمجھ آئے گی۔ لہٰذا بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" وہ بیزاری سے بولی۔

جب عیاد نے ہی اس کی محبت سے انکار کر دیا تو وہ کسی اور کو کیا کہتی۔

"ہو سکتا ہے میں اس مسئلے کا کوئی حل بتا دوں اور آپ نے ایسے کیسے سوچ لیا کہ میں آپ کی بات پر یقین نہیں کروں گی؟ میرے آپ تو اچھی طرح جانتی ہوں۔ شاید آپ ہی مجھے پرایا سمجھتی ہیں۔" وہ ناراضگی سے بولی۔

"ایسی بات نہیں ہے مگر میرے اوپر جو گزری ہے، میں اسے خود بھی سمجھنے سے قاصر ہوں۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"اکیلے کڑھنے سے بہتر ہے کہ آپ اپنی اس پریشانی میں کسی کو شریک کریں۔ یوں اکیلے خود کو جلانے سے اور رونے سے تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" حلیمہ بولی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر....." المیر اسوچ میں پڑ گئی۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔ آپ مجھے بتائیں تو سہی کہ کیا بات ہے؟ ہم مل کر اس مشکل کا حل نکال لیں گے۔" حلیمہ نے اسے یقین دلایا۔ وہ تھوڑی دیر کشمکش سے اسے دیکھتی رہی اور پھر گہری سانس لے کر خود کو تیار کرنے لگی۔

حلیمہ صحیح کہہ رہی تھی۔ اس وقت اسے ایک دوست کی ضرورت تھی جس سے وہ اپنے دل کا حال کہہ سکے۔ یہ بات ایسی نہیں تھی جو وہ اپنی سہیلیوں کو بتاتی لہٰذا اس نے حلیمہ کو ہی بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

"حلیمہ! مجھے عیاد سے محبت ہو گئی ہے۔" اس نے بغیر کسی تمہید کے یہ الفاظ ادا کیے تھے مگر حلیمہ کے کانوں میں یہ الفاظ گرم سیسے کی طرح انڈیلے گئے۔

"کیا.....؟ کیا مطلب؟" حلیمہ کو لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

"میں کہہ رہی ہوں کہ مجھے عیاد ایب سے محبت ہو گئی ہے اور میں نہیں جانتی کہ یہ کب اور کیسے ہوا۔ دل پر تو کسی کا اختیار نہیں ہوتا نا۔ میں بہت دنوں تک خود سے جنگ لڑتی رہی اور بالآخر آج مجبور ہو کر میں نے ان سے اقرار کر دیا۔"

شاید المیر اکو احساس بھی نہیں تھا کہ اس کے یہ الفاظ

Scanned with CamScanner

digest library.com

حلیمہ کے لیے کس قدر تکلیف دہ تھے۔ وہ تو عیاد کی محبت میں پور پور ڈوب چکی تھی۔ اس نے ارادہ کرلیا تھا کہ المیرا کے نکاح کے بعد بھی وہ اس مکتب میں تعلیم جاری رکھے گی اور کل کی ملازمت چھوڑ دے گی۔

عیاد سے اس کا نکاح ہوگا اور قاہرہ میں ان کا چھوٹا سا خوبصورت سا گھر ہوگا۔ حلیمہ میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ وہ خوبصورت تھی، نوجوان تھی اور سلیقہ مند بھی تھی۔ عیاد کے مکتب میں وہ ہمیشہ پردے میں جاتی تھی مگر اس نے ارادہ کرلیا تھا کہ کل کی ملازمت چھوڑنے کے بعد وہ باقی لڑکیوں کی طرح چہرے کا حجاب کیے بغیر ہی مکتب جایا کرے گی۔ اس کا حسن دیکھ کر عیاد ضرور اس کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ اسے تو بس المیرا کے نکاح کا انتظار تھا مگر یہاں تو المیرا، عیاد سے اپنی محبت کا اقرار کر چکی تھی۔

"اقرار.....؟ اور ان کا جواب؟" حلیمہ کو اپنی آواز گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

"انہوں نے تو میری بات کا جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا۔ انہیں شاید احساس بھی نہیں ہے کہ کوئی ان سے کتنی محبت کرنے لگا ہے۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو چکی ہوں حلیمہ! مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ میں کیا کر رہی ہوں..... کیوں کر رہی ہوں۔" المیرا نے اپنا سر تھام لیا۔

"آپ غلط کر رہی ہیں المیرا!" وہ سنجیدگی سے بولی۔

المیرا نے سر اٹھا کر اسے بے یقینی سے دیکھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں، آپ غلط کر رہی ہیں۔ آپ کی نسبت یونس سے طے ہو چکی ہے۔ کچھ ہی عرصے میں آپ دونوں نکاح کے بندھن میں بندھنے والے ہیں۔ کوئی آپ کے خواب اپنی آنکھوں میں سجائے آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ فرض کریں کہ اگر وہ آپ کی محبت کو قبول کر بھی لیتے ہیں تو اس میں آپ کا اور ان کا، دونوں کا ہی نقصان ہے۔ آپ تو نکاح کے بندھن میں بندھ کر یہاں سے چلی جائیں گی مگر استادِ محترم کا کیا ہوگا؟ اس عارضی محبت کا کیا ہوگا پھر؟ آپ اپنی والدہ اور والد کو کیا جواب دیں گی؟" حلیمہ کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔

اسے یہ اطمینان تو ہو گیا تھا کہ عیاد نے المیرا کی محبت سے انکار کر دیا ہے مگر المیرا کو بھی ہوش دلانا ضروری تھا۔

"میں نے تمہیں یہ بات اس لیے نہیں بتائی تھی کہ تم مجھے صحیح غلط کی تمیز سکھانا شروع کر دو۔ میں تم سے اپنے دل کا حال کہہ رہی ہوں۔ میرا ان جذبات پر کوئی اختیار نہیں۔ میں خود کو مجبور محسوس کرتی ہوں اور جیسا میں عیاد کے لیے محسوس کرتی ہوں، ایسا میں نے یونس کے لیے کبھی بھی محسوس نہیں کیا۔ ابھی میری نسبت طے ہوئی ہے، نکاح نہیں ہوا ہے۔ نسبت ختم بھی ہو سکتی ہے۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

"جب عیاد ہی آپ کی محبت کو قبول نہیں کر رہے تو پھر نسبت ختم کرنے کی بات ہی کیوں کر رہی ہیں آپ؟" حلیمہ کو اس کے لہجے سے ڈر لگا تھا۔

کیا وہ واقعی یونس سے اپنی نسبت ختم کرنے والی تھی؟ مگر حلیمہ کو یہ اطمینان تو تھا کہ عیاد، المیرا میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا ہے۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ یہ کیسی آزمائش ہے۔" وہ دوبارہ رونے لگی اور حلیمہ اسے تسلی دینے لگی مگر درحقیقت اسے اب المیرا سے کوئی ہمدردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

المیرا کے پاس سب کچھ تھا۔ وہ نازوں میں پلی تھی۔ حسب نسب، دولت، حسن، تعلیم اور اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ کا ساتھ بھی..... مگر وہ پھر بھی حلیمہ سے اس کی خوشیاں چھیننا چاہتی تھی۔ اسے جو ملا تھا اس پر بھی وہ خوش نہیں تھی۔ اسے اور زیادہ چاہیے تھا۔

حلیمہ نے پہلی دفعہ اپنے لیے کوئی خواب دیکھا تھا۔ وہ یہ ملازمت چھوڑ کر ایک پرسکون زندگی گزارنا چاہتی تھی مگر المیرا نے تو سب کچھ تباہ کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔

"آپ کچھ دن آرام کریں اور مکتب نہ جائیں۔ سکون سے اس بارے میں سوچیں..... خود کو وقت دیں۔ یہ فیصلے اس طرح نہیں لیے جاتے کہ آپ کو کل محبت ہوئی اور آج آپ نے اظہار کر دیا اور کل ان کو بھی ہو جائے گی۔ آپ کا تعلق ایک عزت دار اور امیر خاندان سے ہے۔ عیاد ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے استاد ہیں۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ آپ کے والد اس رشتے کے لیے راضی ہو جائیں گے؟ اور یہ سوال تو تب آتا جب آپ کی کہیں نسبت نہ طے ہوئی ہوتی۔ آپ کو یونس کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔ وہ رشتہ بھی آپ کی مرضی سے ہی طے ہوا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کسی اور جذبے کو محبت کا رنگ دے رہی ہیں۔" حلیمہ نے اسے سمجھانے کی بھرپور کوشش کی۔ اب المیرا کا مکتب نہ جانا ہی بہتر تھا۔ اس کے دل سے یہ خیال خود بخود ہی نکل جاتا۔

المیرا خاموشی سے اسے سنتے لگی۔ اس کی باتیں کسی حد تک ٹھیک بھی تھیں۔ تو کیا اسے واقعی مکتب نہیں جانا چاہیے تھا؟

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ویسے بھی ان کے انکار کے بعد مجھے مکتب جانا ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے خود سے

Scanned with CamScanner

اظہار کرنے غلطی کررہی ہے۔" وہ حلیمہ کی باتیں سن کر کشمکش میں پڑ گئی۔

"آپ نے بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے۔ دودھ پیجیے اور سکون سے سو جائیں۔ جتنا سوچیں گی اتنا آپ کا ذہن الجھے گا۔" وہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ المیرا اس کی باتوں کو سوچتے ہوئے دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے کہنے سے تو یہ سوچیں اس کے ذہن سے نکلنے والی نہیں تھیں۔ تکیے پر سر رکھتے ہی عیاد دوبارہ سے اس کی سوچوں پر حاوی ہوگیا۔

کاش! وہ "ہاں" یا "نہ" کا جواب تو دیتا۔ اس طرح اسے نظر انداز تو نہ کرتا۔ اسے اپنا نظر انداز کیا جانا بے طرح کھل رہا تھا۔ اس کی پوری رات آنکھوں میں کٹی۔ بالآخر سورج نکل آیا۔ اس نے فجر کی نماز ادا کی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ ایک بار پھر آنسو بے اختیار ہو کر اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ اس نے اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے سکون اور خوشی مانگی۔

ناشتے کی میز پر اس کی صبورہ سے ملاقات ہوئی تو اس نے طبیعت خرابی کا بہانہ کر کے کتب جانے سے انکار کر دیا۔ اسے حلیمہ کی باتیں ٹھیک لگ رہی تھیں یا شاید وہ عیاد کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ویسے بھی چند ہی دن رہ گئے تھے۔ اس کے بعد یہ مضمون مکمل ہو جاتا اور وہ کتب کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیتی۔ یہ سوچ ہی بہت جان لیوا تھی۔ اس کے بعد شاید وہ عیاد کو دوبارہ کبھی نہ دیکھ پاتی۔ وہ کتب تو نہیں گئی مگر سارا دن بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہلتی رہی۔ اسے ایک پل کو چین نہیں مل رہا تھا۔ بالآخر اس نے پریشان ہو کر حلیمہ کو ہی بلوا بھیجا۔ اب چونکہ وہ اس راز کو جان چکی تھی تو کم از کم وہ حلیمہ سے بات کر کے اپنے دل کا بوجھ تو ہلکا کر سکتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور حلیمہ کے بجائے فاخرہ اندر داخل ہوئی۔

"میں نے حلیمہ کو بلوایا تھا، تمہیں نہیں۔" المیرا اسے دیکھ کر بولی۔

"جی مگر وہ تو کتب گئی ہیں۔" فاخرہ مؤدب لہجے میں بولی۔

"کتب گئی ہے..... کیا مطلب؟ میں تو کتب نہیں گئی۔ اسے جانے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ حیرت سے بولی۔

"جی، آپ کی طبیعت خراب تھی مگر ان کا کہنا تھا کہ اگر وہ نہ گئیں تو تعلیم کا حرج ہوگا۔ انہوں نے جانے سے پہلے خانم صبورہ سے اجازت لی ہے۔" فاخرہ بولی۔

المیرا نے اسے کمرے سے جانے کا اشارہ کیا۔

"حیرت ہے۔ حلیمہ اسے بتائے بغیر چلی گئی تھی اور وہ بھی اکیلے۔"

اسے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"شاید وہ مجھے پریشان نہیں کرنا چاہتی ہوگی۔" اس نے خود کو تسلی دی اور اب اسے بے چینی سے حلیمہ کا انتظار تھا تاکہ وہ اس سے عیاد کا حال جان سکے۔

☆☆☆

طالب علم ایک ایک کر کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ یوسف اس کی بے قراری سے اچھی طرح واقف تھا۔ آج تو نیل بھی وقت سے پہلے آچکا تھا۔ وہ اپنے دوست کی زندگی کے سب سے اہم دن پر اس کے ساتھ موجود رہنا چاہتا تھا۔

اچانک کتب کے سامنے المیرا کی بگھی آکر رکی۔ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ نیل نے مسکرا کر گلا کھنکھارا۔ عیاد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی مگر اس نے فوراً ہی اپنی مسکراہٹ پر قابو پایا۔

مگر یہ کیا؟ اندر تو صرف حلیمہ ہی داخل ہوئی تھی اور وہ عیاد پر نظر ڈال کر سیدھا جماعت کی طرف بڑھ گئی تھی۔ عیاد وہیں کھڑا المیرا کا انتظار کرتا رہا مگر یہ انتظار طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر یوسف نے ہی باہر جا کر المیرا کو دیکھنے کا فیصلہ کیا مگر بگھی بالکل خالی تھی۔

"عیاد! وہ نہیں آئی۔" یوسف نے آکر اسے مطلع کیا اور اسے ایسا لگا جیسے اس کا بہت بڑا نقصان ہو گیا ہو۔

"ناراض کر دیا نا تم نے اسے۔ میں نے کہا تھا نا وہ کل رات بہت اداس تھی۔" نیل افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

وہ بجھے دل سے جماعت میں داخل ہوا اور معمول کے مطابق سب کو پڑھانا شروع کر دیا۔ جماعت ختم ہوئی تو سب ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔

"بات سنیں۔" اس نے نہ چاہ کر بھی حلیمہ کو پکارا۔

"جی، آپ نے مجھے پکارا؟" وہ حیرانی سے پلٹی۔

آج عیاد نے پہلی دفعہ اسے خود سے پکارا تھا۔ اس کے قدم خوشی سے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے اس تک آئی۔

"امید ہے آپ کو مضمون اچھی طرح سمجھ آرہا ہوگا۔"

عیاد کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے کس طرح المیرا کے بارے میں معلوم کرے۔ وہ المیرا کے لیے کسی قسم کی مشکل نہیں کھڑی کرنا چاہتا تھا، نہ وہ اس لڑکی کا المیرا سے رشتہ

Scanned with CamScanner

digest library.com

جاننا تھا مگر آنکھوں کے ذریعے دلوں کو پہچاننا ضرور تھا۔

''جی، آپ ایک بہت اچھے استاد ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں آپ کی طالب علم ہوں۔'' وہ خوشی سے بولی۔ آج الیرا ساتھ نہیں تھی تو بالآخر عیاد نے اسے پکار ہی لیا تھا۔ یعنی وہ الیرا کی وجہ سے اس سے بات کرنے سے جھجکتا تھا۔ شاید وہ بھی اس کی محبت کو محسوس کر چکا تھا۔

''آں..... وہ..... آپ اکیلی جائیں گی؟ میرا مطلب ہے آپ کے ساتھ آپ کی سہیلی ہوتی ہیں نا؟'' عیاد کو اس طرح کے اوٹ پٹانگ سوال کرنے پر خود پر غصہ بھی آرہا تھا۔

''جی، آج میں اکیلی آئی ہوں تو اکیلی ہی جاؤں گی۔ ان کی طبیعت خراب تھی، اس لیے وہ نہیں آسکیں لیکن آپ فکر نہیں کریں۔ میری بچی باہر ہی کھڑی ہے۔ مجھے اکیلے جانے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔'' وہ جلدی سے بولی۔ عیاد کو اس کے اکیلے جانے کی فکر تھی، اس کے لیے تو یہی بہت تھا۔

''جی، ٹھیک ہے۔'' عیاد یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی اسے تکتی رہی اور پھر اجازت لے کر باہر نکل گئی۔

''تمہارے سوال اس لڑکی کو خوش فہمی میں مبتلا کررہے تھے۔'' نیل نے فوراً ہی اس کا بھانڈا پھوڑا۔

''فضول باتیں مت کرو۔ میں نے اس سے ایسے کوئی سوال نہیں کیے جو وہ خوش فہمیاں پالے۔ میں بس اس سے کسی طرح الیرا کے بارے میں معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ کیوں نہیں آئی۔'' وہ اداسی سے بولا۔

''تم کہتے ہو تو میں معلوم کرآتا ہوں۔'' نیل بولا۔

''نہیں۔ تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ تمہیں کسی لڑکی کی تنہائی میں مخل ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اخلاقی طور پر بھی ٹھیک نہیں ہے۔'' عیاد نے اسے سرزنش کی۔

''ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ یہ کہہ کر ہوا میں تحلیل ہوگیا۔

عیاد کا سارا دن بہت ہی بوجھل گزرا تھا۔ صرف الیرا کے نہ آنے سے یہ دن کتنا خالی اور بیکار لگ رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ الیرا اس کے لیے اتنی اہم ہوچکی ہے۔ شاید اس کی یہ غیر حاضری عیاد کے لیے اس بات پر یقین کی مہر ثبت کرگئی تھی کہ وہ بھی اس کی محبت میں گرفتار ہوچکا ہے۔

☆☆☆

حلیمہ محل واپس لوٹی تو ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اسے پیغام ملا کہ الیرا اسے بلا رہی ہے۔ پہلے تو اس کا دل کیا کہ

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی
شمارہ دسمبر 2025ء
کی جھلکیاں

رومان پرور
ساجدا امجد کے قلم سے شاعر رومان کا تذکرہ

شاہکار حکمت
زویا صفوان کی سحر انگیزی،
ایک بڑے مسلم سائنسدان کا احوال

شکست عشق
سہیل پرواز جیسے پختہ قلم کار کی دلچسپ خودبیتی

ماں جائی
زاہد نسیم کے جادو اثر قلم کا شہکار

وفا گزیدہ
فرح انیس کا زور قلم، نہایت دلچسپ سچ بیانی

ان کے علاوہ
جان بچا ایک بے وطن نوجوان کی فسوں خیز داستان۔ قاتل حسینہ اسرائیل کی خونخوار دوشیزہ کی حیرت انگیز کتھا۔
بورے والا ایکسپریس معروف کرکٹر کا تذکرہ

اور بھی بہت کچھ جسے آپ پڑھنا چاہتے ہیں..... آپ کو پڑھنا چاہیے

یہ شمارہ بہت خاص ہے، ضرور ملاحظہ کریں

Scanned with CamScanner

وہ نہ جائے مگر وہ ملازمت کی وجہ سے مجبور تھی۔ وہ بے دلی سے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ المیرا اسے دیکھ کر بے قراری سے اس کی طرف بڑھی۔

"تم مجھے بتائے بغیر چلی گئیں؟ خیر..... ادھر بیٹھو۔ بتاؤ آج کیا کیا ہوا؟" وہ اشتیاق سے بولی۔

"مجھے لگا میرا حرج نہ ہو اس لیے چلی گئی تھی۔ ایسا تو کچھ بھی خاص نہیں ہوا۔ بس جماعت ختم ہوتے ہی میں گھر واپس آ گئی۔" حلیمہ نے اس سے جھوٹ بولا۔

"اور عیاد.....! کیا انہوں نے میرے بارے میں دریافت کیا؟" وہ اُمید بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"وہ بھلا آپ کے بارے میں کیوں دریافت کریں گے؟ آپ کو ان کا جواب مل چکا ہے۔ آپ کو ان کا خیال اپنے دل سے نکال کر یونس کے ساتھ اپنے رشتے پر دھیان دینا چاہیے۔" حلیمہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

المیرا اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی۔ یعنی عیاد کے دل میں اس کے لیے کوئی جذبات نہیں تھے۔ وہ رات بھر سوچتی اور روتی رہی۔ اس نے دوسرے دن مکتب جانے کا فیصلہ کر لیا۔ خیر حاضر ہو کر بھی اس کو کون سا چین مل جانا تھا۔ جتنے دن رہ گئے تھے، کم از کم وہ تو انہیں دیکھتے ہوئے گزارے جا سکتے تھے۔

دوسرے دن جب وہ مکتب کے لیے تیار ہو کر نیچے اتری تو حلیمہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"آپ مکتب جا رہی ہیں کیا؟ آپ کو کچھ دن آرام کرنا چاہیے۔" وہ فوراً ہی آگے بڑھی۔

"آرام کر کے بھی میں کیا کر لوں گی؟ ویسے بھی چند ہی دن رہ گئے ہیں۔ میری تعلیم کا بھی حرج ہوگا۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر ناشتا کرنے میں مصروف ہو گئی۔ حلیمہ خاموشی سے ناشتا لگانے لگی۔ صبورہ کے سامنے وہ اور کہہ بھی کیا سکتی تھی۔

ان کی بگھی مکتب کے سامنے رکی۔ وہ حلیمہ کے ساتھ اندر داخل ہوئی تو عیاد، یوسف سے باتوں میں مصروف تھا۔ المیرا کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ تو بالآخر وہ آ گئی تھی۔

وہ عیاد کو نظر انداز کر کے سنجیدگی سے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

یوسف نے شرارت سے عیاد کو دیکھا۔

"یہ موقع ضائع مت کرنا۔" یوسف بولا تو عیاد ہنس پڑا۔

"میری مدد کی ضرورت ہے؟" نیل بھی ماہر ہوا۔

"بس کرو تم دونوں۔ اگر ضرورت ہوئی تو میں خود آواز دے دوں گا۔ ویسے اس کے ساتھ ہر وقت اس کی سہیلی موجود ہوتی ہے۔ اگر اس کا کوئی انتظام ہو سکتا ہے تو.....؟"

عیاد نے مدد طلب نظروں سے نیل کی طرف دیکھا۔

"بے فکر رہو۔ بس دیکھ لوں گا۔" نیل مسکرایا۔

عیاد جماعت کی طرف بڑھ گیا۔ طالب علموں کو سمجھاتے ہوئے اس نے بہت دفعہ المیرا پر نظر ڈالی مگر شاید وہ اس سے اب تک ناراض تھی اور اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ جماعت ختم ہوئی تو سب اٹھ کر باہر نکلنے لگے۔ عیاد، المیرا کو روکنا چاہتا تھا مگر حلیمہ کی وجہ سے جھجک رہا تھا۔

"آپ میں سے حلیمہ کون ہے؟" اچانک ایک نقاب پوش خاتون جماعت میں داخل ہوئیں۔

"جی، میں ہوں۔ کہیے کیا کام ہے؟" حلیمہ اس اجنبی خاتون کے منہ سے اپنا نام سن کر حیرت زدہ رہ گئی۔ المیرا نے بھی حیرت سے حلیمہ کو دیکھا۔

"آپ کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ آ سکتی ہیں؟ مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" وہ عورت رازداری سے بولی۔

"جی، مگر مجھے مکتب کے علاوہ کہیں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ کو جو بات کرنا ہے، آپ یہیں کر لیں۔" حلیمہ حیرت سے بولی۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں بھی استادِ محترم کی طالبہ ہوں۔ بس مکتب کے دروازے تک تو چل سکتی ہیں نا؟" وہ عورت عیاد کی طرف دیکھ کر مسکرائی تو عیاد کی ہنسی نکلتے نکلتے رہ گئی۔

وہ نیل تھا جو عورت کا روپ دھارے حلیمہ سے مخاطب تھا۔

جماعت تقریباً خالی ہو چکی تھی اور اب کمرے میں المیرا، حلیمہ، عیاد اور وہ عورت ہی موجود تھے۔

"چلیں آپیں المیرا!" حلیمہ نے اسے چلنے کا اشارہ کر کے المیرا کو پکارا۔

"نہیں، ان کو نہ بلائیں..... مجھے آپ سے اکیلے میں کچھ بات کرنی ہے۔ آپ ان کا یہیں انتظار نہیں کر سکتیں؟ ہم بس باہر ہی کھڑے ہیں۔ دیکھیں، مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ میری درخواست قبول کر لیجیے۔" اس کا اصرار بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

"حلیمہ! تم بات سن لو۔ میں یہیں کھڑی ہوں۔" بالآخر المیرا بول پڑی اور حلیمہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس

Scanned with CamScanner

digest library.com

عورت کے ساتھ باہر نکل گئی۔

اب کمرے میں عیاد اور الیرا ہی موجود تھے۔ الیرا نے اپنا رخ دوسری طرف کرلیا۔

"السلام علیکم!" عیاد نے اپنا گلا کھنکھار کر اسے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" وہ اس کا سلام سن کر چونک پڑی مگر اس کی طرف پشت کیے کھڑی رہی۔

"آپ کل کیوں نہیں آئی تھیں؟" ہمیشہ کی طرح اس کے پاس الفاظ ختم ہوگئے تھے۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔

"وہ..... میں..... میں آپ کے سوال کا جواب دینا چاہتا تھا۔" اس سے پہلے کہ خاموشی مزید لمبی ہوجاتی، عیاد نے ہی بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس کی بات سن کر حیرت سے پلٹی۔

"الیرا! میں اس دن آپ کی بات سن کر گھبرا گیا تھا۔ اظہار کے معاملے میں، میں ہمیشہ سے ہی بہت کورا ہوں۔ یوں تو میرے پاس الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے مگر جہاں بات اظہار کی آتی ہے، میں شدید قلت کا شکار ہوجاتا ہوں۔ مجھے خود کو یقین دلانے میں بہت وقت لگا کہ آپ میرے لیے بہت خاص ہوچکی ہیں کیونکہ میں نے کبھی اس جذبے کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ جس تکلیف سے آپ گزریں، اس کے لیے میری معذرت قبول کیجیے مگر آپ کے جذبات یکطرفہ نہیں ہیں۔ اگر آپ نے پہلا قدم نہ اٹھایا ہوتا تو شاید میں یہ سب کبھی نہ کہہ پاتا۔" وہ لمحے بھر کو رکا اور پھر ان حسین آنکھوں کو دیکھ کر بے خود ہوا۔

"عشق من و خیال تو شد آشنا بہ ہم
پیداست نسبت گل و باد صبا بہ ہم"

(ترجمہ۔ میرا عشق اور تمہارا خیال باہم آشنا ہوگئے۔ گل اور بادِ صبا کی باہمی نسبت ظاہر و واضح ہے)

اس کے پاس الفاظ ختم ہونے لگے تھے۔ وہ اس شعر کے ذریعے اظہار کرکے خاموش ہوگیا۔ الیرا کی آنکھوں میں کئی چراغ جل اٹھے۔ عیاد نے اثبات میں سر ہلا کر اسے یقین دلایا اور وہ شرما کر باہر نکل گئی۔ وہ سرشار سا وہیں کھڑا رہا۔ تو بالآخر وہ بھی اپنا دل کسی کے نام کر چکا تھا۔

وہ باہر نکلی تو نیل نے اسے دیکھ کر حلیمہ کا سر کھانا بند کردیا۔

حلیمہ نے بھی اس عجیب و غریب عورت سے جان چھوٹنے پر شکر ادا کیا اور تیزی سے الیرا کی طرف بڑھی۔

"شکر ہے آپ خود ہی آگئیں۔ اس عورت نے تو میرا سر کھا لیا تھا۔" حلیمہ تیزی سے اس کے ساتھ بگھی کی طرف بڑھ گئی کہ کہیں وہ عورت دوبارہ نہ آجائے۔ نیل نے اسے زچ کرکے رکھ دیا تھا۔

الیرا تو اس وقت کچھ سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اس کے کانوں میں اس خوبصورت شعر کی گونج اب بھی باقی تھی جو اسے عیاد نے سنایا تھا۔ اس قدر خوبصورت اظہار..... وہ اندر تک سرشار ہوگئی تھی۔ حلیمہ نہ جانے کیا کہہ رہی تھی مگر وہ تو جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

عیاد بھی اس کے عشق میں مبتلا تھا۔ کتنا جادوئی احساس تھا یہ..... جیسے عیاد نے اس پر طلسم کردیا ہو۔ اپنی محبت کا طلسم!

بگھی محل کے سامنے رکی تو اسے ہوش آیا۔ راستہ کب اور کیسے کٹا تھا، اسے معلوم ہی نہیں ہوا تھا۔ کاش! یہ راستہ مزید طویل ہوجاتا۔

وہ اس وقت کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہواؤں کے دوش پر صرف اور صرف عیاد کو سوچنا چاہتی تھی۔ وہ حلیمہ کی سنگت میں بگھی سے اتری اور محل کے اندر داخل ہوکر صبورہ سے ملنے کے بجائے سیدھا سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں بند ہوکر عیاد کو سوچنا چاہتی تھی۔

"السلام علیکم!" اچانک اس آواز نے اس کے تیزی سے بڑھتے قدموں کو روکا۔

وہ جلدی سے پلٹی مگر وہاں حیرت کا ایک اور پہاڑ اس پر ٹوٹنے کا منتظر تھا۔ زبیر بن دمام کے ساتھ یونس کھڑا تھا اور زبیر بن دمام اسے ناراض نظروں سے گھور رہے تھے۔

☆☆☆

Year 1773

اسکاٹ لینڈ

فادر تھامس کی بتائی ہوئی مدت پوری ہوچکی تھی اور لیلینا کو اب ان سے ملوانے کے لیے اسکاٹ لینڈ لے جانا ضروری ہوگیا تھا۔ ڈیوڈ اس رات پیش آنے والے واقعے کے بعد قریبی چرچ گیا تھا اور فادر کو اپنے ساتھ رچرڈ کے گھر لے آیا تھا مگر فادر کے مطابق وہاں سب کچھ ٹھیک تھا۔ ان کے بائبل پڑھنے اور مقدس پانی چھڑکنے کے بعد بھی لیلینا نے کسی قسم کا منفی اشارہ نہیں دیا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ اس پر اب بھی کسی قسم کے اثرات باقی ہیں۔ ڈیوڈ نے شکر ادا کیا کہ لیلینا کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں اور شاید اسے ہی کسی بدروح نے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ اس رات کے بعد سے

Scanned with CamScanner

رچرڈ کے گھر میں کوئی انہونا واقعہ پیش نہیں آیا تھا اور وہ سکون کی نیند بھی سوتا رہا تھا۔

آج وہ لیلینا اور رچرڈ کے ہمراہ اسکاٹ لینڈ جا رہا تھا۔ اسے چرچ کی طرف سے اسکاٹ لینڈ انسٹی ٹیوٹ آف آکلٹ سائنسز جانے کی ہدایات ملی تھیں۔ چرچ کے مطابق ان کی ملاقات فادر تھامس سے وہیں ہونا تھی۔

لیلینا پہلی دفعہ اس قصبے سے باہر نکل کر شہری علاقے کی طرف آئی تھی اور بہت شوق سے کھڑکی سے باہر کے نظارے دیکھ رہی تھی۔ بالآخر ایک لمبے سفر کے بعد ان کی بھی اسکاٹ لینڈ انسٹی ٹیوٹ آف آکلٹ سائنسز کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ وہ تینوں ایک ساتھ ہی نیچے اتر آئے۔

لیلینا نے سر اٹھا کر اس عظیم الشان عمارت کو دیکھا جہاں مختلف طالب علم اندر باہر آ جا رہے تھے۔ ڈیوڈ نے وہاں کھڑے دربان کو اپنا نام بتایا تو اس نے اپنے سامنے موجود کاغذات میں سے اس کا نام پڑھ کر ایک آدمی کو اس کے ساتھ روانہ کر دیا جو فادر تھامس کے آفس تک اس کی راہنمائی کرتا۔ وہ اس کی پیروی کرتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ کے اندر داخل ہوئے اور وہاں کی دنیا دیکھ کر حیران رہ گئے۔

وہ شخص فادر تھامس کے آفس پہنچ کر رک گیا اور دروازہ کھول کر انہیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ تینوں اس دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔

"آپ لوگ یہاں بیٹھیں۔ فادر تھامس تھوڑی دیر میں لیکچر ختم کر کے یہیں پر آ جائیں گے۔" وہ شخص یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اچانک دو لڑکے فادر تھامس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے اور ان تینوں کو وہاں بیٹھے دیکھ کر چونک پڑے۔

"جی، آپ کو کس سے ملنا ہے؟" ان میں سے ایک لڑکا آگے بڑھ کر بولا۔

"ہمیں فادر تھامس نے بلایا ہے۔" ڈیوڈ نے اسے مطلع کیا۔

"اوہ اچھا، آپ کو تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔ وہ کچھ دیر میں یہیں آ جائیں گے۔ میرا نام آرتھر ہے اور میں ان کا طالب علم ہوں۔" اس لڑکے نے اپنا تعارف کروایا۔

تعارف کے بعد وہ وہاں رکھے کاغذات کی طرف بڑھ گیا اور انہیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا مگر اس کے ساتھ اندر داخل ہونے والے دوسرے لڑکے کے قدم وہیں جم گئے تھے۔

الیگزینڈر کو اس کی بو آئی تھی۔ وہ اس جگہ جا چکی تھی جہاں وہ سو رہا تھا۔ اس کو بہت کچھ معلوم تھا۔

لیلینا نے اس لڑکے کی نظریں خود پر محسوس کر کے اسے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کے جسم کو اچانک جھٹکا لگا۔ وہ ناخنوں سے کرسی کے ہتھے کو کھرچنے لگی۔

"آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟" الیگزینڈر نے ان سے سوال کیا۔

"ایڈنبرا سے۔ میرا نام ڈیوڈ ہے۔" ڈیوڈ نے اپنا تعارف کروایا۔

لیلینا کے کانوں میں سیٹیاں بجنا شروع ہو چکی تھیں۔

"اور یہ کون ہیں؟ دراصل ہمیں فادر تھامس کی طرف سے ہدایت ہے، جو بھی آئے ہم اس کے بارے میں معلومات لے کر رجسٹر پر لکھ لیں۔" الیگزینڈر بولا تو اس بات پر آرتھر نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اسے تو ایسی کسی ہدایت کے بارے میں علم نہیں تھا۔

"یہ لیلینا ہے۔ رچرڈ کی بیٹی۔ ہم سب ایڈنبرا میں ہی رہتے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا معلومات درکار ہیں آپ کو؟" ڈیوڈ بولا۔

"جی بس اتنی معلومات کافی ہیں۔" الیگزینڈر مسکرا کر کاغذ پر ان کے نام لکھنے لگا اور پھر اس کاغذ کو موڑ کر اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

تھوڑی دیر بعد فادر تھامس کمرے میں داخل ہوئے اور ان تینوں کو وہاں بیٹھا دیکھ کر الیگزینڈر اور آرتھر کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔

وہ دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" آرتھر بولا۔

"ہو سکتا ہے ان کے کوئی مہمان ہوں۔ چلو، میں نکلتا ہوں۔ باقی کام تم دیکھ لینا۔ مجھے آج ذرا جلدی گھر جانا ہے۔" الیگزینڈر یہ کہہ کر تیزی سے باہر کی طرف بڑھ گیا۔

"فادر تھامس سے اجازت تو لے لو۔" آرتھر حیرت سے اسے دیکھنے لگا مگر وہ جواب دیے بغیر ہی جا چکا تھا۔

الیگزینڈر تیزی سے باہر نکلا اور ایک بگھی روک کر اس میں سوار ہو گیا۔ اسے جلد از جلد گھر پہنچنا تھا کیونکہ وہ وہاں سے اپنا سامان سمیٹ کر فوراً ہی ایڈنبرا روانہ ہونے والا تھا۔

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمز شناس کی سلسلہ خیز داستان کے باقی واقعات آئندہ ماہ

Scanned with CamScanner

شہر سے کچھ دور فارم ہاؤس پر مہندی کا جشن اپنے عروج پر تھا۔ کھانے پینے کا عمدہ انتظام عورتوں اور بچوں کو لبھا رہا تھا جبکہ ناچنے گانے والیوں کو دیکھ کر مردوں کے ہوش اڑے جا رہے تھے۔

میرے کچھ قریبی جاننے والے حیران تھے اور ان کا حیران ہونا بنتا بھی تھا۔ سوئمنگ پول سے شدید نفرت ہونے کے باوجود میں نے اپنی مہندی کا فنکشن شہر سے باہر ایک بہت پرانے فارم ہاؤس پر کیوں رکھا تھا؟ کچھ باتیں، کچھ یادیں بہت تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ ان کا جب بھی ذکر ہو، دل خون کے آنسو روتا ہے۔ یہ بات میں کسی کو سمجھا نہیں سکتا تھا۔

برسوں پہلے اسی فارم ہاؤس کے بڑے سوئمنگ پول میں، میں نے خود سے ایک سال چھوٹی اپنی آٹھ سالہ بہن شہلا کی لاش تیرتے ہوئے دیکھی تھی تو پھر نفرت کیسے نہ ہوتی۔

ان قریبی لوگوں کا خیال تو یہ بھی ہے کہ شاید میں وہ سب بھول چکا ہوں، وہ درد میری زندگی سے نکل چکا ہے اور اب میں اپنی زندگی میں مطمئن و مسرور ہوں۔ شاید اسی لیے یہ تقریب سوئمنگ پول کے کنارے منعقد ہو رہی ہے۔ جاننے والے تو اس بات پر بھی حیران ہیں کہ جو کسی کو اپنے اسی گھر کے پرانے گھر میں دو روٹی نہیں کھلا سکتے تھے، آج لاکھوں روپے صرف ایک فنکشن پر کیسے لٹا رہے ہیں؟

آخر لوگوں کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ نہ غربت دائمی ہوتی ہے اور نہ ہی مسرت۔ وقت سب کچھ بدل کر رکھ دیتا ہے۔ میں اپنا وہ وقت کبھی بھولا نہیں جب ہم بہت زیادہ غریب تھے۔ ہمارے سردیوں کے کپڑے ہمیشہ لائٹ ہاؤس سے لیے جاتے تھے۔ کورس کی پرانی کتابیں گلی محلے

غریب سے امیر ہو جانے والے نوجوان کا انوکھا انتقام

اولاد کی صحیح تربیت والدین کی ذمے داری ہے... جب ماں باپ میں سے کوئی غلط راہ پر چلے گا تو اولاد بھی اسی کے نقشِ قدم پر چلتی ہے... وہ بھی اپنے باپ کی دیکھا دیکھی دو نمبری سے مالدار بن گیا تھا... اور صاحبِ حیثیت خاندان والوں کے برابر آگیا تھا... مگر ایک درد اسے مسلسل بے چین کیے رکھتا جس کا اسے حساب چکتا کرنا تھا۔

فراڈیا

کرن نعمان

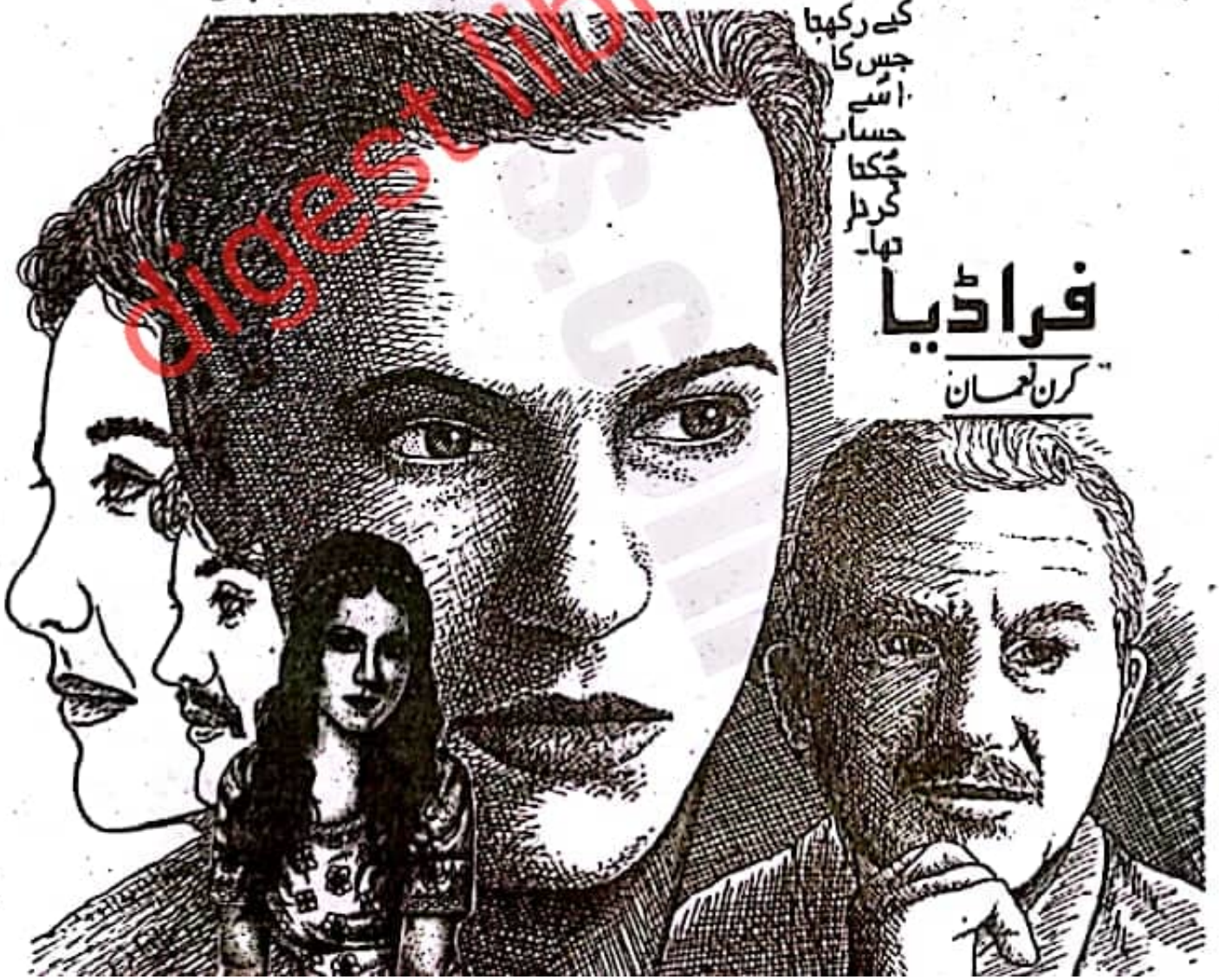

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

یا خاندان کے کسی بچے کی عنایت ہوتیں۔ بچت بازار کے علاوہ ہم نے کوئی بازار دیکھا نہیں تھا اور ایسا صرف میرے ابو کی چالاکیوں کے باعث تھا۔ ان میں تو ابائی بہت تھی جو ساری انہوں نے ہیرا پھیری کرنے میں صرف کی تھی۔ انہوں نے کبھی لگ کر رزقِ حلال کمانے کی طرف توجہ نہیں دی۔ چھوٹے سولے فراڈ کر کر کے اپنی سادہ لوح بیوی اور پانچ بچوں کو پالتے رہے۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی میرے ابو نے اپنی اولاد کو رزقِ حلال کی ترغیب دی ہو۔ ہمیشہ چالاکی کی اور وہی سکھائی۔

میری ماں نیک تھی لیکن غربت اور پانچ اوپر تلے کے بچوں نے اس کی مت ماری ہوئی تھی۔ مجھے اپنے ابو سے اس لیے بھی بڑی نفرت تھی کہ وہ ہمیشہ آڑے وقتوں میں عرفان تایا کے آگے ہاتھ پھیلاتے رہے۔ عرفان تایا کوئی ہمارے سگے تایا نہیں تھے۔ ابو کے چچازاد تھے مگر ان کے اور ہمارے حالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس وقت وہ خاندان کے متمول ترین شخص تھے۔ وہ ہمیشہ ابو کی مدد کرتے رہے کہ خاندان میں ان کا نام اونچا رہے۔ میں نے ہمیشہ ان کی نظر میں خود کو اور اپنے دوسرے بھائی بہنوں کو حقیر ہی دیکھا۔ وہ ہر جمعرات بچوں میں ٹافیاں بانٹتے تھے۔ جب ہم اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھاتے تو وہ کہتے۔

"لو کھاؤ، فراڈیے کے بچو!"

لیکن ہماری امی سے بہت محبت اور نرمی سے بات کیا کرتے تھے۔ امی کے وجود کا ایکسرے کرتی ان کی آنکھیں آج بھی اکثر میرے خیالوں میں زہر گھول دیا کرتی ہیں۔ امی بیچاری انہیں دیکھتے ہی گھبرا کر سر ڈھکتیں اور اِدھر اُدھر مدد طلب نظروں سے دیکھنے لگتیں۔ میرے ابو کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ کسی طرح ان کا داؤ لگ جائے اور عرفان تایا کی جیب کچھ ہلکی ہو جائے۔ مالی مدد کے علاوہ وہی بڑی سی کوسٹر میں خاندان کے بہت سے لوگوں کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی ترس کھاتے ہوئے تفریح کے لیے لے جایا کرتے تھے۔ کبھی کہیں، کبھی کہیں۔

تیں سال پہلے بھی وہی عید کے بعد کافی سارے رشتے داروں کو اس فارم ہاؤس میں لائے تھے جس کے بڑے سوئمنگ پول میں شہلا ڈوبی تھی۔ جس وقت وہ حادثہ ہوا، تمام لوگ رات کا کھانا کھانے چھوٹے سوئمنگ پول کی طرف چلے گئے تھے اس لیے فارم ہاؤس کا وہ حصہ سنسان سا ہو گیا تھا۔ کسی بڑے نے ہم بچوں کو بھی آواز دی تھی اور ہم سب کھانا کھانے کے لیے بھاگ گئے مگر بھاگنے سے پہلے میں نے شہلا کو وہاں دیکھا تھا۔

شہلا پانی کی دیوانی تھی۔ چھوٹے پول میں نہا نہا کر جب اس کا دل نہیں بھرا تو بھاگ بھاگ کر بڑے پول کی طرف جانے لگتی تھی جس میں زیادہ پانی دیکھ دیکھ کر اس کے اندر ہلچل سی مچ جاتی تھی لیکن جب وہ پول کی طرف جانے کی کوشش کرتی، کوئی بڑا اسے ڈانٹ کر بھیج دیتا۔ نہ جانے کیسے سب کی نظروں سے بچ کر وہ پول کے پاس ہی رکی رہی۔ آدھے گھنٹے بعد جب امی کو دوسرے بچوں میں شہلا نظر نہ آئی تب اس کا پوچھنا شروع کیا تاکہ وہ پسندیدہ لمحوں سے محروم نہ رہ جائے۔ ایسے وقتوں میں ہی تو ہمیں اچھے کھانے نصیب ہوتے تھے مگر کوئی کھانا چھوڑ کر اسے ڈھونڈنے پر تیار نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد جب ابو سیر ہو کر کھا چکے تو امی کی آواز پر کان دھرتے ہوئے اسے ڈھونڈنے چلے گئے۔ دل پھٹنے سے چند منٹ بعد بڑے سوئمنگ پول کی طرف سے ان کی دل دہلا دینے والی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ ان کی چیخوں اور شہلا کی سطحِ آب پر تیرتی لاش نے برسوں میرے دل کا سکون اور راتوں کی نیند اجاڑے رکھی۔ کافی ٹائم لگا، میرا پورا خاندان اس صدمے سے سنبھل گیا مگر میں نہیں سنبھلا کیونکہ میرے لیے وہ محض حادثہ نہیں تھا۔

میں خوش تھا کہ آج کی اس تقریب میں عرفان تایا بھی موجود تھے۔ میرے ہی زبردست اصرار پر آئے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ دیکھ لیں کہ فراڈیے کا بچہ بھی آج اس قابل ہو گیا ہے کہ کوسٹر میں بھر کر رشتے داروں کو فارم ہاؤس پر لے آیا ہے اور اس کی مالی حیثیت بھی ان سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی تھی۔

فارم ہاؤس پر جشن کے انتظامات دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ خاص طور پر ناچنے گانے والیوں کو دیکھ کر ان کی بدنظری عروج پر تھی۔ انہیں دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ کاش! میرے ابو فراڈیے نہ ہوتے۔ حق حلال کی کماتے، کھلاتے تو آج میں بھی عزت دار سمجھا جاتا لیکن اب اس کا کیا کریں کہ انہوں نے چالاکی سکھائی اور وہی میں نے دنیا میں آزمائی۔

ابو کی بہ نسبت میری قسمت اچھی نکلی۔ چند چکروں میں ہی حالات کچھ کے کچھ ہو گئے۔ میں خوش تھا کہ عرفان تایا اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہے تھے مگر قسمت کیا دکھانے والی ہے، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

محفل اپنے عروج پر تھی۔ کھانے کا دور چل رہا تھا۔ تبھی فارم ہاؤس کے ایک ملازم کی فلک شگاف چیخیں سب کو سنائی دیں۔ سبھی اس طرف بھاگے۔ بڑے سوئمنگ پول کے بیچوں بیچ عرفان تایا کی لاش تیر رہی تھی۔ ایک کہرام مچ گیا۔ میرے سوا ہر کوئی وہ منظر دیکھ کر دہل گیا تھا لیکن میرے لیے وہ منظر کوئی نیا تو نہیں تھا۔ پانی میں تیرتی لاش کا بھی اور.....

میری نظر نے تو وہ بھی دیکھ لیا تھا کہ کیسے سب کو ناچ گانے میں مشغول دیکھ کر عرفان تایا چپکے سے ایک ناچنے والی کے پیچھے بڑے سوئمنگ پول کی طرف چل دیے تھے جیسے وہ کوئی لڑکی نہ تھی، منشی میں دبی ہائی تھی جسے دیکھ کر شہلا ان کے پیچھے بڑے سوئمنگ پول کے پچھلی طرف بنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

⌘⌘⌘

Scanned with CamScanner

ختم شد

مرزا امجد بیگ

اس دنیا میں طرح طرح کے لوگ بستے ہیں اور یہ دنیا دوسر بازوں، فراڈیوں اور لٹیروں سے بھری پڑی ہے... جو سادہ لوح لوگوں کو پیسے کا لالچ دے کر مختلف طریقوں سے لوٹتے ہیں... زیرِ نظر کہانی بھی ایسے ہی فراڈیے کی ہے... جو لگ بھگ تیس افراد کو لوٹ چکا تھا... مجرم نہایت چالاک تھا اور قانون کی گرفت سے نکلنے کے لیے چالبازیاں کر رہا تھا... مگر اسے نہیں پتا تھا کہ اس کا واسطہ مرزا امجد بیگ سے پڑنے والا ہے۔

روزگار کے نام پر لوگوں کو لوٹنے والے مجرم کی مکاریاں

سال میں ایک آدھ کیس میں پراسیکیوشن کی طرف سے بھی پکڑ لیتا ہوں، یعنی میں وکیلِ استغاثہ کا کردار نبھاتا ہوں۔ یہ سب پیشہ ورانہ تنوع کے لیے ہے۔ اس طرح یکسانیت کا تسلسل قائم نہیں رہتا جس کے نتیجے میں نئے تجربات حاصل ہوتے ہیں مگر کسی بھی کیس کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے میری بنیادی شرط وہی ہے کہ کلائنٹ کا بے گناہ ہونا لازم ہے۔ وکالت میرا پیشہ ضرور ہے مگر میں اسے پیشے سے کہیں بڑھ کر اپنے ضمیر کی ذمے داری سمجھتا ہوں۔ اسی لیے میں نے کبھی گناہ گاروں اور مجرموں کی وکالت نہیں کی۔

اس طویل تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

دو ہزار دو کی دہائی کا کوئی ابتدائی سال تھا۔ نومبر کا مہینا شروع ہو چکا تھا۔ گلابی جاڑے نے شہرِ کراچی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ دن خوشگوار اور رات ٹھنڈی ٹھار ہو جاتی تھی۔ یہ سردی شمالی علاقہ جات یا ساحلِ سمندر سے محروم ملک کے دیگر علاقوں کی طرح شدید اور ناقابلِ برداشت تو نہیں تھی تاہم کراچی والوں کے لیے یہ موسمِ سرما ہی تھا۔ ایسی ہی ایک دل بہار شام میں اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ میری سیکریٹری فرزانہ نے انٹرکام پر پوچھا۔

"سر! کیا پروگرام ہے؟"

فرزانہ ایسا سوال اس وقت کرتی تھی جب آفس بند کرنے کا وقت قریب آجاتا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر وال کلاک کی طرف دیکھا اور کہا۔

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ ابھی شام ہے۔ کلائنٹس کے ساتھ میں اس قدر مصروف رہا کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔"

"سر اب تو انتظار گاہ میں ایک بھی شخص باقی نہیں ہے۔" فرزانہ نے اطلاع دینے والے انداز میں کہا۔ "اگر آپ کی اجازت ہو تو کلوزنگ شروع کی جائے؟"

"ہاں، ہاں ضرور۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔

ریسیور رکھنے کے بعد میں بھی اپنے بریف کیس کو سیٹ کرنے لگا۔ جب آفس میں کوئی کلائنٹ موجود نہیں تھا اور چھٹی کا وقت بھی ہو گیا تھا تو مزید وہاں بیٹھے رہنے کا کوئی

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

قائدہ تھا اور نہ ہی منطق۔

میں نے بریف کیس میں ضروری کاغذات اور فائلیں رکھنے کے بعد اسے بند کیا ہی تھا کہ انٹر کام کا بزر ایک بار پھر بج اٹھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو فرزانہ کی مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"سر! تھوڑی دیر رکنا پڑے گا۔ ایک کلائنٹ آگیا ہے۔"

"کون ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔ "اگر کوئی ضروری معاملہ نہ ہو تو اسے ہم کل بلا سکتے ہیں۔"

"پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا۔" فرزانہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن کلائنٹ بضد ہے کہ وہ ابھی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں آپ کے پاس آکر بتاتی ہوں بیگ صاحب!"

فرزانہ کے آخری جملے نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ کسی بحث مباحثے کے بجائے میں نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے، آجائیں۔"

آئندہ دو منٹ میں فرزانہ نے میرے چیمبر میں آکر مجھے مذکورہ کلائنٹ کے بارے میں جو کچھ بتایا، وہ حیرت ناک اور فکر انگیز تھا۔ مجھ سے ملنے کی ضد کرنے والا ایک خواجہ سرا تھا۔

"کیا نام بتایا ہے اس نے؟" میں نے فرزانہ سے استفسار کیا۔

اس نے جواب دیا۔ "رانی!"

انسانوں کی تیسری اور سب سے زیادہ قابلِ رحم یہ جنس خود کو عورت کہلوانے پر مصر رہتی ہے اسی لیے وہ کھل میک اپ، زیورات اور لیڈیز ڈریس میں نظر آتی ہے۔ عورتوں جیسے نام رکھنا بھی اسی ذیل میں ہے۔

"آپ اسے کچھ دے دلا کر فارغ کر دیتیں۔" میں نے فرزانہ سے کہا۔ "یہ لوگ عموماً پیسوں کے لیے مختلف ناز و انداز اپناتے ہیں۔"

"یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی تھی بیگ صاحب!" فرزانہ نے کہا۔ "اور میں نے اپنے پرس میں سے کچھ پیسے نکال کر اسے دینے کی کوشش کی تھی مگر اس نے وہ پیسے لینے سے صاف انکار کر دیا اور ایک عجیب بات کی۔"

"کون سی عجیب بات؟" فرزانہ کے خاموش ہوتے پر میں نے پوچھا۔

"اس نے کہا..... میں کوئی بھکاری نہیں، ایک کلائنٹ بن کر وکیل صاحب سے ملنے آئی ہوں۔" فرزانہ نے بتایا۔ "میرا نام رانی ہے۔ میں وکیل صاحب کو پیسے دے کر جاؤں گی۔"

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے، آپ رانی کو میرے چیمبر میں بھیج دیں۔"

چند سیکنڈ کے بعد وہ میرے سامنے تھا۔ میں یہاں پر اس کے لیے مذکر کا صیغہ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ اردو لغت میں اس کے حوالے سے جو الفاظ ملتے ہیں، وہ سب مذکر ہیں جیسا کہ خواجہ سرا، مخنث، ہیجڑا، زنانہ اور کھسرا وغیرہ..... یہ سب لغوی ہوشگافیاں ہیں۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اسے مذکر کے کھاتے میں لکھنے سے وہ نر اور مرد ہو جائے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ خود کو لاکھ مؤنث سمجھتا رہے مگر اس سمجھ کے نتیجے میں وہ مادہ یا عورت نہیں بن سکتا۔

رانی کی عمر کا اندازہ میں نے تیس کے اردگرد لگایا۔ اس نے جی بھر کر اپنے چہرے پر میک اپ تھوپ رکھا تھا۔ لباس بھی خالصتاً عورتوں والا تھا۔

"السلام علیکم وکیل صاحب!" اس نے ہاتھ نچا کر مجھے سلام کیا۔

میں نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس کے سلام کا جواب دیا۔ "وعلیکم السلام!"

وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

میں نے پوچھا۔ "رانی! بتاؤ، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"اے وکیل صاحب! بیمار آدمی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور قانونی معاملات میں پھنسا ہوا انسان وکیل کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "میں بھی..... میرا مطلب ہے ہم سب ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے..... قانونی مدد۔"

آپ میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کا کبھی انسانوں کی اس تیسری جنس سے واسطہ نہ پڑا ہو۔ آپ ان کے انداز و اطوار اور بول چال سے بخوبی واقف ہیں لہٰذا میں اس ذیل میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ میری تمام تر توجہ اس کیس پر مرکوز رہے گی۔ سو، زبان و بیان میں اگر کوئی کمی یا کجی رہ جائے تو پیشگی معذرت چاہوں گا۔

"میں آپ کی طرف متوجہ ہوں۔" میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے اپنی مصیبت کے بارے میں کھل کر بتائیں اور آپ کی کہانی سننے سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ "ہم" سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا اس پریشانی کا تعلق آپ کے خاندان یعنی آپ کی کمیونٹی سے ہے؟"

Scanned with CamScanner

digest library.com

"نہیں وکیل صاحب!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اپنی کمیونٹی سے تو میں اکیلی ہی اس دلدل میں پھنسی ہوئی ہوں۔ میرے علاوہ اس معاشرے کے اور بھی کئی لوگ سخت مشکل میں ہیں۔"

"مثلاً کتنے لوگ؟" میں نے پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے پوچھا۔

"لگ بھگ تیس۔"

"اوہ۔" میں نے ایک گہری سانس لی اور رانی کے چہرے پر نگاہ جما کر استفسار کیا۔ "آپ لوگوں کی مشکل یا مصیبت کی تفصیلات کیا ہیں؟"

میرے سوال کے جواب میں رانی نے مجھے جو پتا سنائی، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

رانی اور دیگر کم و بیش ڈھائی درجن افراد کو فراست علی نامی ایک ریکروٹنگ ایجنٹ نے بیرونِ ملک بھیجنے کا جھانسا دے کر لوٹ لیا تھا۔ وہ لوگ کافی عرصے سے اس ایجنٹ کے آفس کے چکر کاٹ رہے تھے مگر وہ بدمعاش ان کے ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ کسی نے متاثرین کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اپنی رقوم کی وصولی کے لیے انہیں قانونی چارہ جوئی کرنا چاہیے..... وغیرہ۔

"میں اسی لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں جی۔" رانی نے اپنی کہانی کے اختتام پر امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "وکیل صاحب! آپ کوئی ایسا قانونی چکر چلاؤ کہ وہ نامراد فراست کسی لٹو کی طرح گھومتے ہوئے آپ کے قدموں میں آگرے۔" بات کے آخر میں اس نے اپنی انگلی سے کسی لٹو کی گردش کا ڈیمو بھی دے دیا۔

"رانی! میں ایک وکیل ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری قانونی مدد کروں تو تمہیں پوری طرح مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔"

"کس کافر نے تعاون کرنے سے منع کیا ہے وکیل صاحب!" رانی نے گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ "آپ بس ہلکا سا اشارہ کریں..... میں ہر خدمت کے لیے تیار ہوں سرکار!"

رانی کے خطرناک ارادے کو بھانپتے ہوئے میں نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ "تعاون سے میری یہ مراد تھی کہ اگر میں نے آپ کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا تو پھر آپ نے اپنا دماغ نہیں چلانا۔ بس وہی کرنا ہے جو میں کہوں گا۔"

"میں سمجھ گئی وکیل صاحب!" وہ جلدی سے بولا۔

"اب آپ مجھے ایف آئی آر کی کاپی دکھائیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تاکہ معاملے کی قانونی نوعیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔"

"کیسی ایف آئی آر اور کہاں کی پولیس رپورٹ وکیل صاحب!" اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "ہم تھانے کے کئی پھیرے لگا چکے ہیں مگر کسی نے ہمارے ساتھ ہونے والے ظلم کی رپورٹ درج نہیں کی۔"

میں نے پوچھا۔ "تھانے والے کیا کہتے ہیں؟"

"انہوں نے الٹا ہمیں ہی ٹاڑ دیا ہے وکیل صاحب!" وہ کڑوے لہجے میں بولا۔ "وہ کہتے ہیں، کیا تم لوگوں نے پولیس سے پوچھ کر فراست کو پیسے دیے تھے جو رقم ڈوبنے کے بعد ہمارے پاس آئے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے....." اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر تھوڑا آگے جھک کر رازدارانہ انداز میں بات مکمل کردی۔

"تھانیدار نے فراست علی سے کوئی ٹھگڑی رقم بٹور لی ہے اسی لیے وہ اس شیطان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کو تیار نہیں ہو رہا۔"

محکمۂ پولیس کی کارکردگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، اس لیے زیادہ تر کیسز میں عوام کی شکایات درست ہوتی ہیں مگر اس بنا پر سب کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکنا چاہیے۔ میں ذاتی طور پر پولیس ڈیپارٹمنٹ کے کئی اہلکاروں کو جانتا ہوں جو اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں ایک پیسے اور ایک سیکنڈ کی ہیر پھیر کو گناہِ کبیرہ تصور کرتے ہیں۔ ان کی آمدنی کو صد فیصد رزقِ حلال کہا جاسکتا ہے لیکن افسوس کہ ایسی مثالیں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔

"ہاں، ایسا ہوسکتا ہے۔" میں نے رانی کے خیال کا گول مول جواب دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ بھی نہیں ہے کہ جسے حل نہ کیا جاسکتا ہو۔ میں اس کا بندوبست کردوں گا۔"

"کیسا بندوبست وکیل صاحب؟" رانی نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو اپنے ایک صحافی دوست کا نمبر دے رہا ہوں۔ آپ صبح اس سے رابطہ کرکے کل کا کوئی وقت مقرر کرلیں۔ میرا وہ دوست آپ کو سب سمجھا دے گا۔ اس کے بعد متعلقہ تھانیدار، فراست علی کے خلاف رپورٹ درج کرنے پر مجبور ہوجائے گا۔ آپ اس رپورٹ کی ایک فوٹو کاپی لاکر مجھے دے دینا، باقی معاملات میں خود سنبھال لوں گا۔" میں سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر اس سے سوال کیا۔

"کیا آپ ایک کام کرسکتے ہیں؟"

Scanned with CamScanner

"کیوں نہیں وکیل صاحب!" وہ گردن اور ہاتھوں کو مخصوص انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ "آپ جو کہیں گے، میں کروں گی۔ حکم کریں۔"

"آپ نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ فراست علی کم وبیش تیس افراد کے پیسے کھائے بیٹھا ہے۔" میں نے رانی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ ان میں سے کتنے لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر تھانے جا سکتے ہیں؟"

اس معاملے کی ایف آئی آر درج کرانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا لیکن میں سردست سامنے نہیں آنا چاہتا تھا کیونکہ میں اس کیس میں وکیلِ استغاثہ کا کردار ادا کرنے جا رہا تھا۔ علاوہ ازیں میں اس ایشو میں تھوڑا ڈراما ڈالنے کے بارے میں سوچ رہا تھا تاکہ رانی کو بھی اپنا ٹیلنٹ دکھانے کا موقع مل سکے۔

"میں کوئی لمبا چوڑا دعویٰ تو نہیں کر سکتی وکیل صاحب!" رانی نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن پانچ چھ بندے تو میں اکٹھے کر کے تھانے لے ہی جاؤں گی۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ اس سے کام چل جائے گا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "یہ قابلِ دخل اندازی پولیس کا کیس ہے۔ ہر صورت اس کی ایف آئی آر تو درج ہونا ہی چاہیے۔"

"رانی" اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

رانی ہمیشہ مؤنث کے لیے استعمال ہوتا ہے اور میں اپنے بیان میں اس نام کے ساتھ مذکر کا صیغہ استعمال کر رہا ہوں۔ اسے ایک مجبوری سمجھ کر برداشت کر لیں۔ میں اس خواجہ سرا کا نام نہیں بدل سکتا اور اسے عورت کہنا بھی مجھے مناسب نہیں لگتا۔ یہ سلسلہ کہانی کے اختتام تک ایسے ہی چلتا رہے گا۔

رانی چند منٹ مزید میرے پاس رکا پھر شکریہ ادا کرنے کے بعد وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں بھی اپنے گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔

اسی رات میں نے اپنے ایک صحافی دوست اسلم شاہ کو فون کر کے رانی اور اس کے ساتھیوں کی مدد کا کہہ دیا۔ اسلم شاہ سے میری دیرینہ دوستی تھی۔ میری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔

"بیگ صاحب! میں جانتا ہوں یہ کام آپ چٹکی بجاتے میں کر سکتے ہیں اور میرے لیے بھی یہ چنداں مشکل نہیں ہے لیکن آپ اس معاملے میں سنسنی خیزی چاہ رہے ہیں تو سمجھ لیں..... میں آپ کو خوش کر دوں گا۔"

"ویری گڈ شاہ جی!" میں نے تشکرانہ انداز میں کہا۔

ہمارے درمیان کچھ دیر تک گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا پھر ہم نے ایک دوسرے کو "شب بخیر" کہہ کر ٹیلی فونک رابطہ برخاست کر دیا۔

آئندہ روز رانی پھر مجھ سے ملنے آفس آ گیا۔ آج وہ بہت زیادہ خوش اور پرجوش تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

"وکیل صاحب! آپ کا وہ صحافی دوست تو بہت کام کا بندہ ہے۔ وہ اپنے ساتھ پریس فوٹو گرافر اور کسی سماجی تنظیم سے تعلق رکھنے والے ایک شخص کو بھی لے کر آیا تھا۔ میں بھی نصف درجن لوگوں کو لے کر گئی تھی۔ ہم نے شاہ جی کی ہدایت پر تھانے کے سامنے احتجاجی نعرے لگائے، فوٹو گرافر نے ہماری تصویریں بنائیں۔ ابھی ہمیں یہ "کام" شروع کیے دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ تھانیدار اپنی کرسی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ وہ ہم سب کو بڑے احترام کے ساتھ اندر لے گیا۔ ہمیں چائے بسکٹ کھلائے اور ہماری شکایت پر فراست علی کے خلاف تفصیلی رپورٹ بھی درج کر لی۔ تھانیدار نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ وہ فراڈیا فراست علی بہت جلد تھانے کی حوالات میں بند ہو گا۔"

"اب تو آپ خوش ہیں نا؟" میں نے استفسار کیا۔

"بہت زیادہ۔" وہ جذباتی ہو گیا۔ "میں بتا نہیں سکتی کہ آج میرے کلیجے میں کیسی ٹھنڈ پڑی ہے۔ جب اس بدذات فراست کو قانون اپنے شکنجے میں جکڑ کر اس کے اندر سے ہمارے پیسے نکلوائے گا تو وہ دن ہم سب کے لیے عید کا دن ہو گا وکیل صاحب!"

"وہ دن ضرور آئے گا مگر اس کے لیے آپ سب کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔" میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ "یہ ایک دیوانی کیس ہے۔ ایسے مقدمات کے فیصلوں میں اکثر تاخیر ہو جاتی ہے۔ جو لوگ صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں، جیت انہی کے حصے میں آتی ہے۔"

"ہم انتظار کر لیں گے وکیل صاحب!" وہ پُرعزم لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ "کیا میں مطمئن ہو جاؤں کہ یہ کیس آپ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے؟"

"بالکل۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

"آپ اپنی فیس تو بتا دیں وکیل صاحب!"

"فیس تو میری خاصی زیادہ ہوتی ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظر جما کر جواب دیا۔ "لیکن میں سمجھتا ہوں اس کیس میں آپ پر زیادہ بوجھ نہیں پڑے گا۔ بس آپ کو ایک کام کرنا ہو گا۔"

Scanned with CamScanner

digest library.com

"کون سا کام؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"آپ جن متاثرین سے مسلسل رابطے میں ہیں، کیا انہیں میرے آفس میں لے کر آسکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کام میں آسانی سے کرلوں گی۔" اس نے پروثوق انداز میں کہا۔ "سمجھ لیں میری طرف سے ان ہے۔"

"تو پھر میری جانب سے بھی ان ہی سمجھیں۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "آپ ان لوگوں کو میرے پاس لے آئیں۔ میں اس کیس میں آپ کو مرکزی مدعی بنانا چاہتا ہوں۔ دوسرے افراد ذیلی مدعی ہوں گے۔ اس اتفاق اور اتحاد و الحاق کے دو بڑے فائدے ہوں گے۔"

"کون سے دو فائدے وکیل صاحب؟" اس نے دلچسپی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

"فائدہ نمبر ایک.....!" میں نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ "اگر کسی کیس میں ایک سے زیادہ مدعیان ہوں اور ان کے دعوے کا مضمون بھی ایک ہو تو اس سے مدعا علیہ پر بہت زیادہ دباؤ آجاتا ہے اور اس کے فرار کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ فائدہ نمبر دو.....!" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"اس اسکیم کے تحت وکیل کی بھاری فیس اور دیگر عدالتی اخراجات کا بوجھ بھی ایک موکل کے بجائے متعدد موکلین پر تقسیم ہو کر قابلِ برداشت صورت اختیار کر لیتا ہے۔"

"آپ بڑے جگاڑی قسم کے وکیل ہیں۔" وہ اپنے ہاتھوں، گردن اور آنکھوں کی معنی خیز حرکات سے میری بلائیں لیتے ہوئے بولا۔ "رب سوہنا آپ کو سلامت رکھے۔"

"آمین۔" میں نے کہا۔

"میں چلتی ہوں۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی قمیص کے دامن کو سیدھا کیا، پرس کو عورتوں کے انداز میں کندھے پر لٹکایا اور نظر بھر کر مجھے دیکھنے کے بعد بولا۔ "جلد ملاقات ہو گی۔"

میں نے جواباً مختصراً کہا۔ "ان شاء اللہ!"

رانی نے لوفرانہ انداز میں مجھے آنکھ ماری، ایک جھٹکے سے مڑا اور میرے چیمبر سے نکل گیا۔

☆☆☆

اسلم شاہ اور اس کے سوشل ورکر دوست کامران جاوید نے فوٹو گرافر رانا شاہد کی معیت میں متعلقہ تھانے کے سامنے جو ڈراما اسٹیج کیا تھا، اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے تھے۔ تھانیدار نے نہ صرف رانی اور دیگر متاثرین کی منشا کی روشنی میں ریکروٹنگ ایجنٹ فراست علی کے خلاف رپورٹ درج کر لی تھی بلکہ دو روز کے بعد پولیس نے فراست علی کو گرفتار کر کے حوالات میں بھی پہنچا دیا تھا۔

پولیس کسٹڈی میں فراست کے رویے سے یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ وہ اس نوعیت کی گرفتاری اور حراست وغیرہ کا عادی ہے۔ تھانیدار نے نگوڑی "قمیص" لے کر فراست کو ایسی "پٹی" پڑھائی کہ پولیس کی تحویل میں اس نے بڑے شاطرانہ انداز میں اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا جس سے پولیس اور ملزم دونوں کا کام آسان ہو گیا تھا مگر میں پولیس اور ملزم کی ملی بھگت سے مطمئن نہیں تھا چنانچہ میں نے فراست علی کو بہ اندازِ دیگر آڑے ہاتھوں لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس مقدمے کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ "رانی اینڈ کو" کو سرکار کی طرف سے ایک وکیل مہیا کیا گیا تھا لیکن میری ہدایات کی روشنی میں رانی نے وکیلِ سرکار پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے پرائیویٹ وکیل کی خدمات حاصل کرنے کا عندیہ دیا تھا۔ یہ اس کیس میں میری قانونی اور باقاعدہ انٹری تھی۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں پولیس کے تیار کردہ چالان پر تھوڑی روشنی ڈالنا چاہوں گا تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

رانی اور دیگر متاثرین کی جذباتی فریاد اور ان کے پیش کردہ کاغذات کے حساب سے ملزم فراست علی پر تعزیراتِ پاکستان کی چھ دفعات عائد کی گئی تھیں جن میں دفعہ چار سو نیں، چار سو چھ، چار سو اڑسٹھ، چار سو اکہتر، ایک سو نو اور چونتیس شامل تھیں۔ اس کیس کا انکوائری آفیسر مراد علی عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ سرکار کی طرف سے اس مقدمے کی پیروی میں کر رہا ہوں تو اس نے حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ پوچھا۔

"بیگ صاحب! آپ کو استغاثہ کے بلاک میں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ کیا اس تبدیلی کا کوئی خاص سبب ہے؟"

"ایس آئی صاحب!" میں نے مراد علی کے چہرے پر نگاہ جما کر گہری سنجیدگی سے کہا۔ "جب کوئی انسان "ایل ایل بی" یا "ایل ایل ایم" اور یا پھر "ایل ایل ڈی" کا امتحان پاس کرتا ہے تو کیا اس سے کوئی ایسا فارم بھروایا جاتا ہے کہ عملی میدان میں اترنے کے بعد اس نے پبلک پراسیکیوٹر بننا ہے یا ڈیفنس اٹارنی؟"

"نہیں جناب!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ایسا کوئی سسٹم یا قانون میرے علم میں نہیں ہے۔"

Scanned with CamScanner

''آپ بہت باخبر انسان ہیں مراد صاحب!'' میں نے توصیفی انداز میں کہا۔ ''ایسا قانون اور قاعدہ آپ کے علم میں اس لیے نہیں ہے کہ اس کا واقعتاً کوئی وجود نہیں۔ کسی بھی ویل ۔ تدفن نہیں لگائی جاسکتی کہ وہ ساری زندگی وکیلِ استغاثہ یا وکیلِ صفائی بن کر پریکٹس کرے گا۔ میں بھی پیشہ ورانہ ٹیسٹ تبدیل کرنے کے لیے کبھی کبھار سرکاری کیس کی پیروی کرلیتا ہوں اور اب آپ کے سوال کا جواب.....!''

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا ہے بیگ صاحب!''

ہمارے درمیان یہ گفتگو عدالت کے کمرے کے باہر راہداری میں ہورہی تھی۔ مراد علی، ملزم فراست علی کو اپنے ساتھ لے کر عدالت پہنچا تھا۔ فراست علی کورٹ روم کے اندر پولیس کی نگرانی میں تھا۔ قبل اس کے کہ ہماری بات چیت طوالت پکڑتی، جج نے مسندِ انصاف سنبھال لی اور ہمیں فی الفور کمرائے عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔

یہ اس کیس کی پہلی باقاعدہ پیشی تھی لہٰذا وکیلِ صفائی بھی درخواستِ ضمانت کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو وکیلِ صفائی نے ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میرا موکل ایک مصیبت زدہ اور مجبور شخص ہے۔ اس کی نیت صاف تھی۔ یہ تو لوگوں کا بھلا چاہ رہا تھا مگر قسمت خراب کہ یہ حالات کے پھیر میں آگیا۔ جب وقت انسان کے خلاف چل رہا ہو تو پھر سب کچھ الٹ کر رہ جاتا ہے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر درد انگیز آواز میں اضافہ کردیا۔

''معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ ملزم کی درخواستِ ضمانت کو منظور کرتے ہوئے اسے گھر جانے کی اجازت دی جائے تاکہ یہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ وہ لوگ اس کی گرفتاری سے بے حد پریشان ہیں۔ ملزم کی ضمانت کو منظور کرنا ایک طرح سے اس کی فیملی پر احسان ہوگا۔''

''یور آنر! کیس کی ابتدا ہی میں ملزم کی ضمانت منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔'' میں نے ملزم کی ضمانت پر رہائی کے خلاف دلائل دیتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''میرے فاضل دوست نے اپنے موکل کے حوالے سے کہا کہ وہ شریف اور نیک نیت انسان ہے۔ انہوں نے عدالت سے یہ درخواست بھی کی ہے کہ ملزم کو گھر جانے کی اجازت دی جائے کیونکہ اس کے بیوی بچے پریشان ہیں۔ تو میں اس سلسلے میں معزز عدالت کی توجہ چند اہم امور کی جانب مبذول کرانا چاہوں گا۔'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''یور آنر! جب پولیس نے ملزم فراست علی کو اس کے گھر واقع نارتھ ناظم آباد سے گرفتار کیا تو خانہ تلاشی کے دوران میں وہاں سے پولیس کو درجن بھر شناختی کارڈز، نصف درجن پاسپورٹس، نقلی مہریں، مختلف ملکوں کی ایمبیسیز کے ایگریمنٹس اور اسی نوعیت کے دیگر کاغذات اور دستاویزات ملی تھیں۔ کسی شریف اور نیک نیت انسان کا ایسی خطرناک جعلسازی سے بھلا کیا کام؟ جناب عالی! ابھی میں نے جس ''سامانِ دھوکا دہی'' کا ذکر کیا، اس کی تفصیلات ملزم کے خلاف تیار کی جانے والی چارج شیٹ میں موجود ہیں اور ان چیزوں کو ضرورت پڑنے پر عدالت میں پیش بھی کیا جاسکتا ہے بلکہ ایسے کئی کاغذات جعلسازی کے نمونے کے طور پر کیس فائل کے اندر لگا بھی دیے گئے ہیں۔ باقی جہاں تک ملزم کی فیملی کی پریشانی کا تعلق ہے تو.....!'' میں نے ایک مرتبہ پھر ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ڈینس کونسلر کو اپنے موکل کے بیوی بچوں کی پریشانی کا بڑا خیال ہے اور ان کم و بیش تیس خاندانوں کا کیا جنہیں مستقبل کے سہانے خواب بیچ کر ملزم نے ان کی زندگی بھر کی جمع پونجی ہتھیالی ہے بلکہ ان میں سے بعض تو اس دھوکے باز شخص کی لچھے دار باتوں میں آکر قرض کے ماؤنٹ ایورسٹ تلے دبے اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہے ہیں۔ یہ.....!'' میں نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے فراست علی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہ معاشرتی ناسور کسی بھی رعایت کے قابل نہیں لہٰذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ اس دغاباز کو جوڈیشل کسٹڈی میں دے کر اس مقدمے کی کارروائی کو آگے بڑھایا جائے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے کیے جاسکیں۔''

''جناب عالی! میرا موکل اپنی فیملی کا واحد کفیل ہے۔'' وکیلِ صفائی نے فراست علی کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر اسے عدالت نے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا تو اس کے بیوی بچے سڑک پر آجائیں گے۔ میرے موکل نے قانون سے تعاون کرتے ہوئے اپنے جرم کا اقرار کرلیا ہے۔ اس کے بدلے میں اس کے لیے تھوڑی گنجائش تو نکالی جاسکتی ہے۔''

Scanned with CamScanner

"ہرگز نہیں جنابِ عالی!" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ "میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ملزم کے جیل چلے جانے سے اس کے بیوی بچے روڈ پر نہیں آئیں گے بلکہ اسی گھر میں رہائش پذیر رہیں گے جہاں وہ اس وقت رہ رہے ہیں کیونکہ میری معلومات کے مطابق نارتھ ناظم آباد والا دو سو گز کا وہ مکان فراست علی کی ذاتی ملکیت ہے۔"

میرے اس سنسنی خیز انکشاف پر جج نے سوالیہ نظر سے وکیلِ صفائی کی طرف دیکھا۔ جج کی اس نظر میں خفگی آمیز حیرت جھلک رہی تھی۔ وکیلِ صفائی کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

"یور آنر! میرے فاضل دوست کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔" ڈیفنس کونسلر نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے اضطراری لہجے میں کہا۔ "وہ مکان میرے مؤکل کے کسی رشتے دار کا ہے جو اس نے ترس کھا کر ملزم کو رہنے کے لیے دیا ہوا ہے۔"

"پراسیکیوشن!" جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا آپ کے پاس ایسا کوئی ٹھوس دستاویزی ثبوت ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ مذکورہ مکان ملزم کی ملکیت ہے؟"

"یس سر!" میں نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن وہ ٹھوس ثبوت میں مناسب موقعے پر عدالت میں پیش کردوں گا۔ فی الحال میں وکیلِ مخالف سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں جو میرے دعوے کی تصدیق کردیں گے..... اگر عدالت کو اعتراض نہ ہو تو۔"

اگرچہ میرے پاس ایسا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں تھا جس کے حوالے سے میں نے بہت بڑا دعویٰ کردیا تھا تاہم میں نے اس مشن پر اپنے ایک خاص بندے کو لگا رکھا تھا جو بہت جلد مجھے کوئی بڑی خوشخبری سنانے والا تھا۔ بہرکیف، اس وقت میں نے جج کے سامنے صریحاً غلط بیانی کی تھی، اس یقین کے ساتھ کہ میں اپنی اس دروغ گوئی کو اچھے سے سنبھال لوں گا۔ میرے تجربے میں آیا ہے کہ انسان کے لیے سب سے قیمتی اور طاقتور شے اس کا یقین ہے۔ میرے اسی یقین نے کام دکھا دیا تھا۔

"نو آبجیکشن!" جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ ڈیفنس سے سوال کرسکتے ہیں۔"

"میرے فاضل دوست!" میں نے روئے سخن وکیلِ صفائی کی جانب موڑتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ اپنے مؤکل کو کب سے جانتے ہیں؟"

"لگ بھگ دو ماہ سے۔" اس نے جواب دیا۔

"یعنی جب سے آپ نے اس کا کیس لیا ہے؟"

"جی..... جی ہاں۔"

"اس کا مطلب ہے آپ اس کے ماضی بعید سے واقفیت نہیں رکھتے؟" میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

"اس نے مجھے اپنے حالات کے بارے میں بتایا ہے۔"

"کون سے حالات؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استفسار کیا۔

اس نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں بتایا۔ "وہی حالات جن کی وجہ سے وہ اس وقت کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کٹہرے میں کھڑا ہے۔"

"آپ نے اپنے مؤکل کے ساتھ "کی طرح" کے الفاظ اضافی استعمال کیے ہیں کیونکہ اس کے حلفیہ بیان اور آپ کی قانونی وضاحت کی رُو سے فراست علی نے اپنا جرم قبول کرلیا ہے لہٰذا وہ کسی مجرم کی طرح نہیں، ایک سند یافتہ مجرم کا درجہ حاصل کرچکا ہے۔ قانون کی زبان میں وہ اب ملزم نہیں، ایک حلف یافتہ مجرم ہے۔ بہرکیف.....!" میں لمحے بھر کے لیے تھما، ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ کا مؤکل جن حالات کا شکار ہوکر یہاں تک پہنچا، وہ اس کا ماضی قریب ہے یعنی زیادہ سے زیادہ ایک سال پہلے کے واقعات لیکن میں نے تو آپ سے مجرم فراست علی کے ماضی بعید کے بارے میں سوال کیا تھا؟"

وہ بے بسی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "میں اپنے مؤکل کے ماضی بعید کے حوالے سے کچھ نہیں جانتا۔"

"میں جانتا ہوں اور بغیر فیس وصول کیے بالکل مفت میں صلاح دے رہا ہوں کہ آپ کو بھی ضرور جاننا چاہیے۔" میں نے وکیلِ صفائی کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر طنزیہ لہجے میں کہا پھر جج سے مخاطب ہوکر بآوازِ بلند ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

"جنابِ عالی! ڈیفنس نے اپنے مؤکل کی مجبوری، لاچاری اور بے بسی کا رونا روتے ہوئے معزز عدالت کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اگر فراڈیے فراست علی کو ضمانت پر رہا نہیں کیا گیا تو اس کے بیوی بچے سڑک پر آجائیں گے کیونکہ وہ اس وقت جس گھر میں رہ رہے ہیں وہ کسی رشتے دار کی ملکیت ہے۔ مذکورہ رشتے دار نے مجرم کے نامساعد حالات کے پیشِ نظر ترس کھا کر انہیں عارضی طور پر وہ مکان رہنے کے لیے دیا ہے جبکہ یہ ایک کھلا جھوٹ ہے۔ میں واشگاف الفاظ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ڈیفنس، معزز عدالت کو اپنی غلط بیانی کے زور پر گمراہ کرنے کی سعی کررہا ہے۔"

Scanned with CamScanner

digest library.com

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" جج نے تیز آواز میں مجھ سے پوچھا۔ "کیا آپ عدالت کو یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ ملزم کے کسی رشتے دار نے اس کی فیملی پر ترس کھا کر انہیں اپنا گھر رہنے کے لیے نہیں دیا اور وہ کہیں اور..... کسی دوسرے مکان میں رہ رہے ہیں؟"

"جناب عالی! میں نے تھوڑی دیر پہلے مجرم فراست علی کی نارتھ ناظم آباد والی دو سو گز پر تعمیر شدہ رہائش گاہ کا ذکر کرتے ہوئے معزز عدالت کو بتایا تھا کہ اس فراڈ شخص کی فیملی سڑک پر نہیں آئے گی کیونکہ وہ لوگ اپنے ذاتی گھر میں رہ رہے ہیں۔" میں نے جج کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اور ان کا یہ "رہنا" کوئی سال، دو سال سے نہیں ہے بلکہ میرے اعداد و شمار کے مطابق مجرم اور اس کے بیوی بچے پچھلے پندرہ سال سے مذکورہ مکان میں رہائش پذیر ہیں لہٰذا کسی عزیز یا رشتے دار کا ترس کھا کر انہیں رہنے کے لیے اپنا مکان دینا ایک بوگس اور مبنی بر دروغ کہانی ہے۔ مجرم فراست علی کے اس گھر کا ایڈریس پولیس کے ریکارڈ پر محفوظ ہے۔ اگر عدالت میرے دعوے کی تصدیق کرنا چاہے تو کسی سرکاری اہلکار کو نارتھ ناظم آباد بھیج کر مجرم کے پڑوسیوں اور محلے داروں سے پوچھ تاچھ کی جاسکتی ہے۔"

"آپ اس بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟" جج نے سوالیہ نظر سے وکیل صفائی کی طرف دیکھا۔

وکیل صفائی نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! میں اپنے موکل کے ماضی کے حوالے سے زیادہ نہیں جانتا لیکن معزز عدالت سے میری التجا ہے کہ فراست علی کی درخواست ضمانت کو منظور.....!"

"یہ التجا آپ پہلے بھی متعدد بار کر چکے ہیں۔" جج نے ناگواری بھرے انداز میں کہا۔ "لیکن آپ عدالت کے سامنے ایک بھی ایسی معقول وجہ نہیں رکھ سکے جس کی بنا پر ملزم کو ضمانت پر رہا کیا جاسکے۔"

جج کے صاف انکار نے وکیل صفائی کے تعزیے ٹھنڈے کر دیے۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے مجرم فراست علی کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا اور ایک ماہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

"دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!"

میں کورٹ روم سے باہر آیا تو راہداری میں "رانی" بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"آپ کو آج کی عدالتی کارروائی کیسی لگی؟"

"اے وکیل صاحب!" اس نے ایک ہاتھ کا مکا بنا کر اسے عجیب سی معنی خیز حرکت دی اور ہونٹ بھینچ کر آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ "آپ بڑے کڑک وکیل ہیں۔ آپ نے اس مردود فراست کو تن کے رکھ دیا ہے۔ مجھے ایسے ہی نوابالاٹ مرد پسند ہیں۔"

"تن کے رکھ دیا ہے.....!" میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "آپ کا مطلب ہے، میں نے فراست کو دیوار سے لگا دیا ہے؟"

"آپ جو بھی سمجھ لیں۔" اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کی کارروائی سے مجھے تو بہت مزہ آیا ہے۔ فراست کی روہانسی شکل دیکھ کر میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہے۔ بس، اسی طرح ٹھوک کر رکھیں وکیل صاحب!"

"جی ٹھیک ہے۔" میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

اس نے واقعتاً میری جان چھوڑ دی۔ "آپ ایک معروف انسان ہیں۔" اس نے گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ بھی جائیں، میں بھی جاتی ہوں۔ اگلی پیشی سے پہلے آپ سے ملنے دفتر آؤں گی پھر ہم ڈھیروں باتیں کریں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

کلائنٹ چاہے کسی بھی جنس سے تعلق رکھتا ہو، وہ بس ایک کلائنٹ ہوتا ہے اور اپنے ہر کلائنٹ کے جذبات کا احترام ہر پیشہ ور شخص پر لازم ہے۔ سو، میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"جی، بالکل ٹھیک۔"

میرے تائیدی انداز نے رانی کو خوش کر دیا۔

☆☆☆

استغاثہ کی جانب سے گواہوں کی خاصی طویل فہرست پیش کی گئی تھی جس میں کم و بیش ڈھائی درجن افراد شامل تھے۔ یہ سب فراست علی نامی انسان نما ناگ کے ڈسے ہوئے تھے لیکن میں یہاں پر چند ایک کی گواہی اور ان پر ہونے والی جرح کا ذکر کروں گا۔ باقی لگ بھگ دو درجن بندوں کو میں نے ایک ہی پیشی پر اجتماعی شہادت کے ذریعے بھگتا دیا تھا۔

جج کرسی انصاف پر براجمان ہوا تو کمرۂ عدالت میں موجود تمام لوگ باادب، باملاحظہ ہوشیار ہو گئے۔ عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا، جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم کا اقرار کر لیا۔ یہ ٹیک کام وہ پولیس کی

Scanned with CamScanner

کسٹڈی میں بھی کر چکا تھا لہٰذا پہلے بے قاعدہ اور اب باقاعدہ فراست علی نے مجرم ہونے کا "اعزاز" حاصل کرلیا تھا۔

اس کیس میں چونکہ میں وکیلِ استغاثہ کا کردار نبھا رہا تھا اس لیے کیس کے تفتیشی افسر سب انسپکٹر مراد علی سے میری گاڑھی چھننے لگی تھی۔ مراد کی عمر چالیس کے اردگرد تھی۔ وہ مائل بہ فربہی بدن کا مالک ایک زیرک اور چاق چوبند پولیس اہلکار تھا۔ میرے استفسار پر اس نے مجھے بتایا تھا۔

"بیگ صاحب! یہ فراست خاصا چالو قسم کا بندہ ہے۔ اس نے اگر ریمانڈ کی مدت کے دوران میں اپنی غلطیوں کا اعتراف کرلیا ہے تو اس سے اس عمل کے پیچھے صرف ہماری مار پیٹ سے بچنا نہیں ہے۔"

"تو پھر.....؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ سب انچارج صاحب کی صلاح کا نتیجہ ہے۔" مراد علی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

سب سمجھ جانے کے باوجود بھی میں نے بڑی سادگی سے کہا۔ "میں سمجھا نہیں ایس آئی صاحب؟"

"یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں کہ دیوانی مقدمات میں ڈوبی ہوئی رقم کی وصولی آسان نہیں ہوتی۔"

"ہاں، مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ "لیکن میں اس کیس کو متاثرین کی آنے والی نسلوں تک دراز نہیں ہونے دوں گا۔"

"وہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے۔" اس نے ذومعنی انداز میں کہا۔

"آپس کی بات ہے۔" میں نے رازدارانہ انداز میں مراد علی سے سوال کیا۔ "آپ کے انچارج صاحب نے فراست علی سے اس زریں مشورے کی کتنی فیس وصول کی ہے؟"

وہ چوکنا نظر سے مجھے تکنے لگا اور ٹالنے والے انداز میں جواب دیا۔ "بیگ صاحب! میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"جانتے نہیں یا بتانا نہیں چاہ رہے؟"

اس بات کا تو مجھے شروع ہی میں اندازہ ہوگیا تھا کہ متعلقہ تھانیدار نے اپنی جیب گرم کرنے کے بعد فراست علی کو یہ پٹی پڑھائی تھی کہ وہ لوگوں سے پیسے لینے کا اقرار کرلے اور اس کے ساتھ ہی اپنے دوالیا ہوجانے کا بھی اعلان کردے تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری..... مگر وہی بات کہ سچائی جان لینے کے بعد میں نے فراست علی کا باجا بجانے کا فیصلہ کرلیا تھا جس کے لیے مجھے کسی بانس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

"بیگ صاحب!" مراد علی نے میرے استفسار کے جواب میں بڑی چالاکی سے کہا۔ "آپ کی وکالت ہمیشہ تھانے اور پولیس والوں کے خلاف رہی ہے۔ اگر اس کیس میں ہم لوگ ساتھ کام کررہے ہیں تو کیوں نہ اسے ایک حسین اتفاق سمجھ کر ہم صرف عدالتی معاملات پر توجہ دیں۔"

"ویل سیڈ!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ایس آئی صاحب! مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا..... شکریہ!"

ہمارے درمیان یہ گفتگو ڈیڑھ ماہ پہلے ہوئی تھی۔ یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزر گئے۔ اگلے ہی لمحے جج کی مخصوص بھاری بھرکم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"پراسیکیوشن! پلیز پروسیڈ۔"

اس دوران میں مراد علی کی بات چیت کے بارے میں سوچتے ہوئے میری توجہ مسلسل عدالتی کارروائی پر بھی مرکوز رہی تھی۔ فراست علی کا بیانِ حلفی ریکارڈ ہوچکا تھا۔ یہ بیان پولیس کی تحویل میں دیے گئے بیان کا عکاس تھا، یعنی وہی گھسی پٹی مظلومیت بھری کہانی کہ میں نے کسی شخص کے ساتھ مل کر یہ کام شروع کیا تھا۔ ابتدا میں تو سب ٹھیک رہا پھر میرا پارٹنر مجھے دھوکا دے گیا جس کے نتیجے میں ایجنسی کا سارا پیسا چلا گیا۔ اس وقت میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے لیکن میں ان لوگوں کے لیے اپنے دل میں گہری ہمدردی رکھتا ہوں جنہوں نے میرے ذریعے بیرونِ ملک جانے کے لیے مجھے بھاری رقوم دیں۔ میرے حالات جیسے ہی ٹھیک ہوں گے، میں سب کی ایک ایک پائی لوٹا دوں گا مگر میں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ جتنے لوگوں نے مجھ پر مقدمہ ٹھوک رکھا ہے، ان میں سے بہت سارے ایسے ہیں جن کو میں جانتا تک نہیں۔ لگتا ہے وہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے آگئے ہیں..... وغیرہم۔

جج کی "پلیز" پر میں نے لبیک کہا اور اکیوزڈ باکس کے نزدیک چلا گیا۔ فراست علی کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ بھاری تن وتوش کا مالک ایک فربہ اندام اور پستہ قامت شخص تھا۔ اس نے سر پر سفید جالی دار ٹوپی پہن رکھی تھی اور اس کی پیشانی پر محراب کا نشان بھی نظر آرہا تھا، جیسا عموماً نمازی حضرات کے ماتھے پر دکھائی دیتا ہے۔

"فراست علی!" میں نے سپاٹ آواز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کیا اور اس کے دائیں بائیں، آگے پیچھے نگاہ پھرانے کے بعد پوچھا۔ "مجھے تو تمہارے

Scanned with CamScanner

نزدیک کوئی دریا حتیٰ کہ کوئی چھوٹی سی نالی بھی رواں نظر نہیں آرہی۔ تم نے ابھی کس گنگا کے پہنے کی بات کی ہے؟"

"وہ..... وہ تو میں نے محاورتاً کہہ دیا تھا۔" اس نے کام چلاؤ اور ڈنگ ٹپاؤ قسم کا جواب دیا۔

"اچھا.....!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر استفسار کیا۔ "اس کا مطلب ہے تم واقعتاً ایک کنگال اور پھٹیچر انسان ہو؟"

"جی..... جی ہاں۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جلدی سے بولا۔ "یہی حقیقت ہے وکیل صاحب!"

"سن کر برا لگا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا اور سوال کیا۔ "تم نے اپنے بیان میں اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ استغاثہ کے گواہوں میں سے زیادہ تر کو تم جانتے تک نہیں۔ وہ لوگ موقع کا فائدہ اٹھانے کے لیے اس ہجوم میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہی بات ہے نا؟"

اس نے جواب دیا۔ "جی، یہی سچ ہے۔"

"معزز عدالت جاننا چاہتی ہے کہ تم نے کتنے لوگوں کو مستقبل کے سنہری خواب دکھا کر ان سے بھاری رقوم وصول کی ہیں؟"

"چار یا زیادہ سے زیادہ پانچ افراد ہوں گے۔"

"تمہاری حجامت بنانے کے لیے یہ تعداد بھی کافی سے زیادہ ہے۔" میں نے ناپسندیدہ نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

اس نے امداد طلب نظر سے وکیل صفائی کی طرف دیکھا لیکن میں نے ڈینس انارکی کو لب کشائی کا موقع نہیں دیا اور فراست علی پر تابڑ توڑ حملے جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم ضرورت مند لوگوں کو روزگار کے لیے دنیا کے کن ممالک میں بھجواتے تھے؟"

"زیادہ تر مشرق وسطیٰ کے ممالک میں۔"

"اور کم تر.....؟"

"کبھی کبھار میرے پاس یورپ اور امریکا کا کوئی کیس بھی آجاتا تھا۔" اس نے بتایا۔

"کیس..... بہت خوب۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "کیا تم نے اپنے آفس میں کوئی تھانہ قائم کر دیا ہے جو تمہارے پاس مختلف کیسز آیا کرتے تھے یا پھر تمہارا آفس کسی اسپتال کا ایمرجنسی وارڈ تھا؟"

"ناراض کیوں ہوتے ہیں وکیل صاحب!" اس نے شاکی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ میرے پاس آنے والوں کو کلائنٹ یا ضرورت مند سمجھ لیں۔"

"سمجھ لیا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا اور پوچھا۔ "تم کسی ضرورت مند کو بیرونِ ملک بھجوانے کے لیے کتنی رقم وصول کیا کرتے تھے؟"

"مڈل ایسٹ کے لیے پچاس ہزار اور یورپ، امریکا کے لیے اسّی ہزار کا ریٹ چل رہا تھا۔" اس نے بتایا۔

یہ آج سے کم و بیش پینتیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں ریکروٹنگ ایجنٹس لوگوں سے اتنے یا اس سے تھوڑے زیادہ پیسے ہی وصول کیا کرتے تھے۔ فراست علی نے ریٹ بتانے میں غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ان تیس افراد کے پندرہ لاکھ روپے ہڑپ کیے بیٹھے ہو؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پندرہ نہیں، محض ڈھائی تین لاکھ روپے وکیل صاحب!" اس نے زور دے کر کہا۔ "بتایا تو ہے کہ ان میں سے پانچ چھ افراد کے سوا میں اور کسی کو نہیں جانتا۔"

"ٹھیک ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "اور اس وقت تمہاری مالی حالت ایسی ہے کہ تم متاثرین میں سے کسی کو ایک روپیا بھی ادا نہیں کر سکتے۔ تھوڑی دیر پہلے تم نے اپنے بیان میں معزز عدالت کو یہی بتایا ہے نا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا۔ "اگر تمہارے نارتھ ناظم آباد والے دو سو گز پر تعمیر شدہ گھر کو فروخت کر دیا جائے تو کیسا رہے گا؟ اس سے تمہارا سارا قرضہ اتر جائے گا اور تمہارے لیے بھی کچھ پیسے بچ جائیں گے۔ قرضے سے میری مراد وہ رقوم ہیں جو تم نے سادہ لوح اور معصوم افراد سے بٹور رکھی ہیں..... انہیں بیرونِ ملک بھجوانے کا جھانسا دے کر۔"

"وہ مکان..... میرا نہیں.....!" وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔

"نارتھ ناظم آباد والا وہ گھر جس کسی کا بھی ہے، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں فراست علی!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "اگر میں غلط نہیں تو مذکورہ مکان کی مارکیٹ ویلیو دس سے بارہ لاکھ کے درمیان ہوگی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

اس نے مختصر جواب دیا۔ "آپ کا اندازہ درست ہے۔"

"فراست علی! تم نے عدالت کو بتایا ہے کہ ریکروٹنگ کے اس دھندے میں کوئی بین الاقوامی آدمی بھی تمہارے ساتھ تھا جس نے تمہیں دھوکا دیا اور تم آسمان سے زمین پر آگرے؟"

Scanned with CamScanner

digest library.com

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "اس بندے نے مجھے بتایا تھا، وہ ایک انٹرنیشنل ریکروٹنگ ایجنسی کا نمائندہ ہے اس لیے بیرونِ ملک لیبر ویزوں کا حصول اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے کیونکہ وہ انٹرنیشنل ایجنسی مختلف ملکوں کی ایمبیسیز اور وہاں کی کمپنیز سے مسلسل رابطے میں رہتی ہے جس کے نتیجے میں اس کام کے راستے میں کوئی دقت یا دشواری پیش نہیں آتی۔ شروع میں سب ٹھیک چلتا رہا۔ میں یہی سمجھا کہ قدرت مجھ پر مہربان ہوگئی ہے لیکن پھر اچانک سب کچھ الٹ کر رہ گیا۔"

"مطلب..... وہ انٹرنیشنل ریکروٹنگ ایجنٹ ڈبل اور سیون تمہیں چونا لگا کر فرار ہوگیا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کریدنے والے انداز میں کہا۔ "اگر میں غلط نہیں تو اس بندے نے تمہیں لگ بھگ پندرہ لاکھ روپے کی ڈوزدی ہے..... ہے نا؟"

"جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ بے دھیانی میں کہہ گیا۔

لیکن ان لمحات میں میرا دھیان مکمل طور پر اپنے کام پر لگا ہوا تھا، اس لیے چونکنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"تم ایک کلائنٹ سے بیرونِ ملک بھجوانے کے پچاس ہزار روپے وصول کرتے ہو؟" میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ "اس حساب سے پندرہ لاکھ روپے تیس بندوں سے لی جانے والی رقم ہے۔ کیا تم اس بزنس میں اپنے لیے کچھ نہیں رکھتے تھے؟ تم نے اپنے تیس کلائنٹس سے جو پیسے اکٹھے کیے، وہ سارے اس بے ایمان اور دھوکے باز پارٹنر کے حوالے کردیے؟"

وہ بری طرح میرے بچھائے ہوئے جال میں پھنس چکا تھا۔ اس نے اپنی عرق آلود پیشانی کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا پھر نحیف سی آواز میں بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے وکیل صاحب!"

میں کہاں اس کی جان آسانی سے چھوڑنے والا تھا۔ میں نے فوراً سوال داغ دیا۔ "پھر کیسی بات ہے؟"

"ہم ففٹی ففٹی کے پارٹنر تھے۔" دو تین گہری سانسیں لینے کے بعد وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس کے علاوہ ہمارے درمیان لین دین بھی چلتا رہتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر ہم پچاس ویزے ایک ساتھ اٹھالیں تو وہ کافی سستے پڑیں گے۔ اس طرح ہماری بچت ہوجائے گی۔ اتنے عرصے میں، میں اپنے پارٹنر پر اندھا بھروسا کرنے لگا تھا اس لیے آسانی سے اس کی باتوں میں آگیا اور میں نے اسے لگ بھگ بارہ لاکھ روپے اپنے پاس سے دے دیے۔"

وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر اپنے ماتھے پر ہاتھ مارنے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

"میری قسمت خراب تھی کہ میں لالچ میں آگیا اور اس وقت میں مجبور اور لاچار عدالت میں کھڑا ہوں۔"

"کیا تمہیں انصاف چاہیے؟" میں نے معتدل انداز میں پوچھا۔

"ہاں، ہاں..... کیوں نہیں۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ "ضرور..... بالکل۔ مجھے انصاف چاہیے۔"

"اس سلسلے میں، میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں اور وہ بھی کسی فیس کے بغیر۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر ٹھوس انداز میں کہا۔ "اگر تم مجھ سے تعاون کے لیے تیار ہوجاؤ تو۔"

"کیسا تعاون وکیل صاحب؟" اس نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

"تم مجھے اپنے دھوکے باز پارٹنر کا نام، پتا اور فون نمبر دے دو۔" میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ "وہ بندہ دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوگا، میں اسے گھسیٹ کر اس عدالت میں لے آؤں گا۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" اس نے سراسیمہ لہجے میں جواب دیا۔ "میں اس کے پتے ٹھکانے سے واقف نہیں ہوں۔ وہ ہمیشہ عالیشان ہوٹلوں میں ملاقات کرتا تھا۔ میں اس کے لباس اور رہن سہن سے مرعوب تھا اس لیے میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ مجھ سے دغا بھی کرسکتا ہے۔ ایک بار میں نے اس سے اس کے گھر کا پتا پوچھا تو اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے اور اس نے خفگی بھرے لہجے میں مجھ سے کہا تھا۔

"فراست علی! کیا تم میری نیت پر شک کررہے ہو؟"

"ایسی بات نہیں ہے بھائی!" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں جلدی سے کہا۔ "بس، وہ تو میں نے ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔"

"فراست علی! کراچی میں میرا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہے۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں زیادہ تر بیرونِ ملک رہتا ہوں اور جب کراچی آتا ہوں تو میرا قیام ہوٹل میں ہوتا ہے۔ اگر میری ذات اور بزنس کے حوالے سے تمہارے ذہن میں کسی قسم کے تحفظات پیدا ہوگئے ہیں تو ہم اس کام کو یہیں پر روک دیتے ہیں۔ آج کے بعد تم اپنے راستے پر اور میں اپنی ڈگر پر..... بولو منظور ہے؟"

"سچ پوچھیں تو وکیل صاحب، میں اس کی دھمکی سے ڈر

Scanned with CamScanner

گیا تھا۔" فراست علی نے اپنی وضاحت کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کی پارٹنرشپ میں مجھے بہت زیادہ مالی فائدہ ہو رہا تھا۔ میں اس سے الگ ہونے کا رسک نہیں لے سکتا تھا لہٰذا میں نے تھوڑی منت خوشامد کے بعد اسے منا لیا۔ اس واقعے کے چند ماہ بعد ہی اس نے پچاس ویزے ایک ساتھ خریدنے کی بات میرے سامنے رکھی تھی اور میں نے بارہ لاکھ روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے تھے۔ اس دن کے بعد وہ دوبارہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔"

فراست علی کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات سے میں نے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ انتہائی مکار، عیار اور چلتا پرزہ قسم کا انسان تھا۔ اس کی رگ رگ اور نس نس سے چالاکی ٹپکتی تھی لیکن میں نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ ایک اداکار اور "کہانی باز" بھی ہوگا۔ اس نے استغاثہ کو بے وقوف بنانے کے لیے ایک تاثر انگیز داستان سنائی تھی جو اسے مظلوم ثابت کرتی تھی۔

"نام.....!" میں نے فراست علی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر درشت لہجے میں استفسار کیا۔ "معزز عدالت تمہارے فراڈ پارٹنر کا نام جاننا چاہتی ہے۔"

"نن.....نہیں۔" یکایک اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ "میں اس کا نام کسی کو نہیں بتا سکتا۔" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "ورنہ وہ.....!"

"ورنہ وہ کیا؟" میں نے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔

"میری گرفتاری سے چند روز پہلے اس نے کسی پی سی او سے مجھے فون کر کے دھمکی دی تھی۔" فراست علی نے سراسیمہ لہجے میں جواب دیا۔ "اس نے بتایا کہ وہ بہت ہی خطرناک انسان ہے۔ اسے ایک صوبائی وزیر کی پشت پناہی حاصل ہے۔ علاوہ ازیں انڈر ورلڈ سے بھی اس کے گہرے رابطے ہیں۔ میں پیسوں کے معاملات کو بھول جاؤں۔ اگر میں نے کسی کے سامنے اس کا نام ظاہر کیا تو وہ میرے بیوی بچوں کے ساتھ بہت برا سلوک کرے گا۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور گلوگیر آواز میں التجا کی۔

"سر! آپ مجھے چاہے پھانسی کی سزا سنا دیں یا عمر قید دے دیں لیکن اس کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہ کریں ورنہ وہ میری بیوی اور بیٹے کو قتل کرانے کے بعد میری بیٹی کو جسم فروشی کے دھندے سے لگا دے گا۔"

"پراسیکیوشن!" جج نے مجھ سے پوچھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے؟"

"جنابِ عالی! فراست سراسر بکواس کر رہا ہے۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "یہ ایک من گھڑت کہانی سنا کر اپنے لیے سب کے دل میں ہمدردی جگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس شخص کا پتا ٹھکانا اسے معلوم نہیں، اس کا نام ظاہر کر دینے سے بھلا کون سی قیامت آ جائے گی اور بالفرض....." میں نے سانس ہموار کرنے کی غرض سے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ فراست علی نے معزز عدالت کو کسی فرضی کردار کی کہانی نہیں سنائی، اس کے ساتھ بارہ لاکھ روپے کا فراڈ کرنے والا وہ شخص اتنا ہی بااثر اور طاقتور ہے جیسا کہ فراست نے اس کی کردار سازی کی ہے تو پھر اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے کسی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں کہ اس بندے نے فراست کو اپنا اصل نام ہرگز، ہرگز نہیں بتایا ہوگا۔"

"ایگریڈ!" جج نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر وکیلِ صفائی سے استفسار کیا۔ "آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"یور آنر! میری معلومات کے مطابق فراست علی کی ایک بیوی اور دو بچے گھر میں اکیلے رہتے ہیں۔ یعنی اس وقت ان کی حفاظت اور سرپرستی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔" وکیلِ صفائی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "فراست کا بیٹا عدیل پندرہ سال کا ہے اور بیٹی سامیا کی عمر اٹھارہ سال ہے۔ علاوہ ازیں ان بچوں کی ماں رابعہ بیگم بھی ایک پرکشش اور خوبصورت عورت ہے۔ اگر چند لمحات کے لیے اس شخص کی دھمکی کو سچ مان لیں تو وہ خطرناک آدمی رابعہ بیگم، سامیا اور عدیل کے لیے ایسے مسائل کھڑے کر سکتا ہے جن کی ہولناکی اور سنگینی کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اب میں اس معاملے کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالنا چاہوں گا۔" اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"یہ مقدمہ جن لوگوں کی جانب سے دائر کیا گیا ہے، وہ پانچ چھ ہیں یا پھر تیس.....ان سب نے پیسے فراست علی کو دیے تھے نہ کہ اس بندے کو جس کے نام کو لے کر میرے فاضل دوست نے ایک خوامخواہ کا ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔ مدعیان سے پیسے وصول کرنے والا شخص اس وقت کٹہرے میں کھڑا ہے اور وہ اپنی غلطی کو تسلیم بھی کر چکا ہے۔ مدعیان کی ڈوبی ہوئی رقم جب بھی اور جیسے بھی فراست علی ہی کو ادا کرنا ہے تو پھر اس نامعلوم شخص کے نام کے کھوج میں عدالت کا قیمتی وقت کیوں برباد کیا جا رہا ہے۔ دیٹس آل یور آنر!"

Scanned with CamScanner

digest library.com

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت پورا ہو گیا۔ جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

☆☆☆

پچھلی پیشی پر وکیل صفائی نے منطقی طور پر جج کو خاصا متاثر کیا تھا لیکن میں اتنی آسانی سے اس نامعلوم شخص کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا جسے ایک ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہوئے فراست علی نے خود کو مجبور اور بے بس ثابت کرنے کا ڈراما رچایا تھا۔ میں نے اپنے خاص بندے کو دو اہم کام سونپ رکھے تھے۔ نمبر ایک..... فراست علی کے نارتھ ناظم آباد والے مکان کی ملکیت کے دستاویزی ثبوت اکٹھے کرنا۔ نمبر دو..... اس بے نام آدمی کا کھوج نکالنا، فراست علی جس کے کندھے کا سہارا لے کر اپنی بندوق سے تیس انسانوں کا "شکار" کر چکا تھا۔ میری یہ کوشش بفضلِ خدا دو ماہ کے بعد کامیاب ہو گئی۔ ان سنسنی خیز انکشافات کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

اس پیشی پر استغاثہ کی طرف سے رانی کو سب سے پہلے گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ رانی اس مقدمے میں مرکزی مدعی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا طویل بیان ریکارڈ کرا دیا تو جج کی اجازت سے میں جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔

"رانی! معزز عدالت جاننا چاہتی ہے کہ تم فراست علی تک کیسے پہنچے تھے؟" میں نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

"اے وکیل صاحب! سچ تو یہ ہے کہ میں اس فراڈیے کے پاس نہیں پہنچی تھی بلکہ اس نے مجھ تک رسائی حاصل کی تھی اور وہ بھی بڑے طریقے سلیقے سے۔" رانی نے اپنے مخصوص زنانہ انداز میں جواب دیا۔ "یہ بہت ہی کھوچل اور چالو قسم کا انسان ہے۔ آپ جانتے ہو ہمارا ہر گھر کے دروازے تک جانا ہوتا ہے۔ کہیں شادی کی تقریب ہو یا کسی کے گھر بچہ پیدا ہو، سب سے پہلے ہم وہاں پہنچتے ہیں۔ میری اسی کوشش سے فائدہ اٹھانے کے لیے فراست نے مجھے ایک پیشکش کی تھی۔"

"کیسی پیشکش؟" وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔

"اس نے مجھ سے کہا کہ دس بیس اور سو پچاس روپے کے لیے میں کیوں بھکاریوں جیسی زندگی گزار رہی ہوں۔" رانی نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "میں نے کہا کہ یہ تو ہمارا پیشہ ہے، اس میں بھیک مانگنے جیسا کچھ نہیں۔ ہم لوگوں کو دعائیں دیتے ہیں، ان کی بلائیں لیتے ہیں جس کے بدلے میں وہ خوش ہو کر ہمیں کچھ پیسے دے دیتے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

"یہ اتنی سی بات نہیں ہے رانی!" اس نے میری تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے فلیٹ کو میں نے پہچان لیا ہے۔ تم بہت آگے جا سکتی ہو۔ یوں چار پیسوں کے لیے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر خود کو برباد مت کرو۔ اگر تم نے میری بات مان لی تو بہت ترقی کرو گی۔"

"اس کی باتیں میرے دل کو چھونے لگیں۔ یہ مجھے ایک عورت کی حیثیت سے مخاطب کر رہا تھا جو مجھے بہت اچھا لگا۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی مرد ہمیں عورت سمجھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تو پھر بتاؤ ترقی کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"کیا تمہیں میک اپ کرنا آتا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "اپنا اور دوسری لڑکیوں کا میک اپ میں ہی کرتی ہوں۔"

"بس تو سمجھ لو کہ تمہاری قسمت کھل گئی رانی!" اس نے خوشخبری سنانے والے انداز میں کہا۔ "میں تمہیں دبئی بھجوا سکتا ہوں۔ وہاں تم ہزاروں نہیں، لاکھوں اور کروڑوں کماؤ گی۔"

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ دبئی جانے کے لیے بہت سارا پیسا چاہیے ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں دوسرے ایجنٹس کی طرح بے رحم اور سفاک نہیں ہوں رانی!" اس نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ "میں لوگوں کو دبئی اور مڈل ایسٹ کے دیگر ممالک میں بھجوانے اور وہاں نوکری دلوانے کے اسّی ہزار روپے لیتا ہوں مگر تمہارے لیے میرے پاس خاص ڈسکاؤنٹ ہے۔"

میں نے بے تابی سے پوچھا۔ "کیسا ڈسکاؤنٹ؟"

"میں تم سے صرف چالیس ہزار لوں گا۔" اس نے بتایا۔ "اس پیکیج میں ویزا، ٹکٹ اور جاب لیٹر وغیرہ سب شامل ہے۔ بس تم میک اپ میں ذرا اپنا ہاتھ صاف کر لو کیونکہ دبئی جا کر تمہیں ارب پتی شیخوں کی عورتوں کا بناؤ سنگار کرنا ہوگا۔"

"میں میک اپ والے کام میں مہارت حاصل کر لوں گی۔" میں نے کہا اور پوچھا۔ "تم مجھ پر یہ خاص مہربانی کیوں کر رہے ہو؟"

"تم مجھے اچھی لگتی ہو۔" اس نے پیار بھرے انداز میں کہا۔ "اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم ترقی کرو اور ایک شاہانہ زندگی گزارو۔ یوں سمجھ لو کہ میں اپنے لیے تم سے ایک

Scanned with CamScanner

پیسا بھی نہیں لے رہا۔ یہ چالیس ہزار روپے تو ویزا فیس اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے لیے ہیں۔"

"میں خوش ہوگئی اور اپنی جمع پونجی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ یہی نہیں، بلکہ میں نے اور بھی کئی ایک لوگوں کو اس سے ملوا دیا تھا۔ یہ ہر کلائنٹ پر مجھے پانچ ہزار روپے کمیشن دیتا تھا۔ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ دبئی جانے سے پہلے میں اپنے چالیس ہزار روپے یونہی کمیشن کے پیسوں سے پورے کرلوں گی لیکن یہ میری بھول اور اس کمینے کی چال تھی۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکی پھر اس نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔

"جج صاحب! میں نے دبئی جا کر ارب پتی عورتوں کا میک اپ کر کے لاکھوں درہم کمانے کے جو خواب دیکھے تھے، وہ اس منحوس آدمی نے چکنا چور کر دیے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے کمیشن کے لالچ میں اور بھی کئی بندوں کو اس کے جال میں پھنسا دیا لیکن میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔ اگر اس عدالت سے مجھے انصاف نہیں ملا تو میں اعلیٰ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گی۔ یہ بدبخت خود کو بہت ہوشیار سمجھتا ہے نا۔ میں نے اس کی ساری چالاکی اور ہوشیاری نہ نکال دی تو میرا نام بھی رانی نہیں ہے۔"

جج نے رانی کے اس پُرجوش اور جذباتی بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور وکیلِ صفائی کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

"ڈیفنس! پلیز پروسیڈ۔"

"رانی! آپ نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ کو دبئی کے کسی بیوٹی پارلر میں نوکری مل گئی تھی۔" وکیلِ صفائی نے ڈیفنس باکس کے نزدیک جا کر گواہ سے سوال کیا۔ "کیا آپ کے پاس ایسا کوئی سرٹیفکیٹ یا ڈگری ہے جو آپ نے کسی ٹریننگ سینٹر سے حاصل کی ہو کیونکہ بیرونِ ملک اس قسم کا روزگار حاصل کرنے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔"

"اے وکیل صاحب! میری ڈگری تو کلائی کا جادو اور آنکھوں کا کمال ہے۔ میں اپنے ہنر ہی سے سارے کام نکال لیتی ہوں۔" رانی نے وکیلِ صفائی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ "کبھی مجھے خدمت کا موقع دو پھر پتا چل جائے گا کہ میرے اندر کون کون سا گن چھپا ہوا ہے۔" اپنی بات کے اختتام پر رانی نے تالی بجاتے ہوئے آنکھ سے وکیلِ صفائی کو ایک معنی خیز اور سنسنی آمیز اشارہ بھی کر دیا تھا۔

وکیلِ صفائی، رانی کی اس بے باکی پر جھینپ کر رہ گیا۔ اپنی خفت مٹانے کی غرض سے اس نے کہا۔ "مجھے ایسا تجربہ کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ آپ سے میں نے جو سوال کیا ہے، اس کا جواب دو۔"

"جواب چاہیے تو سنو وکیل صاحب!" رانی نے عجیب سے لہجے میں بڑے غرور سے کہا۔ "میں بھی ایسے لوگوں کو منہ نہیں لگاتی جو مجرموں کی وکالت کرتے ہوں۔ میرے نزدیک کسی غلط بات کی تائید یا حمایت کرنے والا شخص بھی غلط ہی ہوتا ہے۔"

"آرڈر ان مائی کورٹ پلیز!" جج نے رانی کی طرف دیکھتے ہوئے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ "آپ ڈیفنس کونسلر سے اس انداز میں بات نہیں کر سکتے کیونکہ یہ عدالت کے وقار کے منافی ہے۔ وکیل صاحب آپ سے جو پوچھ رہے ہیں، اس کا سیدھا جواب دیں۔"

"جی سر!" رانی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر وہ وکیلِ صفائی کی جانب متوجہ ہوا۔ "آپ کے مؤکل فراست علی نے مجھ سے ایسی کسی ڈگری یا سرٹیفکیٹ کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ ہمارے درمیان جو بھی ڈیل ہوئی تھی اس کی تفصیل میں عدالت کے سامنے پیش کر چکی ہوں۔ میں تو دبئی جا کر درہم کمانے کے خیال سے اس قدر خوش تھی کہ میں نے اس کمبخت سے کوئی سوال نہیں کیا، بس اس کی مانتی چلی گئی۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں غلط تھی۔ مجھے آنکھیں بند کر کے اس دغاباز پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

رانی کے جواب پر وکیلِ صفائی سٹپٹا کر رہ گیا۔ اس جنس کے گواہ سے کبھی اس کا پالا نہیں پڑا تھا اور طبعاً وہ خاصا شرمیلا بھی تھا اس لیے رانی کی چڑھائی نے اسے قدرے حواس باختہ کر دیا تھا۔ اس نے اضطراری انداز میں اس کیس کے مرکزی مدعی اور استغاثہ کے معزز گواہ رانی سے آخری سوال کیا۔

"رانی! آپ کے بیان کے مطابق آپ نے دبئی میں ایک بیوٹیشن کی جاب حاصل کرنے کے لیے میرے مؤکل کو مبلغ چالیس ہزار روپے دیے تھے۔ کیا اس رقم کی ادائیگی کی کوئی رسید ہے آپ کے پاس؟"

"رسیدوں، جاب لیٹر، ویزا، ٹکٹ اور دیگر کاغذات کا ٹھیکا تو آپ کے مؤکل نے لے رکھا تھا وکیل صاحب!" رانی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا پھر ایک ٹھنڈی اور گہری سانس خارج کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"میں تو اسی وقت اپنا سب کچھ ہار گئی تھی جب اس نے مجھ سے پیار بھرے لہجے میں کہا کہ میں اسے بہت اچھی

Scanned with CamScanner

لگتی ہوں۔ میں ایسی ہی محبت کرنے والی ہوں۔ اگر یقین نہیں آرہا تو آزما کر دیکھ لیں وکیل صاحب!"

"مجھے تمہارے اس بے ہودہ فلینٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" وکیل صفائی نے خفگی بھرے لہجے میں "آپ" سے "تم" پر آتے ہوئے کہا۔ "تم اپنی یہ ادائیں اور عاشقانہ باتیں وکیلِ استغاثہ کے لیے بچا کر رکھو۔"

"آبجیکشن یور آنر!" میں نے بہ آواز بلند کہا۔ "میرے فاضل دوست حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ رانی کا تعلق اگرچہ انسانی معاشرے کی تیسری جنس سے ہے لیکن وہ بھی باقی دو جنس کی طرح واجب الاحترام ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ بلاوجہ ان کی تذلیل کرے اور ماشاء اللہ وکیل صفائی تو ایک پڑھے لکھے انسان ہیں۔ یہ ذمے داری ان پر کچھ زیادہ ہی عائد ہوتی ہے۔"

"آبجیکشن سسٹینڈ!" جج نے فیصلہ کن انداز میں کہا پھر وکیل صفائی سے پوچھا۔ "آپ گواہ سے کوئی اور سوال کرنا چاہتے ہیں؟"

"نو سر!" اس نے نفی میں گردن ہلائی اور مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "جنابِ عالی! گواہ رانی کا بیان ایک جذباتی تقریر سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے بغیر ٹھوس ثبوت کے جو بھی کہا، اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے لہٰذا معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ میرے مؤکل فراست علی کے حالات پر رحم کھاتے ہوئے اسے اپنے گھر جانے کی اجازت دی جائے۔ اس کے بیوی بچوں کی زندگی خطرے میں ہے۔"

"جنابِ عالی! میری جرح کے جواب میں مجرم فراست علی نے معزز عدالت کے روبرو جو کچھ بتایا، اس بیان کی روشنی میں فراست کی فیملی کو، اس کے بزنس پارٹنر کی جانب سے خطرہ تھا۔ اس بے نام اور نامعلوم شخص نے فراست کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس کا نام سامنے آیا تو وہ فراست کی بیوی اور دونوں بچوں کو عبرت کا نشان بنا دے گا۔ یہ میں نہیں کہہ رہا، میں مجرم کے بیان کو دہرا رہا ہوں اور.....!" میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بات عدالت کے ریکارڈ پر ہے کہ مجرم نے اپنے اس فرضی پارٹنر کا نام ظاہر نہیں کیا..... تو پھر اب اس کی فیملی کو کون سا خطرہ ہے؟"

جج نے استفساریہ نظر سے وکیل صفائی کی طرف دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ڈینس! اس امر کی وضاحت کریں۔"

"یور آنر! یہ بات کوئی ڈھکا چھپا راز نہیں ہے کہ پچھلے سال پاکستان کی کرکٹ ٹیم نے ورلڈ کپ جیتا ہے۔" وکیل صفائی اپنی دانست میں دور کی کوڑی لایا۔ "ہماری اس شاندار کامیابی نے دشمن پڑوسی ملک کا سینہ چھلنی کر دیا ہے کیونکہ اس کپ کو اپنے ملک میں لانے کے لیے وہ لوگ جنون کی حد تک بے چین اور خواہشمند تھے۔ اب وہ اپنی شکست کا ماتم کرنے کے لیے ہمارے ملک کی انڈر ورلڈ کا استعمال کر رہے ہیں۔ ان کی خفیہ ایجنسی کے ہماری انڈر ورلڈ سے گہرے رابطے ہیں اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ ملک کے طول و عرض میں پراسرار نوعیت کی دہشت گردی کی وارداتیں ہو رہی ہیں اور کراچی کچھ زیادہ ہی ایسی تخریبی کارروائیوں کے نشانے پر ہے۔ ایک بات خاص طور پر نوٹ کی گئی ہے کہ یہ خونریز واقعات زیادہ تر کھیل کے میدانوں میں ہو رہے ہیں.....!"

"تو اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟" جج نے قطع کلامی کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

"جنابِ عالی! میرے مؤکل فراست علی کا پندرہ سالہ بیٹا عدیل کرکٹ کا بہت شوقین ہے۔ وہ اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر کھیل کے میدان میں گزارتا ہے۔ وہ اپنی ماں کی بالکل نہیں سنتا۔ اس نازک موقع پر اگر فراست علی گھر میں موجود ہوگا تو وہ عدیل کو باہر جانے سے روک سکے گا۔"

وکیل صفائی کی لنگڑی بلکہ مضحکہ خیز وضاحت پر میں نے جج سے کہا۔ "یور آنر! چند لمحات کے لیے اگر ڈینس کونسلر کی بات کو درست مان بھی لیا جائے تو یہ خطرہ صرف مجرم کے بیٹے عدیل تک محدود نہیں ہے۔ اس خطرے کی زد میں ہر وہ نوجوان آسکتا ہے جو کھیل کے میدان میں جانے کا عادی ہے۔ گویا یہ ایک فینشل کرائسس ہے جس پر سنجیدگی سے قانون سازی کی ضرورت ہے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس ملک کے تمام باپ اپنا کام کاج اور آؤٹ ڈور مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر گھر میں بیٹھ جائیں۔"

میرے اس زہریلے اور کٹیلے وار پر وکیل صفائی خفیف سا ہو کر رہ گیا۔ میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے جج سے کہا۔

"جنابِ عالی! حالات و واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجرم فراست علی نے اس معاشرے کے صرف انہی لوگوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے جو مالی طور پر کمزور ہونے کے ساتھ ہی بیرونِ ملک جا کر دولت کمانے کے

Scanned with CamScanner

digest library.com

جنون میں مبتلا ہیں۔ وہ قانونی معاملات کا زیادہ شعور بھی نہیں رکھتے اسی لیے وہ اس گھاگ شکاری کے جھانسے میں آ گئے تھے۔ دیٹس آل یور آنر!"

"پراسیکیوشن!" جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "آپ اپنا اگلا گواہ پیش کریں۔"

جج کے حکم پر استغاثہ کی جانب سے حسن نامی ایک شخص کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ حسن کی تعلیم صفر کے برابر تھی۔ وہ ایک سیدھا سادہ مزدور پیشہ محنت کش تھا جو بیرونِ ملک جا کر اپنی قسمت آزمانا چاہتا تھا۔ حسن کی ماں نے پچاس ہزار کی ایک کمیٹی ڈال رکھی تھی۔ یہی رقم حسن نے اٹھا کر فراست کو دے دی تھی۔ وہ پہلی مرتبہ کسی عدالت میں پیش ہوا تھا اس لیے خاصا گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

حسن نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور پریشان نظر سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی حواسی کیفیت کے پیشِ نظر مختصر اور نرم جرح کی۔ میرے بعد وکیل صفائی کی باری آئی۔

"حسن صاحب!" وکیلِ صفائی نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر تیز لہجے میں استفسار کیا۔ "آپ نے اپنی رقم کے ثبوت کے طور پر جو رسید عدالت میں پیش کی ہے، اس کا تو کوئی سر پیر ہی نہیں۔ کیا یہ آپ نے خود ہی تیار کر لی ہے؟"

"آبجیکشن یور آنر!" میں نے فوراً اعتراض جڑ دیا۔ "استغاثہ کا گواہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ میرے فاضل دوست کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہے۔ وہ خوامخواہ اس سادہ لوح شریف آدمی پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"ڈینیس؟" جج نے سوالیہ نظر سے وکیلِ صفائی کی طرف دیکھا۔

"جنابِ عالی!" ڈینیس انارنی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "رسید کے خود ہی تیار کر لینے سے میری مراد تھی کہ کسی پڑھے لکھے شخص سے گواہ نے کاغذ پر یہ تحریر لکھوائی ہوگی کیونکہ یہ رسید قانونی تقاضے پورے نہیں کرتی۔ اپنی بات کی تصدیق کے لیے میں اس مختصر سی تحریر کا مضمون پڑھ کر عدالت کو سناتا ہوں۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"میں نے حسن سے مبلغ پچاس ہزار روپے وصول پائے..... فراست علی!"

"آبجیکشن اوور رولڈ!" جج نے وکیلِ مخالف کی دلیل پر میرا اعتراض مسترد کر دیا۔

"حسن! اس تحریر سے یہ تو ظاہر ہو رہا ہے کہ تم نے میرے مؤکل کو مبلغ پچاس ہزار روپے دیے تھے۔" وکیلِ صفائی نے استغاثہ کے گواہ پر جرح جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ "لیکن یہ واضح نہیں ہو رہا کہ یہ رقم کس مد میں دی گئی تھی۔ کیا تم نے فراست علی کو پچاس ہزار روپے قرض دیے تھے یا پہلے سے لیا ہوا اس کا قرض واپس کیا تھا؟"

"م..... میں نے یہ پیسے فراست علی کو اس لیے دیے تھے کہ وہ مجھے ملک سے باہر بھجوا دے۔" گواہ نے قدرے ہمت کرتے ہوئے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "اس نے مجھ سے پچاس ہزار روپے مانگے تھے اور..... میں نے دے دیے۔"

"لیکن کاغذ کے اس ٹکڑے سے تمہارا کہا ثابت نہیں ہو رہا۔" وکیلِ صفائی نے سخت لہجے میں کہا۔ "اور اس نام نہاد رسید پر کوئی تاریخ یا دستخط بھی نہیں ہیں۔"

حسن پریشانی سے اِدھر اُدھر تکنے لگا۔

"جنابِ عالی!" وکیلِ صفائی نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "استغاثہ کا گواہ ایسا کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کر سکا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اس نے فلاں تاریخ کو کس کام کے لیے پچاس ہزار روپے دیے تھے۔ ایسی رسیدیں معزز عدالت اور قانون کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتیں۔"

"پراسیکیوشن! آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟" جج نے مجھ سے پوچھا۔

"یور آنر! اگرچہ استغاثہ کا گواہ تعلیم یافتہ نہیں لیکن جرح کے دوران میں وہ اپنے بیان پر قائم رہا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میرے فاضل دوست پچاس ہزار روپے والی اس رسید کو اس طرح لے کر بیٹھ گئے ہیں کہ انہیں اور کسی کاغذ کا ہوش ہی نہیں رہا۔ اس رسید کے ساتھ ہی وہ آفر لیٹر بھی کیس فائل میں لگا ہوا ہے جو مجرم فراست نے بیرونِ ملک نوکری کی تصدیق کے ذیل میں گواہ کو جاری کیا تھا۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ کسی ماہر تحریر شناس سے ان دونوں پیپرز کا تجزیہ کرایا جائے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ.....!" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اس کے علاوہ استغاثہ کے گواہ کے دعوے کی تصدیق ایک اور ذریعے سے بھی کی جا سکتی ہے، وہ بھی ابھی اور اسی وقت۔"

"کس ذریعے سے؟" جج نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

Scanned with CamScanner

''مجرم فراست علی اس وقت کرائے عدالت میں موجود ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ بندہ حلفیہ اقرار کر چکا ہے کہ اس نے پانچ یا چھ لوگوں سے پچاس، پچاس ہزار روپے وصول کیے تھے۔ اسی سے پوچھ لیتے ہیں کہ اس کے بیان کے مطابق اس نے جن پانچ چھ بدقسمت افراد کو چونا لگایا، کیا ان میں حسن کا نام بھی شامل ہے؟''

جج کو میری تجویز پسند آئی۔ اس نے فراست علی سے پوچھا۔ ''کیا تم نے حسن سے بھی پچاس ہزار روپے وصول کیے تھے؟''

اس نے کمال ڈھٹائی سے انکار کر دیا۔

''پھر تمہارا جاری کردہ جاب آفر لیٹر استغاثہ کے گواہ حسن کے پاس کیسے پہنچا؟'' جج نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

فراست نے جواب دیا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

جج نے اس کے بعد مذکورہ دونوں تحاریر کی جانچ پڑتال کے احکامات صادر کر دیے۔

''جنابِ عالی!'' میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اپنے اگلے گواہ کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

''پرمیشن گرانٹیڈ!'' جج نے معتدل انداز میں کہا۔

وحید احمد وٹنس باکس میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

وحید ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ اس نے ایک معروف ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ سے الیکٹریکل انجینئرنگ میں ڈپلوما کر رکھا تھا۔ اسے پاکستان میں اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا اسی لیے وہ ملک سے باہر جا کر اپنی قسمت کو آزمانا چاہتا تھا۔ اس کے باپ کا ملیر کے علاقے میں ایک پلاٹ تھا۔ مذکورہ پلاٹ فروخت کرنے کے بعد وحید نے پچاس ہزار روپے فراست علی کو دے دیے تھے۔

وحید احمد اپنا بیانِ حلفی ریکارڈ کرا چکا تو میں نے مختصر سی جرح کے بعد اسے فارغ کر دیا۔ اپنی باری پر وکیل صفائی وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔

''وحید صاحب! آپ تو ماشاء اللہ پڑھے لکھے انسان ہیں۔'' ڈیفنس کونسلر نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر آپ کو ملک سے باہر جانے کی کیا سوجھی؟ آپ کے پاس تو انجینئرنگ کا ڈپلوما ہے۔''

''ڈپلوما، سرٹیفکیٹ اور ڈگری میں بہت فرق ہوتا ہے وکیل صاحب!'' وحید نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔ ''یہاں تو انجینئرنگ یونیورسٹی کے ڈگری یافتہ بھی بیروزگار گھوم رہے ہیں۔ ان کے مقابلے میں میری اور میرے ڈپلوما کی بھلا کیا اوقات ہے۔''

''جب میرے مؤکل نے آپ کو یو اے ای کی جاب والا آفر لیٹر دیا تھا تو آپ نے اس کمپنی میں فون کر کے اپنی ملازمت کی تصدیق کیوں نہیں کی تھی؟'' وکیل صفائی نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

''وکیل صاحب! اس موقع پر میں خود فراست علی کے آفس گیا تھا۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''شارع فیصل کے اس آفس میں سب کچھ اصلی نظر آ رہا تھا۔ ابھی آپ نے مجھ سے جو سوال کیا ہے، اسی حوالے سے میں نے فراست سے بات کی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ابھی اس کمپنی میں فون کرنا مناسب نہیں ہوگا کیونکہ میرا ویزا پروسس میں ہے۔ جب ویزا وہاں سے اشو ہو جائے گا تو اس کی ایک کاپی متعلقہ کمپنی کو بھی بھیج دی جائے گی۔ تب میں اس کمپنی میں فون کر کے اپنی جاب کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں۔ میں نے اس پر بھروسا کر لیا اور یہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی..... ایک بھیانک غلطی۔'' بات کے اختتام پر وحید نے باقاعدہ جھرجھری بھی لی۔

''کیا فراست نے آپ کو ویزا پروسسنگ کی فیس کی ادائیگی کی، متعلقہ ایمبیسی سے جاری کردہ مہر لگی رسید دی تھی؟'' وکیل صفائی نے سوال کیا۔

گواہ نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''پھر تو آپ میں اور کسی جاہل گنوار شخص میں سرمو فرق نہیں ہے وحید صاحب!'' وکیل صفائی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ نے پچاس ہزار کے بدلے ہاتھ سے لکھی ہوئی کچی رسید پر اکتفا کر لیا، گویا آپ نے ایک سنگین خطرہ مول لیا تھا جس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ میرے مؤکل کو مورد الزام ٹھہرانے سے آپ اپنی کوتاہی کو نہیں چھپا سکتے۔''

اس نے لمحاتی توقف کیا پھر جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! اب کچھ آپ کے سامنے ہے۔''

''یور آنر! استغاثہ کا گواہ حسن علی ناخواندہ اور بے وقوف تھا یا وحید احمد خواندہ اور کوتاہ اندیش، اس سے مجرم فراست علی کے جرم کی سنگینی کم نہیں ہو جاتی۔'' میں نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ''اپنے کلائنٹس کو جعلی دستاویزات کی فراہمی مجرم کی کھلی بدنیتی کو ظاہر کرتی ہے۔ گرفتاری کے وقت پولیس نے مجرم کے گھر سے جعلسازی کا اتنا زیادہ مواد حاصل کیا ہے جو اسے کسی بھی صورت بچنے نہیں دے گا۔ ہم

Scanned with CamScanner

نے ان تھکی دستاویزات پر ایک ماہر کی قیمتی رائے بھی لی ہے۔ اس گواہ کو آئندہ پیشی پر عدالت میں حاضر کیا جائے گا..... دیس آل ہے رآنرا"

جج نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی۔ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں صرف دس منٹ باقی تھے۔ اس قلیل مدت میں کسی اور گواہ کو پیش کرنا ممکن نہیں تھا لہٰذا آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر جج نے عدالت برخاست کردی۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کے تین گواہ عدالت میں پیش کیے گئے جن میں سلیم رانا ایک درزی تھا، ناصر حسین واٹر بورڈ کا ملازم تھا اور جنید خان چائے کے ہوٹل پر کام کرتا تھا۔ یہ تینوں افراد پاکستان سے باہر جا کر خوب پیسا کمانا چاہتے تھے مگر فراست علی نے ان کے ارمانوں پر اوس چھڑک دی تھی۔ ان تینوں کی گواہی میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں، اس لیے میں آگے بڑھتا ہوں کیونکہ اس کے بعد دو اہم گواہیاں ہیں۔

مجرم فراست علی کے گھر سے ملنے والے جعلسازی کے سامان کا باریک بینی سے معائنہ کرنے والے شخص نے معزز عدالت کو بتایا۔

"جنابِ عالی! میں ایک اچھی ساکھ والی ریکروٹنگ ایجنسی میں گزشتہ دس سال سے کام کر رہا ہوں۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ یہاں پر جس ریکروٹنگ ایجنسی کے خلاف کیس زیرِ سماعت ہے، میں نے اس سے پہلے کبھی اس ایجنسی کا نام نہیں سنا۔ نمبر دو، مجھے جو دستاویزات اور مہریں وغیرہ مہیا کی گئی تھیں، میں نے انہیں توجہ سے جانچا ہے اور یہ سب کچھ صد فیصد نقلی اور فراڈ ہے۔ ملازمت کی غرض سے بیرونِ ملک بھیجنے کا طریقۂ کار بالکل مختلف ہوتا ہے۔ میں بس اتنا ہی کہوں گا کہ فراست علی معصوم اور سادہ لوح لوگوں کو دھوکا دے رہا تھا۔"

اگلی گواہی امین عباس نامی ایک شخص کی تھی۔ امین عباس وہی بندہ تھا جو فراست علی کے ایجنسی والے آفس کا مالک تھا۔ جب وہ سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا چکا تو میں جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔

"امین صاحب!" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے شائستہ لہجے میں استفسار کیا۔ "آپ نے مجرم کو جو آفس کرائے پر دیا ہوا تھا، عدالت کو اس کی درست لوکیشن کے بارے میں بتائیں گے؟"

گواہ نے نرسری کے نزدیک شارع فیصل پر واقع ایک کمرشل بلڈنگ کا نام لینے کے بعد بتایا۔ "میں نے اس بندے کو ایک چھوٹا آفس کرائے پر دیا تھا جس کا نمبر جی۔ فائیو ہے۔"

"یعنی مذکورہ آفس گراؤنڈ فلور پر واقع ہے؟"

"جی ہاں..... مگر بلڈنگ کی عقبی جانب۔" اس نے جواب دیا۔

"اس آفس کا کرایہ کتنا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "اور ایڈوانس کی مد میں آپ نے مجرم سے کتنی رقم لی تھی؟"

"آفس کا کرایہ ڈیڑھ ہزار تھا اور اس نے مجھے تین ماہ کا کرایہ بطور ایڈوانس دیا تھا۔"

"یعنی صرف ساڑھے چار ہزار روپے؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "شارع فیصل پر واقع ہر عمارت کی بہت زیادہ مارکیٹ ویلیو ہے پھر آپ نے اتنے کم کرائے پر وہ آفس مجرم کے حوالے کیوں کر دیا تھا اور وہ بھی ایڈوانس کی کوئی بھاری رقم پکڑے بغیر؟"

اگرچہ یہ واقعہ آج سے لگ بھگ بتیس سال پہلے کا ہے پھر بھی اس دور کے حساب سے وہ کرایہ واقعی خاصا کم تھا۔

"اس کی چند وجوہ ہیں وکیل صاحب!" امین عباس وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میرا وہ آفس بلڈنگ کی عقبی جانب واقع ہونے کے سبب خاصا دبا ہوا تھا اور چند ماہ سے خالی بھی پڑا ہوا تھا جس کے نتیجے میں ظاہر ہے میرا نقصان ہو رہا تھا اس لیے میں نے یہ قدم اٹھالیا۔ دوسری جانب اس بندے کی بھی چند مجبوریاں تھیں۔"

وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا تو میں نے سوال داغ دیا۔ "مثلاً کیسی مجبوریاں امین صاحب؟"

"اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ اوورسیز ریکروٹنگ کنسلٹینسی کا آفس کھول رہا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "کام نیا ہے اس لیے یہ نہیں جانتا کہ چلے گا یا نہیں۔ سو، تین ماہ کے لیے ایک تجربہ کر کے دیکھتے ہیں۔ اگر میرا بزنس چل نکلا تو میں زیادہ رقم ادا کر کے باقاعدہ ایگریمنٹ کرلوں گا، بصورتِ دیگر میں تین ماہ پورے ہونے سے پہلے آپ کا آفس خالی کردوں گا۔ اس کی یہ تجویز مجھے پسند آگئی اور میں نے تین ماہ کے لیے وہ آفس اسے دے دیا۔"

"اور وہ بھی کسی لکھت پڑھت کے بغیر؟"

اس نے مختصر جواب دیا۔ "جی ہاں۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد میں نے خیر خیریت

Scanned with CamScanner

digest library.com

دریافت کرنے کے لیے اسے فون کیا تو اس کا نمبر بند آرہا تھا۔" گواہ نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ "میں تشویش میں مبتلا ہوگیا اور آئندہ روز میں آفس جا پہنچا اور یہ دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا کہ ریکروٹنگ ایجنسی کے تمام بورڈز غائب تھے اور آفس پر تالا پڑا ہوا تھا۔ میں نے آس پاس کے لوگوں کو بلا کر ان کی موجودگی میں جب تالا توڑا تو مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ آفس کے اندر کچھ بھی نہیں تھا، سوائے نام اللہ کے۔"

"آپ سے آخری سوال امین عباس صاحب!" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "جب آپ نے مجرم کے آس پاس والے آفسز کے لوگوں سے بات کی تو آپ کو فراست کی آفس ٹائمنگ کے بارے میں کیا پتا چلا تھا؟"

"یہ دن میں گیارہ بارہ بجے تک آفس آتا تھا۔" گواہ نے جواب دیا۔ "اور رات کو بجے تک آفس میں موجود رہتا تھا۔"

"جنابِ عالی!" میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ مجرم فراست علی نے وہ آفس لوگوں کو متاثر اور مرعوب کرنے کے لیے لیا تھا۔ جب اس کا مقصد پورا ہوگیا تو یہ کم و بیش پندرہ لاکھ روپے سمیٹ کر منظر سے غائب ہوگیا۔ اس تناظر میں.....!" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر دبنگ اور بلند آواز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس تناظر میں وکیلِ صفائی کا یہ مؤقف بے جان ثابت ہوجاتا ہے کہ مجرم فراست علی ایک نیک انسان ہے۔ اس نے اپنے کلائنٹس کے ساتھ دھوکا نہیں کیا بلکہ اس کا پارٹنر اسے چونا لگا کر زمین کے نیچے کی دنیا میں غائب ہوگیا ہے۔ فراست علی نے شروع ہی سے سادہ لوح اور معصوم لوگوں کو دھوکا دینے کا منصوبہ بنا رکھا تھا اور میرے اس دعوے کا ایک اور ناقابلِ تردید ثبوت محترم امین عباس کا بیان بھی ہے۔ کوئی چور، ڈاکو، لٹیرا اور فسر باز شخص ہی یوں چپ چاپ منظر سے غائب ہوجاتا ہے۔ اس کیس کے ثابت میں آخری کیل ٹھوکنے کا وقت آگیا ہے۔ آئندہ پیشی پر میں سب کو حیران کردوں گا۔ دیٹس آل یور آنر!"

"ڈیفنس!" جج نے وکیلِ صفائی سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ "آپ اپنے موکل کی حمایت میں کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"جنابِ عالی! میں اب بھی اپنے مؤقف پر قائم ہوں کہ میرا موکل دل اور نیت کا میلا نہیں ہے۔" وکیلِ صفائی نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ "میں فراست علی کی شرافت اور پرہیزگاری کو ثابت کرنے کے لیے اپنے ایک معزز گواہ کو کٹہرے میں بلانے کی اجازت چاہوں گا۔"

جج نے معتدل انداز میں کہا۔ "اجازت ہے۔"

صفائی کا گواہ حافظ بشیر احمد وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا۔ بشیر احمد اس مسجد کی کمیٹی کا صدر تھا جہاں فراست علی نماز ادا کرنے جایا کرتا تھا۔ گواہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر بیان ریکارڈ کرادیا تو وکیلِ صفائی اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

"حافظ جی!" اس نے جرح کی شروعات کرتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ فراست علی کے کردار کے بارے میں کیا کہیں گے؟"

"میں فراست علی کو اچھی طرح جانتا ہوں وکیل صاحب!" گواہ نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "یہ پانچوں وقت ہماری مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے آتا تھا۔ میں نے اسے ایک نیک دل اور عبادت گزار مسلمان پایا ہے۔"

"فراست علی اس وقت دھوکا دہی کے ایک مقدمے میں پھنسا ہوا ہے حافظ جی!" وکیلِ صفائی نے اپنے الفاظ گواہ کے منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کے خیال میں فراست ایسی گھناؤنی حرکت کرسکتا ہے؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وکیل صاحب!" گواہ نے پرجوش انداز میں جواب دیا۔ "اچھا برا وقت ہر انسان پر آتا ہے اور یہ اللہ کی طرف سے بندے کی آزمائش ہوتی ہے۔ میری نظر میں فراست علی بے ایمان اور فریبی شخص ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس وقت یہ کڑے امتحان سے گزر رہا ہے اور مجھے یقین ہے بہت جلد یہ پروردگار کی بارگاہ میں سرخرو ہوجائے گا۔"

"جنابِ عالی!" وکیلِ صفائی اپنے گواہ کو چھوڑ کر جج کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولا۔ "حافظ بشیر احمد ہمارے معاشرے کے ایک معزز اور معتبر انسان ہیں اور یہ میرے مؤکل کے بے داغ ماضی اور اس کے اعلیٰ کردار کی تصدیق کررہے ہیں۔"

"پراسیکیوشن!" جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔ "بشیر صاحب!" میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جما کر اپنی جرح کا آغاز کردیا۔ "کیا میں آپ کا پورا نام جان سکتا ہوں؟"

"حافظ سید بشیر احمد!" اس نے حلق کا پورا استعمال کرتے ہوئے کراری آواز میں جواب دیا۔

"سید صاحب! آپ نے تھوڑی دیر پہلے اللہ کی

Scanned with CamScanner

مقدس آسمانی کتاب قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر سچ بولنے کا حلف اٹھایا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا میں امید رکھوں کہ آپ میرے سوالوں کے بالکل درست جواب دیں گے؟"

"ایک دم کھرے اور سچے جواب وکیل صاحب!" اس نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "میرے استادوں نے مجھے یہی تعلیم دی ہے کہ چاہے گردن تلوار کی قاتل دھار کے نیچے کیوں نہ ہو، ایک مومن کو ہمیشہ حق اور سچ بات کہنا چاہیے۔"

"آپ فراست علی کو کب سے جانتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"لگ بھگ ایک سال سے۔"

"کیا اس سے پہلے یہ کہیں اور رہتا تھا؟"

"نہیں۔" گواہ نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ "یہ تو سالہا سال سے اسی مکان میں رہ رہا ہے لیکن میں متعلقہ مسجد میں کم و بیش ایک سال پہلے آیا تھا اور تب سے میں فراست کو مسجد میں پابندی سے آتا دیکھ رہا ہوں۔"

"یور آنر! پوائنٹ ٹو بی نوٹیڈ۔" میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا۔ "ایک معزز اور معتبر شخص حافظ بشیر احمد کے مطابق مجرم فراست علی سالہا سال سے اپنے نارتھ ناظم آباد والے گھر میں رہائش پذیر ہے۔" پھر میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"حافظ صاحب! کیا یہ سچ ہے کہ فراست علی گاہے بہ گاہے مسجد کمیٹی کو بھاری چندے بھی دیا کرتا تھا؟" میں نے استفسار کیا۔ "آپ مسجد کمیٹی کے صدر ہیں۔ یہ بات آپ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔"

"جی، یہ بات درست ہے کہ فراست علی ایک فیاض، دریا دل اور نیک سیرت انسان ہے۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ مسجد کی خدمت کے علاوہ دوسرے سفید پوش اور ضرورت مند افراد کی بھرپور مدد بھی کیا کرتا تھا۔"

"سید صاحب! قرآن کریم دروغ گوئی کے بارے میں کیا کہتا ہے؟" میں نے صفائی کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"جھوٹ بولنا ایک قبیح اور مکروہ فعل ہے۔" اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ "قرآن پاک میں کئی مقامات پر اس کی مذمت کی گئی ہے۔"

"حافظ صاحب!" میں نے صفائی کے گواہ کو کند چھری سے ذبح کرتے ہوئے مضبوط لہجے میں پوچھا۔ "اس بات میں کس حد تک صداقت ہے کہ اپنی گرفتاری سے پہلے تک فراست علی آپ کی مسجد میں پابندی سے پانچ وقت باجماعت نماز ادا کرنے آیا کرتا تھا؟"

"یہ صد فیصد سچی بات ہے۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"بشیر احمد!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "حقیقت کا علم تو صرف میرے معبود کو ہے لیکن اس عدالت کے ریکارڈ کے مطابق آپ نے مجھے تھوڑی دیر پہلے اپنا مکمل نام بتایا تھا..... حافظ سید بشیر احمد!"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

"آپ سید بھی ہیں اور حافظ قرآن بھی۔" میں نے گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر معنی خیز انداز میں کہا۔ "آپ کو غلط بیانی کرتے ہوئے ذرا سی بھی شرم نہیں آئی؟"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل صفائی نے بلبلا کر طیش بھرے انداز میں کہا۔ "وکیل استغاثہ نے بداخلاقی کی تمام حدود ایک ہی جست میں پھلانگ ڈالی ہیں۔ کسی معزز گواہ کو دروغ گو کہنا ایک گھناؤنی حرکت بلکہ غلیظ گالی ہے۔ معزز عدالت سے میری پرزور اپیل ہے کہ وہ وکیل سرکار کو سرعام معافی مانگنے کے احکامات صادر کرے۔"

میری کاری ضرب پر وکیل صفائی ہیجانی انداز میں ایسے چلا اٹھا تھا جیسے دو نادیدہ ہاتھوں نے اسے اٹھا کر یکایک گرم توے پر بٹھا دیا ہو۔ جج نے معذرت یا معافی کا حکم دینے کے بجائے گمبھیر انداز میں کہا۔

"آبجیکشن سسٹینڈ! پراسیکیوشن اپنے رویے کی وضاحت کریں۔"

"یور آنر!" میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے استغاثہ کے ایک گواہ امین عباس نے میرے ایک سوال کے جواب میں عدالت کو بتایا ہے کہ مجرم فراست علی اپنے آفس میں روزانہ دن بارہ بجے سے رات نو بجے تک موجود ہوتا تھا۔ انہی کم و بیش نو گھنٹوں کے دوران میں تین نمازوں ظہر، عصر اور مغرب کے اوقات پڑتے ہیں۔ مجرم کا آفس شارع فیصل پر اور بشیر احمد صدر مسجد کمیٹی کی مسجد، نارتھ ناظم آباد میں واقع ہے۔ یہ فاصلہ کم از کم آدھے گھنٹے اور زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں طے کیا جا سکتا ہے۔ اگر اوسط وقت پینتالیس منٹ بھی لگا لیے جائیں تو آنے اور جانے کے ایک پھیرے کے لیے ڈیڑھ گھنٹا درکار ہو گا یعنی تین نمازوں کے لیے ساڑھے چار گھنٹے۔ اگر اس میں تین نمازوں کی ادائیگی اور قبلہ حافظ جی سے گپ شپ کا وقت بھی جوڑ لیا جائے.....!"

Scanned with CamScanner

میں نے دانستہ ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سنسنی خیز لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ".....تو کل ملا کر وقت بن جائے گا تقریباً پانچ سے چھ گھنٹے۔ یہ قرین عقل نہیں ہے کہ فراست علی اپنے آٹھ نو گھنٹے کے آفس اوقات کار میں سے پانچ چھ گھنٹے نکال کر شارع فیصل سے نارتھ ناظم آباد، عصر اور مغرب باجماعت ادا کرنے جاتا ہوگا جس کا سیدھا سادہ مطلب یہی نکلتا ہے کہ گواہ بشیر احمد ایک عیار، مکار اور سند یافتہ کذاب ہے۔ اصلاً نسلاً سادات اور حافظ سے میری دست بستہ درخواست ہے کہ وہ بشیر احمد جیسے لفنگی اور دو نمبر افراد پر گہری نظر رکھیں تاکہ معاشرے کے اندر ان کا روایتی اور حقیقی تقدس و تشخص برقرار رہے..... مجھے اور کچھ نہیں کہنا جناب عالی!"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا محدود وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دلائل کے لیے اگلی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"دی کورٹ از ایڈ جارنڈ فار دی ڈے!"

رانی ہر پیشی پر عدالت میں لازمی حاضر ہوتا تھا۔ میں کورٹ روم سے باہر نکلا تو وہ بھی میرے ساتھ تھا۔ کوریڈور میں چلتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔

"اے وکیل صاحب! میں تنہائی میں آپ سے چند منٹ کی ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔"

اس کے معنی خیز اور پراسرار انداز کو دیکھ کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے نہایت ہی محتاط لہجے میں پوچھا۔ "تنہائی میں کیوں رانی؟"

"آپ جب مجھے "رانی" کہتے ہیں تو میں اندر باہر سے جھوم اٹھتی ہوں وکیل صاحب!" وہ معشوقانہ انداز میں بولا۔

میرے کھڑے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "کیا وہ سب تم مجھ سے یہاں نہیں کہہ سکتے، جس کے لیے تنہائی میں ملنا چاہتے ہو؟"

"سمجھا کریں وکیل صاحب!" وہ آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتی ہوں جو میں نے یہاں چھپا رکھا ہے۔" بات کے اختتام پر اس نے اپنے سینے کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

"رانی! کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟" میں نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ "یہ تم کیسی واہیات باتیں کر رہے ہو؟"

"آپ بے تکلفی میں میرے ساتھ "آپ" سے "تم" تک چلے آئے، مجھے آپ کا یہ انداز اچھا لگا ہے۔" اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔ "آپ میری بات کا کوئی ایسا ویسا مطلب نہ نکالیں وکیل صاحب! میں نے اپنے دل میں ایک کیل دبا رکھی ہے جو اس کیس کے ثابت کے لیے آخری ثابت ہوگی۔ آپ نے تھوڑی دیر پہلے عدالت میں یہی کہا تھا نا..... اس کیس کے ثابت میں آخری کیل ٹھوکنے کا وقت آ گیا ہے اور آئندہ پیشی پر میں سب کو حیران کر دوں گا؟" بات ختم کر کے اس نے مجھے سوالیہ نظر سے دیکھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ "ہاں، میں نے کہا تھا۔"

اس نے اپنے پرس میں سے ایک پاکٹ سائز منی ٹیپ ریکارڈر نکالا اور مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کو کچھ سنانا چاہتی ہوں۔"

میں ایک گہری اور آسودہ سانس لے کر رہ گیا۔

☆☆☆

دیوانی مقدمات کے بارے میں عمومی تاثر یہی ہے کہ سالوں نہیں، صدیوں چلتے ہیں۔ اگر دادا نے کوئی کیس کر رکھا ہو تو اس کا فیصلہ پوتے کی زندگی میں جا کر ہوتا ہے لیکن میں اس کیس کو جلد از جلد نمٹانے کے موڈ میں تھا اسی لیے میں نے اپنا ہوم ورک اچھے سے مکمل کر رکھا تھا۔ اگرچہ فراست علی نے ریمانڈ کی مدت کے دوران میں اقبال جرم کر کے پولیس کا کام آسان کر دیا تھا اور انچارج صاحب نے اپنی "دہاڑی" بھی لگا لی تھی لیکن میں نے اپنے کلائنٹ سے جو فیس وصول کی تھی، اس کے ایک ایک پیسے کو رزق حلال میں ڈھالنا مجھ پر لازم تھا۔ سو، میں وہی کر رہا تھا۔

اس پیشی پر دونوں طرف کے وکلاء نے دلائل دینا تھے۔ وکیل صفائی نے اس ذیل میں وہی گھسی پٹی باتیں کیں جو وہ اس کیس کی ابتدا سے اب تک کرتا چلا آ رہا تھا، یعنی اس کے موکل کے پارٹنر نے اسے دھوکا دیا تھا اس لیے وہ بھی دست و بھی داماں ہو چکا ہے لہٰذا وہ فوری طور پر متاثرین کو ان کی رقم واپس نہیں کر سکتا..... وغیرہم!

اپنی باری پر میں نے فراست علی کے نارتھ ناظم آباد والے دو سو گز (کم و بیش سات مرلے) پر تعمیر شدہ گھر کے کاغذات کی فائل کی فوٹو کاپی جج کے سامنے میز پر رکھنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جناب عالی! یہ اس مکان کی ملکیت کی قانونی دستاویزات کا "فوٹو کاپی سیٹ" ہے جہاں اس وقت بلکہ پچھلے پندرہ سال سے مجرم فراست علی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہ رہا تھا اور اب اس کی بیوی اور دو بچے عدیل و سامیا رہائش پذیر ہیں۔ عدیل اسی گھر میں پیدا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے متعلقہ ڈیپارٹمنٹ سے یہ کاغذات نکلوائے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ مجرم فلاں،

Scanned with CamScanner

digest library.com

مفلس یا پھٹیچر نہیں ہے۔ مذکورہ پراپرٹی کی موجودہ قیمت دس سے بارہ لاکھ تک ہے۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ فراست علی کے اس گھر کو فروخت کر کے اس رقم سے متاثرین کی دادرسی کی جائے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے کیے جاسکیں۔"

جج نے بغور اس فائل کا مطالعہ کیا پھر وکیلِ صفائی کو بھی وہ تمام کاغذات دکھائے، اس کے بعد کڑے لہجے میں فراست علی سے استفسار کیا۔

"تم نے عدالت سے غلط بیانی کیوں کی؟"

جب کوئی شخص چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تو اپنی صفائی میں کہنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں بچتا۔ ان لمحات میں فراست علی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اصلی بے بسی اور لاچاری صحیح معنوں میں اب اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔

"مجھے معاف کردیں جج صاحب!" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں اپنی اس حرکت پر بہت شرمندہ ہوں۔"

"یور آنر! ابھی پکچر باقی ہے۔" میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو کچھ سنوانا چاہتا ہوں۔"

جج سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ وکیلِ صفائی کی حالت بھی دگرگوں تھی۔

میں نے رانی کی فراہم کردہ ٹیپ (کیسٹ) کو آن کر کے "پلے" پر سیٹ کیا اور اس پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر کو فل والیوم کے ساتھ جج کی میز پر رکھ دیا۔ اگلے ہی لمحے وہاں سے پہلے ایک شخص کی پھر دو افراد کی گفتگو نشر ہونے لگی۔

"رانی! میں نے تمہیں ہمیشہ اپنے دل کی رانی سمجھا ہے۔ ہمارے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں، انہیں دور کرنے کا وقت آگیا ہے۔ تم یہ کیس واپس لے لو، اس کے بدلے میں، میں تمہیں چالیس ہزار روپے اور سرجانی ٹاؤن والا ایک پلاٹ دینے کو تیار ہوں۔"

اس کے بعد وہ آواز آنا بند ہوگئی اور دو افراد کی بات چیت شروع ہوگئی۔

"رانی! میں نے تمہیں فراست بھائی کا پیغام دے دیا ہے۔ یہ تمہارے لیے فائدے کا سودا ہے۔ کیا کہتی ہو؟ تم جو جواب دو گی، وہ میں فراست بھائی تک پہنچادوں گا۔" کسی مرد نے کہا۔

"مجھے سوچنے کے لیے ایک دن چاہیے۔" رانی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس مرد نے کہا۔ "تم سوچ لو۔ کل اسی وقت بات کریں گے۔"

اس کے بعد خالی ٹیپ چلنے کی مخصوص آواز ابھرنے لگی۔

میں نے عدالت میں جو آڈیو ڈیمو دیا تھا، وہ جج، وکیلِ صفائی اور دیگر حاضرینِ مجلس کی سمجھ میں آگیا تھا تاہم جج نے تصدیق طلب نظر سے مجھے دیکھا اور سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"پراسیکیوشن!"

"جنابِ عالی! نیاز علی نامی ایک شخص برنس روڈ کے علاقے میں ایک چھوٹا سا پرنٹنگ پریس چلاتا ہے جہاں پر وہ شادی کارڈ، برتھ ڈے کارڈ، وزیٹنگ کارڈ، لیٹر ہیڈ اور اسی نوعیت کی چھوٹی موٹی چیزیں چھاپتا ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "نیاز علی درحقیقت فراست علی کا "پارٹنر ان کرائم" ہے۔ اس نے جیل جا کر رانی کے لیے فراست کا پیغام ریکارڈ کیا پھر رانی سے رابطہ کر کے اسے اپنے ٹھکانے پر بلایا۔ رانی اس سے ملنے تو گیا مگر اپنے ساتھ ایک ٹیپ ریکارڈر بھی لے گیا۔ مذکورہ ٹیپ ریکارڈر کو رانی نے اپنے پرس کے اندر چھپا رکھا تھا۔ جب نیاز علی سے رانی کی ملاقات ہوئی تو اس نے نیاز کی نظر بچا کر ریکارڈنگ کا بٹن پریس کردیا۔ اس کے بعد کی کہانی کو سمجھنے کے لیے آئن اسٹائن کا دماغ چاہیے اور نہ ہی ناسا کا اسپیس اسٹیشن..... کہانی کہتے کلائمکس..... مطلب دی اینڈ..... ختم شد!"

ادھر میری بات مکمل ہوئی، ادھر فراست علی تیورا کر ایکوزڈ باکس کے فرش پر گر گیا۔ چاروں جانب پھیلتی تاریکی کو دیکھ کر اسے واقعتاً چکر آگیا تھا یا یہ اس کا کوئی نیا ڈراما تھا، میں اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

رانی نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ "یہ بدذات تو لگا گیا۔"

"پاگل ہوگئی ہو۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"اے وکیل صاحب! ابھی کیا کہا آپ نے؟" وہ فریفتگی بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے ایک ادا سے بولا۔ "ذرا پھر سے کہیں نا۔"

"وہ..... نہیں..... کچھ نہیں۔" میں نے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "میرا مطلب تھا، فراست علی جیسے لوگ اتنی آسانی سے معاشرے کی جان نہیں چھوڑتے۔ بس، اس کیس کو "ختم شد" سمجھ لو۔"

رانی کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ کی معنی خیزی میں اضافہ ہوگیا۔ میری زبان سے اپنے لیے مؤنث کا طرزِ تخاطب سن کر وہ خوشی سے نہال ہوگئی تھی..... سوری! نہال ہوگیا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

Scanned with CamScanner

کُند ذہن

مسیوق بخاری

جسم کا سب سے اہم عضو دماغ... جس کا صحیح ہونا کسی نعمت سے کم نہیں... مگر کسی بھی شخص کی دماغی کمزوری اس پر ایک ٹھپا لگا دیتی ہے... اس کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ تھا... وہ دماغی طور پر کمزور تھا اور اس کے والدین... خاص کر ماں اسے کُند ذہن سمجھتی تھی... مگر ایک حادثے نے اس کی کایا ہی پلٹ دی... اس نے کیا کر دکھایا تھا، اُسے اس کا اندازہ نہ تھا۔

کُند ذہن سمجھے جانے والے ایک بچے کی ذہانت کا احوال

تیز بارش میں ڈرائیور بڑی مہارت سے گاڑی کو آگے بڑھا رہا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ سڑک کا یہ حصہ کئی کلومیٹر تک سنسان اور کسی حد تک خطرناک بھی تھا۔ کئی موڑ ایسے تھے جہاں بہت احتیاط کی ضرورت تھی۔ اگر وہاں احتیاط نہ برتی جاتی تو گاڑی گہری کھائی میں گرنے کا خدشہ تھا۔ عموماً لوگ رات کے وقت اس جگہ سے گزرنے سے گریز ہی کرتے تھے۔ اشد مجبوری کی وجہ سے یہ گاڑی تیز بارش، رات کے اندھیرے کو نظر انداز کرکے اس خطرناک

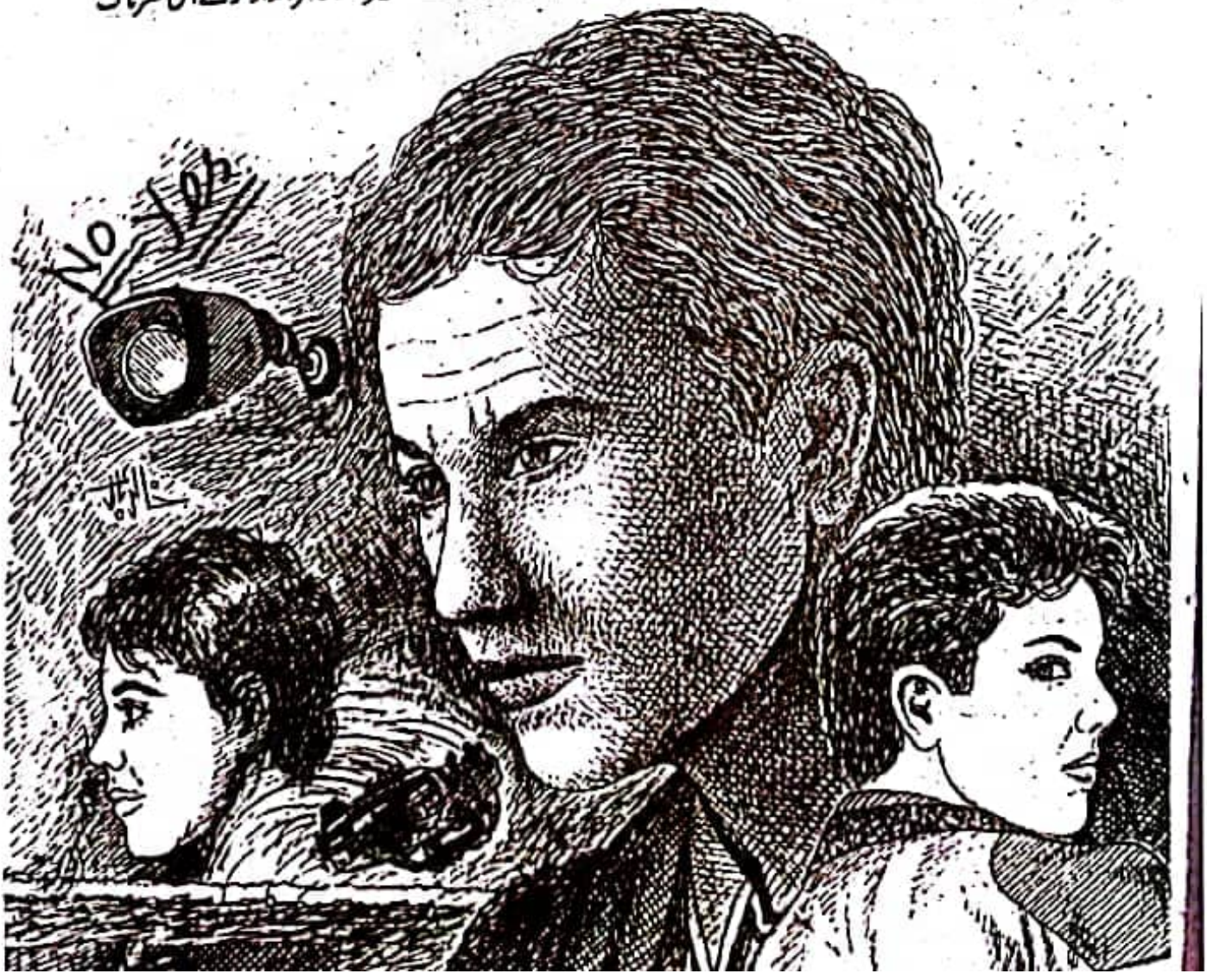

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

سڑک کو استعمال کررہی تھی اور اس سے قدرے فاصلے پر ایک ٹرک بھی آرہا تھا۔

"مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی ہمیں فالو کررہا ہے۔" پچھلی نشست پر بیٹھے شخص نے ڈرائیور سے مخاطب ہوکر کہا۔

"اچھا..... آپ کو کیسے اندازہ ہوا؟" ڈرائیور چونکا اور فکرمندی سے پوچھا۔

"پہلے تو مجھے وہم ہوا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہم رات کے اندھیرے سے نکل پُررونق جگہ پر تھے پھر اس کے بعد مجھے لگا کہ ایسا نہیں ہے۔ لیکن اب پچھلے آدھے گھنٹے سے میں نوٹ کررہا ہوں کہ ہمارے پیچھے آنے والا ٹرالر ہمارا تعاقب کررہا ہے۔ کچھ دیر پہلے میں نے دوبار تم سے گاڑی روکنے کا کہا تھا۔ یہ میں نے دراصل تعاقب کرنے والوں کو چیک کرنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس ٹرالر نے بھی اپنی رفتار غیر معمولی حد تک سست کرلی حالانکہ وہ بہ آسانی ہم سے آگے گزر سکتے تھے لیکن دونوں بار انہوں نے ہمارے ہی آگے بڑھنے کا انتظار کیا۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ ہمارا تعاقب ہورہا ہے اور کیوں ہورہا ہے؟ میں اس پر حیران اور کافی پریشان ہورہا ہوں۔" شاندار مہنگی گاڑی کی پچھلی آرام دہ نشست پر بیٹھے شخص نے کہا۔

"کیا میں اسپیڈ بڑھالوں؟" ڈرائیور نے تیزی سے پوچھا۔

"نہیں، تم جانتے ہو ہم اس جگہ وہ بھی بارش کی پھسلن میں رفتار ہرگز نہیں بڑھا سکتے۔ بس تم گاڑی چلاتے رہو۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہم رش والی جگہ پر ہوں گے اور وہاں رفتار بھی تیز کرسکیں گے۔" پچھلی نشست پر بیٹھا شخص کافی بے چین سا لگ رہا تھا۔

"آدھا گھنٹا بہت ہوتا ہے سر اگر آپ کے خدشات کے مطابق واقعی ہمارا تعاقب ہورہا ہے اور ہمارا کوئی مخالف ہمیں نقصان پہنچانا چاہتا ہے تو اس آدھے گھنٹے میں یہ سب ہوسکتا ہے۔" ڈرائیور فکرمندی سے بولا۔ ان کے پیچھے آنے والا ٹرالر اب فاصلہ کم کرچکا تھا۔

"تھوڑی سی اسپیڈ بڑھالو، دیکھو ٹرالر قریب آچکا ہے۔" مالک نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ اس کے چہرے کے عضلات کھنچ رہے تھے اور وہ ہونٹ بھینچے نشست پر پہلو بدل رہا تھا، اسی دوران گاڑی رک گئی۔

"کیا ہوا، رک کیوں گئے؟" اس نے بے چینی سے کہا۔ جہاں تیز بھاگنے کی ضرورت تھی وہاں وہ رک گیا تھا۔

ڈرائیور کوئی جواب دیے بغیر گاڑی سے اترا اور تیزی سے سڑک کے کنارے کی جانب جانے لگا۔ ادھر ٹرالر بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔

"کیا ہے یہ..... تم کیوں....." جملہ گاڑی میں بیٹھے شخص سے پورا نہ ہوسکا۔ اس کی گاڑی کو ٹرالر نے زوردار ٹکر ماری۔ وہ بری طرح اچھلا اور اس کا چہرہ اگلی سیٹ کی پشت سے ٹکرایا۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ "آدھے گھنٹے میں سب ہوسکتا ہے" ڈرائیور کا کہنا اور پھر ٹرک کی ٹکر سے پہلے گاڑی سے نکل جانا۔

"غدارا" اس کے منہ سے نکلا۔

اتنے میں دوسری اور تیسری ٹکر لگی اور گاڑی جو جان بوجھ کر سڑک کے سب سے خطرناک موڑ پر روکی گئی تھی، کھائی میں گرنے لگی۔ اسے مسلسل چوٹیں لگ رہی تھیں، زخم آرہے تھے۔ دماغ میں کئی سوالات اُبھر رہے تھے۔ بیوی اور اکلوتے بیٹے کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آرہا تھا۔

گاڑی جونہی گرتے ہوئے سڑک کے کنارے پڑے بڑے پتھر سے ٹکرائی، اس کا ایک دروازہ کھل گیا اور وہ باہر اچھل کر گرا۔ گرتے گرتے اس نے اِدھر اُدھر ہاتھ مارے۔ ایک جھاڑی کی مضبوط شاخ اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اسے مضبوطی سے پکڑتے ہوئے اس نے خود کو کھائی میں گرنے سے بچایا۔ گاڑی قلابازیاں کھاتے ہوئے گری اور زوردار دھماکے کے ساتھ اسے آگ لگ گئی۔ سر سے لے کر پاؤں تک لگنے والی شدید چوٹوں نے اسے اذیت ناک درد سے دوچار کررکھا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کا جسم یکدم سن ہونے لگا ہے۔ اسی دوران اس نے چند قدموں کی آوازیں سنیں اور ساتھ ہی تیز روشنی بھی اس کے قریب دکھائی دی۔ وہ جھاڑی کی اوٹ میں پتھر پر گرا تھا اس لیے روشنی اس پر نہ پڑسکی۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑے لوگوں کو نظر نہیں آرہا تھا۔

"جل گیا ہے گاڑی سمیت۔" ایک شیطانی ہنسی سنائی دی اور ساتھ ہی روشنی میں کھڑے ہوئے ایک شخص کا چہرہ اسے نظر آیا جو اس کا دیکھا بھالا تھا۔ وہ حیران بھی نہ ہوسکا۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ وہ ہوش وحواس کھوچکا تھا۔

☆☆☆

"ہیلو ایس، میں مسز لزا روجر بول رہی ہوں۔" ایک اجنبی نمبر سے آنے والی کال پر بات کرتے ہوئے لزا نے کہا۔ دوسری طرف سے جو کہا گیا اسے سن کر لزا کا رنگ زرد پڑگیا۔

Scanned with CamScanner

digest library.com

"جی..... جی..... میں..... سن رہی ہوں۔" صوفے پر تقریباً گرتے ہوئے اس نے بہ مشکل کہا۔

"کس اسپتال میں..... ہے..... اوکے، میں آرہی ہوں۔" لزا نے فون بند کیا اور کپکپاتے جسم کے ساتھ خود کو گھسیٹتی ہوئی لاؤنج میں آئی۔ ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہنے کے لیے ملازمہ کو کہا تو ملازمہ نے حیرت و پریشانی سے اس کی جانب دیکھا۔

"روجر..... کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے..... وہ اسپتال میں ہے۔" اس نے بتایا تو ملازمہ کے منہ سے تاسف بھرا سانس نکلا۔ ملازمہ کو بیٹے کا خیال رکھنے کا کہہ کر وہ تیزی سے باہر بھاگی۔

تقریباً پینتالیس منٹ بعد وہ اس اسپتال پہنچ چکی تھی جہاں اس کا شوہر روجر موت و حیات کی کشمکش میں آئی سی یو میں تھا۔ اسے بتایا گیا کہ اس شہر سے چند کلومیٹر دور شدید زخمی روجر وہاں اچانک رکنے والی گاڑی سے اترنے والے شخص کی نظر میں آگیا۔ ایسا خوش قسمتی سے ہوا تھا ورنہ جھاڑی کے پیچھے گرے ہوئے کسی کا یوں نظر آنا ناممکن تھا۔ گاڑی کا جلی ہوئی حالت میں ڈھانچا بھی انہیں نظر آیا جبکہ ڈرائیور کا پتا نہیں چل سکا۔ یہ اندازہ لگایا گیا کہ خطرناک موڑ پر گاڑی بارش کی پھسلن کی وجہ سے حادثے کا شکار ہوئی۔ روجر جھاڑی میں گر گیا اور ڈرائیور گاڑی سمیت گر کر اس کے ساتھ ہی جل گیا۔

"مسز روجر! ہم آپ کو زیادہ امید نہیں دلا رہے۔ مسٹر روجر انتہائی سیریس کنڈیشن میں ہیں۔ ان کا بہت سا خون بہہ چکا ہے۔ سر، دماغ پر بہت چوٹیں آئی ہیں، وہ مسلسل بے ہوش ہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے اس سے کہا تو اس کی پہلے سے رو کر سوجی ہوئی آنکھوں سے پھر آنسو بہہ نکلے۔

پورا دن وہ اسپتال میں رہی۔ شام کو ڈاکٹرز نے قدرے بہتری کا بتایا تو وہ فوراً جمی کو ملنے کے لیے گھر روانہ ہوگئی۔ اس کا اور روجر کا بیٹا جمی بہت معصوم تھا اور کافی کند ذہن۔ بچپن سے ہی وہ بے وقوفانہ حرکات اور پڑھائی میں حد درجہ نالائق ہونے کے باعث کند ذہن ٹھہرایا جا چکا تھا۔ ابتدائی کلاسز بہ مشکل پڑھنے کے بعد وہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی، سارا دن گیمز کھیلنا، ٹی وی پر باسکٹ بال میچ دیکھنا اور وقتاً فوقتاً لزا کی ڈانٹ سننا اس کی معمولات تھیں۔

"تم کند ذہن اور کم عقل ہو۔ تم کبھی کچھ نہیں کر سکتے۔" لزا اکثر برہم ہو کر کہتی جبکہ روجر کا رویہ بیٹے کے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ رہا۔

"لزا! فکر مت کرو، اسے ذرا اور بڑا ہو لینے دو۔ میں بزنس سمجھا دوں گا اسے۔ دیکھنا یہ سب سیکھ لے گا۔" وہ کہتا تو لزا سر جھٹک کر بڑبڑانے لگتی۔

روجر کی بیوی ہونے سے پہلے لزا طلاق یافتہ تھی۔ اس کی شادی ایک شاپ کیپر مارک سے ہوئی تھی جس سے اس کا ایک بیٹا روکی پیدا ہوا۔ مارک انتہائی گھٹیا، نیچ ذہن اور بے رحم آدمی تھا۔ وہ لزا کے بے تحاشا حسن کی وجہ سے ہمیشہ اسے شک کی نگاہ سے دیکھتا اور بات بے بات اس پر ہاتھ اٹھاتا تھا۔ تنگ آکر لزا نے اس سے طلاق لے لی اور ایک آفس میں ملازمت کرنے لگی۔ روکی کے معاملے میں مارک نے لزا کو کہہ دیا تھا کہ وہ بیٹے کو ماں سے ملنے سے نہیں روکے گا لیکن مستقل وہ باپ کے پاس ہی رہے گا۔ لزا کو اس پر اعتراض نہ ہوا کیونکہ پہلی وجہ یہ کہ اس قیمت پر اس کی مارک جیسے ظالم آدمی سے جان چھوٹ گئی تھی، دوسرا کچھ فاصلے پر سہی لیکن مارک اور روکی اسی شہر میں تھے جہاں لزا تھی۔

لزا کے بے تحاشا حسن نے آفس کے مالک روجر پر کافی اثر کیا اور جلد ہی دونوں کی شادی ہوگئی۔ لزا، مسز لزا روجر بن کر ایک دم زمین سے آسمان پر آگئی۔ روجر بہت اچھا شوہر ثابت ہوا۔ روجر کا بزنس ترقی کر گیا۔ ان کا شمار امیر ترین لوگوں میں ہونے لگا۔ جمی کے پیدا ہونے کے بعد بھی لزا کی بڑے بیٹے روکی سے محبت میں ذرا فرق نہ آیا۔ وہ مہینے میں چار پانچ مرتبہ اسے ملنے کے لیے بلاتی یا خود کسی ہوٹل وغیرہ میں ملتی۔ کبھی کبھار روجر کا روکی سے سامنا ہوتا تو وہ بھی اس سے پیار سے پیش آتا۔

وقت گزرتا گیا اور جمی بڑا ہوگیا۔ اس کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی نالائقیوں اور اکثر معاملات میں بے وقوفی کی وجہ سے اسے کند ذہن کہا جانے لگا۔

"جمی کا ذہن کام نہیں کرتا، نہ جانے کیا کرے گا۔" لزا پریشان ہو کر روجر سے کہتی تو روجر بھی اسے سمجھانے لگتا اور کبھی محض ہنس پڑتا۔

☆☆☆

گھر پہنچ کر لزا نے جمی کو پاس بلایا اور کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ سوجی آنکھوں اور سارا دن گھر سے باہر رہنے کی وجہ جاننے کے لیے جمی اس سے ضرور سوال کرے گا لیکن اسے غصہ آیا کہ اس کا بیٹا اس کے سامنے بیٹھا

Scanned with CamScanner

اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

"تم جانتے ہو نا میں سارا دن باہر تھی؟" لزا نے بات کا آغاز کیا۔

"یس۔" جمی انتہائی اختصار سے بولا۔

"میں اسپتال میں تھی۔" لزا نے جان بوجھ کر اتنا ہی جملہ بولا تاکہ وہ "کیوں" کہے لیکن اسے یہ لفظ سننے میں ناکامی ہوئی۔ اس نے خود ہی بتانا شروع کر دیا۔

"تمہارے ڈیڈی کل شہر سے باہر گئے تھے۔ واپسی پر....." وہ بولتی جا رہی تھی اور جمی کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

"اب ڈیڈی کیسے ہیں؟" اس نے روتے ہوئے پوچھا۔ لزا نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔

"وہ زیر علاج ہیں، امید ہے جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں کچھ دیر بعد پھر اسپتال جا رہی ہوں، تم بھی ساتھ چلنا۔" لزا نے پیار سے کہا اور صوفے پر ہی لیٹ گئی۔

☆☆☆

"مسز روجر! مسٹر روجر کی زندگی تو ہم بچانے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن....." ڈاکٹر نے توقف کیا۔ ایک ضروری بات کرنے کا کہہ کر ڈاکٹر نے اسے اپنے روم میں بلایا تھا۔

"لیکن کیا؟" لزا بے تابی سے بولی۔

"وہ..... بس صرف سانس لے رہے ہیں۔ اس وقت چلنا پھرنا تو دور کی بات، وہ بولنے اور سننے تک سے محروم ہو چکے ہیں۔" ڈاکٹر نے بہت بری خبر سنائی تھی۔ لزا سسکنے لگی۔

روجر کا معذور ہو جانا، جمی کا کسی کام کے قابل نہ ہونا، کاروبار کا جھنجٹ، گھر کے معاملات۔ لزا کے کندھوں پر بہت بڑی ذمے داریاں آن پڑی تھیں۔ ایک فی میل اور ایک میل نرس کے ہمراہ وہ معذور روجر کو گھر لے آئی اور اپنے آپ کو کڑے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے لگی۔

"تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گے اور چلو پھرو گے۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کے پاس بیٹھی ہوئی گلوگیر آواز میں کہتی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی جانب دیکھتا روجر اس کے ہونٹوں کی حرکت کو یقیناً سمجھ رہا ہے۔

فارغ جمی کو ایک مصروفیت مل گئی تھی۔ وہ زیادہ وقت باپ کے کمرے میں گزارنے لگا۔ اسے ویسے بھی لزا کی نسبت روجر سے زیادہ لگاؤ تھا۔ وہ کافی کافی دیر بیٹھا باپ کے ساکت وجود اور کھلتی بند ہوتی آنکھوں کی جانب دیکھتا رہتا۔

"ہو سکتا ہے حالت میں بہتری آ جائے..... ہو سکتا ہے یہ سننے لگیں یا تھوڑا بہت بول سکیں۔ زیادہ امید تو نہیں لیکن پھر بھی....." اسپتال سے ڈسچارج ہونے پر ڈاکٹر کا کہا گیا جملہ اکثر اس کے کانوں میں گونجتا۔

وقت گزرنے لگا۔ لزا نے کاروبار کو مکمل سنبھال لیا تھا۔ روجر کے بزنس میں پچاس فیصد کا پارٹنر ہڈسن اور لزا بالکل اسی طرح کام کر رہے تھے جیسے روجر کے معذور ہونے سے پہلے تھا۔

روجر کا علاج جاری تھا۔ بزنس کی کڑی ذمے داریوں کے باوجود لزا، روجر کی تیمارداری کرنے کی پوری کوشش کرتی۔ جمی زیادہ وقت باپ کے ساتھ کمرے میں ہی گزارتا۔

اسی طرح تین ماہ گزر گئے۔

☆☆☆

"جمی! آج ڈاکٹرز آ رہے ہیں تمہارے ڈیڈی کا معائنہ کرنے۔ میری ضروری میٹنگ ہے۔ اس دوران اگر وہ لوگ آ جائیں تو تم مجھے کال کر دینا۔" لزا نے جمی سے کہا جو ٹی وی پر کھیلوں کی خبریں دیکھ رہا تھا۔

"او کے ممی!" اس نے کہا اور دوبارہ ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ روجر کے کمرے کی جانب بڑھا اور آہستگی سے دروازہ کھولا۔ روجر کی آنکھیں بند تھیں۔ جمی اس کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ اس کا ہاتھ ساتھ پڑی ٹیبل کے اوپر رکھے گلاس سے ٹکرایا۔ وہ روجر کی طرف مسلسل دیکھتے ہوئے بیٹھ رہا تھا۔ گلاس میز پر گرا جس سے پُرسکون خاموش ماحول میں اچھی خاصی آواز پیدا ہوئی لیکن جمی نے میز کی جانب دیکھا تک نہیں۔ اس کی نگاہیں باپ پر جم گئی تھیں جس نے گلاس گرنے کی آواز پر آنکھیں کھول دی تھیں اور میز کی جانب دیکھا تھا۔

'ڈیڈی نے گلاس گرنے کی آواز سنی اور پھر آواز کی سمت دیکھا۔ یعنی وہ سننے کے قابل ہو گئے ہیں۔

روجر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک جمی کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے یہ ایک مووی میں دیکھا تھا۔ اس نے ایسا کرنے کے بارے میں سوچا۔

"ڈیڈی! کیا آپ مجھے سن پا رہے ہیں؟ اگر ہاں تو دو بار پلکیں جھپکیں۔" جمی نے روجر کے اوپر جھکتے ہوئے کہا۔ وہ باپ کے چہرے پر کچھ تاثرات واضح دیکھ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر بھی آ گئے۔

Scanned with CamScanner

digest library.com

"ڈاکٹر ایک بات کرنا ہے آپ سے۔" جمی نے ڈاکٹر کو دھیرے سے کہا اور مزید دھیمی آواز میں کچھ کہا۔ ڈاکٹر نے جمی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سر ہلایا اور اسے لزا کو کال کرنے کا کہا۔

☆☆☆

"روکی! تمہارے ڈیڈی تمہیں یہاں آنے سے روکتے نہیں؟" جمی نے بڑے غور سے سوتیلے بھائی کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"تو مائی ڈیئر برادر! وہ نہیں روکتے۔ اسی لیے تو ممی اور تمہیں ملنے چلا آتا ہوں۔" روکی مسکرایا۔

"انہیں ڈر نہیں کہ کہیں تم ممی سے زیادہ اپیچ ہو کر انہیں چھوڑ نہ دو؟" جمی نے اگلا سوال کیا۔

"بالکل نہیں۔ ڈیڈی کو معلوم ہے میں کیسا ہوں۔ میں اپنے ڈیڈی کو کبھی بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے ممی کی دولت کی کشش مجھے ممی کے پاس مستقل لے آئے گی لیکن ایسا نہیں ہے۔" روکی بولا۔

"ویسے روکی! ایک بات بتاؤ، تمہیں ممی کی دولت میں کچھ تو کشش ہوگی ہی، ہے نا؟" جمی نے قریب ہو کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے ننھے بچے! آج بڑے سوال کر رہے ہو وہ بھی دولت کے بارے میں؟" روکی نے بڑے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

"میں ننھا بچہ نہیں ہوں اور سنو، اپنی ماں اور اپنے گھر سے متعلق سوال کرنا میرا حق ہے۔" جمی نے برا مانتے ہوئے کہا۔

"اپنی ماں.....؟ وہ میری بھی ماں ہے جمی! اور یہ مت بھولو کہ وہ پہلے میری ماں بنی تھی۔" روکی نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا تمہیں غصہ آ رہا ہے میری باتوں پر؟" جمی نے ریموٹ اس کے ہاتھ سے لے کر اپنا پسندیدہ چینل لگاتے ہوئے پوچھا۔ اس نے واضح نوٹ کیا کہ روکی کو اس کا ریموٹ لینا پسند نہیں آیا۔

"ایک ایسا بچہ جس کا باپ بے حس و حرکت بستر پر لیٹا ہو اور وہ خود بہت معصوم اور سیدھا سادہ ہو، اس بے چارے کی بات کا کیا برا ماننا۔" روکی نے کہا۔ اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

"میں بچہ ہوں نہ سیدھا سادہ۔ میں بیچارہ بھی نہیں ہوں۔ میں لوگوں کی حرکتیں خوب سمجھتا ہوں۔" جمی نے فیصلے لہجے میں کہا۔

وہ ہمیشہ ہی روکی کو ناپسندیدگی سے دیکھتا تھا۔ روکی باپ کی طرح نیچ خصلت، تیز طرار اور شاطر تھا۔ باپ کی بیماری نے جیسے اسے بیدار کرنا شروع کر دیا تھا۔

"حرکتیں، کرتوت؟ کیا مطلب ہے جمی! یہ آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" روکی صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جمی نے چند سیکنڈ اس کی جانب دیکھا اور یکدم اپنے مخصوص احمقانہ اور معصومانہ انداز میں مسکرا دیا۔

"تمہاری کون سی حرکتیں ہیں جو میں سمجھوں گا۔ ارے روکی! میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا تم میری الٹی سیدھی باتوں اور سوالوں کے جواب میں کیا کہتے ہو۔ دیکھو پلیز، ممی کو مت بتانا۔" جمی کے لہجے میں سادگی و لجاجت تھی۔ روکی بے اختیار ہنس پڑا۔

"اوہ، میں بھی حیران تھا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔" وہ صوفے پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

جمی نے ریموٹ اسے تھمایا اور اپنا سیل فون آن کر کے گیم لگا لی۔

"تم واقعی مذاق ہی کر رہے تھے نا؟" روکی نے عام سے انداز میں سوال کیا۔

"اور.....میں کیا کر سکتا ہوں؟" جمی پھر ہنسا۔

روکی پوری طرح ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ احمق جمی کی بات سے وہ بالکل مطمئن ہو گیا تھا۔ اسے احساس تک نہ ہوا کہ اپنے سیل فون سے نظر اٹھا کر کندذہن جمی نے اسے بہت چبھتی نظروں سے دیکھا تھا۔

☆☆☆

"ڈیڈی! پلیز، کچھ بولیں۔ میں آپ کی چپ سے اداس ہو گیا ہوں۔" جمی، باپ کا ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا۔ روجر اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ کسی بھی تاثر سے عاری تھا۔

"معلوم ہے آج آپ کا برتھ ڈے ہے۔ ممی آتی ہوں گی پھر ہم کیک کاٹیں گے۔" جمی جذباتی انداز میں باپ سے بولے جا رہا تھا۔

شام ہو گئی۔ لزا نے روجر کے برتھ ڈے کا کافی اچھا اہتمام کیا تھا۔ روکی، جمی اور لزا کے علاوہ روجر کے چند دوست بھی بلا لیے گئے۔ لزا نے روجر کا ہاتھ چھری پر رکھ کر کیک کاٹا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔

جمی حسب معمول اس کام میں مصروف تھا جو وہ پچھلے

Scanned with CamScanner

چند روز سے کر رہا تھا یعنی روجر کی آنکھوں اور چہرے پر غور کرنا۔ اچانک وہ چونک پڑا۔ اس نے روجر کے چہرے سے نظر ہٹا کر ادھر ادھر دیکھا جہاں اسے کسی کلیو کی تلاش تھی لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ سب لوگ تیزی سے ادھر ادھر ہو رہے تھے۔ کسی ایک پر غور کرنا ممکن نہ تھا۔ تبھی اس کے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا۔

''یہ میں نے پہلے کیوں نہیں سوچا؟'' کیک کا ٹکڑا منہ میں لے جاتے ہوئے اس نے خود سے کہا۔

''ڈیڈی کے ساتھ جو ہوا وہ حادثہ نہیں بلکہ کوئی سازش تھی۔'' یکدم ایک انکشاف اس پر ہوا جس نے اسے لرزا کر رکھ دیا۔ اس نے کمرے میں موجود لوگوں کی جانب تیزی سے یوں دیکھا جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کی سوچ کسی نے پڑھ تو نہیں لی۔

روجر کی حالت کے پیش نظر سب انتہائی دھیمی آواز میں ہلکی پھلکی بات کر رہے تھے۔ چند ہی منٹ بعد سب باہر آ کر لاؤنج میں بیٹھ گئے اور پھر ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ لزا بیڈ روم میں چلی گئی تو جمی ڈیڈی کے کمرے میں گیا۔ اس وقت نرس اسے میڈیسن دے رہی تھی۔ جمی نے روجر کی آنکھوں میں غور سے جھانکا جہاں اسے کچھ نظر آ رہا تھا۔

''مسٹر روجر اب آرام کریں گے۔ پلیز، انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔'' نرس نے آہستگی سے کہا۔

''بس ایک منٹ۔'' جمی نے اجازت لینے والے انداز میں کہا۔

نرس کمرے کے دوسرے کونے کی جانب بڑھ گئی۔ جمی تیزی سے باپ پر جھکا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر کچھ بڑبڑایا اور ساتھ ہی واپس چلا گیا۔ اس کے دل و دماغ کا بھونچال اس وقت شدت اختیار کر چکا تھا۔

☆☆☆

''ممی! ڈیڈی کے ساتھ جو ڈرائیور تھا، اس کی ڈیڈ باڈی ملی تھی کیا؟'' ناشتا کرتے ہوئے جمی نے ماں سے سوال کیا۔

''نہیں جمی اور اصل جہاں پر یہ حادثہ ہوا تھا وہاں پر اتنی خطرناک کھائیاں اور گڑھے ہیں کہ وہاں پر دور دور تک تلاش کرنے کے باوجود اس کی ڈیڈ باڈی نہیں مل سکی۔'' لزا نے دکھ سے کہا پھر چونک کر بولی۔ ''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''بس ایسے ہی۔'' جمی نے معصومیت سے پلکیں جھپکتے ہوئے کہا اور ناشتا کرنے لگا۔

لزا نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کو کہا۔ معذور شوہر اور بے وقوف بیٹے کی وجہ سے اس پر بھاری ذمے داریاں پڑ گئی تھیں۔

☆☆☆

جمی نے دروازہ اچھی طرح بند کیا اور آج کی ریکارڈنگ دیکھنے لگا۔ روجر کے برتھ ڈے پر اس کے ذہن میں جو آئیڈیا آیا تھا اس نے اس پر اسی روز عمل کر ڈالا اور باپ کے کمرے میں کیمرا لگا دیا۔

چار روز گزر گئے کچھ خاص دیکھنے کو نہ ملا۔ آج پانچواں روز تھا اور وہ بیٹھا اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ روجر کے کمرے میں لزا اور روکی موجود تھے۔ روکی آج کل ماں کے بہت نزدیک ہو گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ آفس تک جانے لگا تھا۔ لزا بھی اس پر خوب اعتماد کرنے لگی تھی۔ ایک طرح سے اس نے جمی کو نظر انداز کر دیا تھا۔

'ڈیڈی کی بیماری کا، معذوری کا سب سے زیادہ فائدہ روکی کو ہوا ہے۔ اس کا قیام بھی یہاں بڑھ گیا ہے اور اب کنگال روکی کی جیب بھی بھاری ہونے لگی ہے۔ ممی میرے سامنے اسے رقم دیتی ہے تو میری عدم موجودگی میں بھی بڑے بیٹے کو میرے باپ کی دولت میں سے نوازتی ہوگی۔ یقیناً یہ رقم اس کے سچ باپ اور ممی کے سابق شوہر مارک کے بھی کام آتی ہوگی۔' اس نے کئی بار سوچا۔

''معذور ہو کر مسٹر روجر بزنس سے آؤٹ، روکی ان۔'' اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

''اگر ڈیڈی کے خلاف سازش ہوئی ہے تو ماسٹر مائنڈ کوئی بہت قریب ہی کا ہے۔'' کیمرا لگانے سے پہلے اسے یہ یقین تھا۔ اسی دوران لزا نے سیل فون پر کوئی نمبر ملایا اور بات کرنے لگی اور پھر کچھ ایسا ہوا کہ جمی ششدر رہ گیا۔ اس کے اردگرد دھماکے سے ہونے لگے۔ وہ اپنے آپ کو بہ مشکل کنٹرول کیے بیٹھا تھا۔ کیمرا لگانے کے محض پانچویں دن اس پر ایک بہت بڑا انکشاف ہو گیا تھا۔

''ممی.....؟ نہیں، نہیں..... روکی..... ہاں، یقیناً روکی.....!'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور پھر اسکرین آف کر کے آگے کا لائحہ عمل طے کرنے سے پہلے وہ اس کو دہرانے لگا جو وہ گزشتہ کئی دنوں سے کر رہا تھا۔

کند ذہن جمی، کم عقل، دماغ استعمال نہ کرنے والا لڑکا اپنے ڈیڈی کی حالت دیکھ دیکھ کر افسردہ ہوتا اور روز اس کے پاس گھنٹوں گزارتا۔ اسی دوران اس کا دماغ کھل گیا۔

☆☆☆

تقریباً ڈھائی ہفتے قبل جمی جب روجر کے پاس بیٹھا رہا

Scanned with CamScanner

تھا تو اس کا ہاتھ ٹکرانے سے میز پر پڑا گلاس گرا۔ اس کی آواز پر سننے بولنے کی صلاحیت کھو دینے والے روجر نے آنکھیں کھولیں اور میز کی جانب یعنی ادھر دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ بڑی امید کے ساتھ جمی نے ایک سوچی میں دیکھی ہوئی ایک ترکیب آزمانے کا فیصلہ کیا اور روجر کے قریب ہو کر کہا۔

''ڈیڈی! کیا آپ مجھے سن پا رہے ہیں؟ اگر ہاں تو دو بار پلکیں جھپکائیں۔'' جمی کے اس جملے کے پورا ہوتے ہی روجر نے دو بار پلکیں جھپکائیں۔ روجر کی طرف سے مثبت جواب پا کر خوشی سے سرشار ہو گیا۔

''ڈیڈی! میں..... میں ممی کو کال کر کے ابھی بتاتا ہوں۔'' اس نے جونہی کہا روجر کے چہرے کے عضلات سکڑ سے گئے اور آنکھوں میں بھی عجیب سا تاثر پیدا ہوا۔ وہ جمی، جسے کسی بات کی سمجھ جلدی نہیں آتی تھی وہ لمحے میں سمجھ گیا کہ روجر اس بات پر راضی نہیں کہ لزا کو بتایا جائے۔

''ڈیڈی! میں آپ سے کچھ پوچھوں گا۔ ''ہاں'' میں جواب تو دو بار اور اگر ''نہ'' میں تو ایک بار پلک جھپکیں..... یہ بات ممی کو بتا دوں؟''

جمی حیران رہ گیا جب روجر نے صرف ایک بار پلک جھپکی۔ سوال کے جواب میں ''نہ'' کہنے نے منٹوں میں جمی کے دماغ میں کئی خیال پیدا کر دیے جن پر اس نے فوری عمل شروع کر دیا۔ اس نے ڈاکٹر کو بھی اپنا ہمراز بنا لیا۔

''ڈاکٹر! ڈیڈی کی سننے کی حس بحال ہو گئی ہے۔ یقیناً آپ کو معلوم ہو ہی جائے گا۔ پلیز، آپ سے درخواست ہے ابھی یہ خوشخبری آپ کے اور میرے درمیان رہے۔ ابھی ممی کو بھی علم نہیں ہونا چاہیے۔'' ڈاکٹر نے اسے اطمینان دلایا کہ ایسا ہی ہوگا۔

اس کے بعد وہ کئی باتیں روجر سے اسی طرح کرتا رہا۔ اس کے باپ کی دیکھ بھال کرنے والے لوگوں کو اندازہ بھی نہ تھا کہ انہیں باہر بھیج کر ڈیڈی کے پاس بیٹھنے والا معصوم سا لڑکا کس مشن پر کام کر رہا ہے۔

آہستہ آہستہ اسے شک ہونے لگا کہ اس کے باپ کے ساتھ جو ہوا، وہ حادثہ نہیں۔ یہ خیال اسے روجر کی برتھ ڈے تقریب میں آیا جب کمرے میں موجود لوگوں کو دیکھتے ہوئے روجر کے چہرے اور آنکھوں میں بے چینی کے تاثرات ابھرے۔ اس نے فوراً روجر کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا لیکن وہ یہ دیکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا کہ اس کے باپ کو کسے دیکھ کر بے چینی ہوئی ہے۔ اس نے اسی رات روجر کے کمرے میں کیمرا نصب کیا اور پھر روجر کے قریب آ کر پوچھا۔

''ڈیڈی! یہ حادثہ آپ کے خیال میں سازش ہے؟ کیا مجرم آج اس کمرے میں تھا؟''

دونوں سوالات کے جواب میں دو بار پلکیں جھپکی گئیں۔ جمی کے جسم میں سنسناہٹ سی ہوئی۔

''ڈیڈی! میں نے وہ سامنے کیمرا لگایا ہے۔ جب بھی وہ مجرم آپ کے روم میں آئے..... آج، کل یا جب بھی تو آپ نے اسے دیکھتے ہی کیمرے کی جانب دیکھ کر آنکھیں بند کر لینا ہیں۔ اس کا مطلب ہوگا مجرم اس وقت کمرے میں موجود ہے۔'' یہ کہہ کر جمی اپنے روم میں آ کر لیٹ گیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

کون ہے وہ؟ اس نے کیوں ڈیڈی کو مارنا چاہا؟ اگر وہ یہیں کہیں ہے تو کہیں وہ دوبارہ تو ایک کرنے کی کوشش نہیں کرے گا؟

جمی بے چین ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے باقاعدہ خوف محسوس ہوا۔

'ڈیڈی نے ممی کو بتانے سے کیوں منع کیا ہے.....؟ اوہ، وہ ردی بھی تو ہو سکتا ہے؟' جمی کے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح خیال آیا اور اس کے اگلے ہی روز سے وہ اپنے سوتیلے اور تیز طرار بھائی وکی پر نظر رکھنے لگا۔ اس نے ڈیڈی سے مزید بات کرنے کی ٹھانی۔ اس نے کیس حل کرنے کے لیے مزید سوالات تیار کیے۔

''ڈیڈی! آپ کے ساتھ جو ڈرائیور تھا، وہ بھی آپ کے ساتھ گرا تھا؟''

روجر نے ایک بار پلک جھپکی۔ جمی حیران اور پریشان ہوا۔

''اس کی ڈیڈ باڈی نہیں ملی۔ دراصل وہ گرا ہی نہیں اس لیے، ہے نا؟''

روجر نے پھر دو بار پلک جھپکی۔

''وہ آپ کا فرینڈ تھا؟''

پلک ایک بار جھپکی گئی۔

''تو..... کیا وہ دشمن تھا؟''

پلک دو بار جھپکی گئی۔ پھر اس نے پوچھا۔

''کیا وہ بھی سازش میں شریک ہے؟''

جمی کی توقع کے عین مطابق پلکیں دو بار جھپکی گئیں..... اور آج ریکارڈنگ دیکھتے ہوئے وہ اس وقت ششدر رہ گیا جب لزا سیل فون پر کسی سے بات کر رہی تھی تو روجر نے کیمرے کی جانب دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

جمی مزید غور کرنے لگا۔ وہ باپ کی اس حالت کے

Scanned with CamScanner

digest library.com

ذمے دار روکی کو جلد ثبوتوں کے ساتھ قانون کی گرفت میں دیکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

"نرس بتا رہی تھی کہ تم اپنے ڈیڈی کے پاس بہت زیادہ ٹائم گزارتے ہو، اتنا کہ کئی بار انہیں روجر کی ڈیوٹی انجام دینے میں مشکل پیش آنے لگتی ہے۔" لزا نے جمی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ وہ ناشتا کرتے ہی اس کے روم میں آئی تھی۔

"اس نے شکایت کی ہے کہ میں اپنے ہی باپ کے پاس نہ بیٹھوں؟" اس نے پوچھا۔

"شکایت نہیں، بس اپنے کام میں رکاوٹ کا بتایا ہے اور تم ناشتا کرنے کیوں نہیں آئے؟" لزا کا لہجہ اچانک ہی سخت ہونے لگا۔

"میں آج ناشتا نہیں کروں گا۔" جمی نے آنکھیں بھول کر کہا۔

"تم ـــ دراصل کچھ بھی نہیں کرو گے ـــ روکی کو دیکھو، روجر کی بیماری کو دیکھ کر کیسے میری ہیلپ کرنے لگا ہے۔ آفس کا اتنا کام اس نے سنبھال لیا ہے۔ ایک تم ہو، تعلیم تک چھوڑ دی ہے اور دیکھو، روکی حالانکہ اسے ـــ" لزا بولتی جا رہی تھی اور جمی خاموشی سے سنتا جا رہا تھا۔ لزا خوب سنا کر کمرے سے نکل گئی۔

"روکی ـــ روکی ـــ ہر وقت روکی ـــ ہر جگہ روکی۔ واقعی روکی تو اس گھر اور ممی پر قبضہ جما چکا ہے۔" جیکٹ پہنتے ہوئے جمی سلگ اٹھا۔

☆☆☆

"روجر کی طبیعت میں بہتری کے بارے میں ڈاکٹرز ابھی کچھ نہیں بتا رہے۔ ان کا کہنا ہے وہ کوشش کر رہے ہیں، مجھے انتظار کرنا ہوگا۔" لزا فون پر بات کر رہی تھی۔ جمی کی کلاس لینے کے بعد وہ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ جمی بھی آ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ لزا نے اسے دیکھ کر فون بند کر دیا۔

"کہیں جا رہے ہو تم؟" اس کی تیاری دیکھ کر لزا نے سوال کیا۔

"یس۔" جمی نے مختصر سا جواب دیا۔

"ناشتا کر لو۔ آج تم بھی میرے ساتھ آفس چلو۔" لزا نے لہجے میں پیار سموتے ہوئے کہا۔

"نہیں، مجھے آفس جانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔" جمی نے صاف جواب دیا۔

"دیکھو، بزنس تمہارے ڈیڈی کا ہے اور تم دلچسپی نہیں لے رہے۔ میں چاہتی ہوں تم بھی تھوڑا بہت سیکھنا شروع کر دو۔" لزا اب بھی نرمی سے بول رہی تھی۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ممی! ڈیڈی سے شادی سے پہلے آپ نے مارک یعنی روکی کے باپ سے طلاق اس لیے لی تھی نا کہ وہ بہت برا آدمی تھا؟" جمی نے یکدم سوال کیا۔ لزا نے چونک کر اور حیرانی سے اسے دیکھا۔ جمی کا سوال تھا ہی اچنبھا اور ساتھ ہی یہ کہ اس کا انداز انتہائی دوستانہ اور ہمدردانہ تھا۔

"تم یہ بات کیوں کر رہے ہو؟" لزا نے دھیرے سے کہا۔

"آپ روکی کو بہت زیادہ اپنے پاس گھر اور آفس میں رکھنے لگی ہیں۔ کہیں وہ برا آدمی اس بات پر ناراض ہو کر کچھ غلط نہ کر دے، اس لیے کہہ رہا ہوں۔" جمی نے خدشہ ظاہر کیا۔

"ارے نہیں۔ مارک لاکھ برا سہی لیکن اس نے کبھی بھی روکی کو مجھ سے ملنے سے منع نہیں کیا۔ نہ پہلے، نہ اب ـــ جبکہ میں اسے زیادہ وقت اپنے پاس ہی رکھ رہی ہوں۔" لزا نے بیٹے کے خدشات دور کرنے کے لیے کہا۔

لزا اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ماں تھی، اسے بیٹے میں کچھ تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

"ممی کہہ رہی تھیں کہ تمہیں ڈیڈی کے کمرے میں میری وجہ سے پرابلم ہوتی ہے اور ان کے آرام میں خلل پڑتا ہے۔ میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" روجر کی تیمارداری پر مامور دو افراد کے سامنے کھڑا جمی بولا۔ اس کے چہرے پر معذرت خواہانہ مسکراہٹ تھی۔

"وہ دراصل ـــ" نرس نے بولنا چاہا لیکن جمی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور پھر خود بولنے لگا۔ اس نے بڑے دوستانہ انداز میں گویا درخواست کی کہ اسے ڈیڈی کے پاس کچھ دیر بیٹھنے دیا جائے۔ ان کا مثبت جواب پا کر جمی نے انہیں کمرے سے بھیج دیا اور روجر کے قریب بیٹھ کر وہ سوال کیے جن کو پوچھنے کے لیے وہ بے چین ہو رہا تھا۔

"کیمرے کی جانب دیکھ کر آنکھیں بند کرنا میری ہدایت کے مطابق اشارہ تھا؟" اس نے جلدی سے سوال کیا۔ جواب میں پلکیں دو بار جھپکی گئیں۔

"روکی؟" جمی نے سرگوشی والے انداز میں روجر کے کان کے بالکل قریب ہو کر پوچھا۔

پلک ایک بار جھپکی گئی۔ جمی کا جسم جھٹکا کھا اٹھا۔ روکی کے

Scanned with CamScanner

بارے میں روجر نے "نہ" کہا تھا۔ وہ آنکھیں پھیلائے روجر کی طرح ساکت سا ہو رہا تھا۔

'جس وقت ڈیڈی نے کیمرے کی طرف دیکھ کر اشارہ دیا تھا، اس وقت روکی اور ممی دو ہی افراد کمرے میں موجود تھے۔ روکی نہیں تو پھر.....؟' جمی سے آگے سوچا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ انگلا نام لینے کے لیے کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی زبان گنگنو اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ جمی نے بڑی کوشش سے اپنے ہونٹ وا کیے۔

"تو کیا ممی.....؟" اس نے حلق سے بہ مشکل آواز نکالی۔ اس کا وجود ساکت کیفیت سے زلزلوں کی زد میں آ گیا تھا۔ اس کے اس سوال کے جواب میں پلک صرف ایک بار جھپکی گئی یعنی "نہ"۔

جمی کو جھٹکا سا لگا جس نے اسے بدترین جذباتی کیفیت سے نکال تو دیا لیکن اگلے ہی لمحے شدید حیران بھی کر دیا۔ روکی نہیں..... ممی بھی نہیں تو پھر کون؟

"کیا اس وقت کوئی تیسرا کمرے میں موجود تھا؟" اس نے پوچھا۔

"ڈیڈی! میں الجھن میں پڑ گیا ہوں۔ مجرم کا اشارہ دے کر آپ نے دو موجود افراد کے بارے میں "نہیں" کہا ہے۔ اس کا مطلب ہے معاملہ الجھا ہوا ہے۔ ڈیڈی! میں بالکل نہیں سمجھ پا رہا لیکن میں جانتا ہوں کہ میں یہ معاملہ حل کر لوں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔" جمی کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

اس نے باپ کو تو اطمینان دلا دیا تھا لیکن اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ اس کشمکش، الجھن میں دو دن گزر گئے۔

رات کا وقت تھا۔ وہ سونے کے بجائے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے اپنی اس الجھن کو حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس کے بارے میں وہ کسی کو حتیٰ کہ ممی تک کو نہیں بتا سکتا تھا۔ آج شام وہ جب روجر کے پاس بیٹھا تھا تو اسے روجر کی آنکھوں میں سوال نظر آ رہا تھا۔

وہ دماغ پر زور ڈال رہا تھا۔ اسی دوران اسے یہ بھی خوشی محسوس ہوئی کہ مجرم جو بھی ہو، کم از کم اس کی ماں تو نہیں ہے۔ اس نے پھر سوچنا شروع کیا۔

'روکی تھا..... ممی تھیں۔ پہلے ڈیڈی کی طرف دیکھ کر بول رہی تھیں پھر سیل فون پر بات کرنے لگیں اور پھر.....!' اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

"ممی..... کسی سے فون پر بات کر رہی تھیں۔" اس نے بڑے دھیان سے اپنی سوچی بات پر غور کیا۔

"اوہ..... مجھے پہلے کیوں یہ خیال نہیں آیا..... ایسا ہی ہے..... یقیناً ایسا ہی ہے۔" وہ اچھل کر بیڈ سے اترا اور روجر کے کمرے کی جانب بڑھا لیکن اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ روجر ادویات کے زیر اثر گہری نیند میں تھا۔ اگلی صبح کا انتظار کرنا اسے مشکل ترین کام لگ رہا تھا لیکن ساتھ ہی ایک خیال نے اسے مصروف کر دیا۔ وہ اٹھا اور پین اور نوٹ بک نکال لی۔

☆☆☆

"ممی! کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔ وہ دراصل میں

شگوفے

ایک بڑی فرم نے اپنے ملازمین کو پیشکش کی کہ وہ لوگ دفتر کے اخراجات کم کرنے کے طریقے بتائیں۔ جس ملازم کا طریقہ سب سے اچھا ہوگا، اسے پانچ سو روپے بطور انعام دیے جائیں گے۔

ایک نئے ملازم نے یہ کہہ کر مقابلہ جیت لیا کہ انعام کی رقم سو روپے سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔

انشورنس

ایک انشورنس ایجنٹ نے ایک خاتون کو بتایا۔ "ہمارے یہاں ایک نئی پالیسی متعارف ہوئی ہے جس کے تحت ہم ٹانگ یا ہاتھ ٹوٹ جانے پر ایک ہزار روپے ادا کرتے ہیں۔"

خاتون گھبرا کر بولیں۔ "اف میرے خدا۔۔۔ مگر آپ ان ٹوٹے ہوئے ہاتھ اور پیروں کا کرتے کیا ہیں؟"

(مرسلہ: شازیہ حمید، کراچی)

ہائے سردی

ایک فرمانبردار بیٹے نے سردیوں میں ایک گرم کوٹ پانچ سو روپے میں خریدا اور اسے اپنے باپ کو بھیجنے کا ارادہ کیا لیکن یہ سوچ کر کہ زیادہ مہنگا خریدنے پر والد ناراض نہ ہو جائیں، اس نے کوٹ پر تین سو روپے کا لیبل لگا دیا اور بھیج دیا۔

چند دنوں کے بعد اسے باپ کا خط ملا جس میں لکھا تھا۔

"کوٹ بہت گرم اور اچھا تھا۔ میں نے وہ کوٹ ساڑھے تین سو میں فروخت کر دیا ہے۔ تم ایسے ہی پانچ کوٹ اور بھیج دو۔"

(مرسلہ: فاروق سیال، مری)

نے ایک کار خریدنا تھا اور کچھ نئے....." روحی ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھا لزا سے مخاطب تھا۔

"ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔ مل جائے گی رقم، جتنی تمہیں چاہیے۔" لزا نے بڑے پیار سے بیٹے کی بات کاٹتے ہوئے اسے کہا۔

جمی خاموشی سے ناشتا کر رہا تھا اور روحی کا وقت بے وقت لزا سے رقم مانگنا معمول تھا۔ کچھ عرصے سے یہ چیزیں جمی کو چبھ رہی تھیں لیکن آج وہ ان باتوں پر ہلکا سا بھی دھیان نہیں دے رہا تھا۔ اس کا فوکس صرف اور صرف روجر سے پوچھے جانے والے سوالوں پر تھا جو اس نے سوچ رکھے تھے۔

ناشتا کرتے ہوئے لزا نے چند بار جمی کی جانب دیکھا اور پھر گہری سانس لے کر رہ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ روحی کے ساتھ آفس کے لیے روانہ ہو گئی۔ اس کے آفس نکلتے ہی جمی نے روجر کے کمرے کا رخ کیا۔ نرس کے ہاتھ سے سوپ لے کر جمی نے اسے باہر جانے کو کہا اور خود روجر کو سوپ پلانے لگا۔ روجر اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو "کچھ سمجھ میں آیا؟" جمی باپ کی کیفیت کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔

"ڈیڈی! آپ کے اشارے کے بعد میں نے آپ سے سوال پوچھے، جن کے جواب نے مجھے الجھا دیا۔ میں اس کے بعد سے اس معاملے کو سلجھانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اب میں آپ سے کچھ سوالات پوچھوں گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ کے اشارے کی جو مجھے سمجھ آئی ہے، وہ درست ثابت ہوگی۔" سوپ کا خالی پیالہ ٹیبل پر رکھتے ہوئے جمی باپ کی طرف متوجہ ہوا۔

"ڈیڈی! جس روز آپ نے مجرم کا اشارہ دیا، اس وقت روم میں ممی اور روحی موجود تھے۔ ان دونوں کے بارے میں آپ نے "نو" کہا اور پھر یہ بھی کہا کہ مجرم اسی دوران موجود تھا۔ میرے دماغ میں ایک اور خیال آیا ہے کہ اگر کوئی تیسرا ہے تو وہ وہی شخص ہو سکتا ہے..... ممی جس سے فون پر....." جمی ابھی یہیں پر تھا کہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی روجر نے دو بار پلکیں جھپک دیں یعنی "ہاں"۔

جمی جو مسلسل اس کے چہرے، آنکھوں پر نظر جما کر بات کر رہا تھا، اس کی اس حرکت پر چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"ممی جس سے بات کر رہی تھیں، وہ ہے آپ کا مجرم؟" جواب پہلے ہی مل چکا تھا پھر بھی اس نے پوچھا۔

روجر نے دوبارہ "ہاں" کہا۔

"گھٹیا، درندہ، ظالم..... میرے باپ کو اس حال پر پہنچانے والا اتنا قریبی ہے کہ ممی اس سے فون پر بات کر رہی تھیں۔ کون ہے وہ.....؟"

"جس وقت مجھے فون پر مجرم ہونے کا خیال آیا تھا میں نے کچھ لوگوں کے نام لکھے تھے۔ اب میں ایک ایک کر کے نام لوں گا۔ جب مجرم کا نام آئے، آپ دو بار پلکیں جھپک دیں۔ اگر آج کی لسٹ میں موجود لوگوں میں وہ نہ ہوا تو میں آج رات سوچ سوچ کر دوسری اور پھر تیسری لسٹ بناؤں گا اور بہت جلد آپ کا مجرم قانون کی گرفت میں ہوگا۔" جمی نے تیز تیز بولتے ہوئے جیکٹ کی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور ایک ایک نام لینے لگا۔ ہر نام لینے کے بعد وہ روجر کی طرف دیکھتا۔

جمی نام لیتا جا رہا تھا اور روجر ساکت لیٹا اسے دیکھ رہا تھا۔ جمی مایوس سا ہو رہا تھا۔ اب آخری دو نام بچے تھے۔ سیکنڈ لاسٹ نام لیتے ہوئے جمی نے روجر کی جانب دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ نئی لسٹ تیار کرنا پڑے گی لیکن یہ دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا جب روجر نے "یس" میں جواب دیا۔

چند لمحے گنگ سا رہنے کے بعد جمی نے دوسری اور پھر تیسری بار فہرست میں موجود سیکنڈ لاسٹ نام دہرایا اور تینوں بار جواب "ہاں" میں پا کر وہ کرسی پر ڈھے سا گیا۔ ہر مشکل میں ساتھ نبھانے والا ایک مہربان سا چہرہ اس کے سامنے آ رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنے گھر کو اس موڑ پر لانے والے، اس کے باپ کو اس حالت میں لانے والے کا پتا چل جانے کی خوشی منائے یا اس بات پر ششدر رہ جائے کہ ایسا شخص بھی یہ سب کر سکتا ہے۔ جمی کا خون کھول رہا تھا۔

"ڈیڈی! اس روز اس خطرناک روڈ پر جانے کا فیصلہ آپ کا تھا؟" جمی نے اپنے آپ کو سنبھالا اور باپ سے پوچھا۔

روجر نے "نو" میں جواب دیا۔

"اس طرف یقیناً وہ ڈرائیور لے کر گیا ہوگا کیونکہ وہ غدار ہو چکا تھا؟"

روجر نے "یس" کا اشارہ دیا۔ اب ساری تفصیل معلوم ہو چکی تھی۔ سازشی شخص نے سازش تیار کی، ڈرائیور کو خریدا اور پھر وہ حادثہ ہوا جسے سب حادثہ ہی سمجھ رہے تھے۔

"ڈیڈی! بے فکر رہیں۔ آپ کو اس حالت میں لانے اور ہمیں ایک سانحے سے دوچار کرنے والے کو میں جلد گرفتار کروا دوں گا۔ میں اب تو ممی سے بات کر سکتا ہوں نا؟" جمی نے کہا تو روجر نے دو بار پلکیں جھپکیں۔

Scanned with CamScanner

digest library.com

جمی کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکا کہ روجر کے داہنے ہاتھ میں ہلکی ہلکی سی جنبش ہو رہی تھی۔

☆☆☆

"ممی! ایک بات کرنا ہے آپ سے۔" لزا کے کمرے میں داخل ہو کر جمی نے بڑے عام سے انداز میں کہا۔

"کیا بات..... صبح نہیں ہو سکتی؟ میں تھکی ہوئی ہوں، آرام کرنا چاہتی ہوں۔" لزا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنی گردن کا مساج کر رہی تھی۔

"میں نے سارا دن اس وقت کا انتظار کیا ہے کہ آپ سے بات کروں حالانکہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کہوں کہ آفس کی مصروفیات چھوڑ کر فوراً پہنچیں لیکن اس لیے نہیں کیا کہ کسی کو شک نہ ہو جائے۔" جمی نے لزا کے قریب آ کر کہا تو لزا چونک پڑی۔

"کون سی اہم بات، جس کے لیے مصروفیات چھوڑنے کا کہنے والے تھے؟" لزا نے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شدید حیرت تھی۔

جمی کچھ کہے بغیر دروازے کی طرف بڑھا اور اسے بند کر کے لزا کے سامنے کرسی رکھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے انداز پر لزا اسے بڑے غور اور تجسس سے دیکھ رہی تھی۔

"ممی! جو میں کہنے لگا ہوں، وہ ذرا حوصلے سے سنیں۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ لزا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ڈیڈی کے ساتھ جو ہوا، وہ حادثہ نہیں بلکہ ایک سوچی سمجھی سازش تھی۔" جمی نے لزا کی سماعتوں میں دھماکا کیا۔ چند ثانیے گنگ سی رہنے کے بعد لزا نے بولنے کی ہمت کی۔

"یہ بات تم سے..... کس نے کی..... کس نے بتایا تمہیں؟" اپنے حواس کو بہ مشکل کنٹرول کر کے اس نے سوال کیا۔

"خود ڈیڈی نے۔" جمی نے اگلا دھماکا کیا۔

"کیا..... کیا کہا..... جمی تم یہ کیا.....؟" لزا سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"دھیان سے سنیں۔" ماں کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے جمی نے گویا اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بہت دھیمی تھی جو صرف لزا کو سنائی دے سکے۔

"ڈیڈی بول نہیں سکتے، بتا نہیں سکتے، کوئی بھی حرکت کرنے سے معذور ہیں لیکن یہ بتایا انہوں نے ہی ہے۔" جمی کہہ رہا تھا اور لزا اپنے ناسمجھ سے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔

"ایک روز جب میں ڈیڈی کے کمرے میں تھا تو گلاس گرنے کی آواز پر....." جمی نے اس روز کی بات بتائی تو لزا حیران رہ گئی۔

"میں حیران تھا کہ ڈیڈی نے آپ کو یہ خوشخبری بتانے سے کیوں منع کیا ہے۔ وہ تو مجھے اب معلوم ہوا کہ یہ اس لیے تھا کہ کہیں آپ خوشی خوشی میں یہ خبر سب کو نہ سنا دیں کیونکہ ان کے قتل کی سازش کرنے والا آپ کے انتہائی قریب تھا۔ اگر اسے پتا چل جاتا کہ روجر ٹھیک ہو رہا ہے تو وہ جو ڈیڈی کے بالکل معذور ہو جانے سے اطمینان میں ہے، دوبارہ ایک کرنے کی کوشش کرتا۔ ویسے میں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ ڈیڈی کے مجرم کو معلوم ہے کہ ڈیڈی اسے جان چکے ہیں، اس کا جواب ڈیڈی نے "نہ" میں دیا ہے۔" جمی بول رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے سن رہی تھی۔

"کون ہے مجرم..... کیا تم نے..... یہ بھی معلوم کر لیا ہے؟" لزا نے بے تابی سے سوال کیا۔ اس کی آواز لاشعوری طور پر اونچی ہو گئی تھی۔ جمی نے دونوں ہاتھ اس کے کندھے پر دوبارہ رکھ کر اسے آہستہ بولنے کا اشارہ دیا اور جواب دیے بغیر بولنے لگا۔

"ڈیڈی کے برتھ ڈے پر....." جمی کافی دیر بولتا رہا۔ اس نے اب تک کی ساری تفصیل ماں کو بتا دی۔ اس پر انکشافات کی بارش ہو رہی تھی۔ یہ سن کر وہ حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔ اس کے لیے یہ انکشاف غالباً سب سے زیادہ سنسنی خیز تھا کہ اس کا کند ذہن جمی دماغ لڑا رہا تھا اور یہ کہ وہ کافی کچھ بلکہ سب کچھ معلوم بھی کر چکا تھا۔

"کون ہے وہ جس نے یہ سب کیا..... نام..... بتاؤ اس کا۔" لزا نے گلوگیر آواز اور نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"وہ ہمارے بہت قریب کا آدمی ہے جس نے ڈرائیور کو خریدا وہ ڈیڈی کو جان بوجھ کر ادھر لے کر گیا جہاں قتل کر کے حادثے کا رنگ دیا جا سکے اور اب وہ ڈرائیور جس کی ڈیڈ باڈی تو اس لیے نہیں ملی کہ وہ مرا ہی نہیں لیکن وہ ادھر دوبارہ نظر نہیں آیا۔ وہ یقیناً اپنی قیمت لے کر کہیں دور چلا گیا ہوگا اور جو ماسٹر مائنڈ ہے اس کا پتا چل گیا ہے کہ وہ کون ہے لیکن ڈیڈی کو کیسے اس کے ماسٹر مائنڈ ہونے کا معلوم ہوا، یہ میں نہیں جانتا۔ شاید کچھ عرصے سے اس کی حرکتوں پر نظر ہو یا ڈرائیور کے ذریعے اس کا نام سامنے آیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب حادثہ ہوا جس کی مکمل تفصیل ڈیڈی بولنے پر ہی بتا سکتے ہیں، وہاں یہ موجود ہو۔" جمی نے کہا اور پھر ساتھ ہی بولا۔ اس نے اس دوران لزا کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"ممی..... وہ ہے..... ڈیڈی کا بزنس پارٹنر.....

Scanned with CamScanner

ہڈسن!'' جمی نے بالآخر نام بتادیا۔

لزا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ہر معاملے، ہر مشکل میں پیش پیش، دھیمے لہجے والا، روجر کی معذوری کے بعد بزنس کے معاملات پہلے سے بھی اچھی طرح چلانے والا، لزا کو تسلی دینے والا، باوقار، شائستہ سا ہڈسن اتنا بھیانک ہوسکتا ہے، یہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''تمہیں یقین ہے..... کہ تمہارے ڈیڈی نے..... اسی نام..... ہڈسن کے نام پر ''یس'' کہا تھا؟'' لزا نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔ اس کا جسم باقاعدہ کانپ رہا تھا۔

''جی..... یہ سچ ہے جو میں نے بتایا۔ میں تو.....'' جمی تھوڑا سا رکا اور پھر ذرا جھجک کر بولا۔ ''میں تو روی کو مجرم سمجھنے لگا تھا۔ دراصل.....'' جمی نے اپنے شک کی وجوہات بتائیں۔ ''لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ روی آپ سے مالی فائدہ لینے کے لیے لالچی تو ہوسکتا ہے لیکن وہ یا اس کا باپ مارک واردات نہیں کرسکتے۔'' جمی نے لزا کے ہاتھ اب بھی تھام رکھے تھے۔ لزا رو رہی تھی۔

''مجھے روجر کے کمرے میں لے چلو۔ آج میں خود اپنے شوہر سے بات کروں گی۔'' جمی کے کندھے کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے لزا نے کہا۔ اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔ چند ہی منٹ بعد وہ روجر سے تصدیق کرچکی تھی کہ ہڈسن ہی ان کی خوشیوں کا قاتل ہے۔

''حادثے کی مکمل نوعیت کیا ہے؟ اس کا جلد ہی پتا چل جائے گا کیونکہ اب بات روجر کی پلکوں کی ''یس، نو'' اور ہمارے سوالوں تک نہیں رہی۔ اب ہڈسن اور پولیس کے درمیان بات چیت ہوگی، مکمل جملوں کے ساتھ اور پھر ہماری پیٹھ میں خنجر گھونپنے والا انجام کو پہنچے گا۔'' آنسو صاف کرتے ہوئے لزا نے کہا۔ اس کے لہجے سے نفرت اور غصہ چھلک رہا تھا۔ اس نے روجر کا داہنا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اچانک اس کی کیفیت میں تھوڑی سی تبدیلی ہوئی۔ اس نے چونک کر اپنے ہاتھ کو دیکھا جس میں دبا ہوا روجر کا ہاتھ ہلکی ہلکی جنبش کررہا تھا۔ اس نے اس حرکت پر غور کیا اور خوشی سے چلائی۔

''جمی! دیکھو، تمہارے ڈیڈی کا ہاتھ حرکت کررہا ہے۔'' جمی تیزی سے آگے بڑھا اور روجر کے ہاتھ کو دیکھ کر مسکرادیا۔ یہ اس کے ڈیڈی کی طبیعت کی بہتری کی جانب اشارہ تھا۔

وہ وہیں بیٹھ گیا جبکہ لزا کمرے سے باہر نکل گئی۔ اسے نہایت ضروری کال کرنا تھی۔

☆☆☆

سارے بزنس پر قبضہ جمانے کے خواہشمند ہڈسن نے جو بھیانک شیطانی منصوبہ بنایا تھا، وہ ناکام ہوچکا تھا۔ گرفتاری کے بعد سچ اگلوانا پولیس کا کام تھا جو انہوں نے بخوبی نبھایا۔

روجر کا بزنس پارٹنر بننے سے پہلے ہڈسن اتنا بڑا کاروباری نہیں تھا۔ بڑی رقم قرض لے کر اس نے زوجر کے سامنے اپنی مالی پوزیشن مستحکم ظاہر کی۔ وہ روجر کی کامیابیوں اور شہرت سے بہت متاثر تھا اور ہر قیمت پر اس کے ساتھ کاروبار میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ یہ ہونے کے بعد آہستہ آہستہ وہ روجر سے حسد کرنے لگا اور منفی سوچوں نے اسے گھیر لیا۔ پورا بزنس سنبھالنے کے لیے اس نے پلان ترتیب دے لیا۔ لزا اس پر بہت اعتماد کرتی تھی اور روجر کی واحد اولاد جمی..... تو اس کے بارے میں کئی بار روجر نے ہڈسن سے بات کی تھی کہ وہ بہت سیدھا سادہ اور اپنے کھیل میں مگن رہنے والا بچہ ہے۔ خود اس کی بھی جمی سے جب ملاقات ہوئی، وہ انتہائی کم عقل اور بے ضرر سا دکھائی دیا۔

حادثے کی رات سے دو ہفتے قبل ساری سازش کا تانا بانا بُن لیا گیا تھا۔ روجر کو ایک ضروری بزنس میٹنگ کے لیے شہر سے باہر جانا تھا۔ ڈرائیور کو خرید لیا گیا جو جان بوجھ کر گاڑی کو اس سڑک پر لاتا اور پھر ٹرالر سے ٹکر مارتا۔ اس سے قبل ڈرائیور نے سائڈ پر اتر جانا تھا اور اپنی غداری کی قیمت وصول کرتے ہی دوسرے شہر کے لیے روانہ ہوجانا تھا۔

تیز بارش میں سارا پلان طے شدہ انداز میں ہوا لیکن روجر کی خوش قسمتی کہ وہ زیادہ نیچے گرنے کے بجائے سڑک سے چند فٹ نیچے جھاڑیوں میں پھنس گیا۔ اسے پتھر پر گرنے کی وجہ سے شدید چوٹیں آئیں لیکن قسمت کو اس کی زندگی منظور تھی اور ساتھ ہی اسے بے ہوش ہونے سے پہلے جانی پہچانی آواز بھی سنائی دی اور ساتھ ہی انتہائی قابلِ اعتماد ساتھی ہڈسن کا چہرہ بھی نظر آگیا۔

ہڈسن نے سب کچھ بتادیا لیکن وہ اس بات پر حیران تھا کہ اس کے بارے میں کیسے پتا چلا کہ وہ مجرم ہے؟ روجر تو گرتے ہی بے ہوش ہوگیا ہوگا۔ اول تو اس نے دیکھا ہی نہیں ہوگا، اگر دیکھا بھی تو وہ تو بولنے، ہاتھ سے لکھنے تک سے محروم ہے پھر اس کی نشاندہی کس نے کی؟ غائب ہوجانے والا غدار ڈرائیور بھی قانون کی گرفت میں آچکا تھا۔

ہڈسن پر اقدامِ قتل، فراڈ کی سخت دفعات لگیں اور لمبے عرصے کے لیے جیل کی سلاخیں اس کا مقدر بن گئیں جبکہ

Scanned with CamScanner

معذور ہونے والا روجر آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ قدرت اس پر مہربان تھی۔ وہ اٹک اٹک کر سہی لیکن تھوڑا بہت بولنے کے قابل بھی ہو رہا تھا۔ وہ وہیل چیئر پر آچکا تھا۔ اس کی ٹانگیں ابھی کوئی رسپانس نہیں دے رہی تھیں لیکن پھر بھی وہ بہت خوش تھا کیونکہ وہ بدترین حالت سے باہر نکل آیا تھا۔ قدرت اس پر مہربان تھی۔ اس کے کم عقل بلکہ کند ذہن قرار دیے گئے بیٹے نے پیچیدہ کیس حل کیا تھا۔

''تھینک یو ڈاکٹر! آپ نے جمی کے ساتھ مل کر راز کی حفاظت کی ورنہ واقعی معاملہ بگڑ سکتا تھا۔'' لزا، روجر کے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔

''آپ کا بیٹا بہت سمجھ دار ہے۔ میں نے ایسے ذہین لوگ کم ہی دیکھے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا تو لزا بے اختیار مسکرا دی۔ روجر کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔ جمی اس وقت موجود نہیں تھا۔

''ڈاکٹر! جسے آپ ذہین کہہ رہے ہیں، وہ اپنی حرکتوں کی وجہ سے کم عقل اور کند ذہن کہلاتا رہا ہے۔ وہ اتنا سیدھا تھا کہ عام سی باتیں بھی اس کے دائیں بائیں سے گزر جاتی تھیں۔ نہ جانے کیسے اس نے یہ سب کر لیا۔'' لزا نے بتایا تو ڈاکٹر بڑی متانت سے مسکرا کر بولا۔

''مسز روجر! یہ حقیقت ہے کہ ذہین، فطین، عام سمجھ والے لوگوں کے علاوہ کم فہم، کم عقل اور کند ذہن بھی ہوتے ہیں لیکن یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کئی کند ذہن وہ ہوتے ہیں جنہیں یہ ٹائٹل دے کر اور بار بار کہہ کر راضی کر لیا جاتا ہے کہ وہ خود کو یہی سمجھیں..... مسلسل کہا جائے تو جو تھوڑی بہت عقل ہوتی ہے، وہ بھی دب جاتی ہے لیکن اس کے برعکس اگر کوئی ایسے لوگوں کو یہ کہہ کر حوصلہ افزائی کرے کہ ..... تم کر سکتے ہو..... تم کسی سے کم نہیں ہو..... تو ایسے لوگ جن کے ذہنوں پر منفی جملے سن سن کر گرد پڑ چکی ہوتی ہے، وہ اپنے متعلق کہے گئے کو غلط ثابت کر سکتے ہیں۔ جمی کو کسی نے زبان سے نہیں کہا لیکن حالات اور باپ سے محبت نے اس کے دماغ کے بند دروازے کھول دیے۔ یہ مشاہدہ کرنے میں اتنا تیز ہو گیا کہ باپ کے تاثرات سے معاملے کے گڑبڑ ہونے کا اندازہ کر لیا پھر دماغ نے اتنا کام کیا کہ موڈی کے دیکھے گئے سین کے مطابق ''یس..... نو'' کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کا دماغ کیونکہ ایک رستے پر اسٹارٹ ہو چکا تھا اس لیے کیسز لگانا اور ایک ساکت پڑے شخص سے مجرم کا پوچھنے کے لیے ناموں کی لسٹ بنا لینا اس کے لیے روٹین کا کام بن گئے اور یہ آگے سے آگے بڑھتے ہوئے مجرم کو گرفتار کروانے تک کے مرحلے پر کامیابی سے پہنچ گیا۔ اگر جمی یہ سب نہ کرتا تو ہو سکتا ہے موقع پا کر ہڈسن روجر کو قتل کرنے کی پہلی کوشش میں ناکامی کے بعد دوبارہ وار کرتا۔'' ڈاکٹر بولتا جا رہا تھا اور لزا اور روجر بڑے انہماک سے سن رہے تھے۔

''جمی پر پیار سے توجہ دیں۔ وہ مزید اچھے کام کر سکتا ہے۔ یاد رکھیں، اس نے وہ کیس حل کیا ہے جس کے گواہ تھے نہ ثبوت، نہ کوئی مدعی۔ اسے حادثہ سمجھا گیا۔ اس واقعے کا واحد عینی شاہد متاثرہ شخص تھا جو کسی بھی قسم کی حرکت سے محروم تھا۔ یہ جمی کی انتہائی ذہانت کا ثبوت ہے کہ اس نے محض تاثرات دیکھ کر گڑبڑ ہونے کا اندازہ کیا اور مجرم کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ مجھے یقین ہے اب جمی کو آئندہ کوئی بھی کند ذہن نہیں کہے گا۔'' ڈاکٹر نے گفتگو ختم کرتے ہوئے روجر اور لزا کی جانب دیکھا۔ دونوں کے چہرے پر فخر اور شفقت کے جذبات واضح نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

''تم..... وکیل..... بنو گے.....؟'' روجر اٹک اٹک کر بیٹے سے سوال کرنے والا تھا۔ جمی اس کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے اسے پارک کی سیر کروا رہا تھا۔

''جی ڈیڈی! میں نے پڑھائی دوبارہ شروع کر دی ہے اور میرا ارادہ قانون کی تعلیم حاصل کر کے وکیل بننے کا ہے۔'' جمی نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''گڈ!'' روجر خوش ہوا۔

''ڈیڈی! جانتے ہیں میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟'' رک کر بینچ پر بیٹھتے ہوئے جمی نے باپ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''جان..... تا..... ہوں۔'' روجر مسکرا رہا تھا۔

''میں جانتا تھا کہ آپ جانتے ہیں۔'' جمی ہنسا۔ ''جب میں نے دوبارہ پڑھائی کا فیصلہ کیا تو میں نے فیلڈ چننے کا بھی سوچا۔ فوراً میرے دماغ میں آیا کہ بغیر گواہ، ثبوتوں اور کیس وائر کیے بغیر کیس کو جان سکتا ہوں، حل کر سکتا ہوں تو کورٹ کے معاملات تو اس کی نسبت آسان ہوں گے۔ کیوں ڈیڈی! ٹھیک کہا نا؟'' جمی نے روجر سے کہا۔ جواب میں روجر نے مسکراتے ہوئے دو بار پلکیں جھپکیں۔

''ارے..... ڈیڈی! کیا کرتے ہیں آپ۔'' جمی باپ کی شرارت پر ہنس دیا۔

اٹک اٹک کر بولنے والا روجر اپنے بیٹے کو فخر سے دیکھ رہا تھا۔

⌘⌘⌘

Scanned with CamScanner

محفلِ شعر و سخن

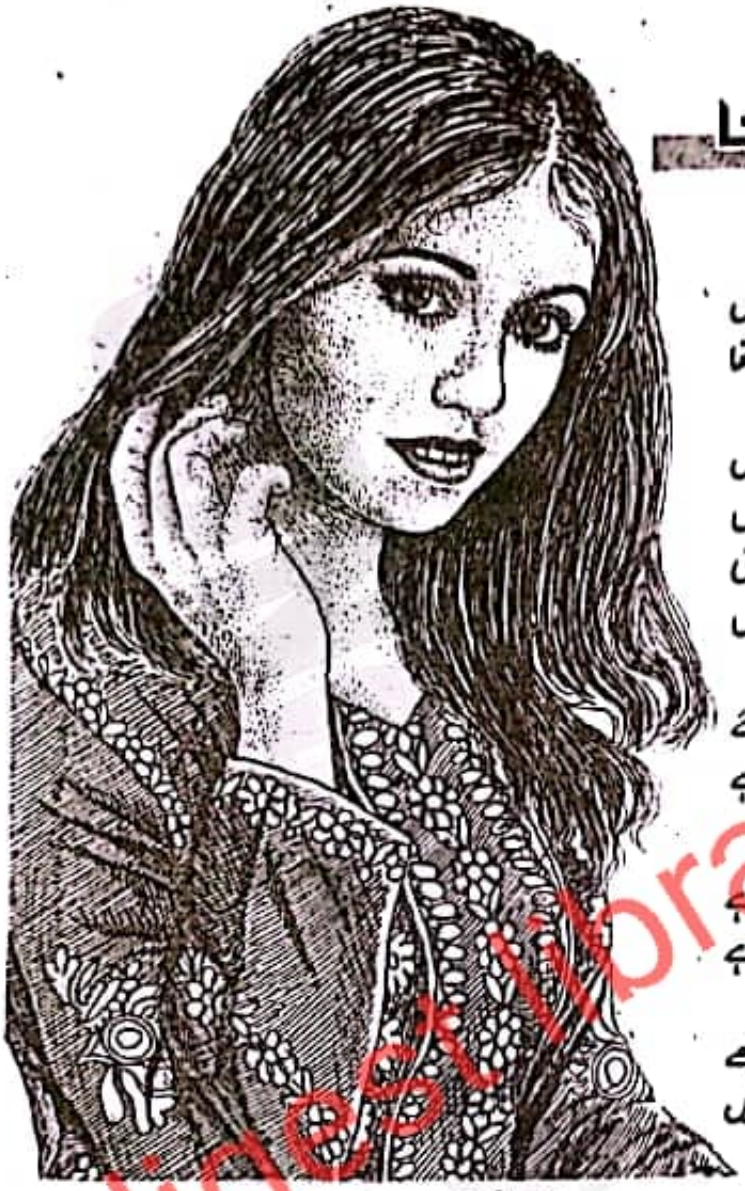

ظہیر عباس.....گلگت

وہ قتل کرکے مجھے ہر کسی سے پوچھتے ہیں
یہ کام کس نے کیا ہے، یہ کام کس کا تھا

❁ عیوق بخاری ..... ساؤتھ پنجاب

اوقات سے بڑھ کر ہم نے خواب دیکھے ہیں
اور پھر خواب ٹوٹنے کے عذاب دیکھے ہیں
ریت پر چل کر آبلہ پائی ہی مقدر بنی
اور پانی کی جگہ سراب دیکھے ہیں

❁ ایس شہزاد.....نواب شاہ

تجھ سے ملے بچھڑ گئے، تجھ سے بچھڑ کے مل گئے
ایسی بھی قربتیں رہیں، ایسے بھی فاصلے رہے

❁ رضوان احمد.....کبیر والا

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے
تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے

❁ آصفہ محمود.....کراچی

نشانے ان کے کبھی چوکتے نہیں دیکھے
بہت قریب سے جو لوگ وار کرتے ہیں

❁ بینش صدیقی.....بھکر

دنیا میں دو ہی لوگ تو بازوق ہیں عدم
اک میں ہوں اور دوسرا میرا رقیب ہے

❁ آصف راہی.....ہزارہ

بس ایک چہرہ کتابی نظر میں ہے ناصر
کسی کتاب سے میں استفادہ کیا کرتا

❁ نسیم خان.....کوئٹہ

کون سود و زیاں کی دنیا میں، درد و غربت کا ساتھ دیتا ہے
جب مقابل ہوں عشق اور دولت، حسن دولت کا ساتھ دیتا ہے

❁ نعمت اللہ خان.....پشاور

ان کو بھولے ہیں تو کچھ اور پریشاں ہیں فراز
اپنی دانست میں دل نے بڑی دانائی کی

❁ نسیم اختر.....ملتان

گفتگو کسی سے ہو تیرا دھیان رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا

❁ عائشہ شاہ زیب.....کراچی

کوئی واقف بھی نہیں ہے تجھ سے
اور چرچا بھی تیرا ہے ہر سو

❁ حورین شاہد.....کراچی

مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری
میری موت سے نہ ہوگی میرے غم کی ترجمانی

❁ انعم کمال.....حیدرآباد

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
سنی نہ معرکِ للسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

❁ شیراز احمد.....کراچی

آنکھ اس سوچ سے اکثر میری بھر آئی ہے
تم اگر روٹھے تو پھر کس سے شناسائی ہے

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

❁ مسز ضیا قمر.....ساہیوال

سچ تو یہ ہے دوستو بے کار ہیں حصار
لوگ گھر میں لٹ گئے میں گھر کے باہر بچ گیا

❁ محمد وسیم.....میاں چنوں

مجھ سے انا پرست نے چاہا اسے قتیل
پتھر کو اپنی آنچ سے پانی وہ کر گیا

❁ ظہیر بیگ.....راولپنڈی

پھیلتی جاتی ہے ناصر رنجِ ہستی کی روا
اور سمٹے جا رہے ہیں پاؤں پھیلانے کو ہم،

❁ حنا خان.....مری

ہر ایک چہرے پہ دل کو گمان اس کا تھا
بسا نہ کوئی یہ خالی مکان اس کا تھا

❁ خالد حبیب.....خوشاب

تاثیر ہی الٹی ہے اخلاص کے امرت کی
ہم جس کو پلاتے ہیں وہ زہر اگلتا ہے

❁ حماد رضا.....خانیوال

وہ مانگتے ہیں اب زخم پرانے مجھ سے
کبھی خود ہی بڑھائے تھے یارانے مجھ سے
اک میرا حوصلہ ہے کہ ضبط کیے بیٹھا ہوں
وہ کہ اب آئے ہیں حساب گنوانے مجھ سے

❁ عتیق ناز.....جہلم

بہت اداس ہو دیوار و در کے جلنے سے
مجھے بھی ٹھیک سے دیکھو جلا تو میں بھی ہوں

❁ حلیمہ ناز.....سکھر

آنکھوں سے میری کون میرے خواب لے گیا
چشمِ صدف سے گوہرِ نایاب لے گیا

❁ ایم خلیل.....مظفر گڑھ

ازل ہے بس گئی ہے سربلندی اپنی فطرت میں
مجھے بس ٹوٹنا آتا ہے جھک جانا نہیں آتا

❁ عامر مہدی.....کوئٹہ

میں اپنے اشک بچاؤں گا کس طرح محسن
زمانہ سنگ بکف ہے تو شیشہ گر آنکھیں

❁ یمنیٰ جاوید.....کراچی

ہماری قسمت میں لکھی تھی جدائی جو ہمیں ہمیشہ ملی
مزہ تو تب تھا جب کوئی چپکے سے ہم سفر بن جاتا

❁ گوہل نواز.....لاڑکانہ

چاند تنہائی کے پاتال میں تھک جاتا ہے
سوچتے ہوں گے بہت ہم سے بچھڑنے والے

❁ ارشد بھٹی.....بھکر

ہم سے قاتل کے خدّ و خال تو پوچھ
ہم نے مقتل میں شب گزاری ہے

❁ طارق محمود.....کوہاٹ

یہ دستورِ وفا صدیوں سے رائج ہے زمانے میں
صدائے قرب دی جن کو انہی کو دور دیکھا ہے

❁ نظام الدین.....لاہور

کیا خوب ہے یہ حسن بھی اور حسنِ ادا بھی
رشتہ ہے رقیبوں سے بھی اور ہم سے وفا بھی

❁ عظیم احمد.....جھنگ سٹی

بلند رکھنا نگاہ اپنی، مزاج اپنا، خیال اپنا
نہ ڈگمگائیں قدم تیرے کچھ اس طرح رکھنا وقار اپنا

❁ فہیم خان.....کوئٹہ

بھول گیا رنگ حنا بھی میرا
خط بھی خون سے تحریر ہوا کرتے تھے

❁ شازیہ ذوالفقار.....نواب شاہ

ہم باوفا تھے اس لیے نظروں سے گر گئے
شاید تمہیں تلاش کسی بے وفا کی تھی

❁ محمد علی آتم.....ڈی آئی خان

تو کبھی دیکھ جلتے ہوئے صحرا میں درخت
کیسے جلتے ہیں وفاؤں کو نبھانے والے

❁ نازیہ خان.....آزاد کشمیر

مجھ کو تو اپنے حال پہ رہنے دے اے ناصح
ان کی جفاؤں نے مجھے سب کچھ سکھا دیا

❁ ساجد عباس.....حافظ آباد

اس بیاباں میں ہے سایہ بھی گریزاں مجھ سے
کون دیکھے گا تماشا میری رسوائی کا

❁ ڈاکٹر نصیر شیخ.....فیصل آباد

بے وجہ تو نہیں ہیں چمن کی تباہیاں
کچھ بجلیاں ہیں برق و شرر سے ملے ہوئے

❁ اعجاز احمد.....واہ کینٹ

میری پلکوں پہ جلے ہیں جو تیرے نام کے ساتھ
ان چراغوں کا تعلق ہی نہیں شام کے ساتھ

❁ دردانہ ریاض.....میرپور خاص

دل کے دریا کو کسی روز اتر جانا ہے
اتنا بے سمت نہ چل لوٹ کے گھر جانا ہے

❁ بدر زمان.....پنوعاقل

دنیا کی ہر خوشی سے تیرا غم عزیز تر
روزِ ازل سے تیری عطا کے اسیر ہیں

Scanned with CamScanner

❁ محمد اسلم.....ملک وال

لوگ پتھر مارنے آئے تو وہ بھی ساتھ تھے
ہم خطائیں جن کی اپنے نام لکھواتے رہے

❁ عبدالقیوم.....کمالیہ

وہ ایک پل کو دکھائی تو دے کہیں محسن
میں جاں گنوا کے بھی اس پل کو مختصر نہ کروں

❁ عبدالعزیز خان.....شیخوپورہ

پھر کیوں ہے غریبوں کے مکانوں میں اندھیرا
یہ چاند اگر سارے زمانے کے لیے ہے

❁ سلمیٰ پرویز.....کوٹ غلام محمد

اس نے ہنسی ہنسی میں محبت کی بات کی
میں نے عدیم اس کو مکرنے نہیں دیا

❁ شاہین مجسم.....کراچی

اس لیے کوئی زیادہ نہیں رکتا ہے یہاں
لوگ کہتے ہیں میرے دل پہ تیرا سایہ ہے

❁ حفیظ محمد.....مظفرگڑھ

اک آگ غمِ تنہائی کی جو سارے بدن میں پھیل گئی
جب جسم ہی سارا جلتا ہو پھر دامنِ دل کو بچائیں کیا

❁ فوزیہ رحمان.....پشاور

جھوٹ بولوں گا تو سولی پر چڑھا دے گا مجھے
میرے اندر کا تو انسان ابھی زندہ ہے

❁ ولید احمد.....اوکاڑہ

چاند تنہائی کے پاتال میں تھک جاتا ہے
سوچتے ہوں گے بہت ہم سے بچھڑنے والے

❁ رضوان سعید.....سرگودھا

جلتی رہیں دیارِ محبت کی مشعلیں
کیا جانے آفتابِ تمنا کہاں ڈھلے

❁ شاہینہ مہتاب.....چنیوٹ

خود پیاس کا صحرا ہوں مگر دل کی یہ ضد ہے
کہ دشت پہ ساون کی طرح ٹوٹ کے برسوں

❁ عنایت حسین.....دوہڑی

تنہا سمجھ رہا ہے میرے دل کو چارہ گر
دنیا بسی ہے اس میں کسی کے خیال کی

❁ محمد اقبال.....کراچی

تیری معصومیت اے عشق روا سب بجا لیکن
یہ دنیا ہے، فرشتوں پر بھی تہمت آ ہی جاتی ہے

❁ شاہدہ جنید.....کراچی

اس دور میں احساسِ وفا ڈھونڈنے والو
صحرا میں کہاں ملتے ہیں دیواروں کے سائے

❁ قاضی فضل.....لودھراں

یہ ڈوبتا ہوا سورج ٹھہر نہ جائے وہی
اگر وہ سامنے وقتِ زوال آجائے

❁ مصباح علی.....خانپور

میں کشتی میں اکیلا تو نہیں ہوں
میرے ہمراہ دریا جارہا ہے

❁ عبدالرشید.....ملتان

اٹھ کر تو آگئے ہم تیری بزم سے مگر
یہ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

❁ مہتاب احمد.....حیدرآباد

تمام رات میرے گھر کا ایک در کھلا رہا
میں رات بھر دیکھتی رہی وہ راستہ بدل گیا

❁ نبیلہ اظہار.....لیہ

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

❁ نعیم احمد.....بہاولپور

آؤ سوچیں خزاں آنے سے پہلے ایک رات
کون دیکھے گا بہاروں کا پریشان ہونا

❁ ہما نواب.....ایبٹ آباد

آیا ہی تھا خیال کہ آنکھیں چھلک پڑیں
آنسو کسی کی یاد سے کتنے قریب تھے

❁ سعدیہ وہاب.....وہاڑی

جب وہ مجھ سے چھپ کر رویا، تب یہ بات کھلی ہے
کہنے کو ہم ایک ہیں لیکن دکھ اپنا اپنا ہے

❁ فیاض احمد.....اوکاڑہ

اڑتا ہوا غبار سرِ راہ دیکھ کر
انجام ہم نے عشق کا سوچا تو رو دیے

محفلِ شعر و سخن

کوپن برائے شعر و سخن
جنوری 2026

نام: ----------

پتا: ----------

Scanned with CamScanner

کسی بھی شخص کا ماضی اس کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے... بیتی ہوئی تلخ یادیں اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں... اور بعض دفعہ تو دماغی پیچیدگی کا بھی سبب بن جاتی ہیں... اس کا ماضی بھی تلخ تجربوں سے عبارت تھا... ایسے میں ذہنی دباؤ کے سبب اس کی ازدواجی زندگی متاثر ہونے لگی... مگر پھر اچانک ایک راز سے پردہ اٹھ گیا۔

ماضی میں بُرے تجربات سے گزرے ایک شخص کی کہانی

راز

اے آر راجپوت

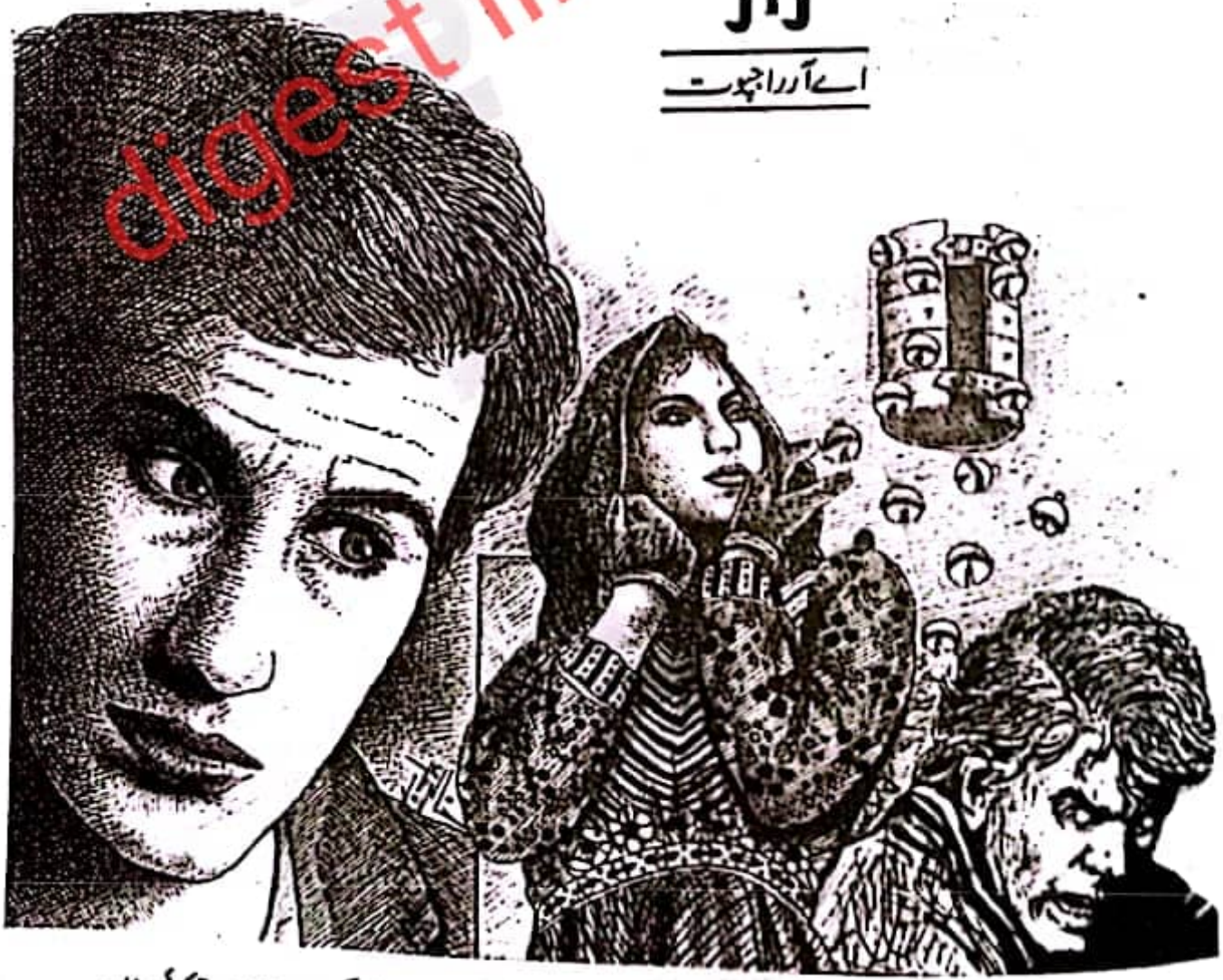

وہ سپر اسٹور عالیہ کے گھر کے نزدیک ہی واقع تھا جہاں سے وہ اپنے شوہر اجمل کے ساتھ ہر ماہ کی گروسری اور دیگر ضروری خریداری کیا کرتی تھی۔

عموماً یہ دونوں میاں بیوی دوپہر کو ہی جاتے، وجہ اس کی یہی تھی کہ اس وقت رش کم ہی ہوتا تھا، اور تو کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن کیش کاؤنٹرز پر لمبی لمبی قطاریں دیکھ کر عالیہ کا دل گھبرانے لگتا تھا پھر ایسے میں تھکن کا بھی احساس سوا ہو جاتا، اسی لیے یہ دونوں دوپہر یا سہ پہر میں ہی شاپنگ کر آتے۔

digest library.com

Scanned with CamScanner

آج بھی حسب سابق دونوں خریداری میں مصروف تھے۔ اجمل نے ٹرالی سنبھالی ہوئی تھی اور عالیہ اس کے اندر پسند کی چیزیں رکھے جا رہی تھی۔ تب ہی اچانک عالیہ کو لگا، کوئی شخص اسے نہ صرف دیکھے جا رہا تھا بلکہ ان کے قریب بھی ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ ان کی شاپنگ تقریباً ختم ہو چکی تھی اور کیش کاؤنٹر سے بھی فارغ ہونے ہی والے تھے کہ اسی دوران ایک بار جب عالیہ نے کچھ غور کے ساتھ اس کی طرف گھورا تو چونک پڑی۔ وہ اسے شناسا لگا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ عالیہ کو اس کی مسکراہٹ دیکھ کر ایک ''خوشگواری'' کا احساس ہوا۔

''ارے..... عالیہ! تم..... کیسی ہو بھئی؟ سنا ہے تمہاری شادی ہو گئی تھی۔ تم تو ایسی غائب ہوئیں کہ اپنا کوئی پتا نشان ہی نہ چھوڑا۔'' اسد اس کی طرف بڑھتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے بولا۔

عالیہ اسے اسد کی حیثیت سے پہچان چکی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے گھبرا کر جب اپنے شوہر اجمل کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں جیسے شعلے برسا رہی تھیں۔ اسی لہجے میں وہ عالیہ سے بولا۔

''میں گاڑی پارکنگ سے نکالتا ہوں، فارغ ہو کر آجانا۔'' اس کے بعد وہ اسد کو خاصی چبھتی ہوئی نظروں سے گھورتا ہوا ایگزٹ ڈور کی طرف لپکا۔ عالیہ اپنی پوری جان سے لرز گئی۔

بہرکیف، اس نے کسی نہ کسی طرح اسد کو ٹالا اور جلدی سے ٹرالی گھسیٹتے ہوئے باہر آگئی۔ اجمل گاڑی آگے لا چکا تھا، اتر کر اس نے سامان ڈکی میں رکھا اور پھر دونوں کار میں فرنٹ سیٹوں پر سوار ہو گئے۔ اجمل نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

سارے راستے اجمل نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ وہ بس ہونٹ بھینچے سامنے نظریں جمائے چپ چاپ گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ گھر پہنچے، سامان اتروایا، اس کے بعد اجمل خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ کر کہیں نکل گیا۔

اس دن کے بعد اجمل بالکل بدل کر رہ گیا۔ عالیہ سے اس نے بات چیت بھی بند کر دی، یہاں تک کہ دونوں الگ کمرے میں سونے لگے۔ اجمل کے اس طرح یکلخت بدل جانے پر عالیہ بیچاری متحیر تھی۔ اگرچہ اسے پتا تھا کہ اجمل کس قدر شکی مزاج کا آدمی ہے مگر وہ اس حد تک جا سکتا تھا، اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اس نے سوچا کہ اسد اس کا کلاس فیلو ہی تھا، اگر ایک عرصے بعد اسے دیکھ کر اس نے اس کے ساتھ بات کر لی تھی تو کون سی قیامت آگئی تھی؟ یہ تو اجمل کو اس سے شادی سے پہلے ہی سوچنا چاہیے تھا کہ وہ ایک ایسی لڑکی سے شادی کر رہا ہے جو پرائمری سے لے کر یونیورسٹی تک لڑکوں کے ساتھ پڑھتی رہی ہے۔ کیا اس نے اسے ایسی ہی حقیر اور گری پڑی شے سمجھ رکھا ہے؟ اس کے رویے سے تو یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ اس پر قطعی اعتماد نہیں کرتا۔ ابھی تو ان کی شادی کو چھ ماہ ہوئے تھے اور ابھی سے یہ حال تھا تو باقی زندگی یوں بے اعتمادی کی اس فضا میں آرام سے کیسے گزر سکتی تھی؟

عالیہ کو شب زفاف کا وہ لمحہ یاد تھا جب اجمل نے اس کا گھونگٹ اٹھاتے ہی یہ بات اس سے کہہ دی تھی۔

''عالیہ! میں بہت صاف گو انسان ہوں، نہ ہی میں کسی کو دھوکا دینا پسند کرتا ہوں اور نہ ہی یہ چاہوں گا کہ کوئی مجھے دھوکا دے۔ میں نے اپنی اب تک کی زندگی بے حد صاف ستھری گزاری ہے۔ کبھی اپنے دامن کو کسی برائی سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ میرا کردار ہمیشہ سے بے داغ رہا ہے۔ میں آج تمہارے سامنے عہد کرتا ہوں کہ تمہارا ہوں اور تازیست تمہارا ہی رہوں گا۔ کسی دوسری عورت کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گناہ سمجھوں گا۔ اس لیے میں تم سے بھی یہی امید رکھتا ہوں، تم بھی مجھے یقین دلاؤ کہ تم سے اپنے ماضی میں کوئی لغزش نہیں ہوئی اور یہ بھی وعدہ کرو کہ ہمیشہ میری وفادار بیوی بن کر رہو گی۔''

تب عالیہ حیرت سے اپنے اس عجیب و غریب شوہر کو دیکھتی رہ گئی تھی اور اسے یقین ہو چلا تھا کہ اجمل بے حد شکی مزاج ہے۔ چونکہ اس کے ذہن پر بھی کوئی بوجھ نہ تھا اس لیے اس نے اجمل کو یقین دلا دیا تھا کہ اس نے ماضی میں بھی ہمیشہ پاکیزہ زندگی بسر کی ہے اور آئندہ اجمل ہی کے ساتھ وفادار رہے گی..... وغیرہ۔

یہ ''دلچسپ'' عہد و پیماں کرتے ہوئے اس وقت عالیہ دل ہی دل میں بہت ہنسی بھی تھی۔ تاہم اس میں بھی شبہ نہیں کہ اجمل نے بعد میں اسے بے اندازہ چاہتیں دیں لیکن اس وقت وہ الجھ کر رہ جاتی تھی جب اجمل اس پر اکثر اپنی بے اعتمادی کا بھی اظہار کرتا۔ نہ اسے وہ کہیں اکیلے جانے کی اجازت دیتا اور نہ ہی خود کبھی اپنے کسی دوست کے گھر لے جاتا۔ آفس جانے کے بعد دن میں کئی کئی بار فون کرتا رہتا، سیل فون کی تو شامت ہی آئی رہتی۔ یہاں تک کہ کچن میں کام کے دوران عالیہ کو ہینڈ فری ہر وقت کان سے لگائے رکھنا پڑتا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی تھی کہ کچھ لوگوں کا مزاج ایسا ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ سب کچھ

Scanned with CamScanner

digest library.com

معمول پر ہو جائے گا۔

ایک ملازمہ تھی، پھر ایک دن نہ جانے اجمل کے جی میں کیا سمائی کہ وہ اپنی کسی دور کی رشتے کی پھوپی کو ہمیشہ کے لیے گھر لے آیا۔ اجمل کی یہ پھوپی بیوہ اور بے اولاد تھی مگر ''بڑی بی'' تھیں بڑی کائیاں۔ ایک ماہر جاسوس کے سے انداز میں عالیہ کی ایک ایک حرکت کی نگرانی کرتی تھیں۔ عالیہ سمجھ گئی کہ وہ اجمل نے محض اس کی چوکیداری کے لیے ان بڑی بی کو اپنے سر پر مسلط کیا ہے۔ موبائل فون پر کسی کی کال آجاتی تو وہ بھی کان لگا لیتیں۔

یوں تو اجمل ہر طرح سے اچھا ہی تھا، اس کا بہت خیال بھی رکھتا تھا۔ دفتر سے سیدھا گھر آجاتا، اسے اپنے ساتھ شام کو اکثر سیر کے لیے لے جاتا۔ دونوں عموماً رات کا کھانا بھی باہر ہی کھاتے تھے۔ اس کے کہے بغیر ہی ڈھیروں شاپنگ کروا ڈالتا۔ فرشیکہ شکی طبیعت کے علاوہ وہ ہر لحاظ سے ایک مثالی شوہر تھا۔ عالیہ یقیناً اپنی قسمت پر رشک کرتی اگر اجمل کی فطرت میں اس قدر بے اعتمادی نہ ہوتی۔

عالیہ بہر حال یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اجمل آخر ان اچھائیوں کے باوصف ایسا کیوں ہے؟ بظاہر وہ ایک مکمل انسان ہی تھا، اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی، انگلینڈ سے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ایک فرم میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ خوبصورت سا گھر، گھومنے پھرنے کے لیے گاڑی، گویا کسی چیز کی کمی نہ تھی۔

اجمل سے عالیہ کی شادی بس اچانک ہو گئی تھی۔ اس نے ابھی بی اے کا امتحان دیا ہی تھا کہ اس کے بہت سے رشتے آنے لگے۔ عالیہ فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتی تھی، اس کی خواہش تھی کہ کم از کم ایم اے تو کر لے مگر ماں کو اس کی شادی کی بہت جلدی تھی کیونکہ اس سے چھوٹی تین اور بہنیں تھیں اور ماں کلثوم بیگم چاہتی تھیں کہ جلد از جلد بیٹیوں کے فرائض سے سبکدوش ہو جائیں۔

بھائی کوئی نہیں تھا۔ عالیہ نے کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا، باپ کسی پرائیویٹ کمپنی میں اچھے عہدے پر تھا۔ بہر کیف، اجمل کا رشتہ آیا، پسند کیا گیا اور چٹ منگنی، پٹ بیاہ ہو گیا۔

اسد، عالیہ کا محض کلاس فیلو تھا اور بس..... لیکن ہنسی مذاق اور مسکرا کر بات کرنے کی عادت تھی جو سب کو ہی اچھی لگتی تھی۔ وہ بدخصلت نہ تھا۔ بہر کیف، اجمل کے اس قدر بیگانہ ہو جانے اور ہر طرح کا تعلق توڑ دینے پر عالیہ کو بے حد دکھ ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اجمل کو کیسے یقین دلائے کہ اسد صرف اور صرف اس کا کلاس فیلو تھا۔ عورت ذات کی سو مجبوریاں ہوتی ہیں، وہ کسی سے کہہ کر نہ تماشا بننا چاہتی تھی، نہ ہی اپنے گھر والوں کو پریشان کرنے کو اس کا دل کرتا۔ خود اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اس معاملے پر اجمل سے کھل کر بات کر سکے۔ کوئی قریبی اور گہری سہیلی بھی نہ تھی کہ اسے ہی اپنا دکھڑا بیان کر کے کوئی مشورہ لے لیتی۔

انسان جب تنہا ہو جائے تو پھر گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ یہی حال عالیہ کا ہوا۔ اس نے سب کچھ خدا پر چھوڑ دیا۔ عالیہ اب ساتھی اور ہمسفر کے ہوتے ہوئے بھی تنہا رہ گئی تھی۔ بس، دونوں کے بیچ ضرورت کی حد تک بات ہوتی اور ختم۔

آخر کب تک..... بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب اجمل سے بات کر کے ہی رہے گی۔ اس طرح آخر کب تک چلتا رہے گا۔

''اجمل!'' اس نے اسے مخاطب کیا۔

''جی فرمایئے؟'' اجنبی اور کسی قدر تلخ لہجے میں کہا گیا۔ عالیہ کی ہمت ٹوٹنے لگی، دل چاہا وہ بغیر مزید بات کیے پلٹ جائے مگر آج اس کے فیصلہ کن عہد نے اس کے قدم روک لیے۔

''آپ مجھ سے ناراض ہیں؟'' اس نے کہا۔

''بڑی جلدی خیال آگیا میری ناراضگی کا۔'' اجمل زہر خند لہجے میں بولا۔

''وہ..... وہ میں.....'' عالیہ نے بے چینی سے ہاتھ مسلے۔

''کہیے، رک کیوں گئیں؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''پلیز! آپ یقین کریں کہ اسد میرا محض کلاس فیلو تھا، اسی لیے اس نے مجھ سے بات کی تھی ورنہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔''

''اوہ، اچھا..... تو وہ آپ کا کلاس فیلو تھا؟ بڑی بے تکلفی تھی اس کی تمہارے ساتھ..... کیا کلاس فیلو ایسے ہی آپس میں فری ہوتے ہیں؟'' اجمل نے تمسخرانہ کہا تو اس ذہنیت پر بے اختیار عالیہ کا سر پیٹ لینے کو جی چاہا۔ وہ اپنے کمرے میں واپس آگئی اور اپنی بدنصیبی پر آنسو بہانے لگی۔

صبح ناشتے کی میز پر اجمل کا موڈ سخت خراب تھا، جب ہی اس نے محض آملیٹ میں نمک کم ہونے کا بہانہ کر کے ملازمہ کے سامنے ہی عالیہ کو سخت سست کہنا شروع کر دیا تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

''آنسو بہانے کی ضرورت نہیں۔'' اجمل بے رحمی سے بولا۔ ''تم عورتوں کے پاس مردوں کو رام کرنے کا ایک

Scanned with CamScanner

ہی ہتھیار ہے، آنسو..... مگر میں ایسا نہیں ہوں۔ مجھ پر تمہارے ان آنسوؤں کا قطعی اثر نہیں ہوگا۔'' وہ آخر میں غرّایا۔ بے اختیار عالیہ کا بھی جی چاہا کہ چائے کی گرم گرم پیالی اس سنگدل شخص کے خوبصورت چہرے پر دے مارے جس کا اندر اتنا غلیظ تھا۔

وہ آگے بولتا رہا۔ ''دنیا کی ہر عورت مکار اور بے وفا ہوتی ہے، عیش شوہر کی کمائی پر کرتی ہے اور آنکھ کسی اور سے لڑاتی ہے۔ میں نے شادی کے پہلے دن ہی تمہیں سمجھا دیا تھا کہ میں تمہاری بڑی سے بڑی خطا معاف کرسکتا ہوں لیکن یہ کبھی برداشت نہیں کروں گا کہ تمہارے ماضی میں کسی شخص سے تعلقات رہے ہوں اور تم نے کس معصومیت سے کہا تھا کہ تمہارا ماضی بے داغ ہے..... ہم..... شکر ہے کہ جلد ہی مجھ پر تمہاری اصلیت کھل گئی ورنہ پتا نہیں میں کب تک تمہارے فریب کا شکار ہوتا رہتا۔ اب میں تمہیں اس قدر اذیتیں دوں گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ یہ تو سوچنا بھی مت کہ میں تمہیں طلاق دے کر آزاد کردوں گا تاکہ تم آسانی سے اپنے محبوب کے ساتھ شادی کرسکو۔ میں تمہاری بے وفائی کے تم سے گن گن کر بدلے لوں گا۔ تمہارے لیے میں یہ زندگی اس قدر کٹھن بنادوں گا کہ تم موت کی پناہ مانگو گی مگر تمہیں مرنے بھی نہیں دوں گا۔'' اجمل کے لہجے میں پرلے درجے کی جہالت اور چٹانوں جیسی سنگینی تھی۔

عالیہ کا جی کیا کہ وہ بھی سناڈالے مگر وہ اپنی مجبوریوں کے سبب خاموش رہی۔

عالیہ نے اللہ سے مدد مانگی۔ اللہ نے عورت کو صبر جیسا مضبوط ہتھیار دیا ہے۔

''میرے معبود! صرف تو ہی ہے جو اس گھڑی میں میری مشکل آسان کرسکتا ہے۔ اس شخص کو ہدایت دے اور مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد ہوئی ہو تو وہ معاف فرما۔'' دعا کے بعد عالیہ کو کچھ روحانی سکون سا ملا۔

ایک دن شام میں اچانک اجمل کا چھوٹا بھائی احسان اور اس کے بیوی بچے آگئے۔ دو بچے تھے، ایک سولہ سالہ لڑکا فہیم اور پندرہ سالہ سعدیہ، بیوی عاشی بھی تھی۔ اس کی ذرا عالیہ سے گہری دوستی تھی۔ عالیہ پیار سے اسے ''بھابی بہن'' کہتی۔

اس دن پہلی بار مجبوراً سہی، اجمل نے عرصے بعد عالیہ سے اچھی طرح بات کی ورنہ تو وہ شعلہ فشاں بنا رہتا۔ اب بھائی، بھابی کے آنے پر یوں دکھاوا کرنے لگا جیسے عالیہ اور اس کے تعلقات بہت ہی اچھے ہوں۔

عالیہ بھی اب اجمل کے ستم سہہ سہہ کر تنگ آچکی تھی چنانچہ اس نے بھی موقع تاک کر تنہائی میں عاشی بھابی کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

بھابی عاشی بہت مخلص تھیں۔ اسے گلے لگالیا اور کہنے لگیں۔ ''عالیہ! تم تسلی رکھو، تمہاری اس میں کوئی خطا نہیں ہے۔ دراصل اجمل تم سے اپنی ماں کا انتقام لے رہا ہے۔''

''کیا.....؟'' عالیہ متحیر سی بھابی عاشی کا چہرہ تکنے لگی۔

''میں کچھ سمجھی نہیں بھابی؟'' اس نے الجھ کر کہا۔

''ہاں.....!'' عاشی جیسے دھماکا کرنے کے انداز میں آگے بولی۔ ''یہ اس خاندان کا ایک اسرار ہے جو آج تک کسی کو نہیں بتایا گیا۔ مجھے بھی بس سمجھو اتفاق سے ہی ان کی کسی پرانی جان پہچان والی سے علم ہوا تھا۔ ایک مرتبہ احسان مجھے اپنے آبائی گاؤں لے گئے، وہاں ان کی چچی نے مجھے ان کی والدہ کے متعلق سب کچھ تفصیل سے بتادیا تھا۔ یہ راز آج تک میرے دل کی گہرائیوں میں دفن ہے۔ میں نے بھی احسان کو کبھی علم نہیں ہونے دیا کہ میں ان کی ماں کی اصلیت جان چکی ہوں۔ میں تمہیں بھی کبھی نہ بتاتی مگر اب چونکہ تمہاری زندگی متاثر ہورہی ہے اس لیے مجبوراً مجھے تم پر اس راز کا انکشاف کرنا پڑ رہا ہے۔

''اجمل اور احسان کی ماں درحقیقت ایک طوائف تھی۔ اجمل کا باپ تیمور ایک بہت بڑے زمیندار کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بے حد لاڈلا، خودسر اور قدرے رنگین مزاج بھی۔ شہر میں زیرِ تعلیم تھا اور تعلیم کے بہانے تفریح اور آوارہ گردی کرتا رہتا۔ وہیں اس کی ملاقات چنی بائی کی بڑی حسین بیٹی پاکیزہ سے ہوگئی۔

''پاکیزہ ایک نوشگفتہ پھول کے مانند پاکیزہ تھی۔ وہ اس بازار کے ماحول سے سخت نفرت کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ جلد از جلد اس دوزخ سے نجات حاصل کرلے۔ اس سے قبل کہ اس کی ماں اس کی معصومیت کو داغدار کرتی، پاکیزہ کی خواہش پر اجمل کے والد یعنی تیمور موقع پاکر اسے اغوا کرکے لے گئے۔

''چنی بائی اور اس کے گرگوں نے پاکیزہ کی تلاش میں زمین و آسمان ایک کرڈالا مگر انہیں ناکامی ہوئی۔ تیمور (اجمل کا باپ) حیدرآباد میں ہی اپنے ایک دوست کی کوٹھی میں پاکیزہ سمیت چھپا ہوا تھا۔ پھر تیمور نے پاکیزہ سے نکاح کرلیا اور اس کے دوست نے انتہائی خفیہ طور پر انہیں ان کے آبائی گاؤں پہنچادیا۔

''تیمور نے اپنے والدین کو صرف یہ بتایا کہ اس نے

Scanned with CamScanner

پاکیزہ کے ماں باپ کی مرضی کے خلاف اس سے شادی کی ہے تاہم پاکیزہ کی اصلیت تیمور نے کسی کو بھی نہ بتائی۔ پھر تیمور نے مزید تعلیم کا ارادہ ترک کر دیا اور زمینداری کرنے لگا، اسی طرح دس سال بیت گئے۔ پاکیزہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ تیمور، پاکیزہ کو پا کر بہت خوش تھا۔ اس نے اس کی زندگی کو جنت کا نمونہ بنا دیا تھا۔ اس کے اطوار سے بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی طوائف کی بیٹی ہے۔

''دس سال کے اس عرصے میں پاکیزہ نے تیمور کے تین خوبصورت اور صحت مند بیٹوں کو جنم دیا تھا۔ اس دوران کئی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ تیمور کے والدین یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے۔ اب خاندان کی سربراہی کا منصب اس کے بڑے بھائی کے پاس تھا۔

''گھر میں سکون و اطمینان تھا۔ تینوں بھائیوں کی بیویاں اور اولادیں ایک ہی حویلی میں گھل مل کر خوش و خرم زندگی بسر کر رہی تھیں۔ اس کے ماضی کے متعلق سوائے تیمور کے کسی کو بھی علم نہیں تھا اس لیے وہ مطمئن تھی کہ یہاں کوئی ایسا فرد نہیں جو اس کے ماضی کا حوالہ دے کر اسے ذلیل کر سکے لیکن پھر اچانک تیمور کی ہنستی کھیلتی زندگی کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی کہ ان کا گلشن اجڑ گیا اور ایک رات پاکیزہ اچانک ہی گھر سے غائب ہو کر اپنے چاہنے والے شوہر کو زندہ درگور کر گئی۔

''زمیندار تیمور تو نیم پاگل ہو گیا تھا۔ اس نے غم و غصے میں خاندان کے بچے بچے کو اس کی اصلیت بتا دی۔

''آخر طوائف تھی نا، اس لیے اس کو یہ شریفانہ زندگی پسند نہ آئی اور میرے خلوص و محبت کا تمسخر اڑا کر چلی گئی۔ اس شقی القلب کو اپنے معصوم بچوں کا بھی خیال نہ آیا۔''

تیمور رو رو کر ایک ایک سے یہی کہتا پھرنے لگا تھا۔

''جب پاکیزہ گھر سے گئی تب اجمل نو سال کا تھا۔ اس سے چھوٹا جہان آٹھ سال اور ظفر پانچ سال کا تھا۔ اجمل چونکہ بڑا تھا، باپ کے زیادہ قریب رہتا کیونکہ زمینوں اور دیگر معاملات میں وہ باپ کا بازو بنا ہوا تھا۔ باپ نے اسی کو ماں کے متعلق بہت زیادہ بدظن کیا۔ دونوں بھائی شہر اپنے اسکول اور ہاسٹل کی زندگی میں مگن تھے۔ انہیں ماں کے یوں چلے جانے کا صدمہ تو ضرور ہوا تھا مگر انہوں نے اسے اپنے دل کا روگ نہیں بننے دیا تھا بلکہ وہ خود اپنے والد کو ہی زیادہ قصوروار سمجھتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کے والد نے ایک طوائف سے شادی کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی لیکن اجمل کی سوچ ان سے مختلف تھی۔ زمیندار تیمور ہر وقت اٹھتے بیٹھتے اجمل کے سامنے پاکیزہ کو برا بھلا کہتا رہتا تھا۔ یوں اس نے اجمل کے معصوم ذہن کو پاکیزہ کی برائیوں اور بے وفائی کی داستان سنا سنا کر اس قدر زہر آلود کر دیا کہ وہ عورت ذات ہی سے نفرت کرنے لگا تھا۔

''زمیندار تیمور نے چھوٹے بیٹوں کے اصرار پر گاؤں کو خیرباد کہا، زمینیں فروخت کر کے کراچی شفٹ ہو گیا اور یہیں کاروبار شروع کر دیا۔ کیونکہ باشعور ہونے کے بعد جب کبھی وہ گاؤں جاتے تو انہیں محسوس ہوتا جیسے خاندان اور برادری کا ایک ایک فرد انہیں ان کی ماں کی وجہ سے حقیر سمجھتا ہو۔ انہوں نے اپنے والد کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ نئی جگہ آ کر وہ کسی کو بھی ان کی ماں کا قصہ نہ بتائے بلکہ ہر ملنے جلنے والے کو یہی بتایا جائے کہ ان کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔

''بھائی جو پڑھ لکھ کر خاصے سمجھدار ہو چکے تھے، انہوں نے اجمل کی بھی شخصیت سنوارنے کے لیے اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی جو اس نے پوری بھی کی لیکن ماں کے خلاف باپ کی بھری ہوئی نفرت کی آگ کو اپنے سینے میں بجھا نہ سکا۔

''جب دونوں بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں تو اس کی شادی کا ذکر بھی چلا لیکن وہ شادی کے نام سے ہی بھڑک اٹھتا تھا۔ دونوں بھائیوں اور بھابیوں سے بھی اس نے کبھی سیدھے منہ بات نہ کی۔ تیمور کو صبر آ چکا تھا۔ شادی سے وہ مسلسل انکاری تھا لیکن ایک دن بڑی عجیب بات ہوئی۔ اس نے خود ہی کہہ ڈالا کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ شاید وہ اپنے سینے میں بھڑکی انتقام کی آگ کو سرد کرنا چاہتا تھا، کسی اور کی زندگی میں زہر گھول کر۔''

یہاں پہنچ کر عاشی بھابی نے ذرا رک کر گہری ہنکاری بھری پھر آگے بولیں۔

''ہم یہی سمجھے تھے کہ شاید عورتوں سے اس کی نفرت ختم ہو چلی ہے اسی لیے شادی پر اچانک آمادگی ظاہر کر دی ہے لیکن..... عالیہ..... تمہاری بپتا سن کر ایسا لگا جیسے اس نے صرف اپنی ماں کا بدلہ لینے کے لیے شادی کی تھی۔''

عاشی بھابی نے اپنی بات ختم کر دی تو عالیہ گم صم سی ہو گئی۔

''کیا سوچنے لگیں عالیہ؟'' عاشی بھابی نے اسے چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر یکدم پوچھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ میں تو ناکردہ گناہوں اور ایک عورت کے کیے کی سزا بھگت رہی ہوں۔'' عالیہ نے گلوگیر لہجے میں بھابی سے پوچھا۔

''تم نے بتایا ہے کہ پہلے اجمل کا برتاؤ تمہارے

Scanned with CamScanner

digest library.com

ساتھ اچھا تھا مگر پھر اچانک تمہارے کلاس لیلا کے یوں سرِراہ تمہیں مخاطب کرنے سے اس نے تمہارے ساتھ بدسلوکی شروع کردی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجمل تمہیں چاہتا ضرور ہے، بس ذرا غلط فہمی کی وجہ سے تم سے بدگمان ہوگیا ہے۔"

"مگر بھابی غلط فہمی تو اب پیدا ہوئی ہے، مجھ پر اعتماد تو وہ کبھی بھی نہیں کرتے تھے۔ ایک بڑی بی کو مستقل طور پر میری نگرانی کے لیے متعین کر رکھا ہے۔ میں تو ایک دن بھی اجمل کے ساتھ خوش نہیں رہی۔ اجمل نے مجھے کوئی گری پڑی تھرڈ کلاس لڑکی سمجھ رکھا ہے جو یوں میرے کردار پر شک کرتے رہے۔ یہ تو سراسر میری توہین ہے۔ ان حالات میں، میں کب تک گزارہ کرسکتی ہوں۔ یا تو خودکشی کرلوں گی یا پھر پاگل ہوجاؤں گی۔" عالیہ نے یکا یک ہی بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اتنی بھی مایوسی ٹھیک نہیں۔ گھبراؤ نہیں، اللہ بہتر کرے گا۔ میں احسان سے بات کرتی ہوں کہ وہ اجمل کو کسی ماہرِ نفسیات کو دکھائیں۔"

☆☆☆

کام مشکل تھا مگر احسان نے کسی طرح اجمل کو شہر کے ایک معروف ماہرِ نفسیات سے ملنے پر آمادہ کر ہی لیا۔ کئی دن کے علاج کے باوجود اجمل کی حالت میں سرِمو فرق نہ پڑا۔ احسان اور عاشی بھابی کے جانے کے بعد وہ الٹا عالیہ پر ہی برس پڑا کہ اس نے ہی بھائی اور بھابی کو یہ الٹی پٹی پڑھائی ہوگی۔

اجمل نے اپنا علاج بند کردیا اور عالیہ کے ساتھ اس کا رویہ تحقیر آمیز ہوتا چلا گیا۔ اب تو وہ اس قدر سنگدل اور بے رحم بن گیا کہ اکثر اسے بری طرح مارنے پیٹنے بھی لگا۔

یوں شادی کو تقریباً ایک سال کا ہی عرصہ ہوا تھا۔ اس دوران میں دو بار صرف چند روز کے لیے عالیہ اپنے والدین سے ملنے کے لیے جاسکی تھی۔ جتنے دن وہ اپنے والدین کے گھر میں رہی، اجمل اس کا سایہ بنا رہا۔ شاید ڈرتا تھا کہ عالیہ اس کی زیادتیوں کے متعلق کہیں اپنے والدین کو نہ بتا ڈالے۔ عالیہ کو اس کی بزدلی واضح نظر آئی تاہم اس نے سوچا کہ اس کے نصیب میں تو جو دکھ کا تحریر تقدیر نے لکھ دیے تھے، وہ تو اسے اب جھیلنے ہی تھے۔ بھلا وہ اپنے بوڑھے والدین کو کیوں خوامخواہ رنجیدہ یا پریشان کرتی۔ اسی لیے جب بھی ماں باپ کے گھر جاتی، اپنے اشک اندر ہی اندر پی کر بظاہر ہنستی مسکراتی رہتی تاکہ انہیں اس کے دکھوں کی بھنک بھی نہ پڑ سکے۔

عاشی بھابی کو بھی اس نے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ وہ کسی کو بھی اس کے گھریلو حالات نہ بتائیں۔ یوں اجمل بھی دوسروں کے سامنے بہت احتیاط کرتا تھا اور اپنے رویے کو کافی تبدیل کرلیتا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا، عالیہ نہیں چاہتی تھی کہ زمانے کو اس کے اوپر ٹوٹنے والے ظلم و ستم کا علم ہو کیونکہ اسے اپنے دکھوں کا اشتہار بننا کبھی پسند نہیں تھا اور نہ ہی وہ اپنی ذات کو لوگوں کی جھوٹی ہمدردیاں بٹورنے کے لیے تماشا بنانا چاہتی تھی۔

ایک دن اپنے دکھوں پر روتے ہوئے عالیہ نے بیچارے اسد کو بھی کوس ڈالا کہ نہ وہ اس روز سپر اسٹور میں ملتا اور نہ یہ سب ہوتا، لیکن عالیہ نے اپنا سر جھٹک دیا اور یوں ہی پھیکے سے انداز میں آپوں آپ ہی مسکرا دی۔ وہ اسد کی حقیقت جانتی تھی، وہ تو کلاس گروپ کا ایک ایسا کم گو نوجوان تھا جو۔ اس کی کوئی بہن نہیں اس لیے وہ عالیہ کو بہن کہتا تھا۔ بلاشبہ اس کا انداز بھی بھائیوں جیسا ہی تھا۔ وہ نٹ کھٹ سا صاف دل لڑکا اب کیا جانتا تھا کہ اس کی وجہ سے ہی اس کی بہن کی زندگی کانٹوں کی سیج بن چکی ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود ایک عجیب بات ضرور تھی جس پر خود عالیہ کو بھی حیرت ہوتی تھی۔ وہ یہ کہ نہ جانے کیوں اسے کبھی اجمل سے نفرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب بھی اسے اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ چاہتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی زیادتیوں کو وہ چپ چاپ برداشت کرلیتی۔

ایک رات اجمل گھر آیا تو بڑا چپ چپ سا تھا۔ عالیہ کو کچھ حیرت ہوئی۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق عالیہ پر کوئی طنز بھی نہ کیا۔ بس چپ چاپ صوفے پر آڑے ترچھے انداز میں پڑا کچھ سوچتا رہا۔ رات کافی بیت چلی تھی، وہ ویسے ہی صوفے پر پڑا تھا۔ عالیہ ڈرتے ڈرتے اس کے قریب گئی اور اس کی پیشانی کو چھوا تو ایک دم ہی گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ہاتھ جلتے ہوئے انگاروں پر پڑ گیا ہو۔

اجمل کو بہت تیز بخار تھا۔ کبھی کبھی وہ ہذیانی کیفیت میں بڑبڑانے لگتا تھا۔ عالیہ سب کچھ بھول کر ایک دم پریشان سی ہوگئی۔ اس نے ڈاکٹر کو فون کیا اور اجمل کی کیفیت بتاتے ہوئے فوراً آنے کو کہا۔ ڈاکٹر نے اسے ہدایت کی کہ اس کے پہنچنے تک وہ اجمل کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرے۔

عالیہ نے یہی کیا۔ ڈاکٹر بھی آگیا، معائنہ کیا۔ کچھ

Scanned with CamScanner

دوائیں تجویز کیں اور تسلی دے کر چلا گیا۔

کئی دن علاج ہوتا رہا۔ اس تمام عرصے میں عالیہ، اجمل کی تیمارداری میں مصروف رہی۔ رات رات بھر جاگ کر اسے اجمل کو دوائیں دینا اور اس کا ٹمپریچر لینا پڑتا۔ یوں اجمل کی حالت پہلے سے بہتر ہوتی چلی گئی اور وہ جلد بھلا چنگا ہو گیا۔

تب ہی اجمل نے پہلی بار عالیہ کو اس کے نام سے اور بڑی ملائمت آمیزی سے پکارا اور ایک بالکل عجیب اور عالیہ کی توقع کے خلاف بات کی۔

''عالیہ..... تم جانتی ہو کہ مجھے بخار کیوں ہوا تھا؟'' اجمل کا لہجہ عجیب اور اسرار بھرا تھا۔

''نہیں؟''

''تو سنو.....!'' اجمل جیسے انکشاف کرنے کے انداز میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں عالیہ کہ تمہیں میری ماں کی کہانی معلوم ہو چکی ہے کیونکہ میں نے اس رات چنی بائی کا سراغ لگا لیا تھا اور اس نے مجھے میری ماں کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔''

عالیہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ سنتی رہی، وہ بتاتا رہا۔

''میری ماں ایک اعلیٰ گھرانے کی چشم و چراغ تھی مگر ان کے والد کے ایک دشمن نے ان سے انتقام لینے کے لیے ان کی پانچ سالہ بچی کو اغوا کر کے بازارِ حسن میں مٹھو خاں کو فروخت کر دیا تھا جو اسے چنی بائی کے پاس لے آیا۔ چنی بائی نے اس بچی کو اپنی بیٹی بنا کر اس کی پرورش کی اور ساتھ ہی ساتھ اسے ناچ گانے کی تربیت بھی دی مگر اس کا دل اس گندے ماحول میں نہیں لگتا تھا۔ جب وہ پندرہ سال کی ہوئی تو میرے والد کے ذریعے اسے اس گناہ کی نگری سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ اپنی برسوں کی محنت کو یوں اکارت جاتے دیکھ کر چنی بائی تو پاگل ہی ہو گئی کیونکہ میری ماں ہی اس کے بڑھاپے کا سہارا تھی اور وہی ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔ کافی عرصے تک اس نے تلاش جاری رکھی پھر مایوس ہو کر بیٹھ گئی۔

''اس سال بعد چنی بائی اپنے سازندوں اور کچھ رقاصہ لڑکیوں کے ساتھ میرے والد کے گاؤں میں ایک شادی کی تقریب میں آئی۔ وہاں میری ماں بھی موجود تھی جسے چنی بائی کی نظروں نے ڈھونڈ لیا۔ اسی رات کو وہ میری ماں کو اپنے گرگوں کے ذریعے اغوا کرا کے اپنے اڈے پر لے آئی تھی مگر میری ماں نے اس کا کہنا ماننے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ ایک شریف آدمی کی عزت بن چکی ہے اس لیے وہ کسی صورت بھی گناہ آلود زندگی بسر نہیں کرے گی۔ میری ماں پر تشدد کیا جانے لگا۔ ایک دن موقع پا کر میری ماں نے اپنے ہاتھوں میں پڑی سہاگ کی نشانی چوڑیاں پیس کر کھا لیں اور خودکشی کر لی۔ یوں میری ماں نے بے عزتی کی زندگی پر موت کو ترجیح دی۔ آہ..... کس قدر عظیم تھی میری ماں..... اور میں کتنا برا ہوں کہ اتنے عرصے اپنی پاکباز ماں کو کیا کیا کہتا رہا۔ میں شاید ساری زندگی یونہی اپنی ماں کو بے وفا اور دھوکے باز سمجھ کر کوستا رہتا اور انتقاماً ہر عورت سے نفرت کرتا رہتا مگر اتفاق سے مجھے تمہاری اور عاشی بھابی کی وہ گفتگو سننے کا موقع مل گیا جس میں تم نے بھابی کے سامنے میری زیادتیوں کے گلے شکوے کیے تھے اور بھابی نے تمہیں میری ماں کی داستان سنا کر تمہارے ساتھ میرے رویے کی توجیح پیش کی تھی۔

''اسی وقت میں نے عہد کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو، میں اپنی ماں کا سراغ اب لگا کر ہی دم لوں گا۔ اپنے اندر پلنے والے اس نفرت کے ناسور سے چھٹکارا پا کر ہی رہوں گا۔ میری نیت صاف تھی، خدا نے بھی مدد کی۔

''کئی روز بعد میں نے چنی بائی کا کھوج لگا لیا۔ وہ کسی خیراتی اسپتال میں زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی تھی۔ اس نے بھی ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے میرے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا۔

''مجھے معاف کر دینا عالیہ! میں نے تم پر بڑے ظلم اور زیادتیاں کیں جس کا مجھے ساری زندگی افسوس رہے گا لیکن اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔'' کہتے ہوئے اجمل کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

عالیہ کو یوں لگا جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔ اسے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ ایک مرد جو انجانے میں اپنی ماں کو برا سمجھتے ہوئے ہر عورت سے متنفر ہو گیا تھا، اس کا عورتوں پر اب اعتماد بحال ہو گیا تھا۔ مرد واقعی ساری زندگی اپنی ماں ہی کا پرتو ہر عورت میں تلاش کرتا رہتا ہے۔ اگر ماں اچھی ہو تو ایسی ہی اچھائیاں اور خوبیاں اپنی بیوی میں دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اگر ماں ہی بری ہو تو ساری عورت ذات سے اس کا اعتبار اٹھ جاتا ہے۔

عالیہ نے اسی وقت اجمل کو سچے دل کے ساتھ معاف کر دیا تھا کیونکہ جب سے عاشی بھابی نے اجمل کی ماں کے متعلق جو داستان سنائی تھی، اسے تب ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اجمل بے قصور ہے۔ عالیہ نے اسی وقت خدا کے حضور سجدۂ شکر ادا کیا کہ اس قادرِ مطلق نے اسے صبر کا پھل عطا کر دیا تھا۔

***

Scanned with CamScanner

جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

چھ یا سویں قسط

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید ہو سیدہ در و دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے نا آشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید داآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

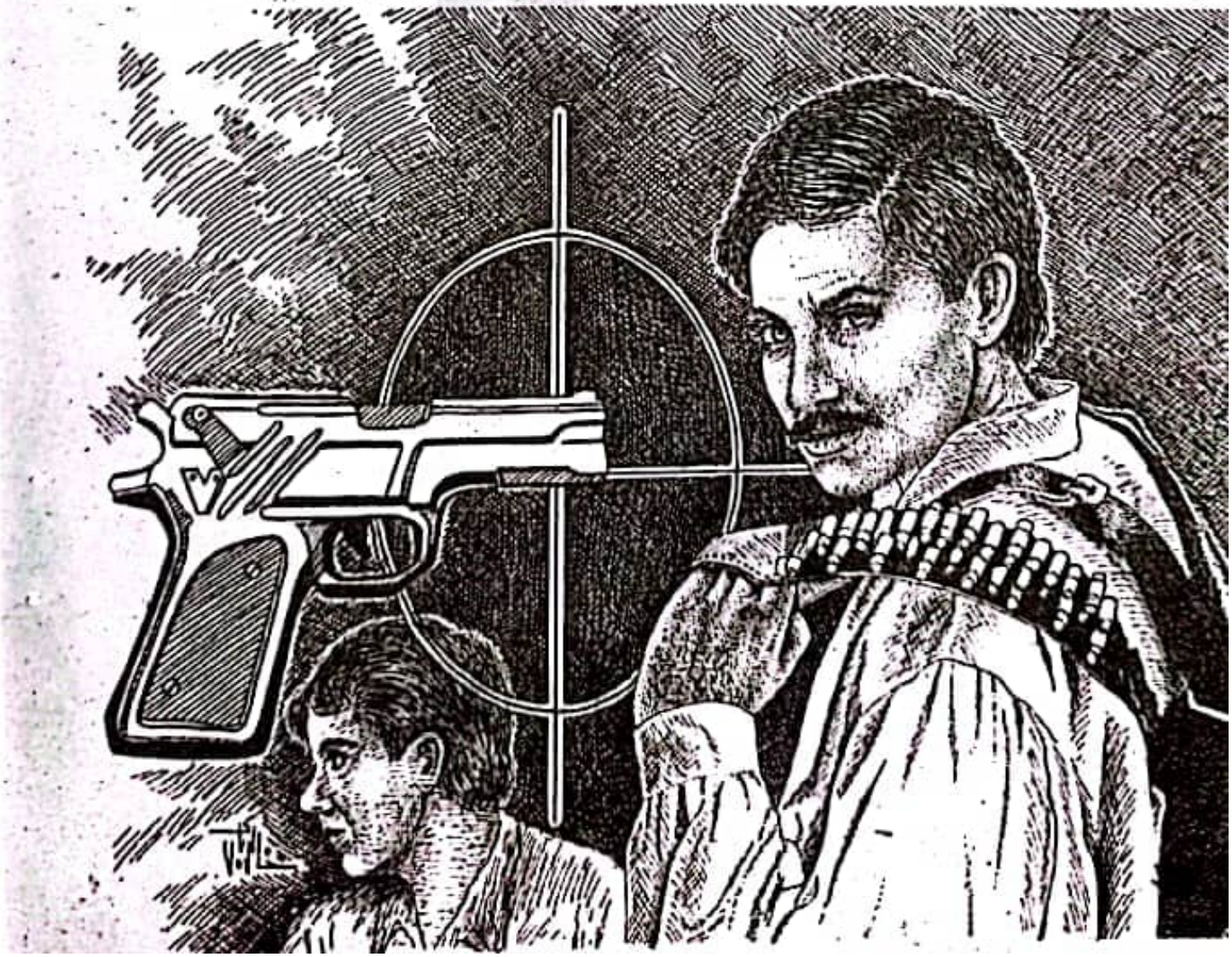

digest library.com

Scanned with CamScanner

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

روشنیوں کا شہر کراچی ..... اس نے جانے کتنے لوگوں کو اپنے دامن میں ماں کی طرح سمیٹ رکھا ہے۔ ان گنت داستانوں کی امین اس مہربان گود نے سی کو نے میں سہراب خان گوٹھ یعنی میں بھی رہتا ہوں جو ایک غریب محلے میں محبت کرنے والی ماں اور ایک سخت گیر طبیعت کے حامل باپ کا ایسا ناخلف بیٹا بھی تھا جو ہر وقت باپ کی بے جا ڈانٹ پھٹکار کا نشانہ بنا رہتا۔ میری ایک بہن بھی تھی راحیلہ، مگر نہیں، بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ میری بہن نہیں تھی بلکہ خالہ زاد تھی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک ناگہانی حادثے میں مر چکے تھے اور ماں نے اسے میرے ساتھ ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ یہ راز صرف میری ماں اور راحیلہ کو پتا تھا۔ راحیلہ بچپن سے ہی مجھے ایک بھائی کی نہیں بلکہ کسی اور ہی "نگاہ" سے دیکھا کرتی۔ ماں میری شادی اس سے کروانا چاہتی تھی لیکن میں اب بھی اسے ایک "بہن" کے ہی روپ میں دیکھتا تھا۔ میرا باپ، ماں کو مارا پیٹا کرتا تھا۔ ایک دن ماں کو اس نے گہرا زخم دیا تو میں برداشت نہ کر پایا اور باپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہو گیا۔ باپ کا پارہ یہ دیکھ کر ہائی بلڈ پریشر بڑھ گیا اور اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ جہان سے کوچ کر گیا تو گھر میں سکون ہوا۔ غربت اور باپ کی سخت گیر طبیعت نے مجھے ایک حد تک جرائم کی طرف لڑھکا ضرور دیا تھا مگر میں جلد ہی سنبھل گیا مگر اس "سنبھلنے" کی مجھے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ میں اور میرا باپ ایک فیکٹری میں معمولی ورکر تھے۔ گلی کے محلے میں ہی تین ہم عمر لڑکے میرے یار کہلائے۔ ایک کا نام سلیم، دوسرے کا ماجد اور تیسرا ماجد تھا۔ ماجد کی جوان بہن فوزیہ میری پہلی اور آخری محبت ٹھہری۔ ہم چاروں جرائم پیشہ گروہ کے آلہ کار بن گئے۔ اقبال نامی ادھیڑ عمر شخص ہمارا "باس" کہلایا۔ اس کا نائب سجاد بیگ تھا۔ اسی گروہ نے ہم چار یاروں کو ایک روز آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا جہاں ہمیں لڑائی بھڑائی کی خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ گروہ دیگر جرائم کے ساتھ بھتا خوری بھی کرتا تھا۔ ہمارے فیکٹری مالک سیٹھ سکندر سے بھتا لینے کے لیے "باس" اقبال نے ہمیں استعمال کیا۔ میں نے سلیم وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ میرے ہی دشمن ہو گئے، تاہم میں نے سیٹھ سکندر کے ساتھ نمک حلال کیا اور اسے سب باتیں بتا دیں۔ گروہ سمیت میرے تینوں یار میری جان کے دشمن ہو گئے۔ سیٹھ سکندر کی جواں سال خوب صورت بیٹی سدرہ میری "نمک حلالی" سے متاثر ہوئی۔ سیٹھ سکندر کا سالا، سجاد بیگ ہی جرائم پیشہ گروہ کے باس اقبال کا نائب تھا۔ وہ سدرہ کی ماں کا سوتیلا بھائی تھا۔ میں نے اس کی پالنگ آشکار کر دی۔ وقت تیزی سے بدلا۔ ماں مر گئی۔ ماجد عرف ماجے کے قتل کا الزام مجھ پر لگا۔ فوزیہ مجھ سے متنفر ہو گئی کیونکہ بعد میں راحیلہ نے اسے حقیقت بتا ڈالی تھی۔ میں لاک اپ ہوا تو ہمہ تا ہو گیا۔ باس اقبال، سلیم چھالیا اور راجو بوری میرے خون کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں راحیلہ اور فوزیہ کو لے کر کراچی سے سیالکوٹ ہجرت کرنے لگا۔ صادق آباد میں فوزیہ اور راحیلہ سے بچھڑ کر میں بالآخر "چوہدری جی برادران" کے نرغے میں چلا گیا۔ وہاں بھولے سے میری عجیب حال میں ملاقات ہوئی۔ اس کی سنگ سے چوہدری شالا جی نے زبردستی شادی کر لی تھی۔ اس کا نام نادو تھا۔ ہم تینوں فرار اختیار کر گئے۔ راستے میں پولیس اور چوہدری جی برادران کے حواریوں سے مقابلے میں بھولا مارا گیا۔ نادو میری ذمے داری بن گئی۔ وہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ اسے وہ حقیقت کسی اور سے محبت تھی۔ اس کا نام مختیار تھا۔ مختیار راجن پور میں رہتا تھا۔ فوزیہ اور راحیلہ کو بھی میں نے کسی طرح تلاش کر لیا۔ سیالکوٹ میں ایک ماں بیٹی سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ گلے دار تھیں۔ لڑکی محبت اور ماں شگفتہ خاتون۔ محبت کسی رسیم نامی لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ دونوں فائٹنگ کلب کے ممبر بھی تھے۔ عقدہ کھلا کہ شگفتہ، باس اقبال کی منکوحہ تھی اور محبت بیٹی مگر شوہر کی بھرمار زندگی سے تنگ آ کر شگفتہ اپنی بیٹی محبت کے ساتھ کراچی سے سیالکوٹ اپنے ماں باپ والے گھر میں آن بسی تھی۔ فائٹنگ کلب کا ایک ماسٹر عرف استاد جوجی میرا دوست بن گیا۔ محبت اب بھی باپ (اقبال) سے ملاقات کرتی تھی۔ سیالکوٹ میں اقبال چوک پر اس کے باپ یعنی باس کا بنگلا تھا۔ ایک خفیہ گروہ "کالی لہر" سے میرا ٹاکرا ہو گیا۔ یہ جادو ٹونے کرنے والا گروہ تھا۔ عدیل جو کہ جگنو نامی شخص کا بھائی تھا ان کے ہاتھوں مارا گیا۔ جگنو ایک بڑی سیاسی شخصیت کا آلہ کار تھا۔ وہ میرا دشمن اور بعد میں دوست بن گیا۔ کالی لہر کے رانجا بابا اور سیڈم کبھی سے میری دشمنی عروج پر تھی۔ میرا دشمن باس اقبال بھی ان کی جادوئی ہانڈیوں کی زد میں آ کر اسپتال پہنچ گیا۔ اس کی بیٹی محبت میری دشمن بن گئی جبکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون مجھے بھائی سمجھتی تھی۔

اب میری بیک وقت جنگ بازی ..... باس اقبال کے نائب سجاد بیگ، چوہدری جی برادران اور کالی لہر والوں کے ساتھ جاری تھی۔ میں راحیلہ کا پیچھا کرتے ہوئے رانجا بابا کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے اٹھا کر فارم ہاؤس لے آیا۔ رانجا نے منتر پڑھ کر شروع کر دیے۔ مجھے سر پر کچھ مار کر بے ہوش کر دیا گیا اور جب ہوش آیا تو وہ لوگ باور کرانے لگے کہ میں مر چکا ہوں اور میری روح ان کے قبضے میں ہے۔ پھر مجھے حالتِ بے ہوشی میں قبر میں دفنا دیا گیا۔ انہوں نے کچھ کھلا کر میرے جسم کو مفلوج کر دیا تھا۔ وہاں تجو نے حملہ کیا اور تب ہی لیلیٰ مدد ہوئی اور ایک ماں بیٹی نے مجھے قبر سے نکالا۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ پھر میری محسن میرا علاج کرنے لگی۔ ان ماں بیٹی کو گاؤں والوں نے رد بلد کر دیا تھا۔ وہاں کے چوہدری کا بیٹا صمد یار چنبیلی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اماں میرے علاج کی غرض سے خاص بوٹی لینے سرحد پار نکل گئی۔ اماں خاص بوٹی لے آئی تھی اور اس نے دوا کا سفوف اور تیل تیار کر لیا تھا۔ دوا نے مجھ پر جادو کی اثر دکھایا اور میرے اندر طاقت کا خزانہ سمر گیا۔ جنگل میں ایک تیندوا عورت کو دبوچے ہوئے تھا۔ میں نے درندے کو ٹھکانے لگا دیا۔ زخمی عورت صمد یار کی ماں شمیلہ خانم تھی۔ صمد یار کے گماشتوں نے اماں کی مڑھی کو آگ لگا دی۔ میں انہیں تھانے لے گیا تاہم انہوں نے مجھے ہی اندر کروا دیا۔ میں تھانے سے بھاگ نکلا۔ مجھے شمیلہ خانم نے ایک ڈاکٹر کے کلینک پر ٹھہرا دیا۔ ڈاکٹر ہمیں پھنسانا چاہتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو گرفت میں لیا۔ وہ بیگا مشتی میں ڈاکٹر جان سے چلا گیا اور میں اماں اور چنبیلی کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میں استاد جوجی کے ٹھکانے پر آ گیا۔ وہاں سے ہم کالی لہر والوں کے ایک ٹھکانے پر پہنچے تو وہاں نزاکت اور راڑوں کی لاشیں ملیں۔ میں نے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ وہاں سے میں ایک قصائی صورت بدمعاش کو اپنے ٹھکانے پر لے آیا۔ اس پر تشدد کر کے ہم معلومات لے رہے تھے کہ وہاں ہانڈیوں کی بارش ہو گئی۔ ہم نے دشمنوں کو مار بھگایا۔ ہم کالی حویلی پہنچ گئے۔ وہاں میرا رانجا سے ٹاکرا ہوا۔ رانجا نے استاد جوجی کو شدید زخمی کر دیا۔ میں نے رانجا کی ایک ٹانگ کاٹ ڈالی تاہم رانجا بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں دشمن کے ایک اور ٹھکانے پر پہنچا تاہم انہوں نے مجھے قابو کر لیا۔ میں زخمی بھی ہو گیا۔ اچانک وہاں سلیم نے حملہ

Scanned with CamScanner

کر دیا۔ مجھے وہاں سے نکال لیا گیا۔ سلیم اور چودھری برادران نے مجھ سے مفاہمت کر لی تاہم اس کے پیچھے ان کا کوئی خاص مقصد تھا۔ راحیلہ بھی انہی لوگوں کے پاس تھی۔ سلیم اور میں نے راجا تیمور کو چھاپنے کی کوشش کی تاہم ہمیں ناکامی ہوئی۔ وہاں سے واپسی پر ایک جگہ ایمبولینس اور پولیس نظر آئی۔ تنگو کو مذہوبا گیا تھا۔ میں نے تیمور کو چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کی فیکٹری پہنچ گیا۔ وہ لوگ کوئی "شے" لے کر کہیں جا رہے تھے۔ میں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ میں نے پیدل ہی ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ اچانک دوڑتے ہوئے سر پر چوٹ لگنے سے میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا راجا تیمور اور ڈائیمنڈ ہلاک ہو چکے تھے اور کیوس سے ڈھکی شے غائب تھی۔ راجا تیمور کا ایک ساتھی زندہ میرے ہتھے چڑھ گیا۔ معلومات پر پتا چلا کہ کسی گروہ نے انہیں ہلاک کیا تھا اور بوبورگا نامی قدیم مجسمہ لے اڑے تھے۔ میں نے میڈم مچھی تک پہنچنے کے لیے ان کا پیچھا کیا اور ان کے ساتھیوں کی کشتی میں سوار ہو گیا۔ ہم انڈین حدود میں داخل ہو گئے۔ بوبورگا کا مجسمہ بھی انہی کے پاس تھا۔ کشتی ایک جگہ رکی تو بھیل یوں نے حملہ کر دیا تاہم بھیل یوں سے نمٹ لیا گیا۔ آگے جل کر ایک مگرمچھ نے ہم پر حملہ کیا اور کشتی میں صرف دو افراد بچے۔ ایک میں اور دوسری شینا۔ میں نے شینا کو اپنی سیدھی کہانی سنا کر اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ ہماری کشتی ندی کی طغیانی کے باعث تباہ ہو گئی۔ ہم ایک جگہ پہنچ گئے۔ شینا زخمی ہو گئی۔ وہاں موجود میاں بیوی نے ہماری مدد کی۔ ہم ان کے گھر آ گئے تاہم وہاں مخالف گروہ کے لوگ آ گئے۔ انہوں نے ہمیں پکڑ لیا تاہم میں ان کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ میں واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو وہاں مخالف گروہ کا باس اور ایک لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ باس البرٹ رمنڈو اور اس کی ساتھی بوبورگا کے مجسمے کے چکر میں تھے۔ میں اور شینا انہیں چکما دے کر نکل گئے۔ ایک جگہ جنگل میں باس کے ساتھی مارے گئے اور وہ ہمیں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ میں اور شینا ایک بستی میں پہنچ گئے۔ وہاں شینا کے ساتھی میری طرف سے مشکوک ہو گئے۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ راستے میں مجھے کچھ آگریز ملے۔ گورا پارٹی ایک سرکس کمپنی سے تعلق رکھتی تھی اور وہ وہاں ایک گوریلا کو پکڑنے آئے تھے۔ وحشی قبیلہ ان کا دشمن ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے مدد کا کہا۔ میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ دشمنوں کی قبیل سے آگریوں نکالنے کے چکر میں ماریا کا باپ مارا گیا۔ ماریا نے گرگینڈوا کو قابو کر لیا اور ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم ماریا کے سرکس والی جگہ پر پہنچ گئے۔ وہاں میری ماریا کے منیجر سے لڑائی ہو گئی اور وہ میرا دشمن ہو گیا۔ منیجر سیڈی غیر قانونی دھندے میں ملوث تھا۔ منیجر سیڈی اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ میں وہاں سے رانگا مالی روانہ ہو گیا۔ میں ایک آبادی میں پہنچ گیا۔ میرا وہاں دشمن کے گروہ سے ٹکراؤ ہو گیا۔ میں نے انہیں زیر کر دیا۔ دشمن کے علاقے میں رمنڈو سے میرا سامنا ہو گیا۔ وہ بوبورگا کے مجسمے کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شینا کو بھی اغوا کر لیا تھا۔ رمنڈو کو مجسمہ چاہیے تھا اس لیے اس نے مجھے اپنے ساتھ ملا لیا۔ میں اس مشن میں زخمی ہو گیا اور مچھی کے چنگل میں پھنس گیا۔ اچانک وہاں کسی گروہ نے حملہ کر دیا اور میڈم مچھی فرار ہو گئی۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا تاہم میرے کہنے پر فوزیہ کو رہا کر دیا گیا۔ ہم رمنڈو کے پیچھے گئے۔ گروہ کے کچھ ساتھیوں کو رمنڈو نے ہلاک کر دیا۔ رمنڈو کی گاڑی تباہ ہو گئی۔ مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تاہم میں فوزیہ کے ہمراہ بچ نکلا۔ بوبورگا کے حوالے سے میں ایک صحافی جمیلہ سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا مگر وہ قتل کر دی گئی تھی۔ وہاں مجھے ایک لبنانی رپورٹر ملی۔ میں مائرہ کے ساتھ بوبورگا کے مجسمے کو تباہ کرنے نکلا۔ مائرہ ماری گئی۔ واپسی پر مجھے مچھیروں نے پکڑ لیا تاہم میں ان کی گرفت سے نکل بھاگا اور واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ ہم کراچی آ گئے۔ میری ایک خاتون سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مشہور اداکارہ روبی تھی جو خود کو جگنو کی بہن بتاتی تھی۔ اسے اپنے بچانی کا پچھلا سامان حاصل کرنا تھا اور میری مدد درکار تھی۔ ہم نور پور روانہ ہو گئے۔ راحیلہ کسی نوید نامی شخص کی اکے کار بن گئی تھی۔ میں راحیلہ کو وہاں سے نکالنا چاہتا تھا تاہم مجھے حراست میں لے لیا گیا۔ میں راحیلہ کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم راحیلہ میرے پاس نہیں رکی۔ میں نے ناردو کو کچھ لوگوں کی تحویل میں دیکھا۔ وہ چودھری کے گماشتے تھے اور انہوں نے ناردو کو مختیار سے طلاق دلوائی تھی۔ میں نے ناردو کو آزاد کرا لیا تاہم وہ خود چودھری کے پاس چلی گئی۔ سندرہ کو کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا۔ میں نے تعاقب کیا۔ اسے سجاد بیگ نے اغوا کرایا تھا۔ میں نے سندرہ کو اس کے چنگل سے نکال لیا۔ میں نے سلیم چھالیا کا پیچھا کیا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ روبی کو بازیاب کرانے جا رہا تھا۔ ہم نظام شاہ کے فارم ہاؤس پہنچ گئے۔ وہاں کچھ لوگ آ گئے اور مار ماری ہوئی۔ دلاور شاہ مارا گیا جبکہ وہ لوگ روبی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ دلاور شاہ کے قتل کا الزام مجھ پر آیا اور مجھے لاک اپ کر دیا گیا۔ نظام شاہ کے راتب خور انسپکٹر نے مجھے حوالات میں ختم کرانے کی کوشش کی۔ تاہم میں بچ گیا۔ میں نے نئے SHO کو اعتماد میں لے لیا۔ مجھے بری کر دیا گیا۔ فوزیہ اور میری شادی ہو گئی۔ روبی زخمی حالت میں سندرہ کے گھر پہنچ گئی۔ میں روبی سے ملنے پہنچا۔ روبی نے بتایا کہ جگنو کو نظام شاہ اور لاکھا نے مارا تھا۔ میں نے انہیں عبرتناک انجام سے دوچار کرنے کا عہد کر لیا۔ میں نوید مچھر اکے والا میں پہنچ گیا۔ میں نے نوید کو زخمی کر دیا اور اس سے بچ گمیں کی فائل پر دستخط کرا لیے۔ میں وہاں سے نکل پڑا۔ راستے میں راحیلہ سے سامنا ہوا تاہم نوید کے آدمیوں نے راحیلہ پر گولی چلا دی۔ گولی اس کے شانے میں لگی تھی۔ میں نے نوید کے گماشتوں کو ختم کر دیا۔ میں راحیلہ کو جوتی کے ٹھکانے پر لے آیا۔ اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ میں نظام شاہ اور لاکھا سے حساب چکتا کرنے کے لیے نور پور فارم ہاؤس پر پہنچ گیا۔ لاکھا وہاں پہنچا تو فوزیہ اس کے قبضے میں تھی۔ اس نے مجھے زخمی کر دیا۔ وہاں زبیر پہنچا اور ہماری مدد کی۔ میں نے لاکھا سمیت اس کے کئی ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیا۔ شگفتہ آنٹی کو ان لوگوں نے ختم کر دیا تھا۔ فوزیہ کی حالت بری تھی۔ ہمارا بچہ اب نہیں رہا تھا۔ میں دفتر جا رہا تھا۔ میں نے کچھی کو دیکھا۔ میں اس کا پیچھا کرتا ہوا ان کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہاں نجمت سے میری ملاقات ہو گئی۔ بھانڈیل سائیں کے گماشتوں نے ہمیں دیکھ لیا اور وہ ہمیں ڈھونڈنے لگے۔ ہم وہاں سے نکل کر ایک ہوٹل پہنچ گئے۔ وہاں بوبورگا کے حصول کے لیے بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس کے کارندے موجود تھے۔ وہاں دھینگا مشتی ہوئی اور ہم دونوں کارندوں کو اپنے ٹھکانے پر لے آئے۔ ان کے ساتھ وسیم بھی تھا۔ ہم نے انہیں ڈرایا تو وسیم نے اندر کی باتیں بتانا شروع کر دیں۔ ایک کارندہ میرے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم بوبورگا کے حصول کے لیے وسیم کو لے کر نکلے۔ وہاں مار ماری ہوئی۔ وسیم نے دھوکے سے ہمارے ایک آدمی کو مروا دیا اور خود نکل بھاگا۔ ہم وہاں پہنچے جہاں ہمارا آدمی مارا گیا تھا۔ اچانک وہاں ایک جیپ نمودار ہوئی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

Digest Library.com

Scanned with CamScanner

یکا یک جیسے چاندنی میں نہائے اس ٹھٹھرتے ہوئے ماحول میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ خود میں گم صم ہو گیا تھا، میری نظریں جھاڑیوں کی اوٹ سے سامنے کی طرف جمی رہیں۔ میں ان مسلح افراد کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

تالا لگے ہوئے بظاہر خالی مکان کے اندر سے اچانک کون برآمد ہوا تھا جسے دیکھتے ہی دونوں بائیک سوار بری طرح چونک کر چند قدم پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن میں دوسرے رخ پر ہونے کے سبب اسے ابھی نہ دیکھ پایا تھا لیکن پھر ایسے میں اچانک ہی چار پانچ مسلح افراد سے بھری ہوئی بغیر بڑ کی جیپ جانے کہاں سے نمودار ہو کے وہاں آن کھڑی ہوئی تھی۔

کیا ہونے والا تھا جس کا احساس ذرا دیر پہلے ہی نگہت اور مجھے نامعلوم سی بے چینی میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔

پھر دفعتاً ہی کوئی آواز سی ابھری..... عجیب آواز۔ دو خونخوار کتے مکان کے کھلے دروازے سے دوڑتے ہوئے تیزی سے برآمد ہوئے اور ان کا ہدف وہی اول الذکر بائیک سوار یعنی شاہد اور حیات تھے جو تالا توڑ کر نیا لگانے آئے تھے مگر اسی وقت جیپ سے اترنے والے مسلح افراد نے ان پر اپنے آتشیں ہتھیاروں سے فائر کھول دیے۔

دم بخود سے ماحول میں یکلخت گولیوں کی گھن گرج کے ساتھ خونخوار کتوں کی معدوم ہوتی آخری غراہٹیں بھی شامل تھیں۔ ان کی لاشیں دونوں بائیک سوار شاہد اور حیات سے چند قدموں کے فاصلے پر آن پڑیں۔ دونوں ایک دم خوفزدہ سے ہو کر پیچھے ہٹے اور اپنی بائیک کی جانب کھسک لیے۔ انہیں بھی اب میری طرح شاید کسی عجیب اور اسرار بھرے خطرے کی بو محسوس ہو چلی تھی۔

مسلح افراد پانچ کی تعداد میں تھے اور تین نے مکان کے اندر غالباً کھلے دروازے پر گولیاں داغی تھیں، باقی دو نے کتوں کو ڈھیر کیا تھا۔ فائرنگ اب بند کر دی گئی تھی۔ بائیک سوار شاہد اور حیات بھی ڈری سہمی نظروں سے مکان کی طرف اور کبھی ان مسلح افراد کو دیکھ رہے تھے۔

ایک نے وہیں سے کھڑے کھڑے ان سے پھنکار کر پوچھا۔ ''تم کون ہو اور یہاں کرنے آئے تھے؟''

''وہ..... وہ ہم تو زمیندار صالح چودھری کے نوکر ہیں جی۔'' ایک نے جلدی سے جواب دیا۔ ''یہ مکان زمیندار صاحب نے کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔ ہم یہاں مکان خالی کرانے آئے تھے۔ یہ میرا ساتھی شاہد ہے اور میں حیاتا۔ ہمیں اس کا کرایہ نہیں ملا تھا کئی دنوں سے تو زمیندار صاحب کے حکم سے.....''

''بس..... بس۔'' مسلح افراد کے ساتھی نے ہاتھ روک کر اسے خاموش کرا دیا اور ابھی انہیں وہیں ٹھہرے رہنے کا حکم دیا پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

''کیا خیال ہے شہابے! اندر گھسا جائے؟ وہ اندر ہی موجود ہیں۔''

شہابے کے نام پر میں چونک گیا۔ تو یہ بھانڈیل سائیں کے آدمی تھے اور جو مخاطب تھا اس کی آواز میں پہچان گیا تھا۔ یہ شمشاد تھا۔ وہ آگے بولا۔

''شاکر! تو اور منیر سامنے کے دروازے سے اندر داخل ہو، میں اور رفیق تمہیں کور کیے پیچھے آتے ہیں۔''

شاکر، شہاب اور شمشاد کو میں جان گیا۔ باقی منیر اور رفیق کو نہیں۔ شمشاد تو وہی تھا جسے نگہت نے بڑی خوبصورتی سے اس رات بیوقوف بنایا تھا۔ بہرحال بات کچھ سمجھ میں آئی تھی۔ انہیں کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے دشمن یعنی میڈم مچھی کے ساتھی جنہوں نے بقول راحیلہ اور نگہت کے، اس رات کو میڈم مچھی کو بچانے کے لیے بھانڈیل سائیں کی حویلی پر شب خون مارا تھا، وہ اسی مکان میں ہی مقیم تھے۔

صورت حال خاصی گمبھیر تھی۔ میں سردست تماشا دیکھنے کے لیے ابھی کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یقیناً نگہت بھی کہیں قریب میں گھات لگائے بیٹھی یہ سب دیکھ رہی ہوگی، تاہم میں یہاں سے ہل نہیں سکتا تھا۔

پانچوں مسلح تانے مکان کے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ میری بے چین نظریں ان پر جمی رہیں۔ دل جیسے رک رک کر دھڑک رہا تھا۔ اچانک جیسے ہی وہ تینوں دروازے کے قریب پہنچے، تو اسی دم بخودی فضا میں عجیب سی ''شپ، شپا، شپ'' جیسی سنسناتی آواز ابھری۔ اگلے ہی لمحے کوئی چمکتی سی تیز شے مکان کے اندر سے کسی آبی چمگادڑ کی طرح لہراتی برآمد ہوئی، جس نے پہلے شاکر کی گردن پر چرکا لگایا اور پھر منیر کی گردن اڑا دی۔

یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے وقوع پذیر ہوا تھا کہ باقی ساتھی ہکا بکا سے رہ گئے۔ صرف دو ایک سیکنڈ بعد ہی دوسری بار مکان کے کھلے دروازے کے اندر سے دوبارہ وہی ''شاپ شپ'' کی سنسناتی آواز برآمد ہوئی اور وہی مہیب شے لہراتی ہوئی نمودار ہوئی۔

شمشاد نے تو فوراً جھکائی دے کر خود کو اس کے وار سے کسی چرکے سے بچا لیا لیکن شہاب خود کو نہ بچا پایا۔ وہ چمکتی ہوئی تیز دھار شے اس کے سینے میں جا گھسی۔

Scanned with CamScanner

digest library.com

"فائر.....!" شمشاد کرتے ہی چیخا پھر گن سیدھی کر کے اندھا دھند فائرنگ کر ڈالی۔

یہ فائرنگ چند منٹ رہی پھر روک دی گئی۔ شاکر اور منیر کی لاشیں بھربھری مٹی والی زمین پر پڑی تھیں۔ شمشاد اور رفیق دائیں بائیں ہٹ گئے تھے۔ ان پر اس قدر دہشت طاری تھی کہ وہ مکان کے کھلے دروازے کے سامنے جانے کی ہمت تک نہیں کر پا رہے تھے۔ نہ جانے پھر کوئی جانکاہ مصیبت نمودار نہ ہو جائے اور ان کا بھی حشر اپنے ساتھیوں جیسا ہو۔ باقی بائیک سوار حیات اور شاہد اس خوفناک صورت حال سے اس قدر گھبرائے کہ انہیں شمشاد کی دھمکی کی پروا بھی نہ ہوئی اور وہ جلدی سے اپنی بائیک پر سوار ہو کر یہ جا، وہ جا۔

دونوں نے ہنوز اپنی گنیں سیدھی کر رکھی تھیں مگر اندر داخل ہونے کی کوشش دوبارہ نہ کر پائے۔ کچھ انتظار کیا، اس کے بعد رفیق نے شمشاد کو اشارہ دیا کہ وہ اوپر چھت پر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہے، وہ اسے کور دے۔ شمشاد نے فوراً اپنے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دی اور پھر رفیق آگے بڑھ گیا۔

میں ابھی خاموشی کے ساتھ یہ خونی کھیل اختتام تک دیکھتے رہنا چاہتا تھا۔ مجھے لگتا یہی تھا کہ اندر گربھ داس اور اس کے چیلے موجود ہیں اور دوبارہ کوئی بے رحمانہ حملہ کرنے کے لیے گھات لگائے بیٹھے ہیں۔

اگر ایسا ہی تھا تو گربھ داس واقعی میڈم بچھی کا ایک خطرناک اور چھلاوا صفت چیلا تھا۔ پپو یعنی بشارت کو اسی نے بڑی بے دردی اور سرعت سے ہلاک کیا تھا۔

مجھے بہرحال ابھی تک کبیر کے وہ الفاظ یاد تھے۔ اس مردود گربھ داس نے چھرا پپو کے پیٹ میں نہ صرف پیوست کیا تھا بلکہ دونوں ہاتھوں سے اس کا دستہ پکڑ کر اوپر سینے تک پپو کو چیرا ڈالا تھا۔

ان الفاظ نے جو بچی کو بھی ہیبت کے مارے بے دم کر دیا تھا اور وہ مجھ سے توقع کیے بیٹھا تھا کہ میں پپو کے انتقام میں گربھ داس کا حشر اس سے بھی زیادہ بھیانک کروں گا۔

رفیق اس منحوس مکان کی داہنی طرف والی دیوار سے بند کھڑکی کے رخنوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رات کی تاریکی میں تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔ شمشاد اسے دیکھتا رہا۔ اب مکان کے کھلے مگر تاریک دروازے سے ان دونوں کی توجہ ہٹ چکی تھی لیکن میں گاہے بہ گاہے اس طرف دیکھ لیتا۔

معاً دروازے پر میں نے دو سائے تیزی سے حرکت کرتے دیکھے۔ پہلے کسی نے ذرا سر باہر نکال کر جھانکا اور ان دونوں کو دوسری جانب متوجہ پا کر باہر نکل آئے۔ ان کے ہاتھوں میں سیاہ چمکتے ہوئے ریوالور دکھائی دیے۔

یہی وہ وقت تھا جب شمشاد کی غیر ارادی نظر ان پر پڑی اور وہ جیسے بری طرح بدکا مگر اسی وقت دونوں سائے اپنے ریوالور کے بیک وقت ہی ٹریگر دبا چکے تھے۔

یک بیک دو دھماکے ہوئے۔ شمشاد کی چونکہ ان پر عین وقت پر نگاہ پڑی تھی، اس نے عقلمندی یہ کی کہ ان پر جوابی گولی چلانے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے فوراً جست بھری اور بائیں جانب کی جھاڑیوں میں جا گرا۔ یہ وہی جگہ تھی جدھر کچھ فاصلے پر نگہت چھپی بیٹھی تھی۔

دونوں خونی سائے الگ ہو کر دوڑے۔ ایک نے مکان کی عقبی سمت کا رخ کیا اور دوسرے نے چند قدم آگے سرک کر انہی جھاڑیوں میں فائرنگ کر دی جدھر شمشاد نے پناہ لی تھی۔

میرا دل دھک سے رہ گیا کیونکہ وہاں نگہت بھی دبکی بیٹھی تھی مگر شکر رہا کہ مجھے ادھر سے کسی کی چیخ سنائی نہ دی۔ نگہت کی نہ ہی شمشاد کی۔

تب ہی ایک گولی چلی۔ مذکورہ جھاڑیوں سے ایک شعلہ پھوٹا اور سائے کے جسم میں کہیں پیوست ہو گیا۔ سایہ کرب ناک چیخ مار کر سینہ پکڑے گرا۔ یہ شمشاد کا کارنامہ تھا۔ دوسرا فائر چھت سے رفیق نے بھی داغا لیکن ٹھیک اسی وقت دوسری جانب سے دو فائر ہوئے۔ میں نے رفیق کی چیخ سنی۔ وہ شاید دوسرے سائے کے نشانے پر آ گیا تھا۔

دفعتاً جھاڑیوں سے میں نے شمشاد کو دوبارہ نمودار ہوتے دیکھا۔ ایک دشمن کو ڈھیر کرنے کے بعد اس کی ہمت سوا ہو گئی تھی۔ نگہت شاید وہاں سے پہلے ہی ہٹ گئی تھی ورنہ شمشاد اور اس کا "سامنا" ہونا ضروری تھا۔

نگہت میری ہی ہدایت پر عمل کیے ہوئے تھی۔ میری نظریں پھر دروازے کی جانب گھوم گئیں۔ شمشاد ہاتھ میں گن تھامے دوڑتا ہوا مکان کی دیوار کے اس طرف دوڑا تھا جدھر سے رفیق کی چیخ سنائی دی تھی۔ وہ گولی لگنے کے بعد چھت کی منڈیر سے نیچے لاش کی صورت ہی آن گرا تھا۔ شمشاد تنہا رہ گیا اور الٹے پاؤں جھاڑیوں کی طرف دوبارہ پناہ لینے کے لیے دوڑا۔ یا شاید وہ یہاں سے دور بھاگنا چاہ رہا تھا۔ ایک سایہ اس کے تعاقب میں لپکا۔

وہاں دو ایک فائر ہوئے لیکن کوئی انسانی چیخ سنائی نہ دی۔ پھر میں نے مکان کے دروازے سے ایک گرانڈیل

Scanned with CamScanner

سائے کو اُبھرتے دیکھا۔ اس نے ہاتھ میں لمبی نال والا سیاہ پستول پکڑ رکھا تھا۔ اس کے انداز میں چوکنا پن تھا۔

وہ اوپر سے برہنہ تھا، نیچے نقط تہبند تھی۔ پورا جسم سیاہ تھا، سر گنجا اور ڈیل ڈول کسی گینڈے جیسا تنومند اور مضبوط دکھائی دیا۔ مجھے اسی پر گربھ داس کا شبہ ہوا۔

یکلخت ہی غم و غصے سے میرا پورا وجود ایک عجیب سے ارتعاش کا شکار ہوگیا۔ یہ ایسا ہی لرزا تھا جیسے کوئی اپنے بھیانک دشمن کو دیکھتے ہی اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے بے چینی میں کانپنے لگتا ہے۔

میرے تپتے ہوئے وجود میں جارحانہ سی جنبش ابھری مگر میں نے بڑی مشکلوں سے خود پر قابو پائے رکھا۔ وہ بدہیئت ڈیل ڈول کا شخص پستول تانے پہلے محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر قریب اپنے ساتھی کی لاش کو گھورا۔ اس کے حلق سے مجھے ایک عجیب سی وحشیانہ غراہٹ اُبھرتی سنائی دی۔

پھر وہ تیزی کے ساتھ اسی جانب کو لپکا جدھر اس کا دوسرا ساتھی شمشاد کے پیچھے گیا تھا۔

یکلخت ہی میرے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ پل کے پل میں نے ایک فیصلہ کیا اور موقع تاک کر اپنی کمین گاہ سے نکلا اور کسی چوکنا چیتے کی طرح مکان کے دروازے کی جانب لپکا۔

بلاشبہ یہ میری ایک خطرناک حرکت تھی جو میرے لیے جان لیوا بھی ثابت ہوسکتی تھی کیونکہ اندر گربھ داس کے ایک یا دو ساتھی اور بھی موجود ہوسکتے تھے لیکن مجھے اس کا امکان کم ہی محسوس ہوا تھا کیونکہ اگر وہ ہوتے تو گربھ داس تنہا باہر نکلتا دکھائی نہ دیتا۔

تاہم یہ قیاس خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ دشمن انتہائی بے رحم اور خطرناک تھا۔ احتیاط ضروری تھی۔

گربھ داس، شمشاد کے تعاقب میں مکان سے باہر نکل چکا تھا اور میں لپک کر دروازے سے سیدھا اندر داخل ہوگیا۔ میری یہ حرکت دلیرانہ وار تھی لیکن میں نے نہایت ہوشیاری سے اور ایک بڑا رسک لے کر یہ کام نمٹایا تھا۔

میں نے مکان کا دروازہ ایسے ہی کھلا رہنے دیا تھا تاکہ گربھ داس لوٹے تو اسے کسی قسم کا شبہ نہ ہوپائے۔ اندر داخل ہوتے ہی میں یکلخت دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ مکان میں بظاہر سناٹا تھا لیکن صحن میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔

اس کی روشنی میں مجھے وہاں اندر صرف ایک ہی کوٹھری نظر آئی۔ صحن تنگ تھا۔ بس کہنے کو مکان تھا، نظر کسی تنگ و تاریک کھولی کی طرح ہی آتا تھا۔

بوسیدہ سی سنگی سیڑھیاں اوپر چھت کو جاتی دکھائی دیں۔ در و دیوار سے پلستر اکھڑا ہوا تھا اور اینٹیں نظر آرہی تھیں۔ کوٹھری کا دروازہ خستہ حال تھا، وہ بھڑا ہوا تھا۔ اندر ہلکی سی روشنی تھی۔ شمشاد اور اس کے ساتھیوں کی اندھا دھند فائرنگ سے اینٹیں مجھے کہیں کہیں سے ٹوٹی اور ادھڑی ہوئی نظر آئیں۔

میں سیدھے کوٹھری کی جانب بڑھنے کے بجائے دیوار سے چپکے ہوئے اس کے دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ میں تسلی کرنا چاہتا تھا کہ کوٹھری اندر سے خالی ہے یا کوئی اندر موجود تھا۔

ابھی میں کوٹھری کے دروازے سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر تھا کہ اچانک چھت پر شور سا سنائی دیا۔ پھر ایک فائر ہوا اور کسی کی چیخ سنائی دی۔ میں نے پیش قدمی روک دی اور گردن موڑ کر سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ نہ جانے اب کون کام آیا تھا؟ گربھ داس کا متوقع طور پر آخری ساتھی یا پھر شمشاد؟

کوٹھری خالی تھی ورنہ کوئی ضرور باہر آتا۔ یہ سوچ کر میں نے اندر جانے کا ارادہ ترک کیا اور پستول نکال کر سیڑھیوں کی طرف لپکا اور جھکے جھکے انداز میں اس کے سالخوردہ قدمچے طے کرنے لگا لیکن ابھی نصف ہی طے کر پایا تھا کہ اچانک کوئی شے اوپر سے لڑھکتی ہوئی نیچے کو آئی اور میرے قدموں سے ٹکرا کر ٹھہر گئی۔

نیم تاریکی میں میری تیز نظریں اس پر گڑ گئیں۔ یہ کٹی ہوئی انسانی کھوپڑی تھی جس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ کٹے ہوئے حصے سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔ یہ شمشاد کی لاش تھی۔ وہ شاید گربھ داس کو جل دے کر لوٹا ہوگا۔ اس کا مقصد رفیق کی طرح مکان کی چھت پر گھات لگا کے انہیں ہلاک کرنا ہوگا مگر بدقسمتی سے وہ گربھ داس کے ایک خونی گرگے کی زد میں آگیا۔

میرا دل مالش کرنے لگا اور مجھے ابکائی آگئی۔ اگلے ہی لمحے میں نے اوپر سیڑھیوں کے سرے پر خوفناک سی غراہٹ سنی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو گربھ داس کا ایک تنومند سیاہ رو ساتھی ہاتھ میں لمبا سا چھرا پکڑے کھڑا خونی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ شمشاد کی گردن یقیناً اسی مردود نے ہی اڑائی تھی۔

میں نے پستول والا ہاتھ سیدھا کیا ہی تھا کہ اس نے چھرا میری جانب اچھال دیا۔ شاں شپ کی آواز سے چھرا فضا میں لہرایا ہی تھا کہ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے صحن میں چھلانگ لگا دی۔ چھرے کی کسی

Scanned with CamScanner

digestlibrary.com

سنگی دیوار سے ٹکرانے کی چھناکے دار آواز ابھری۔

یہ میں ہی تھا جو اتنے قریبی فاصلے سے اس کے خوفناک چہرے کے مہیب وار سے بچ سکا تھا۔ کوئی اور اس قدر پھرتی کا مظاہرہ کرنے سے قاصر ہی رہتا۔

گربھ داس کا ساتھی وار خالی جاتے دیکھ کر تلملا گیا اور وہ وہیں سے چیخ مار کر صحن میں آن کودا۔ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ مجھے ابھی تک اسے چلانے کا موقع نہ مل سکا۔ تاہم وہ صحن میں ہی کونے پر جا لڑھکا تھا۔

اب میں اور گربھ داس کا ساتھی آمنے سامنے تھے۔ گربھ داس کے اب تک جو چند ساتھی مجھے نظر آئے تھے، وہ اس سمیت لنگی پوش تھے۔ جانے یہ میڈم مچھی کے کون سے وحشی ساتھی تھے، ابھی اس کا عقدہ کھلنے والا تھا۔

وہ مجھے وحشیانہ نظروں سے گھورتا ہوا تیزی سے لپکا۔ ساتھ ہی اس نے ایک چیخ بھی ماری۔ وہ یقیناً باہر موجود..... ..... اپنے ''گرو'' گربھ داس کو خبردار کرنا چاہتا تھا۔

میں نے جھکائی دی اور ساتھ ہی اپنے دونوں ہاتھوں کا ''ڈبل پنچ'' جو میرا محبوب وار تھا، بنا کر اس کی پسلیوں پر بھی جڑ دیا۔ اس کے حلق سے بھیانک چیخ ابھری اور وہ نیچے گر کر تڑپنے لگا لیکن جلد ہی اس نے سنبھالا لیا اور اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اپنے اس وار پر از حد مایوسی ہوئی تھی ورنہ اس کی شدید ضرب سے اتنی جلدی کوئی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ کوئی ایک آدھ ہڈی تو ضرور ہی اس وار سے چیخ جایا کرتی تھی۔

وہ گیند کی طرح اُچھلا۔ میں سمجھا مجھ پر ٹوٹنے والا ہے لیکن نہایت مکاری سے وہ مجھ پر پڑنے کے بجائے سیدھا سیڑھیوں کی جانب گرا جدھر میرا پستول موجود تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی جانب لپکتا، وہ بہ سرعت پستول ہاتھ میں لیے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ پر تان لیا۔

میرے قدم رک گئے اور میں سن ہو کر رہ گیا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے ''شاشپ'' کی وہی مخصوص آواز سنی۔ کوئی شے دروازے سے لپکتی ہوئی آئی اور گربھ داس کے ساتھی کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ یہ مخصوص قسم کا درانتی نما خنجر تھا۔

اس کے حلق سے بھیانک چیخ برآمد ہوئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میری حیرت بھری نظریں دروازے کی جانب اٹھ گئیں۔ وہاں نگہت کھڑی تھی۔ اس نے یقیناً مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اپنی کمین گاہ سے حرکت کی تھی اور باہر گرے ان ہی کے ہتھیار کو اٹھا کر اس نے مکان کا رخ کیا ہوگا، پھر عین وقت پر مجھے خطرے میں پا کر اس نے ان ہی کے ہتھیار سے وار کر ڈالا۔ یقیناً اس کی تربیت میں ایسے ہتھیاروں کا استعمال بھی شامل ہوگا ورنہ اس ہتھیار کو پھینکنے میں خاص مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔

دفعتاً ہی میں نے ایک بھیانک منظر دیکھا۔ نگہت کے عقب میں نیم تاریکی سے مجھے گربھ داس اچانک دیو کی طرح برآمد ہوتا دکھائی دیا۔ اس نے دائیں ہاتھ میں خم دار چھرا پکڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں نگہت کو اس کے عقب میں موجود قیامت خیز خطرے سے آگاہ کرتا، اس نابکار گربھ داس نے عقب سے ایک ہاتھ گھما کر نگہت کی گردن کے گرد لپیٹ لیا اور اپنے مہیب چہرے کی تیز چمکتی دھار اس کی نازک گردن کے قریب شہ رگ پر رکھ دی۔

نگہت بے بس ہو گئی۔ میں حق دق سا رہ گیا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ نگہت اس وحشی درندہ صفت کے ہاتھوں پل کے پل بڑی بے رحمی سے ذبح ہو سکتی تھی۔

وقت کو جیسے یکلخت سانپ سونگھ گیا، لمحے جامد ہو گئے، ساعتیں رک گئیں۔ یوں جیسے قیامت آنے والی ہو۔

گربھ داس کی گول گول ابھرے ہوئے ڈیلوں والی آنکھوں میں سفاکانہ چمک اور بدہیئت سیاہ رو ہونٹوں پر سنگدلانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''کیوں بالکے..... اڑا دوں تیری اس گوپن کی گردن؟''

''نن..... نہیں۔'' بے اختیار میرے لبوں سے لرزاں سی آواز ابھری۔ ساتھ ہی ایک ہاتھ بھی آگے کو اٹھا۔ نگہت کے خوبصورت چہرے پر یکایک موت کی زردی پھیل گئی تھی۔

''ہاہاہا..... ا'' اپنی شخصیت کی عکاسی کرتا گربھ داس کریہہ انداز میں ہنسا۔ ''بہوت جیوٹ کتھائیں سن رکھی ہیں رے ہم نے تو ہاری..... بہوت ناک میں دم کیا تو نے ہمری میڈم مچھی کے..... بڑا نقصان کیا رے تو نے ہمری..... جات کا، ہمری پاٹ کا۔ ہم تجھے پہچان گئے ہیں..... بہوت اچھی طرح پہچان گئے ہیں رے..... مورکھا'' کہتے کہتے یکایک اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک اُبھری۔

اس کی بات سے مجھے یہی اندازہ ہوا کہ جہنم واصل رانا لنگڑا کے بعد یہی اس کا کوئی ایسا خطرناک ساتھی تھا جسے اس مردار نی میڈم مچھی نے نہ صرف میرے بارے میں سب بتا رکھا تھا بلکہ میری تصاویر بھی اسے دکھا رکھی ہوں گی ورنہ یہ مجھے میڈم مچھی یا کالی لہر کے ایک خطرناک دشمن کی حیثیت سے کیسے پہچانتا؟ یہی سوچ کر یکایک میرے دل

Scanned with CamScanner

میں ایک مکارانہ خیال آیا۔

"دیکھو گربھ داس.....!" میں نے اسی طرح اپنا ایک ہاتھ اسے روکنے کے انداز میں اٹھائے رکھتے ہوئے اس سے بڑی بے چارگی کے ساتھ کہا۔ (جوش دکھانے کا مطلب اپنی شناخت کی تصدیق اور نگہت کی جان کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہوتا)

"تم نے ابھی جو کچھ کہا وہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ ہم تو یہاں....."

"بول..... بول..... بولتا رہ۔" وہ اچانک میری بات کاٹ کر تمسخرانہ انداز میں غراہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ "بہت مزہ آورت ہے ہمرے کو تیری اس بکواس کو سن کر..... رے۔ بالکل ٹھیک بتایا تھا ہمری مہان میڈم (مچھی) نے کہ تو ایک نمبری مکار، چلتر باز اور کھترناک ہے۔"

میں مایوس نہیں ہوا، پھر کہنا چاہا ہی تھا کہ اس نے مجھے چپ کرا دیا۔

"بس..... زیادہ وقت نہیں ہمرے پاس۔ اسی طرح چپ چپاتے باہر کو آجا۔ اگر کوئی غلط حرکت کی تو یاد رکھ اس کنیا کی گوری گردن والی کھوپڑی کو لڑھکا دوں گا۔" آخر میں اس کے لہجے میں سفاکی عود کر آئی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔ مچھی کا ٹرینڈ چیلا تھا، رانگا لنگڑا کا دوسرا روپ۔ میں نے اسی مہلت کو غنیمت جانا اور سر جھکا کر قدم آگے بڑھائے۔ وہ نگہت کو اسی طرح قابو کیے ہوئے الٹے قدموں دروازے سے باہر تاریکی میں آگیا۔

میں بعد میں مکان سے باہر نکلا۔ بغیر ہڈ والی جیپ کھڑی تھی۔

"جلدی کر، جیپ کا اسٹیرنگ (اسٹیئرنگ) سنبھال، اسٹارٹ کر۔ وقت نہیں بچا میرے پاس۔" اس نے تحکمانہ درشتی سے کہا۔ میں نے یہی کیا۔

جیپ اسٹارٹ کر دی، ہیڈ لائٹس روشن ہو گئیں۔ اس نے مجھے مڑ کر دیکھنے سے بالکل منع کر رکھا تھا۔

اس کے بعد وہ بھی نگہت کو اسی طرح بے بس کیے اور دبوچے جیپ کے عقبی حصے میں سوار ہو گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں نگہت خود کو بچانے کے لیے ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے لیکن کچھ تسلی بھی تھی کہ نگہت بھی اس وحشی نما انسان کی طاقت سے بخوبی واقف تھی۔

گربھ داس نے پڑھی چالاکی کر ڈالی۔ اس نے جیپ میں سوار ہوتے ہی نگہت کو کسی کھلونے کی طرح میرے برابر والی سیٹ پر اچھال دیا۔ میرا پستول اس کے قبضے میں تھا اور پھر اس نے سیٹ کے نیچے رکھ دیا۔

"اب جیسا میں بولتا رہوں، اسی راستے پر گاڑی چپ چاپ چلاتا رہ۔" اس نے تہدیدی انداز میں کہا۔ "ذرا بھی کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش تو نے کی بالکے، تو یاد رکھنا پہلے اسی کو پن کی جان جائے گی۔"

نگہت کو اس کے شکنجے سے آزادی ملتے ہی میری سانس میں سانس آئی تھی، میرا حوصلہ سوا ہوا تھا۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ سر پر ہی نہیں بلکہ ہمارے عقب میں بھی منڈلا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ گربھ داس ایک ذرا سے شبہے میں بھی نگہت کو عقب سے گولی داغ سکتا تھا۔ اسی لیے سر دست میں خاموشی سے اس کا ہر حکم ماننے کو تیار رہا۔

ساتھ ہی موقع ملتے ہی میں نے نگہت کو نظروں ہی نظروں میں اشارہ دے دیا تھا کہ وہ بھی ابھی چپکی بیٹھی رہے، کسی قسم کی "مہم جوئی" دکھانا خطرناک ہوگا، جب تک کہ میں کوئی حرکت نہ کروں۔

گاڑی تاریکی میں مناسب رفتار سے دوڑنے لگی۔ وہ مجھے راستہ بتاتا رہا۔ نگہت میرے برابر میں خاموش بیٹھی تھی۔ چپ میں بھی رہا لیکن اندر سے میرا ذہن ہلچل کا شکار تھا۔ یہ نابکار ہمیں کدھر لے جا رہا تھا؟ کیا وہاں اس کے اور بھی ساتھی موجود تھے؟ کیا اس طرف بھی انہوں نے کوئی اور مکان کرائے پر لے رکھا تھا جس طرح یہ مکان کسی مقامی زمیندار صالح چودھری سے لیا تھا؟

دفعتاً میں چونکا جب اس نے جیپ کو مین روڈ کی طرف جانے والے راستے کی سمت موڑنے کو کہا تھا۔ تو گویا یہ نابکار ہمیں اپنے کسی شہر والے ٹھکانے کی جانب لے جانے کا خواہاں تھا۔

لیکن نہیں..... میرا اندازہ جلد ہی غلط ثابت ہوا۔ یہ راستہ شہر سیالکوٹ کے بجائے چونڈہ کی جانب جاتا تھا۔ ہم آدھے ناکرہ کراس کر چکے تو جیسوران سے چند ایک کلومیٹر ہی پہلے اس نے بائیں جانب جیپ کو کچے میں اتارنے کا اگلا حکم مجھے دیا۔

یاد رہے سیالکوٹ سے چونڈہ تقریباً چھبیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور ہم شہر سیالکوٹ سے تقریباً پندرہ بیس کلومیٹر کی دوری پر تھے۔ یہاں چھوٹے موٹے دیہات اور کچھ کھیت کھلیان کے آثار دکھائی دینے لگے۔ کسی قریبی قصبے سے گزرتے ہوئے ہم مختصر سے جنگل میں داخل ہو گئے۔

Scanned with CamScanner

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جانے یہ کمبخت کہاں کہاں سے "شارٹ کٹ" لگاتا، دور افتادہ گاؤں قصبات سے ہمیں گھماتا بالآخر کسی چھوٹے سے سرحدی گاؤں میں لے آیا۔

آبادی سے قدرے دور جدھر ایک قدرتی نہر بہہ رہی تھی اور کنارے پر ایک مختصر قطعہ گھاس کا میدان نظر آیا۔ وہیں گھنے پیڑوں کے جھنڈ تلے لکڑی اور اینٹوں کا مکان بنا ہوا تھا۔ اس کے چھوٹے سے احاطے میں ایک گاڑی کھڑی دیکھ کر میں بری طرح چونکا۔ اس ٹٹے ماڈل کی چمچماتی کار کو میں پہچان چکا تھا۔ یہ وسیم کی کار تھی۔

میرا خیال تھا کہ گربھ داس مجھے جیپ کو اس طرف موڑنے کا کہے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ تھوڑی دور آگے جا کر گھاس کا یہ قطعہ اختتام پذیر ہوا تو ریتیلا سا علاقہ شروع ہوگیا۔ وہاں ایک اجاڑ اور ویران سے بھٹے کے آثار دکھائی دیے۔ اس کے اطراف میں کوئی سات آٹھ کے قریب جھونپڑی نما گھر بنے ہوئے تھے جو سب کے سب ویران کھنڈر ہی نظر آتے تھے۔

شاید یہ بھی بھٹے کے مزدوروں کی رہائش کے طور پر مستعمل ہوتے ہوں لیکن اب ویران اور کھنڈر بن چکے تھے۔ ایسے ہی ایک کھنڈر نما مکان کے قریب مجھے گربھ داس نے جیپ روکنے کا حکم دیا۔

جیپ کی آواز سنتے ہی مکان کے اندر سے دو افراد برآمد ہوئے۔ یہ سب بھی صدری (واسکٹ) پوش تھے، نیچے لنگیاں بندھی ہوئی تھیں۔ دونوں ہی ہٹے کٹے تھے۔

شاید گربھ داس کا یہ اپنا ہی کوئی "لنگی پوش" گروپ تھا۔ ممکن تھا کہ اسی گروپ نے بروقت میڈم مچھی کو بھانڈیل سائیں کے ہاتھوں گنامی کی موت سے بچایا تھا۔ اگرچہ اس کی مخبری وسیم نے ہی کی تھی۔

آس پاس کافی سناٹا اور ویرانی سی تھی لیکن میرا ذہن درختوں کے جھنڈ میں بنے اس مکان پر اٹکا ہوا تھا جدھر میں نے وسیم کی کار کھڑی دیکھی تھی جو اس بھٹے والی ریتیلی جگہ سے صرف چند سو گز کے فاصلے کی دوری پر رہ گیا تھا۔

وہ دونوں لپک کر جیپ کی طرف بڑھتے لیکن جیسے ہی انہوں نے اپنے "گرو" کے ساتھ مجھے اور نگہت کو دیکھا، صورت حال کا اندازہ کرتے ہی دونوں نے پھرتی کے ساتھ اپنی صدری کے اندر ہاتھ ڈالے اور درانتی نما خنجر نکال لیے۔

انہیں چاقو زنی میں ہی نہیں بلکہ چاقو اچھال کر مارنے میں بھی خاص مہارت حاصل تھی جس کا مشاہدہ میں کر ہی چکا تھا۔

ان کی آنکھوں سے یکایک وحشیانہ چمک پھوٹنے لگی۔

"یہ دونوں بہت خطرناک دشمن ہیں۔" ان دونوں کے قریب آتے ہی گربھ داس نے کہا۔ "تم جاؤ تم دوڑ کر جاؤ اور میڈم جی کو کہو کہ..... جلدی۔"

ایک یہ حکم سنتے ہی اسی جانب کو دوڑ پڑا جدھر مجھے وہ درختوں میں گھرا مکان نظر آیا تھا۔ اس کی بات پر میں اندر سے بدکا۔ گویا میڈم مچھی بھی ادھر ہی تھی لیکن وسیم کی کار؟

میرے تیزی سے سوچتے ذہن کو فوری ادراک ہوا۔ چونکہ وسیم، میڈم مچھی کا یہاں سب سے بڑا "سہولت کار" تھا اسی لیے وہ... میڈم کے ساتھ خود بھی ادھر ہی ہوگا اور کوئی بعید نہیں کہ بوبھورگا کا مجسمہ بھی وہ اسی جگہ لا چکے ہوں۔

یہاں سے انڈین بارڈر بھی نزدیک تھا۔ میڈم مچھی اب اپنے سب سے بڑے دشمن یعنی میرا خاتمہ چاہتی تھی اور یوں وہ ایک پنتھ دو کاج کے مصداق مجھے کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھی۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ بعد میں مجھ پر جو انکشافات ہوئے، وہ اس سے سربسر مختلف اور سنسنی خیز تھے۔

گربھ داس بڑا چالاک اور ہوشیار ثابت ہوا۔ اس نے مجھے جیپ میں ہی اسی طرح بیٹھے رہنے کا حکم دیا جبکہ خود وہ نگہت کو گن پوائنٹ پر لیے نیچے اتر گیا، پھر اسے بھی خود سے دور کر کے میری ڈرائیونگ سیٹ کے قریب کر کے اس طرح کی پوزیشن پر کھڑا کر دیا کہ اب بیک وقت ہم دونوں ہی گربھ داس کے پستول کے نشانے پر تھے۔

وہ خاصا محتاط ثابت ہوا۔ وہ مجھ سمیت نگہت سے بھی انتہائی محتاط تھا۔ گویا میں نے اب تک شاید کچھ کر دا مست قلندر کرتا تھا کیونکہ مجھے آنے والے اعصاب شکن اور سنسنی خیز حالات کا ادراک ہوگیا تھا اور یہ کہ میرا کل بہر سمیت میڈم مچھی، وسیم اور بوبھورگا وغیرہ معاملے کا یہ آخری ڈراپ سین ہے۔

گربھ داس نے مجھے جیپ کے اندر ڈرائیونگ سیٹ پر جبکہ نگہت کو باہر میرے قریب ہی کھڑکی کے قریب بلا حرکت جمے رہنے کا حکم دے رکھا تھا۔ حتیٰ کہ ہمیں گردنیں موڑ کر ادھر اُدھر دیکھنے کی بھی ممانعت تھی۔

رات شاید اپنے پچھلے پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ آسمان صاف تھا، تارے چمک رہے تھے۔ قریب میں نہر خاموشی سے بہہ رہی تھی۔

گربھ داس کے گماشتے کو گئے کچھ دیر ہوئی تھی کہ میں نے جیپ کے مرر میں عقب میں روشنی چمکتی دیکھی۔ گماشتہ شاید میڈم مچھی کو وسیم ہی کی کار میں لا رہا تھا۔ یقیناً

digest library.com

Scanned with CamScanner

اس میں وسیم بھی ہوسکتا تھا کیونکہ کار اسی کی تھی۔

میرا دل رک رک کر دھڑکنے لگا۔ فیصلہ کن لمحات قریب تھے۔ میڈم مچھی کا مجھ سے ایک عرصے بعد سامنا ہونے والا تھا اور میں چشم تصور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ بہت طیش میں اور زخمی ناگن کی طرح بل کھا رہی ہوگی۔

کار قریب آگئی۔ گربھ داس چند قدم پیچھے ہٹا تاکہ ہم پر نظریں جمائے رکھتے ہوئے انہیں بھی دیکھتا رہے۔ نگہت اور میں نے ذرا گردن موڑی۔ کار کے دروازے کھلے، اس کے اندر سے میڈم مچھی اور وسیم برآمد ہوئے۔ گربھ داس کا وہ گماشتہ جو انہیں اس کے حکم پر بلانے گیا تھا، وہ بھی اتر آیا۔

وسیم کی مجھ پر نگاہ پڑی اور اس نے جھٹ سے پستول نکال لیا۔ وہ مجھے دیکھ کر خاصا ژولیدہ اور بدکا ہوا سا لگ رہا تھا جس کی وجہ میں جان سکتا تھا۔ وہ اندر سے مجھ سے خوفزدہ ہی رہتا تھا حالانکہ اس وقت وہ دیکھ سکتا تھا کہ میں اسی کے ساتھیوں کی گرفت میں تھا۔ نگہت پر بھی اس نے ایک نظر ڈالی تھی۔

البتہ میڈم مچھی کی حالت مختلف تھی۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ جلتی بلتی نگاہوں سے میری طرف گھورتی ہوئی اپنے مقربِ خاص کارپرداز گربھ داس کے قریب جا کھڑی ہوئی اور زخمی ناگن کی طرح پھنکار کر بولی۔

"گربھ داس! تم نے اس مورکھ کو گرفت میں لے کر بہت بڑا جیوٹ کام کیا ہے۔ اس نے مجھے بہت زخم دیے ہیں، میرا بہت نقصان کیا ہے جو ناقابلِ تلافی اور ناقابلِ معافی ہے۔" مارے غضب کے پھنکارنے کے بعد اس نے نگہت کو دیکھا۔

"یہ کنیا کون ہے؟" اس نے گربھ داس سے پوچھا۔

"یہ..... اس کی گوپن ہے، محبوبہ ہے۔" گربھ داس نے معنی خیز لہجے میں کہا تو میڈم مچھی زخم کھائی ناگن کی طرح بل کھاتے ہوئے بولی۔

"نہیں گربھ داس! تمہیں ابھی کچھ معلوم نہیں۔ اس کی گوپن کوئی اور ہے جس سے اب اس نے شادی کرلی ہے۔ یہ اس کی کوئی ساتھی ہوگی۔"

"ایک ہی بات ہے میڈم جی!"

میرا دل اب بری طرح دھڑک رہا تھا کیونکہ میڈم مچھی جس قدر زخم کھائی اور بپھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی، وہ کسی بھی وقت ہم دونوں کو ختم کرنے کا حکم صادر کرسکتی تھی اور میں مزید مناسب موقعے کے انتظار میں نگہت اور اپنی جان کا رسک بہرحال ہرگز نہیں لینا چاہتا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی میں نے کوئی جارحانہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا، میڈم مچھی کی ایک بات نے نہ صرف میرے تنے ہوئے اعصاب کو پرسکون سا کردیا بلکہ جو اس نے گربھ داس سے آگے کہا، اسے سن کر مجھے اندر سے ایک زبردست جھٹکا لگا۔

"گربھ داس! لڑکی کو ادھر ہی رکھو اور اسے نہر والے مکان کی طرف لے چلو۔ ہم نے اس کے منہ سے مقدس بومبورگا دیوتا کے مجسمے کے بارے میں اگلوانا ہے۔"

میں نگہت کی طرف سے البتہ یہ سن کر فکرمند ہوگیا تھا کہ اسے ادھر ہی کسی کھنڈر نما جھونپڑ نما مکان میں رکھا جائے گا۔ نگہت بھی میڈم مچھی کا یہ حکم سن کر پریشان سی دکھنے لگی لیکن وسیم نے ہماری پریشانی رفع کردی۔ وہ مچھی سے بولا۔

"میڈم! میرا خیال ہے نگہت کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔ یہ ضروری ہے اور اس کی کمزوری بھی۔ کیا خبر اس کا منہ کھلوانے کے لیے اس کمزوری کی ضرورت پڑے ہمیں۔"

اس رذیل کا آخری اشارہ سمجھتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور نگہت کا چہرہ بھی سرخ ہوگیا جبکہ گربھ داس نے یہ سنتے ہی مکروہ مسکراہٹ اور گرسنہ نظروں سے نگہت کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر دونوں کو لے چلو۔" مچھی نے کہا اور کار کی جانب پلٹی۔ وسیم بھی اس کے پیچھے لپکا۔ وہ دونوں کار میں سوار ہوکر واپس نہر کنارے والے مکان کی طرف پلٹ گئے۔ گربھ داس نے وہی روش اختیار کیے رکھی یعنی نگہت کو میری برابر والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ایک شمبو نامی ساتھی کو اندر سے بلا کر اس کے ہمراہ ہماری عقبی سیٹ پر آگیا۔ گن اس نے تانے رکھی تھی جبکہ شمبو نے بھی ہاتھ میں اپنے درانتی نما خنجر کو ماہرانہ انداز میں پکڑ رکھا تھا۔

مجھے جیپ کو کار کے پیچھے لگانے کا حکم ملا اور میں نے ایسا ہی کیا۔

جیسا کہ مذکور ہوا، نہر کنارے والا مکان یہاں سے چند سو گز ہی دوری پر تھا۔ چند منٹوں میں وہاں تک پہنچتے پہنچتے میرے اندر یہ سوچ سوچ کر ہلچل ہوتی رہی کہ یہ کیا قصہ نکل آیا تھا؟

بومبورگا کا مجسمہ ان سے بھی کوئی ہتھیا لے گیا تھا مگر کون؟ وہ تو پہلے ہی ان کے پاس تھا اور بھانڈیل ساتھیوں کی غداری کے بعد مجسمہ تو پھر بھی وسیم کے قبضے میں ہی ہونا چاہیے تھا۔

ایک خیال میرا ریڈ فاکس اور بلیک کیٹس کی طرف بھی

Scanned with CamScanner

گیا تھا۔ کہیں ان کے کسی ساتھی نے وسیم کے ٹھکانے پر شب خون مار کر اسے چھین تو نہیں لیا ہوگا مگر یہ کیسے ممکن تھا؟ کیونکہ ریڈ فاکس اور بلیک کیٹس کے ٹاپ سپر ایجنٹوں کی جو کھیپ یہاں "بلیک اسٹون" یعنی بوبورگا کے مجسمے کے حصول کے لیے خفیہ طور پر وارد ہوئی تھی، وہ سب کے سب میرے بروقت "ایکشن" لینے کے بعد پولیس اور بعد میں اعلیٰ حکام کے سپرد کر دیے گئے تھے۔ باقی میرے ہی ہاتھوں واصلِ جہنم ہوئے۔ تو پھر یہ کیا پراسرار معاملہ ہو سکتا ہے؟ لیکن میرے ذہن میں آخری خیال جو ابھرا تھا، اس پر میں ضرور کھٹکا تھا اور وہ تھا بھانڈیل سائیں..... کیونکہ یہی وہ واحد شخص تھا جسے معلوم تھا کہ مجسمے کو سپردِ دست وسیم کی کسٹڈی میں دیا گیا ہے۔ کیا خبر اسی کے آدمیوں نے یہ "معرکہ" سرانجام دیا ہو۔

شہر کنارے والے مکان پہنچے تو یہ مجھے کوئی کانچ نما ہی لگا۔ ہم جیپ سے اتر آئے۔ وسیم نے کار سے اترتے ہی احتیاط کے پیشِ نظر دوبارہ اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس کی محتاط روی دیکھ کر صاف کہا جا سکتا تھا کہ وہ مجھ سے بری طرح خوفزدہ تھا۔

کچھی بظاہر غیر مسلح نظر آ رہی تھی۔ گربھ داس اور شمبو بھی چوکس انداز میں دکھائی دیے۔ مجھے اور نگہت کو جیپ سے اترنے اور مکان کی جانب قدم بڑھانے کا حکم مل چکا تھا۔

لہٰذا سب سے پہلے وسیم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور جلدی سے ایک طرف ہٹ کر اپنے پستول کی نال کا رخ ہماری جانب کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے ایک غصیلی سی نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔

اندر داخل ہوتے ہی اچانک مجھے اپنے عقب میں نگہت کی کراہ آمیز چیخ سنائی دی۔ میں چونک کر پلٹا ہی تھا کہ میری گدی پر بھی قیامت ٹوٹی اور میری آنکھوں تلے یکدم اندھیرا چھا گیا۔

☆☆☆

ہوش آنے پر تیز روشنی کا کوندا میری آنکھوں میں پڑا اور میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ سر کو جھٹکا دیا تو دماغ کی ٹیسوں نے بلبلا کر رکھ دیا۔ میں وہیں جہاں کا تہاں تھم گیا۔ یہی لگا تھا کہ میں سنگی فرش پر پڑا ہوں اور پانی سے شرابور بھی ہوں۔ آنکھوں کے گرد تاریک دائرے منڈلاتے رہے تو کبھی تیز روشنی کے جھماکے۔

معلوم ہوا کوئی طاقتور ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر وقفے وقفے سے پھینک رہا تھا۔ پھر مجھے ہوش میں آتا پا کر ٹارچ کی روشنی گل کر دی گئی۔ تب بھی چند سیکنڈوں تک میری آنکھوں کے سامنے تاریک دائرے منڈلاتے رہے۔ اس کے ذرا دیر بعد میں پوری طرح دیکھنے کے قابل ہوا تو میں نے خود کو ایک درمیانے سائز کے کمرے میں جکڑ بندوں میں پڑے پایا۔ میرے دونوں ہاتھ پشت کی سمت کر کے باندھے گئے تھے۔ یہی نہیں، ٹخنوں کی طرف سے بھی دونوں پیر رسن بستہ ہی محسوس ہوئے۔

کمرے میں روشنی ہو رہی تھی البتہ یہ نہیں پتا چلتا تھا کہ وقت کیا ہوا تھا۔ صبح تھی، دن یا پھر ابھی تک رات کا پچھلا پہر۔

دو ہی کھڑکیاں تھیں۔ ایک بند تھی اور دوسری کا ایک پٹ وا تھا۔ وہیں سے مجھے ملگجے اندھیارے کی جھلک نظر آئی تو کچھ اندازہ ہوا کہ ابھی سپیدۂ سحر نمودار ہونے کو تھا۔

کمرے میں میرے سامنے تین افراد کھڑے نظر آئے۔ ایک تو میڈم کچھی تھی اور دوسرا گربھ داس، اور دونوں ہی میری طرف قہر آلود نظروں سے گھور رہے تھے جبکہ وسیم کے چہرے پر حسبِ سابق سنجیدگی اور پُرسوچ سے تاثرات رقصاں تھے۔

گربھ داس کے قریب پانی کی بالٹی رکھی تھی۔ مجھے اسی بالٹی کے پانی سے جلد ہوش میں لانے کا "فریضہ" شاید اسی مردود نے انجام دیا تھا۔

تاہم یہ سب دیکھنے کے بعد مجھے سب سے زیادہ جس کی فکر و تشویش ہوئی تھی، وہ نگہت تھی جو یہاں مجھے دکھائی نہ دی۔

"ہاں..... تو دیکھو سہراب.....!" وسیم نے ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں مجھ سے کہنا شروع کیا۔

"تمہارے پاس سچ بولنے کے سوا اب کوئی دوسرا آپشن نہیں رہا ہے۔ چاہو تو سیدھی طرح سچ بتا کر اپنے سر پر منڈلاتی مصیبت کو کم کر دو، یا ہماری بات نہ مان کر اپنی گردن کا طوق تنگ کر ڈالو۔ کیونکہ تم دیکھ ہی رہے ہو کہ بوبورگا کا مجسمہ ہمارے لیے کس قدر اہمیت کا حامل ہے اور ظاہر ہے اس کے حصول کے لیے ہم کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ یوں بھی میں نہیں سمجھتا کہ پتھر کا وہ مجسمہ تمہارے لیے کسی خاص اہمیت کا حامل رہا ہے۔ بس، اب میں مزید کچھ نہیں کہوں گا۔ اب تمہیں ہی بولنا ہے مگر سچ کیونکہ اب بات میڈم کچھی اور گربھ داس ہی تم سے کریں گے۔ بہتر یہی ہے میری رعایت سے فائدہ اٹھا لو۔ یہ تمہاری مرضی ہے۔"

بہت مکاری سے اس نے یہ کہہ کر اپنی بات ختم کر دی۔ میں چپ چاپ اس کی بکواس سنتا رہا لیکن اندر سے

Scanned with CamScanner

digest library.com

میں ایک عجیب سی اپل کا شکار تھا۔ وجہ اس نے پینڈورا باکس کے کھلنے کی تھی۔ وہ منحوس مجسمہ ان کے قبضے سے بھی کوئی لے اڑا تھا جس کا انکشاف ابھی ذرا دیر پہلے ہی انہی کی زبانی ہوا تو پہلے مجھے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھانڈیل سائیں کی طرف گیا تھا لیکن ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک اور خیال بجلی کی سی تیزی سے ابھرا تھا کہ کہیں یہ وسیم کی ہی کوئی سازش تو نہ تھی۔ کوئی گہری اور زہریلی سازش..... کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میری زندگی اس کے لیے اب یقینی موت ہے اور وہ یوں مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہو، یہ جھوٹ بول کر۔ یعنی میڈم لچھی وغیرہ کے سامنے کہ اس مجسمے کی چوری میں میرا ہاتھ ہے۔ اس لیے کہ وہ دیکھ ہی رہا تھا کہ میڈم لچھی میری کس قدر خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔

تب ہی مجھے نگہت کے ان الفاظ کی اچانک ہی اہمیت سمجھ میں آنے لگی جسے میں عمومی سی مثال ہی گردانے ہوئے تھا کہ آخر کو اس نے وسیم کے ساتھ کافی عرصہ اکٹھے ہی گزارا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ اس کی چھپی ہوئی اور قبیح قسم کی فطرتوں سے اچھی طرح واقف تھی اور اسی لیے اس نے مجھے اس سے محتاط رہتے ہوئے بار بار یہی کہا تھا کہ وسیم ایک موقع پرست اور مکار انسان ہے۔

اس نے خوب موقعے سے فائدہ اٹھایا تھا۔

"یہ جواب دے گا یا ہم اپنا کام شروع کر دیں وسیم؟" مجھے خاموش پا کر اچانک ہی میڈم لچھی نے تحکمانہ انداز میں وسیم سے پوچھا۔

"میں جواب دینے اور سچ بولنے کو تیار ہوں میڈم لچھی!" معاً میری گرج دار آواز کمرے کی محدود اور سیلن زدہ در و دیوار میں گونجی اور وہ تینوں ہی میرا چہرہ تکنے لگے۔

"لیکن یہ سچ میں وسیم کے کہنے یا اسے سنانے کے لیے نہیں بولوں گا۔ صرف تم سے بولوں گا میڈم لچھی!" میں اب بغیر رکے کہتا رہا اور پورے اعتماد سے میڈم لچھی کی آنکھوں میں آنکھیں بھی ڈالے رہا۔

"وجہ اس کی یہی ہے کہ یہ ایک انتہائی مکار، موقع شناس شخص ہے اور اپنے مفادات کی خاطر اپنے قریبی ساتھیوں کو بھی چکر دینے سے باز نہیں رہتا۔ میں سو فیصد یقین سے ہی نہیں بلکہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجسمہ کوئی نہیں لے گیا۔ وہ ابھی تک وسیم کے قبضے میں ہی ہے۔ جس طرح تم نے لچھی اسے سنبھالے رکھنے اور بعد میں گڑھ مولا بھانڈیل سائیں کی حویلی میں پہنچانے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ بعد کے حالات تمہاری توقع کے برخلاف نکلے۔ تمہیں بروقت بھانڈیل سائیں کی غداری کا علم ہوا۔ مجسمہ وسیم کے پاس ہی رہنے دیا گیا۔ اور یہی سچ ہے۔"

یہ سب میڈم لچھی سے کہنے کے بعد میں نے وسیم کے چہرے کی طرف بھاگتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر یکا یک پہلے حیرت اور پھر گھبراہٹ صاف نظر آئی لیکن جو آخری تاثرات اس کے چہرے سے اس وقت نمودار ہوئے تھے، جب میڈم لچھی اور گڑھ مولا نے بیک وقت اس کی طرف اپنی گردنیں موڑ کر دیکھا، وہ بوکھلاہٹ تھی۔

"ی ی..... یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟ میں..... میں بھلا یہ کیسے کر سکتا ہوں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم میرے سب سے بڑے دشمن ہو۔ ہر موقعے پر تم نے مجھے نیچا دکھانے اور شکست دینے کی کوششیں کی ہے اور..... اور....."

بدحواسی، غصے اور جانے انجانے خوف تلے اس کی آواز میں واضح طور پر لڑکھڑاہٹ تھی۔ نفسیات کی رو سے اگر ایسے کسی شخص کی "چوری" فوراً پکڑی جائے، خواہ اس کا کوئی ٹھوس ثبوت بھی نہ ہو لیکن قیاس اور محتاط تجزیے کی بنیاد پر ٹھیک ٹھیک اندازہ قائم کر لیا جائے تو چور کو ایک زبردست ذہنی جھٹکا لگتا ہے اور وسیم اسی "جھٹکے" کا بری طرح شکار ہوا تھا کیونکہ یہ اس کے لیے غیر متوقع تھا۔

"میڈم لچھی! میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا تھا کہ میری تم لوگوں سے کبھی دشمنی نہیں رہی، جب تک کہ تم لوگوں نے میری منگیتر جواب میری بیوی بن چکی ہے، اس پر ہاتھ نہ ڈالا تھا مگر....."

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اور اپنی مکارانہ چال کا رخ بدل کر دوبارہ اس سے مخاطب ہو کر کہنا شروع کیا۔

"تم نے فوزیہ کو بہت ہی بدترین قید میں رکھا۔ میں نے پھر بھی اسے چھڑانے تک ہی اپنی مہم کو محدود رکھا تھا۔ بعد میں تم نے خود ہی دیکھ لیا تھا کہ ریڈ فاکس اور بلیک کیٹس پہلے ہی سے بومبور گا کے مجسمے کے پیچھے پڑے ہوئے تھے، جنہیں وہ بلیک اسٹون کا نام دیتے ہیں۔ بعد کے حالات تم لوگوں کے علم میں ہی ہیں۔"

"خوب، اچھی رام کتھا سنائی تم نے۔" میڈم لچھی نے میرا تمسخر اڑانے والے انداز میں کہا۔ "ابھی سے پہلے تم نے یہاں سیالکوٹ میں ہماری کھٹیا کھڑی کی تھی، اس کے بارے میں کیا کہو گے؟"

"سادہ سا جواب۔" میں نے اسی طرح اعتماد سے کہا۔ "میرے ایک گہرے دوست جگنو کے بڑے بھائی عدیل کا قتل ہوا تھا جس کا سراغ لگاتے لگاتے ہمیں معلوم ہوا

Scanned with CamScanner

کہ یہ کام بھانڈیل سائیں کی مدد سے کالی لہر نامی کسی تنظیم نے کروایا تھا جس کی کھوج کا آخری سراغ تم تک پہنچا اور وہیں سے دشمنی کی ابتدا ہوئی۔"

"فضول باتیں چھوڑو اب اور مقدس بوبورگا کا مجسمہ میرے حوالے کردو۔ میں خاموشی سے واپس انڈیا چلی جاؤں گی۔ اب ہمارا مستقل ٹھکانا وہیں ہوگا۔" چھپی نے مکاری سے کہا۔ بلاشبہ وہ میری نپی تلی جوابی کارروائی سے لاجواب ہو چکی تھی۔

"حیرت ہے، تم نے ابھی میری بات کو غور سے نہیں سنا جو میں نے وسیم سے متعلق تمہیں بتائی؟" میں نے قدرے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

اس پر چھپی نے ایک نگاہ وسیم پر ڈالی۔ میرا خیال تھا اب وہ اس سے مخاطب ہوگی لیکن پھر مجھ سے ہی بولی۔

"تمہیں اس بات کا کیسے اتنا یقین ہے؟"

"مجسمہ آخری وقت تک اسی کے پاس رہا۔ بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس کے یہاں آئے ہوئے چند ایجنٹس گرفت میں آچکے ہیں۔ بھانڈیل سائیں تمہارے ساتھیوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر اسپتال جا پہنچا ہے۔ باقی بچا میں، تو تم خود سوچو بھلا مجھے اس پتھر کے بے جان مجسمے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

"یہ ایسا کیوں کرے گا بھلا..... تم پر الزام لگا کر؟"

"بڑی ٹھوس وجہ ہے۔ تم اگر دو ایک روز کا پرانا اخبار دیکھ لو تو اس کی مجھ سے پرانی دشمنی کی وجہ سمجھ آجائے گی۔" میں نے کہا۔ پھر چند روز پہلے اور دیگر ایسے حقائق میں نے چھپی کے گوش گزار کر ڈالے جس سے اس کی میرے ساتھ ذاتی نوعیت کی دشمنی، کینہ اور انتقامی روش ظاہر ہوتی تھی۔

میڈم چھپی سوچ میں پڑ گئی تو وسیم چلا کر چھپی سے بولا۔

"میڈم! یہ ہر ابر جھوٹ بولے جا رہا ہے۔ ایک نمبر کا مکار اور چالاک شخص ہے یہ۔ مت بھولنا میڈم کہ اس نے تمہارا کتنا نقصان کیا ہے۔ کتنے اہم آدمیوں کو ہلاک کیا ہے۔ مقدس بوبورگا کے مجسمے تک کو اس نے سمندر برد کر ڈالا تھا۔ یہ ہمیں آپس میں لڑوا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔"

"تم اپنے ان خفیہ ٹھکانوں کی تلاشی دے دو..... دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ابھی ہو جائے گا۔" میں نے زہریلی مسکراہٹ تلے اس سے کہا۔

"خفیہ ٹھکانے..... کیسے خفیہ ٹھکانے اور تمہیں بھلا ان کا کیسے علم ہو سکتا ہے؟" وسیم نے بوکھلاہٹ میں کہا تو میرے ہونٹوں پر رقص کرتی زہریلی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ تب ہی میں نے ایک اور نفسیاتی وار کرتے ہوئے اور کچھ چھپی پر اپنی بات کی اثر پذیری کی غرض سے اس سے کہا۔

"نگہت سے تمہاری نفرت اور ناراضگی کے بعد اس نے مجھے سب بتا رکھا ہے۔"

"میڈم! مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ مورکھ کچھ غلط نہیں کہہ رہا۔" اچانک ہی گربھ داس جو غیر متوقع طور پر اب تک خاموشی مگر شاید غور سے ہماری باتیں سن رہا تھا، یکدم سنسناتے لہجے میں میڈم چھپی سے بولا اور اب اس کی ابلے ہوئے لیلوں والی آنکھیں وسیم کے چہرے پر جم گئیں۔

"وکھت (وقت) ضائع کرنے کے بجائے ترنت ہمیں یہ بھی کر کے دیکھ لینا چاہیے۔ باقی یہ تو ہماری قید میں ہے ہی۔ بات اس کی غلط نکلی تو پھر اس مورکھ سے بھی اچھی طرح نمٹ لیں گے۔ وہ کنیا بھی ادھر ہی قید میں ہے۔"

"کنیا" سے اس کی مراد یقیناً نگہت ہی تھی اور تب ہی میں نے اس سے مخاطب ہو کر للکارنے کے انداز میں کہا۔

"گربھ داس! مت بھولنا کہ تم نے میرے ایک ساتھی کو بڑی بے رحمی سے ہلاک کیا ہے۔ نگہت کا اگر تم نے بال بھی بیکا کیا تو بلاوجہ دشمنی پالنے سے تم لوگ اپنا مقصد بھی حاصل نہیں کر سکو گے۔ جوش اور انتقام سے اندھے ہونے کے بجائے ہوش سے کام لو اور لوگوں کو بے دردی سے ہلاک کرنے کے بجائے اپنا مجسمہ حاصل کرو اور اس ملک سے نکل جاؤ۔"

گربھ داس کا مکروہ چہرہ یکدم سرخ ہو گیا۔

"دیکھا تم نے۔ کس قدر خار کھایا ہوا ہے یہ ہم پر۔ یہ ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ اس کے اندر ابھی تک ہم سے انتقام لینے کا بھوت سوار ہے۔" وسیم پھر چلایا۔ "یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم نگہت کو اس کی کمزوری بنا کر یا اس پر تشدد کر کے اس کے منہ سے مقدس بوبورگا کے مجسمے کے بارے میں یقیناً اگلوا لیں گے اور....."

"تم خاموش رہو۔" اچانک گربھ داس نے غصیلے لہجے میں اس سے کہا۔ پھر چھپی سے مخاطب ہو کر سنجیدگی سے بولا۔

"میڈم جی! آپ بتائیں، اب کیا کرنا ہے؟"

"تم کیا کہتے ہو گربھ داس؟" چھپی جو کسی سوچ میں محو تھی، اس سے بولی۔

"میرا خیال تو وہی ہے کہ پہلے اس کی بات کی تصدیق ہو جاتی۔" گربھ داس نے کہا تو میں نے دیکھا وسیم کا چہرہ ایک بار پھر دھواں دھواں ہونے لگا۔

"اس..... اس کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ کیا تم لوگ مجھ پر شک کر رہے ہو؟ ایک دشمن کی بکواس پر اتنا اعتبار۔"

Scanned with CamScanner

''بکواس بند کرو اپنی۔'' یکدم گربھ داس نے غصیلے لہجے میں اسے ڈپٹ کر چپ کرایا۔ ''میڈم جی کا جو حکم ہوگا، اسی پر ہم سب کو عمل کرنا ہے۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔''

''صاف صاف کہہ دو کہ تم لوگوں کو مجھ پر اعتبار نہیں رہا ہے۔'' وسیم کو بھی طیش آ گیا۔ ''اور تم یہ بالکل غلط کہہ رہے ہو کہ میڈم جی کا حکم ہے۔ تم ایسا چاہ رہے ہو، میڈم صاحبہ نہیں۔'' وسیم کی اس جوابی کارروائی پر گربھ داس اس کی طرف قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے یوں اپنے دانت پیسنے لگا جیسے ابھی اس پر آن پڑے گا اور ایسا ہو بھی جاتا شاید اگر درمیان میں میڈم پچھی اپنا ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ نہ دیتی۔

''وسیم! گربھ داس سے مت الجھو۔ ایسا میں خود بھی چاہتی ہوں۔'' بالآخر میڈم پچھی نے بھی اپنے چیلے گربھ داس کی تائید میں وسیم سے کہہ ہی ڈالا۔

''وجہ اس کی تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ بھانڈیل سائیں جیسا ہمارا خیر خواہ اور دوست کیسے اچانک بدل گیا تھا۔ ہماری جان کے درپے ہو گیا تھا۔ یہ تو شکر ہوا کہ.....''

''اس کی مخبری کس نے کی تھی میڈم! کیا بھول گئیں کہ وہ میں ہی تھا ورنہ تم آج زندہ نہ ہوتیں۔'' وسیم نے اچانک اس کی بات کاٹ کر کہا تو گربھ داس جیسے ہتھے سے ہی اکھڑ گیا۔

دیکھا جاتا تو وسیم کی یہ بڑی جرأت تھی کہ اس نے میڈم پچھی کے منہ پر یہ جتا دیا۔ صاف لگتا تھا کہ میں ان کے درمیان میں پھوٹ ڈالنے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ اگرچہ یہ میرا اضافی ''پلس پوائنٹ'' تھا مگر حقیقت اب بھی اپنی جگہ جوں کی توں تھی۔ یعنی مجھے پورا شک تھا کہ بوبسورگا کا وہ منحوس مجسمہ ادھر اُدھر نہیں ہوا ہے۔ یہ وسیم کی چال تھی جو مجھے اس کے چہرے پر ابھرنے والے اچانک تاثرات اور حالات کے تجزیہ کرنے سے معلوم ہوا تھا۔

اب یہ ہوا کہ وسیم کے میڈم پچھی کو اس طرح بولنے سے گربھ داس اس کی یہ ''گستاخی'' برداشت نہ کر سکا اور کسی ارنے بھینسے کی طرح اس کی جانب لپکا اور اس کی گردن دبوچ لی۔ وسیم بھی اگرچہ گھبت کی طرح کرائے کا کلب کارکن رہ چکا تھا لیکن گربھ داس کی یہ حرکت اس کے لیے شاید غیر متوقع تھی اور وہ اس کے شکنجے میں آ گیا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے دیکھا، وسیم نے ایک داؤ کھیلا اور اپنی دائیں ٹانگ کا گھٹنا اس کے پیٹ پر جڑ دیا۔ گربھ داس کے حلق سے بیل جیسی وحشیانہ ڈکراہٹ بلند ہوئی اور گرفت ڈھیلی پڑتے ہی وسیم نے اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔

نال کا رخ گربھ داس کی طرف ہی تھا اور اس کا لال بھبوکا چہرہ مجھے اس کے اندر کے خطرناک عزائم کا صاف پتا دینے لگا۔ پھر اس سے پہلے کہ گربھ داس بچنے کی کوشش کرتا، وسیم نے ٹریگر دبا دیا۔

کمرے کی محدود فضا میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ گربھ داس کے دائیں پہلو میں گولی لگی۔ وہ ایک طرف کو ذرا جھکا۔ ٹھیک اسی وقت میڈم پچھی نے جست بھری۔ وسیم نے اپنے پستول کا رخ اس کی جانب موڑنے کی کوشش کی تھی تب تک میڈم پچھی اس تک پہنچ چکی تھی۔

دونوں نیچے گرے۔ میں نے دیکھا، پستول وسیم کے ہاتھ سے چھوٹ کر پرے جا پڑا تھا۔ ادھر گربھ داس بھی سخت جان ثابت ہوا۔ زخمی ہونے کے باوجود اس نے بھی خوفناک غراہٹ خارج کرتے ہوئے ان کی جانب رخ کیا۔

تب ہی میں نے ایک حیران کن اور چونکا دینے والا منظر دیکھا۔ میڈم پچھی ادھیڑ عمر اور استخوانی جسم کے باوصف بڑی سخت ''کاٹھ'' کی بنی ہوئی لگتی تھی۔ اس نے وسیم پر جھپٹا مارتے ہی جانے کیسی ''شعبدہ بازی'' چلی کہ اس سے لپٹتے ہی وسیم کسی زبردست شاک سے دوچار ہو گیا۔ یوں جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔ وہ ماہی بے آب کی طرح فرش پر پڑا پچھی کی گرفت میں تڑپنے لگا لیکن وہ بھی ایک تربیت یافتہ لڑاکا تھا۔ ایسے میں اس نے بھی جوابی داؤ کھیلا اور اپنی دونوں ٹانگیں سکیڑ کر میڈم پچھی کے سینے پر رکھتے ہوئے اسے خود سے پرے اچھال دیا۔

نتیجے میں میڈم پچھی لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھتے گربھ داس کے اوپر جا گری۔ دونوں فرش بوس ہوئے اور تب تک وسیم نے یہی مناسب سمجھا کہ ایک ذرا بھی وقت ضائع کیے بغیر یہاں سے بھاگ نکلے ورنہ یہ دونوں (میڈم پچھی اور گربھ داس) اسے کھا ہی نہ جائیں۔

وہ دیوانہ وار اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑا۔ میں فرش پر ہنوز زن بستہ حالت میں یہ سب خونی کھیل دیکھ رہا تھا۔ آج تو جیسے ایک کے بعد ایک چونکا دینے والے مناظر میرے منتظر تھے، کیونکہ دروازے کے قریب پہنچ کر وسیم نے جیسے ہی اپنا ایک ہاتھ بڑھایا، دروازہ دھڑ سے کھلا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے سنبھلا ہی تھا کہ دو افراد اس کی راہ میں آن کھڑے ہوئے۔

یہ دونوں انہی کے ''لنگی پوش'' ساتھی تھے جو شاید گولی وغیرہ چلنے کی آواز پر یہاں پہنچے تھے مگر ابھی انہیں حالات کا اتنا ادراک نہ ہو پایا تھا کہ یہاں تینوں کے

Scanned with CamScanner

digest library.com

درمیان پھوٹ پڑی تھی۔ جب تک وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے، وسیم بھی کائیاں نکلا۔ اس نے اتنی سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر دونوں کو دھکیلا اور ان کے درمیان سے راستہ بناتا باہر دوڑتا چلا گیا۔

"پکڑو اسے..... جانے نہ پائے۔" میڈم چیخی چلائی۔ دونوں بدک کر الٹے پاؤں پلٹ گئے۔ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وسیم اب ان کے ہاتھ کہاں آنے والا تھا۔ میڈم بھی اس کے پیچھے لپک گئی تھی۔

اب کمرے میں، میں اور زخمی گربھ داس ہی رہ گئے تھے۔ میں بے بس تھا۔ پہلو والے زخم کے سبب گربھ داس وہاں اپنا ایک ہاتھ رکھے ہوئے لیٹا رہا۔ خون اس کے پہلو سے بہہ بہہ کر فرش کو لمحہ بہ لمحہ رنگین کرتا جا رہا تھا۔

بڑے ہی عجیب اور سنسنی خیز جذباتی ڈرامے کی اچانک ہی شروعات ہوئی اور میری حالت ایسی تھی کہ میں بت بنا یہ سب دیکھے جاتا تھا۔

البتہ وسیم کی اس حرکت نے میری بات کی بہرحال تصدیق کر دی تھی اور خود میں بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اگر ایسا وسیم نے کیا بھی تھا تو کیوں اور کس کے لیے؟

"سجاد بیگ....." یہی ایک نام بے اختیار میرے ذہن رسا میں ابھرا۔ پل کے پل میں کچھ عرصہ پہلے والے حالات پر غور کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بھانڈیل سائیں کالی لہر والوں کا ایک خاص کارندہ تھا۔ ساتھ ہی اس کی باس اقبال سے بھی دوستی تھی۔ اس نے کالی لہر والوں کے وسیع تر مفادات (اپنے لیے بھی) کے لیے اسے بھی ساتھ ملانے کی کوشش کی تھی لیکن چونکہ باس اقبال خود کراچی کا ایک بڑا انڈر ورلڈ ڈان تھا، اسے بھلا کسی اور تنظیم کا عہدیدار بننے کی کیا ضرورت تھی جس کا مطلب کسی کی ماتحتی میں ہی آنا تھا۔ پھر جب اس کے مرنے کے بعد اس کا نائب اور سدرہ کے نام نہاد ماموں سجاد بیگ نے تنظیم کی باگ سنبھالی تو اس نے بھانڈیل سائیں کی آفر کو یقیناً قبول کیا ہوگا کیونکہ اس کی تنظیم میں گرفت وہ نہیں تھی جو اس کے اصل روح رواں باس اقبال کی تھی، جو اس کا باپی بھی کہلاتا تھا۔ پھر وسیم نے اس کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنا چاہا تھا اور سجاد بیگ نے پرانے باس یعنی "باپی" کی بیٹی کا کارڈ گربھ کی صورت میں کھیلنا چاہا جس پر وسیم بھی رضامند تھا مگر گربھ پیچھے ہٹ گئی تھی۔

بھانڈیل سائیں کو بھی ہاتھ دکھانے کے بعد وسیم ممکن تھا کہ سجاد بیگ سے کوئی ساز باز کر رہا ہو یا پھر یہ کوئی اور ہی پراسرار چکر تھا؟ میرا ذہن بار بار الجھ رہا تھا کیونکہ وسیم نے بہرحال میڈم پھی کی جان بھی وقت پر بچائی تھی۔ ممکن ہے وہ تب بھی کوئی دوہرا کھیل کھیل رہا ہو اور ابھی اپنا اعتبار کالی لہر والوں پر قائم رکھنا چاہتا ہو مگر در پردہ کسی اور سے ساز باز میں مصروف ہو۔ بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس تو اب اس کے لیے ناممکنات تھے، پھر کون ہو سکتے تھے وہ لوگ جن کے لیے وسیم کالی لہر والوں کو بھی دھوکے میں رکھے ہوئے تھا؟

میں زیادہ دیر غور نہ کر سکا۔ دفعتاً ہی مجھے باہر کسی کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وسیم راہِ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اتنا تو ہونا تھا کہ اس کی بھی بھانڈیل سائیں کی طرح "قلفی" کھل چکی تھی۔ اس کا سبب میں ہی سہی لیکن یہ پھر بھی برا ہی ہوا۔ وسیم کو فرار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ ان لوگوں کو چکما دے گیا۔ میں اگر جکڑ بندوں سے آزاد ہوتا تو یقیناً وسیم کو یوں فرار ہونے نہ دیتا۔

بہرکیف دیکھنا اب یہ تھا کہ اس کے تعاقب میں کون جا سکتا تھا؟ میڈم پھی یا اس کا کوئی ساتھی؟ جبکہ اس کا خاص چیلا گربھ داس تو جیسے فرش پر ابھی تک پڑا اپنی موت کی گھڑیاں گن رہا تھا۔

لیکن چند لمحوں کے بعد وہ ہولے سے کراہا اور پھر دوسرے پہلو کے بل پر اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی وقت باہر مجھے دوسری گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔

میرا سوچتا ذہن ٹھٹکا۔ شاید میڈم پھی کے وہی دو گماشتے جو گولی کی آواز سن کر یہاں پہنچے تھے، وسیم کے تعاقب میں گئے تھے اور جیپ وہیں سے حاصل کی ہوگی ان لوگوں نے جس پر میڈم پھی اور گربھ داس مجھے اور گمبھت کو یہاں تک یعنی کھنڈرات والے گھروں تک لے کر پہنچے تھے۔

میرا اندازہ صحیح نکلا کیونکہ اس کے ذرا ہی دیر بعد میں نے میڈم پھی کو تھکے تھکے قدموں سے بڑبڑاتے ہوئے اندر داخل ہوتے دیکھا مگر وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور لنگی پوش بھی تھا۔ اسے میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ شکیلہ ادھر ہی تھا۔

شاید وہ ان حالات کی وجہ سے بعد میں وہاں سے یہاں کاٹیج والے مکان میں آیا تھا۔ میڈم پھی نے ان دونوں کو سب سے پہلے گربھ داس کی مرہم پٹی کرنے اور اسے اٹھا کر اندر دوسرے کمرے میں لے جانے کا کہا۔

جب وہ دونوں گربھ داس کو ڈنڈا ڈولی کر کے اندر لے گئے تو میڈم پھی نے جلتی سلگتی آنکھوں سے میری جانب

Scanned with CamScanner

گھورتے ہوئے پُرغیظ لہجے میں کہا۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے مورکھ! تم نے ہی مجھے اور میری حیثیت کو آج اس حال تک پہنچایا ہے کہ میرے دوست بھی میرے دشمن بن گئے ہیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ میں بھی میڈم چھی ہوں۔ مقدس بومبورگا کی ایک ادنیٰ داسی..... تم دیکھنا مورکھ! ایک روز وہ پھر مجھے اتنی شکتی دے گا کہ میں تم سب کو بھسم کر ڈالوں گی۔ کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ بس ایک بار مجھے اس کا پتا چل جائے۔ صرف ایک بار۔"

وہ اپنی ہی آگ میں جلتی رہی، ابلتی اور بلکتی رہی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ ہر کوئی چڑھتے سورج کا پجاری ہوتا ہے۔ میڈم چھی اور کالی لہر والوں کی جب سے میں نے کھٹیا کھڑی کی تھی، وہ کہیں کے نہیں رہے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے گھر میں گھس کر میں نے انہیں مارا تھا۔ یہ تو شکر رہا کہ دشمن کے دشمن بھی میرے کام آئے تھے۔ میرا اشارہ ریڈ فاکس اور بلیک کیٹس کی طرف ہے۔ بے شک ایسا بے خبری اور حادثاتی طور پر ہی ہوا تھا۔

میڈم چھی کی یہ ساری بکواس اس کی بے بسی اور کم مائیگی کی دلیل تھی۔ وہ گھر کی رہی تھی نہ گھاٹ کی۔

میں نے کہا۔ "محترمہ! پہلے تم بومبورگا کے مجسمے کی بات کرو جس سے تم ابھی تک محروم ہو۔" میرے لہجے میں ہلکا طنز در آیا تھا۔ میڈم چھی دانت پیستے ہوئے مجھے گھور کر رہ گئی۔ وہ دھیرے دھیرے اپنی جھنجلاہٹ اور پے در پے ناکامیوں کے سبب آنے والی مصیبتوں سے اپنے مشتعل ہوتے اعصاب پر قابو پانے لگی۔

میں غور سے اس کی کیفیت کو دیکھتا رہا پھر اسی استحکام اور مکارانہ فروتنی سے بولا۔

"میڈم چھی! ابھی تو تمہاری سب سے بڑی غلطی رہی کہ تم نے اپنے اصل دشمن کو بھلا کر مجھ جیسے ایک غیر اہم آدمی سے بلاوجہ ہی پنگا لے ڈالا۔ حالانکہ ہمارے راستے ہی جدا تھے مگر تم نے مجھے اپنے راستے پر ڈال دیا۔ اب بھی وقت ہے، اپنی آنکھیں کھول لو۔ تمہارے دشمنوں میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوا جا رہا ہے لیکن تم لاعلم ہو۔ یہ تو شاید ہم دونوں کی خوش قسمتی رہی ہے کہ تمہارے اور میرے ایک ہی دشمن ہیں مگر میں یہ بھی کہوں گا کہ اب بھی تم اپنے چھپے ہوئے خطرناک دشمنوں سے ناواقف ہو جن کا سامنا مجھ سے ہو چکا ہے اور وہ بھی تمہارے اس مقدس بومبورگا کے مجسمے کے حصول کے لیے کوشاں ہیں، جسے وہ اپنی مہم جوزبان میں "بلیک اسٹون" کا نام دیتے ہیں۔"

میں نے بڑی ہوشیاری سے پتا پھینکا تھا۔ اگر حالات ساتھ نہ دے رہے ہوں تو اپنا انسان جلد باتوں میں پھنسنے لگتا ہے اور میڈم چھی انہی حالات کا شکار تھی۔ اسی میں انسان جلد بے وقوف بن کر چال میں آجاتا ہے۔

"مجھے سب معلوم ہے۔" وہ پھنکاری۔ "اس کا سبب بھی تم ہی ہو۔"

"وہ کیسے؟" میں نے مصنوعی حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہیں اگر معلوم ہوتا ان کے بارے میں تو تم رانگا مائی کے اس دور دراز جنگلی قبیلے میں اپنے اصل ٹھکانے کو ان کے ہاتھوں برباد اور بومبورگا کے مجسمے کو ان سے بچا نہ لیتیں؟"

وہ لاجواب ہو کر مجھے گھورنے لگی۔ پھر یکدم ایک قہقہہ لگایا..... شیطانی قہقہہ، جس میں مجھے بہت سے رمز چھپے محسوس ہوئے۔ اسی لہجے میں گویا میرے لیے ایک نیا انکشاف کرتے ہوئے بولی۔

"اصل ٹھکانا..... ہونہہ..... ہمارے اصل ٹھکانے سے کوئی بھی واقف نہیں ہو سکا آج تک۔ وہ تو ہمارا عارضی ٹھکانا تھا۔"

"اچھا!" میں متاثر نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "تو تمہارا اصل ٹھکانا کہاں ہے؟"

"انڈیا میں، ترچناپلی کی ویران گھاٹیاں ہماری پناہ گاہیں رہی ہیں۔" وہ جوشِ زعم و غرور میں بتانے لگی۔ "وہ ایک جادو نگری ہے..... پوری جادو نگری۔ میں اس کی تن تنہا حکمران ہوں۔ یہ جو تم میرے ساتھ گربھ داس اور لگی پوش دیکھ رہے ہو نا..... یہ میرے جاں نثار ساتھیوں کا ایک گروپ ہے جسے گربھ داس اپنی سرداری میں رکھے ہوئے ہے۔ انہی لوگوں کو بنگلا بلا کر میں نے بان کی مدد سے ہی مقدس بومبورگا کے مجسمے کو خلیج بنگال کی گہری تہوں سے برآمد کیا تھا۔ سمجھے تم..... یہی میری طاقت ہے۔ میری ایک آواز پر یہ سب لوگ، میں جدھر بھی ہوں، جس ملک یا خطے میں ہوں، میرے ایک اشارے پر چلے آتے ہیں۔ اس وقت بھی میرے یہ جاں نثار ساتھی مختلف جگہوں پر موجود میرے ایک اشارے کے منتظر بیٹھے ہیں اور تم..... سہراب علی خان..... تم کہتے ہو کہ میری طاقت گھٹ چکی۔ بالکل نہیں۔"

میں اندر سے چونک گیا اور نہ چاہتے ہوئے میں بھی اسی لہجے میں استفسار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بولا۔ "اوہ..... تو پھر تم بومبورگا کے مجسمے کو بحفاظت یہاں پاکستان لانے کے بجائے انڈیا یعنی ترچناپلی میں اپنے اصلی ٹھکانے کی طرف

Scanned with CamScanner

کیوں نہ لے گئیں؟"

"اس کی سیدھی سی وجہ ہے۔" وہ بولی۔ "بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس، یعنی جو ابتدا ہی سے ہمارے یعنی مقدس بوبورگا کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ تمہیں تو بعد میں علم ہوا، مجھے تو پہلے ہی سے علم ہو چکا تھا۔ اسی لیے میں نے رانگا مائی کا رخ کیا تھا مگر بدبخت وہ لوگ وہاں بھی مقدس بوبورگا کا سراغ ڈھونڈتے ہوئے آن پہنچے تھے۔ خیر، اب میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میرا اور اس کا کھوج لگاتے ہوئے یہاں تک بھی آن پہنچیں۔ بس اسی لیے میں یہاں آ گئی۔ بھانڈیل سائیں کے علاقے میں ایک نئی ابتدا کرنا چاہتی تھی، ساتھ ہی تم سے انتقام بھی لینا تھا۔"

"خیر، مجھے اس سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ میرے بارے میں جلد کوئی فیصلہ کرو۔" میں نے بظاہر غیر دلچسپی اور غیر متاثر کن لہجے میں کہا لیکن سچی بات یہی تھی کہ میں اندر سے یہ سب سن کر کھٹک گیا تھا۔

بات وہی تھی کہ میڈم مچھی کے برے دن شروع ہو چکے تھے۔ اب سردست تو اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس یہاں تک بھی آن پہنچے تھے لیکن میں نے انہیں چھٹی کا دودھ یاد دلاتے ہوئے اعلیٰ اداروں کے حوالے کر دیا تھا۔

یوں ان کے ساتھ ساتھ میرا بھی ان سے ٹاکرا ضروری ٹھہرا تھا کیونکہ وہ بوبورگا کے مجسمے کو ایک خاص تجربے سے گزار کر خطرناک اور بڑی تباہی پھیلانے والے ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری میں کام میں لانا چاہتے تھے۔

بہرحال یہی میں نہیں چاہتا تھا کیونکہ اسی کے لیے بنگلا دیش کی بہادر لیڈی رپورٹر جمیلہ جوبرانی اور بعد میں مائرہ مانچی نے اپنی جانیں قربان کی تھیں۔ لیکن یہ سب باتیں میں میڈم مچھی کی طرح جوش خروش میں نہیں بتانا چاہتا تھا بلکہ اس سے میں نے اپنی غیر دلچسپی ہی دکھائی تھی اور نجمت کے بارے میں بھی فوراً اگلا سوال کر ڈالا۔

"اور میری ساتھی نجمت کہاں ہے؟ مجھے اس کی فکر ہو رہی ہے۔ اس بیچاری کا تو ان سارے معاملات سے سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔"

میری بات سن کر مچھی نے مجھے سرخ آنکھوں سے گھورا اور چند قدم چلتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ پھر میرے اوپر جھک کر بولی۔

"تم میری طرف سے کسی خوش فہمی میں مت رہنا مورکھ کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گی یا معاف کر دوں گی۔"

انتہائی نفرت اور غصیلے لہجے میں یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا دایاں استخوانی ہاتھ جس کی پتلی پتلی کالی انگلیوں کے ناخن بھی لمبے اور کسی ڈائن کی طرح مڑے ہوئے نظر آئے، میری جانب بڑھایا۔ جانے وہ رذیل عورت نما ڈائن کیا کرنا چاہتی تھی لیکن جیسے ہی اس کا مکروہ اور ہڈیوں کے ڈھانچے جیسا ہاتھ میرے جسم کو چھوا، مجھے اچانک ہی ایک زبردست شاک لگا۔ اس قدر کہ میں رسن بستہ ہونے کے باوجود بری طرح تڑپ کر رہ گیا۔

میرا پورا دماغ جھنجھنا کر رہ گیا۔ پہلے تو میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ ہوا کیا تھا۔ ہاں شاید ہائی وولٹیج کا کرنٹ (الیکٹرک شاک) لگا تھا مگر کیسے؟ کیا یہ اس منحوس عورت کی کوئی نئی شعبدہ گری تھی؟ اس کا مشاہدہ میں نے ابھی چند منٹ پہلے ہی تو کیا تھا جب اس نے یہی حال وسیم کا بھی کیا تھا۔

میں جکڑ بندوں میں بھی ہل کر رہ گیا اور تڑپتا ہوا غیر ارادی طور پر پرے سرکا۔ وہ شیطانی انداز میں قہقہے لگانے لگی۔ اس کی شعبدہ بازی سے مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ اس نے اپنے جسم کے اندر کوئی بیٹری لگا رکھی ہوگی۔ خود کو "ارتھ" کیا ہوگا تاکہ اسے شاک نہ لگے۔ میں ان کی عجیب شعبدہ بازیاں پہلے بھی دیکھ چکا تھا جس کا تعلق کبھی جادو ٹونے سے نہیں رہا تھا۔ اگرچہ عام اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کو یہ جادو ہی لگتا تھا۔

"مورکھ! تو ہی تو میرا دشمن نمبر ایک ہے۔ تجھے کیسے چھوڑ سکتی ہوں میں۔ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔" وہ اسی لہجے میں بھونکنے لگی۔ "نجمت کیا، میں تو یہاں تیرے ایک ایک ساتھی کو لا کر تیرے سامنے اذیتیں دے دے کر نرک تک پہنچاؤں گی۔ اس کے بعد تیری باری آئے گی۔"

میں دنگ رہ گیا۔ مجھے واقعی خوش فہمی ہو چلی تھی، جب انہوں نے وسیم کے مقابلے میں میری باتوں کو ترجیح دی تھی مگر وہ تو شاید میرے خون کی پیاسی تھی۔

میں نے اپنی روش جاری رکھی اور اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے پھر اس سے بولا۔

"ٹھیک ہے مچھی! اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں، جبکہ میری کوشش بلکہ خواہش تو یہی تھی کہ ان حالات (میں نے دانستہ "ان حالات" کے الفاظ کو واضح صوتی اثرات میں ادا کیا تھا) میں تمہاری کچھ مدد کر کے اس دشمنی کو ختم کرا دوں اور اسی لیے میں نے وسیم کی بدنیتی کے سلسلے میں بروقت تمہیں آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ ایک بات تو بہرحال وسیم نے غلط نہیں کہی تھی کہ میری اور اس

Scanned with CamScanner

digest library.com

کی دشمنی ابتدا ہی سے چلی آرہی ہے۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کر ایک نیا پانسا پھینکا۔

"اسی سبب میں وسیم ہی نہیں بلکہ بھانڈیل سائیں کے بارے میں بھی اور بہت کچھ جانتا ہوں۔ مجھے تمہارے پاکستان آنے اور یوبورگا کے مجسمے کی کامیاب تلاش کے بارے میں پہلے پتا انہی کی زبانی چلا تھا۔ یوں اگر تمہارا پہلے ہی مجھ سے سامنا ہو جاتا تو میں یقیناً تمہیں ان کی بدنیتی سے آگاہ کر دیتا..... خیر۔"

میں چپ ہوا اور دزدیدہ نظروں سے اپنی گفتگو کی اثر پذیری اس کے سیاہ رو شیطانی اور استخوانی چہرے سے بھانپنے کی بھی کوشش کرتا رہا۔ یوں پہلی بار اس کے غیظ و غضب میں مجھے کچھ دراڑیں پڑتی نظر آئیں۔

"تم ان دونوں کے بارے میں اور کیا کیا جانتے ہو؟" بالآخر اس نے سوال کیا۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ آتے آتے رہ گئی۔ انتہائی معصومیت سے بولا۔

"کیا اس طرح میری تم سے دشمنی ختم ہو جائے گی؟"

میری بات پر دوبارہ اس کے مکروہ چہرے پر غیظ کے آثار ابھرنے تو میں نے جلدی سے کہا۔ "م..... میرا مطلب ہے، کم ہی ہو جائے کچھ تو..... یہی بہت ہوگا میرے لیے۔"

"بکواس نہیں۔ کام کی بات کرو۔ جو پوچھا ہے، جواب دو۔" اس نے درشتی سے کہا۔

"اس سے پہلے جو تم یہاں اس شہر میں یا پھر اس ملک میں جادو ٹونے والا کھیل کھیلتا اور اسے پھیلانا چاہتی تھیں، وہی کھیل بھانڈیل سائیں اور وسیم کراچی کے ایک بڑے انڈر ورلڈ ڈان سجاد بیگ کے ساتھ کھیلنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" میں نے فر فر بولنا شروع کر دیا۔

"یہ پلاننگ اس وقت ان لوگوں نے بنائی تھی جب انہیں تمہاری یہاں یوبورگا کے مجسمے سمیت اچانک آمد کا علم ہوا تھا۔" یہ بتاتے ہوئے میں نے اس شام اور رات والی ان کی "میٹنگ" کے بارے میں بھی بتا دیا کیونکہ یہی وہی دن تھا جب پچھی بذات خود بھانڈیل سائیں کی حویلی میں "مہمان" کی حیثیت سے موجود تھی۔ یوں میری باتوں کی سچائی کی تصدیق بھی ہوئی اور اس روز نجمت بھی میرے ساتھ تھی۔

اب دنیا کی کوئی طاقت پچھی جیسی ڈائن کو مجھ پر بھروسا کرنے سے نہیں روک سکتی تھی۔

میں رکا تو وہ جلدی سے بولی۔

"آگے بتاؤ، رک کیوں گئے؟"

"ہاں، بھانڈیل سائیں کو وسیم ہی کے ذریعے تمہارے دیگر ساتھیوں کی بھی یہاں موجودگی کا پتا چلا تھا کہ تم اس شہر میں بہرحال تنہا نہیں ہو۔ تمہارے اور بھی جنگجو ساتھی یہاں موجود ہیں۔ اس پر وسیم، بھانڈیل سائیں اور سجاد بیگ (یہاں میں نے رنگ آمیزی شروع کرتے ہوئے جھوٹ کو سچ کے لبادے میں لپیٹنا چاہا تھا) نے یہ پلاننگ کی کہ تمہارے پیچھے ریڈ فاکس اور بلیک کیٹس کو لگا دیا جائے جو خود ہی تمہارے ساتھیوں سے نمٹ لیں گے، کیونکہ تمہیں تو بہرحال اس رات ہی بھانڈیل سائیں نے سوتے میں قتل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔"

"لیکن وسیم نے ہی میری جان بچائی تھی۔" پچھی نے درمیان میں مجھے ٹوکا تو میں استہزائیہ انداز میں ہنس کر بولا۔

"کمال ہے میڈم پچھی! تم خود ایک جہاندیدہ عورت ہو۔ اتنی سی چال بھی نہیں سمجھ سکیں کہ وسیم نے اس طرح تمہاری جان بچا کر اپنا اعتبار تم پر بٹھانے کی کوشش کی تھی کیونکہ وسیم کے بارے میں تھوڑی دیر پہلے ہی میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ بلا کا موقع پرست اور طالع آزما شخص ہے۔ اس نے بھانڈیل کو بھی ہاتھ دکھا دیا تھا کیونکہ اب اس کا اصل گرو گھنتال سجاد بیگ ہے اور اسی سے اسے مطلب ہے کیونکہ نجمت....." میں نے آگے باس اقبال اور اس کی بیٹی نجمت کے بارے میں بھی تھوڑی تفصیل بتائی۔

پچھی کے چہرے پر سوچ کا جال سا بن گیا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے اسی کے انداز میں پھر کہا۔

"پچھی جی پلیز، مجھے نجمت کے بارے میں بتا دو۔ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ اسے کم از کم ادھر ہی لے آؤ۔ اگر ہمیں سزا ہی دینی ہے تو ایک ساتھ ہی دے ڈالو۔"

پچھی نے جیسے میری بات سنی ان سنی کر دی لیکن اسی وقت میں نے شمبو کو اس کمرے سے نکلتے دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے زخمی گربھ داس کو وہ اور اس کے دو ساتھی ڈنڈا ڈولی کر کے مرہم پٹی کے لیے اندر لے گئے تھے۔

شمبو خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ پچھی سے بولا۔ "میڈم جی! گربھ داس کی حالت نہیں سنبھل رہی ہے۔ اس موئے وسیم نے بہت گہرا گھاؤ لگایا ہے اپنے سردار گربھ جی کو۔ پہلو میں گولی دھنسی ہوئی ہے اور نکل نہیں رہی۔ جب تک گولی جلد نہیں نکلے گی اس کی حالت ٹھیک نہیں ہوگی۔ زہر پھیلنے کا خطرہ الگ ہے پورے جسم میں۔"

"تو پھر کیا کریں؟" میڈم پچھی جھلا کر بولی۔

"اسے ترنت کسی اسپتال لے جانا ہوگا۔" شمبو بولا۔

"تو لے جاؤ پھر، میں خود پریشان ہوں۔ مقدس

Scanned with CamScanner

بوبسورگا کو میں نے اپنے ہاتھوں سے دوبارہ کھودیا ہے۔ مجھے اس کا غم مارے ڈال رہا ہے۔" مچھی کی حالت اپنا ہی منہ اور بال نوچنے جیسی ہورہی تھی۔

شمبو نے میری جانب خارکھائی نظروں سے گھورا اور مچھی سے دوبارہ مخاطب ہوکر بولا۔

"میڈم جی! اس مورکھ کو کہیں ٹھکانے لگادو۔ اسی کے کارن تو ہماری مصیبتیں بڑھتی جارہی ہیں۔"

"دفع ہوجاؤ، جو کہا ہے وہ کرو جاکے۔" مچھی نے شمبو کو بری طرح جھڑک دیا تو وہ کان دبائے فوراً ہی وہاں سے کھسک گیا۔

"میں تمہاری پریشانیوں کو کم کرسکتا ہوں میڈم جی! مجھ پر بھروسا کرو۔" بدستور لوہا گرم دیکھتے ہوئے میں نے اپنی سی کوشش جاری رکھی۔

مچھی نے ایک جھٹکے سے گردن گھما کر میری جانب پرتپش نگاہوں سے دیکھا۔ میں ڈرا، کہیں یہ بدبخت دوبارہ غصے میں آکر مجھے شاک نہ دے ڈالے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ چند لمحے تو میری جانب گھورتی اور قدرے سوچتی نگاہوں سے تکتی رہی پھر اپنا سر جھٹک کر خود کلامی بڑبڑائی۔

"میں نے یہاں آکر بھیانک غلطی کی۔ میں نے اگر بنگلا سے انڈیا کا رخ کیا تھا تو مجھے ترچناپلی میں ہی چھپے رہنا چاہیے تھا۔ بہت جلد بازی کی میں نے..... کیا کرتی، مجھے ان کمینوں، را اور موساد (بلیک کیٹس اور ریڈ فاکس) کا ڈر ستایا ہوا تھا۔ کہیں وہ مجھ سے مقدس بوبسورگا کا مجسمہ نہ چھین لیں۔ وہاں بھی وہ میرے پیچھے آگئے تھے۔ بہت خفیہ طریقے سے میں راجستھان کے صحرائی علاقے سے ہوتی ہوئی تھر اور پھر چولستان کے راستے یہاں تک پہنچی مگر افسوس..... یہاں مجھے میرے اپنوں نے لوٹ لیا۔"

"اس میں تمہاری اپنی ہی غلطی ہے، میڈم جی!" میں نے اپنی ترپ چال کی ضربات مسلسل جاری رکھیں۔ میں جانتا تھا کہ پریشانی اور مصیبت میں پھنسا ہوا آدمی جلد شکار ہوکر جال میں آن پھنستا ہے۔ آگے بولا۔

"تم نے دشمن کو اپنا دوست سمجھ لیا اور دوست کو اپنا دشمن۔"

"تم کیا کرسکتے ہو میرے لیے؟" بالآخر وہ میرے دام میں آ ہی گئی۔

"وسیم اور بھانڈیل سائیں کی گردنیں صرف میں ہی ناپ سکتا ہوں۔" میں نے فوراً کہا۔ "اگر تمہیں نہیں معلوم تو تازہ اخبارات کا مطالعہ کرلو۔ را اور موساد کے یہاں تمہارے پیچھے آئے ہوئے ٹاپ ایجنٹوں کو میں نے ہی پکڑوایا تھا۔"

"یہ بات میرے علم میں ہے۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور ساتھ ہی اس نے اپنے سر کو بھی اثباتی جنبش دی تھی۔

"وسیم نے بوبسورگا کے مجسمے کے لیے سجاد بیگ سے جو گٹھ جوڑ کیا ہے، وہ بہت خطرناک ہے۔ تم سجاد بیگ کو نہیں جانتیں، وہ کس قدر طاقتور تنظیم کا سربراہ ہے۔ یہ سب مل کو تمہاری کٹھیا کھڑی کرسکتے ہیں اور تمہیں خالی ہاتھ یہاں سے انڈیا فرار ہونے پر مجبور کرسکتے ہیں اور ہلاک بھی کرسکتے ہیں۔"

میری بات سن کر مچھی نے ایک جھٹکے سے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں بھی اپنی نظریں چرانے کے بجائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے تکتا رہا۔

ماہرین نفسیات کے مطابق ایسے موقع پر نظریں چرانا اپنی بات کی سچائی کو مدھم کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مچھی کا رویہ ایک دم نرم پڑنے لگا۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ "تم نے پھر مقدس بوبسورگا کو خلیج بنگالا میں غرق کیوں کیا تھا؟"

"محض اتفاقاً۔" میں نے فوراً جواب دیا۔ "تم نے میری محبوبہ فوزیہ کو اغوا کرنے کا جرم کیا تھا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ وہ بات ختم کرو۔" وہ ہاتھ ہلا کر بولی۔

"میں بھی تو یہی چاہتا ہوں میڈم جی!" میں نے بھی اسی طرح کہا۔ "ہمارے تمہارے دشمن ایک ہی ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے جبکہ میں تمہارے دشمنوں کے رازوں، منصوبوں اور ٹھکانوں سے اچھی طرح واقف بھی ہوں۔ کیا تم نے ابھی اس کا ثبوت نہیں دیکھا؟ وسیم کا گربھ داس کو زخمی کرکے یہاں سے فرار ہونا، میری بات کی سچائی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے؟"

"ہم....." اس نے ہنکاری لی پھر شاکی لہجے میں بولی۔ "تم بھی تو مجھے دھوکا دے سکتے ہو؟"

"کیوں؟ وجہ پر ذرا غور کرلو میڈم جی!" میں نے کہا۔ "بھلا اب مجھے تمہیں نقصان پہنچا کر یا تمہاری دشمنی سے کیا فائدہ ملنے والا ہے؟ فوزیہ اب میری بیوی ہے، میرے گھر میں سکون سے ہے، بس.....!"

"تمہاری باتیں جانے کیوں دماغ کو نہیں لگتیں مگر..... دل مانتا ہے۔" وہ الجھ کر بولی۔

"دماغ میں فتور کا کیڑا ہوتا ہے اور دل میں سچ کا دیپ۔"

میڈم مچھی میری طرف غور طلب نظروں سے تکتی

Scanned with CamScanner

رہی۔ یوں جیسے میرے اندر تک جھانک لینا چاہتی ہو۔

"میں آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اس کمرے کی جانب بڑھ گئی جہاں گربھ داس کو اس کے دو چیلے لے گئے تھے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میری ترپ چال کامیاب جارہی تھی۔

لچھمی کے دل پر میں اپنی چکنی چپڑی باتوں کا اثر جمانے میں شاید کامیاب ہی رہا تھا۔ اب اس میں خوش فہمی کا کوئی گمان باقی نہ رہا تھا کیونکہ میری کچھ باتوں کی تصدیق اس کی آنکھوں کے سامنے اور بعد کے پیش آمدہ حالات سے بھی ہوتی رہی تھی۔

اگر ایسا تھا تو یہ کالی لہر والوں کے خلاف میری بڑی کامیابی تھی۔ میڈم لچھمی جیسی چیلی کو بڑی مکاری سے شیشے میں اتارنا آسان کام نہ تھا۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ اگر وہ میری باتیں مان لیتی ہے تو مجھے بھی جلد بازی کے بجائے بظاہر اس کی "حمایت" میں اس کا "خیر خواہ" اور "دوست" بن کے رہنا تھا، جب تک کہ میرا مقصد پوری طرح حل نہیں ہو جاتا۔

ماحول میں جیسے یکایک اسرار بھرا سناٹا طاری ہو گیا۔ کمرے کی ادھ کھلی کھڑکی سے باہر پو پھٹنے کے آثار محسوس ہونے لگے تھے۔ باہر سے آبی اور جنگلی چرند پرند کے بیدار ہونے کی مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ وقت اور موسم بدلنے کے ساتھ پانسا بھی پلٹنے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

میں اسی کمرے کی جانب تکنے لگا جدھر تھوڑی دیر پہلے لچھمی نے رخ کیا تھا اور جہاں گربھ داس شاید اب زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اگر وہ مرجاتا تو میری انتقام کی حسرت اور آگ دبی ہی رہ جاتی، جو اس نے بشارت عرف پپو کو بے دردی کے ساتھ اپنے چھرے سے ہلاک کر کے کی میرے اندر بھڑکا رکھی تھی۔

تھوڑی دیر گزری اور لچھمی برآمد ہوئی۔ اس کے عقب میں شمبو اور دوسرا ساتھی بھی نمودار ہوئے۔ اس دوسرے ساتھی کا ابھی مجھے نام نہیں معلوم ہو سکا تھا۔

انہوں نے اب گربھ داس کو ایک بیڈ نما سی چارپائی پر لاد رکھا تھا اور اسے قریبی زینے کی جانب لے جانے لگے۔ لچھمی سمیت انہوں نے میری جانب دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ وہ اسے اوپری منزل میں لے گئے۔

شاید اب لچھمی اپنے طور پر ہی اس کا علاج کرنے والی تھی۔

کچھ تنہائی کا موقع ملا تو میں نے اپنے جکڑ بندوں کو ہلا جلا کر دیکھا۔ میں پیہم کوشش کرتا تو شاید انہیں کھول بھی لیتا لیکن بدقسمتی سے ابھی تک مجھے ہوش میں آنے کے بعد ایسا کوئی تنہا موقع نہ مل سکا تھا جس سے فائدہ اٹھا کر میں اس پر توجہ دے پاتا۔

اب کچھ موقع ملا تو میں نے ان کی سختی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن یہ خیال بھی آیا کہ اب شاید ایسا کرنا میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر سکتا تھا کیونکہ اب لچھمی کو میں کسی حد تک "رام" کر چکا تھا۔

لیکن نگہت.....؟ وہ کہاں اور کس حال میں تھی؟ اگر وہ مقید تھی تو کیا اس لڑکی کے لیے زیادہ دیر ان کی قید میں رہنا مشکل ہوتا؟ یہی خیال مجھے بار بار آتا تھا۔

دفعتاً میری نگاہ غیر ارادتاً دروازے کی جانب پڑی۔ وہاں باہر مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے کوئی دروازے پر زور آزمائی کر رہا ہو۔ یہ دیکھ کر یکلخت میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

پھر میں نے دیکھا کہ دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا تھا۔ باہر شاید کوئی اپنی کوشش کر رہا تھا۔ پہلا خیال میرا نگہت کی طرف گیا تھا۔ وہ زیادہ دیر کسی کی قید میں رہنے والی لڑکی نہ تھی۔

کمرے میں روشنی تھی۔ باہر سے دروازہ کھولنے والے یا والی نے یقیناً روشنی کی جھلک دیکھنے کے بعد اندر جھانکا ہوگا۔ کوئی بعید نہیں کہ مجھ پر بھی نگاہ پڑی ہو۔ باقی کمرا اسے خالی ہی نظر آیا ہوگا۔

اگلے ہی لمحے دروازے کا ایک پٹ دھڑ سے کھلا اور پھر دوسرا۔ میری بے چین نظروں نے غیر متوقع طور پر دو مسلح افراد کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ خاصے لحیم شحیم تھے دونوں۔ ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد ان میں سے ایک کمر بند کے وسط میں گن سنبھالے چوکنا کھڑا ہو گیا، دوسرا میری جانب لپکا اور چند قدم میرے قریب آ کے بندوق سیدھی کر لی۔

اس کے ہاتھ میں ڈبل بیرل رائفل تھی۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ اس بے بسی اور مجبوری کی حالت میں مرنا کون پسند کرتا ہوگا؟ وہ شاید مجھے گولی سے اڑا ڈالنا چاہتا تھا۔ میرے لیے دونوں ہی اجنبی تھے۔

"کون ہو تم؟" اس نے ٹریگر دبانے کے بجائے درشت لہجے میں سوال کیا۔ خطرہ ٹلا نہیں تھا مگر مہلت ضرور ملی تھی۔

"میں..... ان کی قید میں ہوں..... ان کا دشمن۔" میرے سوچتے ذہن میں فوراً ہی یہ جواب آیا تھا۔

"دشمن.....؟ کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے اسی درشتی سے پوچھا۔ میرے دشمن کم نہ تھے۔ نام بتاتا تو پہچان لیے جانے کا خدشہ تھا جبکہ اس وقت خود میں بے بس پڑا ان کے

Scanned with CamScanner

digest library.com

رحم وکرم پر تھا۔

"تت..... تو تیر.....!" میں نے لہجے میں گھبراہٹ طاری کرتے ہوئے غلط نام بتایا۔

"تو تیر.....!" وہ ہولے سے بڑبڑایا۔

"تم کس کی قید میں ہو؟ یہاں کون ہے اور....." اگلا سوال پوچھا گیا۔

"میں..... یہاں بہت عجیب قسم کے لوگوں کی قید میں ہوں۔" میں نے بھی احتیاط کے پیش نگاہ ہی میڈم چھی وغیرہ کے نام نہیں لیے تھے۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ کس مقصد کے لیے اور کس دشمن کے تعاقب میں یہاں تک پہنچے تھے۔

"کیا مطلب، صاف بولو۔" وہ غرایا۔

"پتا نہیں جی، مجھے انہوں نے اپنے کسی دشمن کے شبے میں قید کر رکھا ہے۔ ان کا ایک ساتھی زخمی بھی ہے۔ اسے یہ لوگ اوپری منزل میں لے گئے ہیں۔ شاید اس کی مرہم پٹی کرنے۔ یہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے لڑائی ہوگئی تھی۔ میں تو اسی طرح پچھلے کئی گھنٹوں سے بندھا پڑا ہوں۔"

"کوئی عورت ہے؟ بڈھی سی، جادوگرنی لگتی ہے وہ۔ تم اسی کی قید میں ہو؟" اس نے پوچھا۔ میرا ذہن کھٹک گیا۔ تو گویا یہ چھی ہی کے کسی دشمن کے بھیجے ہوئے گرگے ہو سکتے تھے مگر کس کے؟ وسیم کے یا پھر بھانڈیل سائیں کے؟

اپنا آخری الذکر خیال مجھے زیادہ قوی لگا کیونکہ اس سے پہلے بھی شمشاد اور منیر وغیرہ ان کے تعاقب میں اس گھر تک بغیر ہڈ والی جیپ میں آن پہنچے تھے جہاں گربھ داس اور شمبو وغیرہ مقیم تھے اور جس کے دروازے پر بظاہر تالا پڑا تھا۔

لیکن تھا بھانڈیل سائیں کے حواریوں نے ان کی تاخیر پر خبر لینے کے لیے مزید فرستادے ان کے تعاقب میں روانہ کر دیے ہوں۔ تب پھر انہوں نے اپنے ساتھیوں کی یہاں بغیر ہڈ والی جیپ بھی دیکھ لی ہوگی۔ انہیں یقین ہوگا کہ ان کے دشمن ادھر ہی ہیں۔

یہ سب تیزی سے سوچنے کے بعد ہی میں نے اپنی شناخت کروانے سے گریز کیا تھا کیونکہ بھانڈیل سائیں کے سب حواریوں نے میری شکل دیکھ نہیں رکھی تھی۔ نام سے پہچان لیتے تو الگ بات تھی۔ دشمن تو میں بھی ان کا تھا۔ اندر سے خدشہ یہی لگا رہا۔ اسی لیے جلد سے جلد ان سے جان چھڑا لینا ضروری تھا۔ میں جیسے خود کو اب دو ہاتھیوں کے درمیان پسا ہوا محسوس کرنے لگا۔

مجھ پر ڈبل بیرل کی بندوق کی سیدھ نال تانے ملک الموت کی طرح کھڑا شخص بڑی خونی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ وہ اپنے جواب کا منتظر تھا۔

ناچار میں نے فوراً اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "ہاں..... ہاں، وہی ہے، وہی ہے..... بوڑھی سی، بدصورت، جادوگرنی کی طرح نظر آنے والی۔"

"کہاں ہے وہ مردار نی؟" اس نے پوچھا۔

"اوپر..... مگر..... وہاں اس کے بہت سے ساتھی موجود ہیں لیکن تم صرف دو ہو۔" میں نے دانستہ ایسا کہا تھا تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ تھے کتنے۔

"ہم دو ہی کافی ہیں۔" اس نے غرا کر کہا۔ مجھے اپنی فکر ہونے لگی، جلدی سے چال چلی۔

"سنو..... سنو.....!" وہ اپنے ساتھی کی جانب پلٹنے لگا تو میں نے یکدم کہا۔ وہ رکا۔

"کیا ہے؟"

"وہ..... چار جیپ سوار تمہارے ہی ساتھی ہوں گے، جو ان کی قید میں ہیں؟" حسب توقع وہ میری بات سن کر بری طرح چونکا۔

"ہاں — ہاں، کہاں ہیں وہ؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"انہیں بھی میری بیوی کے ساتھ قید کر دیا ہے ان رذیلوں نے۔" میں نے دانستہ گفت کے ساتھ میاں بیوی کا رشتہ منسلک کیا تاکہ یہ مجھے سہراب کی حیثیت سے نہ پہچان پائیں۔

"اسی مکان میں قید ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"نہیں..... وہ ادھر..... بھٹا ہے نا....." میں نے جھوٹ بولا مگر بھٹا وہاں تھا، جو یقیناً انہیں بھی دکھائی دیا ہوگا۔

"ہاں..... ہاں۔"

"وہ اس کے عقب میں بہت آگے ایک کوٹھری ہے۔ تمہارے ساتھی اور میری بیوی کو ان ظالموں نے وہیں قید کر رکھا ہے۔"

"اچھا۔" اس کے منہ سے زیر لب نکلا۔

"سنو، موقع ہے۔ وقت ضائع مت کرو۔ اپنے ساتھیوں کو چھڑاؤ پہلے تاکہ تمہاری تعداد زیادہ ہو سکے۔ میں تمہیں اس مقام تک لے جا سکتا ہوں مگر خدا کے لیے میرے ہاتھ پیر کھول دو۔"

میری چالاکی کام آگئی اور میرا داؤ چل گیا۔ بات ہی ایسی تھی۔ اپنے ساتھیوں کا سن کر انہیں میری بات کا یقین آ گیا تھا۔ وجہ ان کی بغیر ہڈ والی جیپ تھی جو اس کانچ کے باہر موجود تھی۔

اس نے لپک کر جھکتے ہی میرے پہلے ہاتھوں کے جکڑ بند کھولے اور جب پیروں کی جانب متوجہ ہوا تو اچانک

Scanned with CamScanner

وہی سنسناتی ہوئی شناسا "شاشپ" کی منحوس آواز میری سماعتوں میں گونجی۔

تب ہی میری پھٹی پھٹی نظروں نے ہولناک منظر دیکھنے سے پہلے اپنے چہرے اور پھیلی ہوئی آنکھوں میں خون کے چھینٹے پڑتے محسوس کیے۔ اگلا لمحہ وہ ہولناک منظر دیکھنے کا تھا جس میں میرے ہاتھوں کے بعد پیروں کے جکڑ بند کھولنے والے شخص کا بغیر گردن والا دھڑ لہراتا ہوا گرا۔ اس کا سر دوسری جانب کسی فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا دور جا پڑا۔ میں گنگ رہا۔

کمرے کے وسط میں کھڑے شخص کی بھی اپنے ساتھی کی یہ حالت دیکھ کر میرے جیسی ہی کیفیت ہوگئی۔ تب ہی میں نے زینے کے اوپر کھڑے شمبو کے اس ساتھی کو دیکھا جس کے ہاتھ میں دوسرا درانتی نما اور قدرے لمبے پھل والا چھرا لہرا رہا تھا۔ غالباً ایک کو شکار کرنے کے بعد وہ دوسرے کو شکار کرنے کے لیے پر تول ہی رہا تھا کہ ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔

وسط میں کھڑے گن بردار نے سامنے کھڑی موت کو دیکھ کر فوراً ہی سنبھالا لیا تھا اور گن سے اس منحوس و مردود لنگی پوش کا نشانہ لیا۔ گولی اس کے سینے میں پیوست ہوئی اور وہ ایک بھیانک چیخ خارج کرتا ہوا لاش کی صورت میں مختصر سے زینے کے قدموں سے نیچے لڑھکتا ہوا آنے لگا۔

میں نے اپنے تحمل پڑتے اعصاب پر فوری قابو پایا اور جلدی سے اپنے پیروں کے جکڑ بند کھولنے لگا کہ بھانڈیل سائیں کے اس متوقع حواری نے لنگی پوش سے اپنے ساتھی کا بروقت انتقام لینے کے بعد میری جانب اپنی گن کا رخ کر دیا۔ میری آنکھیں پھیل گئیں۔

اسے شاید نہیں معلوم تھا کہ میری اس کے بدنصیب ساتھی سے کیا "بات چیت" ہوئی تھی یا پھر وہ میرا بھی قصہ پاک کرنے کے درپے ہوگیا تھا۔

تب ہی میں نے ٹریگر پر موجود اس کی انگلی کو ایک ذرا جنبش کرتے دیکھا اور اس کی نال بھیانک انداز میں دہاڑی۔ یہی وہ وقت تھا جب میں اپنے پیروں کے جکڑ بندوں کو بھلا کر ہاتھوں کی آزادی کو ہی غنیمت جانتے ہوئے چیتے جیسی پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ یہی نہیں، لڑھکتا ہوا زینے کے خلا کے عقب میں بھی جا رہا۔

اسی وقت اس آدمی کی چیخ سنائی دی جس نے مجھ پر فائر جھونکا تھا۔ تب ہی مجھے حیرت کا جھٹکا لگا، جب میں نے زینے کی خلا کی دیوار کے عقب سے اسے دیکھا۔

وہ ننگے فرش پر اوندھے منہ پڑا، اٹھنے اور پاس ہی ہاتھ سے چھوٹی ہوئی اپنی گن کو دبوچنے کی کوشش میں تھا کہ نگہت کو میں نے اس پر اچھلتے دیکھا۔ اس کے ایک ہاتھ کے کرائے کا بجا تلوار گردن پر پڑا اور وہ شخص آواز نکالے بغیر ہی دھڑام سے نیچے آ رہا۔

"شپ..... شپ..... شاشپ" کی دوبارہ سنسناتی آواز ابھری۔ چمکتے ہوئے پھل والی درانتی کو میں نے زینے سے نمودار ہو کر نگہت کی طرف کسی باز کی طرح اڑ کر جاتے دیکھا۔

میں تو سردست یہ خونی تماشا دیکھ ہی سکتا تھا، کچھ کرنے کے لیے ابھی مجھے اپنے پیروں کے مضبوطی سے بندھے جکڑ بندوں کو کھولنے کی مشقت کرنی تھی۔

نگہت نے کمال پھرتی سے اپنے جسم کو مخصوص انداز میں لہرا کے چمگادڑ کی طرح اڑتے ہوئے اس ہتھیار کی مہیب زد سے بچایا پھر وہی درانتی، قدیم افریقی ہتھیار "بومرنگ" کی طرح فضا میں گردش کرتی ہوئی دوبارہ پلٹ کر زینے پر کھڑے لنگی پوش کے ہاتھوں میں جا پہنچی۔

یہ شمبو تھا۔ میں نے جلدی جلدی ہاتھ چلانے شروع کر دیے۔ ایک منٹ کے اندر اندر میں نے اپنے پیروں کے جکڑ بند کھول لیے۔ شمبو نے دوبارہ وار کیا اور خود بھی زینے سے نیچے جست بھری۔ نگہت نے دوسری بار خود کو بومرنگ ٹائپ اس خطرناک ہتھیار سے بچایا لیکن شمبو نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس پر جست بھری اور اسے رگیدتا ہوا فرش پر آ گیا۔ دونوں چکنے فرش پر دور تک پھسلتے ہوئے کھلے دروازے سے جا ٹکرائے جس کے سبب ایک کھلا ہوا پٹ دوبارہ بند ہوگیا۔

اگلے ہی لمحے میں نے نگہت کو لیٹے لیٹے ہی اس پر شیرنی کی طرح جھپٹتے دیکھا مگر شمبو بھی لڑائی بھڑائی کا ماہر تھا۔ اس نے بھی فرش پر لیٹے لیٹے عجیب داؤ کھیلا اور نگہت کے "آرم لاک" سے خود کو بچا کر اس سے پرے ہوگیا۔ نگہت نے بھی کم پھرتی کا مظاہرہ نہ کیا۔ وہ لپک کر اٹھی تھی۔

ادھر میں بھی جیسے ہی نگہت کو بچانے کے لیے لپکا تو زینے کے اوپر سے گولی چلی..... دھماکا ہوا اور نگہت کی دلدوز چیخ سنائی دی۔ میں سن ہو کر رہ گیا۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

Scanned with CamScanner

تنہائی ایسا زہر ہے... جو آہستہ آہستہ انسان پر اثرانداز ہوتے ہوئے اسے کسی اور ہی دنیا کا باسی بنا دیتا ہے... وہ اپنی ایک الگ دنیا بنا لیتا ہے اور اسی میں جیتا ہے... وہ بھی ایسی ہی کیفیت میں مبتلا تھا... ایسے میں اسے کسی سے محبت ہو گئی جسے وہ اپنی زندگی بنانا چاہتا تھا... مگر جب حقیقت کا ادراک ہوا تو سب کچھ بکھر چکا تھا...

تخیلاتی محبت میں مبتلا ایک مصور کی داستان

مصوّر

صباحسان یوسفزئی

وہ آرٹ گیلری میں کھڑی اپنے فن پاروں کا تنقیدی جائزہ لے رہی تھی کہ اس نے اپنے عقب سے آتی آواز سن کر پیچھے پلٹ کر دیکھا اور پیچھے کھڑے شخص کو دیکھ کر وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔ اس بھری پری دنیا میں وہی ایک واحد شخص اس کا محبوب، ہمدرد اور غمگسار تھا۔ اس کا نام آندرے تھا اور اس کا نام مونیکا تھا۔ مونیکا نسلاً اطالوی تھی۔ وہ ویسے ہی پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی جیسے یورپ میں اکثر بچے سڑکوں پر سو سو کر بڑے ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ

digest library.com

Scanned with CamScanner

اپنے ماں باپ کو نہیں جانتی تھی اسی لیے اس کا نام صرف مونیکا تھا۔ اسے اپنے والدین کا پتا نہیں تھا، وہ گمنام تھی۔ شاید وہ حرام کی اولاد تھی یا پھر اس کے والدین مفلسی کے ڈر سے اس کو یوں ہی سڑک پر چھوڑ گئے تھے..... مگر جو بھی تھا، وہ پیدا ہوتے ہی ایسے جرم کی سزا بھگت رہی تھی جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ فرانس میں برف باری خوب ہوتی ہے اور آج آرٹ ایگزیبیشن کی شام بھی بالکل ویسی ہی برف باری ہو رہی تھی جیسی اس رات ہوئی تھی جب وہ آندرے سے پہلی بار ملی تھی۔

وہ آندرے کو دیکھ کر اس پہلی ملاقات میں کہیں کھو سی گئی۔ اسے پھر سے وہ سب یاد آنے لگا۔ وہ سخت برف باری کی ایک رات تھی۔ جب وہ ٹھنڈ سے بچنے کے لیے خدا سے دعائیں کر رہی تھی۔

"اے خدا..... ! میں نہیں جانتی میں کون ہوں، میں نیکی کا پھل ہوں یا گناہ کا؟ مگر تو، تو سب جانتا ہے اور میں تیری ہی مرضی سے اس دنیا میں آئی ہوں۔ اگر تیری رضا نہ ہوتی تو میں کبھی نہیں ہوتی۔ میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ جب سے پیدا ہوئی ہوں زمانے کی ٹھوکریں ہی کھائی ہیں لیکن آج کی سردی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی۔ اے خدا! مجھ پر رحم کر۔ کوئی ایسا معجزہ دکھا دے کہ مجھ غریب کو کوئی کمبل دے جائے۔"

مونیکا کو اپنے والدین سے ورثے میں کوئی مذہب نہیں ملا تھا مگر اس نے جب سرسری طور پر دیگر مذاہب کے بارے میں ان کی عبادت گاہوں میں جا کر جانا تو اسے یہودیت سب سے بہتر لگی کیونکہ وہ بس، مندر گرجا گھر اور سینا گوج تک ہی گئی تھی۔ ہندو لاکھوں بھگوانوں کی پوجا کرتے ہیں اور مونیکا کو اتنا الجھا ہوا مذہب نہیں چاہیے تھا۔ عیسائی ایک مثلث بناتے ہیں جس میں وہ یسوع مسیح، مریم اور خدا کو ایک خاندان کے طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ مونیکا کو یہ بھی سمجھ نہیں آیا کہ خدا کو خاندان بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر جب وہ آخر میں سینا گوج گئی اور وہاں اس نے یہودی مذہب کو جانا تو اس کا دل ذرا مطمئن ہو گیا کیونکہ یہودی خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے۔ اپنے وقت پر نماز بھی پڑھتے تھے، روزے بھی رکھتے تھے۔ اسے یہ دین باعثِ راحت لگا۔ اسی لیے اس نے ان کا دین قبول کر لیا تھا۔

وہ بے حد غریب اور لاچار سہی مگر کٹر یہودی تھی۔ یہ ایک اور بڑی وجہ تھی کہ لوگ اسے کام نہیں دینا چاہتے تھے۔ کوئی اس پر اعتبار نہیں کرتا تھا اور وہ بھیک مانگنے تک پر مجبور ہو گئی تھی کیونکہ فرانس میں یہودیوں کو بہت بے بھروسا سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنی چالبازیوں سے اپنی ساکھ اتنی کمزور کر لی تھی کہ کوئی ان کے سچ پر بھی اعتبار نہیں کرتا تھا۔ مونیکا یہ سب جانتی تھی پھر بھی خدا سے اپنے لیے رحم مانگ رہی تھی کیونکہ اس کے دل میں اپنے تئیں ایمان تھا۔ جو بھی یقین سے مانگے، خدا اس کو مایوس نہیں کرتا۔ مونیکا کو بھی مایوسی نہیں ہوئی تھی۔

کمبل تو نہ ملا مگر اسے آندرے ضرور مل گیا۔ وہ اپنے اوورکوٹ میں ہاتھ ڈال کر سر جھکائے کہیں جا رہا تھا کہ اس کی نظر سڑک کنارے بیٹھی ہوئی ایک خوبصورت اطالوی دوشیزہ پر پڑی۔ وہ ٹھنڈ کے مارے بری طرح کپکپا رہی تھی۔ اس کے پاس سردی سے بچنے کے لیے کوئی معقول لباس نہیں تھا۔

اس کی آنکھیں شہد رنگ تھیں اور ان میں التجا جھانک رہی تھی۔ وہ خاموش تھی مگر اس کے خاموش لب فریاد کر رہے تھے۔ آندرے نے کچھ سوچتے ہوئے اپنے اوورکوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس کی ہتھیلی پر کچھ رکھ دیا۔ پہلے وہ سمجھی کہ اس نے کچھ فرانک رکھے ہوں گے مگر ایسا کچھ نہیں تھا۔ اس نے اس کی ہتھیلی پر ایک کارڈ رکھا تھا جس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ مونیکا کو پہلے تو بہت غصہ آیا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ شخص اس کی غربت کی توہین کر رہا ہے مگر وہ اس کارڈ کو پڑھے بغیر اسے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اسی لیے اس نے بے بسی سے اپنی ہتھیلی پر رکھے ہوئے کارڈ کو دیکھا اور اسے اٹھا کر پڑھنے لگی۔ وہ جیسے جیسے کارڈ کو پڑھتی جا رہی تھی، اس کا غصہ ختم ہو کر شکر گزاری میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے احسان مندی سے آندرے کو دیکھا۔

آندرے نے مسکراتے ہوئے اسے ایک گلی کے کونے پر کھڑی ہوئی اپنی گاڑی میں بیٹھنے کا راستہ دکھایا۔ وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوئی اس کی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔ گاڑی میں ہیٹر آن تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سرد جہنم سے نکل کر جنت میں آ گئی ہو۔ وہ خوبصورت بھی تھی اور جوان بھی۔ یہ بات اچھی طرح سمجھتی تھی کہ آدھی رات کو اسے لفٹ دینے والا فرشتہ بھی ہو سکتا ہے اور شیطان بھی مگر اس نے آندرے پر بھروسا کرنا مناسب سمجھا اور گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی آندرے بھی وہاں آ گیا۔ پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ

Scanned with CamScanner

digest library.com

کر کے آگے بڑھا دی۔ تھوڑی دیر تک ان دونوں کے درمیان خاموشی رہی پھر آندرے نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں بھوک لگی ہے؟"

مونیکا اس کے سوال سے یوں چونک گئی جیسے آندرے نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ پھر اس نے تائید میں سر ہلا دیا۔ اس کے اندر اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ منہ کھول کر آندرے کو جواب دے سکتی۔ آندرے نے ایک ہوٹل کے سامنے گاڑی روک دی، پھر مونیکا کے لیے کھانے کا آرڈر دیا۔ تین چار مختلف قسم کے سوپ، نوڈلز، برگر اور سلاد منگوائے پھر اسے کھانے کے لیے کہا۔ پہلے تو مونیکا ذرا ہچکچائی مگر بھوک ستا رہی تھی۔ اس نے کھانا شروع کیا تو اس کا ہاتھ نہیں رکا۔ آندرے نے اس کو خوب کھلایا پلایا۔

وہ بے حد خوش تھی۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوا تھا ورنہ اسے مزدوری کے نام پر ایک ایک پیٹی کے لیے بھی گلیوں میں بھاگنا پڑتا تھا۔ پورے دن کی بھاگ دوڑ کے بعد بھی اسے پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا تھا۔ اس پر شہر کے بدقماش لڑکے اس کو الگ تنگ کرتے تھے اور آندرے..... آندرے تو فرشتہ تھا جس نے اسے کھانا دیا، اپنی گرم اور آرام دہ گاڑی میں گھومنے کا موقع دیا اور اب ایک شاندار رہائش گاہ دینے والا تھا۔ جس کے بدلے اسے کوئی اتنا مشکل کام نہیں کرنا تھا۔ بس آندرے کا آرٹ اسکول جوائن کرنا تھا۔

وہ نیدرلینڈ کے گھر سے نکلا تھا کہ ایسی ضرورت مند لڑکی کو آرٹ سکھائے گا جو واقعی اس کی مستحق ہوگی۔ پھر پتا نہیں کیوں مونیکا کو دیکھ کر اس کے دل نے یہی کہا تھا کہ یہی وہ لڑکی ہے جس کی اسے تلاش تھی۔

مونیکا حسین ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی تھی مگر حالات کی مار نے اس کو کمزور کر دیا تھا۔ بہرحال رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں آندرے کی خوبصورت سی کوٹھی میں پہنچ گئے تھے۔ آندرے نے ایک بہت پرسکون کمرا اس کی رہائش کے لیے مختص کر دیا۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ آرام دہ بستر پر سوئی تھی۔ کچھ نیند کا خمار تھا، کچھ تھکن بھی اور کچھ جان لیوا سردی سے بچ جانے کی خوشی کہ وہ دن چڑھے تک سوتی رہی۔

اگلے دن جب وہ سو کر اٹھی تو ایک خوبصورت اور نفیس جوڑا اس کے پلنگ پر استری ہوا رکھا ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک رات میں اس کی زندگی اس قدر بدل گئی ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھی اور وہ لباس لے کر غسل خانے میں گھس گئی۔ غسل وغیرہ کرنے کے بعد اس نے اپنے بال سنوارے۔

جب تک وہ نیچے آئی، تب تک تقریباً ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ ناشتے کی میز پر آندرے نے اسے بتایا کہ اسے شام کو تیار رہنا ہے۔ اس کی پہلی آرٹ کلاس شام کو ہوگی۔ اسے قدرتی طور پر مصوری سے دلچسپی تھی لیکن اس کی حیثیت اتنی نہیں تھی کہ وہ باقاعدہ اس چیز کی تعلیم حاصل کرتی۔ اسی لیے اس نے کبھی اس خواہش کو دوسروں پر ظاہر نہیں کیا تھا مگر اس نے خدا سے مانگا تھا۔ خدا کسی کو نامراد نہیں لوٹاتا۔ مونیکا کو بھی شاید اس کے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔

آندرے نے پورے جوش و جذبے سے اسے سکھانا شروع کر دیا۔ وہ خود ہی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کی حامل تھی۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ بڑی برق رفتاری سے وہ سب سیکھتی جا رہی تھی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس نے مصوری اور مجسمہ سازی میں اپنا ایک الگ ہی نام پیدا کر لیا اور آج جب اس کی پہلی آرٹ ایگزیبیشن تھی، تب آندرے نے اس کے پیچھے کھڑے ہو کر تعریفی الفاظ کہے تھے۔

وہ چونک کر پلٹی اور آندرے کو دیکھ کر مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔ وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں مٹی سے مورت نہیں بناتی بلکہ سنگ تراشی کرتی ہوں۔ میں کیسی مجسمہ ساز ہوں، یہ تو تم خوب جانتے ہو۔"

وہ اس کا جواب سن کر خاموشی سے مسکرا دیا۔

آرٹ ایگزیبیشن کی وہ شام یادگار رہی۔ لوگوں نے مونیکا کے بنائے ہوئے آرٹ پیس دیکھے تو اش اش کر اٹھے۔ وہ سب آندرے کی لگن اور مونیکا کی محنت کی دل کھول کر تعریفیں کرنے لگے۔ مونیکا کی بنائی ہوئی تصویریں لوگوں کا دل اپنی طرف کھینچ لیتی تھیں۔ یہ سب قسمت کے کھیل ہوتے ہیں۔ جس مونیکا کو چھ ماہ پہلے کوئی اپنے گھر ملازمت نہیں دینا چاہتا تھا، آج وہی مونیکا فرانس کی سب سے نامور آرٹسٹ بن گئی تھی اور یہ سب آندرے کی وجہ سے ہوا تھا۔

وہ بہت خوش تھی۔ اس کے فن پارے ہاتھوں ہاتھ بک رہے تھے۔ حتیٰ کہ رات 12 بجے تک آخری پینٹنگ بھی بک گئی۔ وہ پینٹنگ ذرا مختلف تھی اور مونیکا کے دل

Scanned with CamScanner

کے بہت قریب بھی۔ پتا نہیں کیوں؟ مگر وہ پینٹنگ کو بیچنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے 1990ء میں ہی اس پینٹنگ کے دس لاکھ یورو مل رہے تھے مگر پھر بھی وہ بدستور انکار کر رہی تھی مگر جب بولی پندرہ لاکھ یورو تک پہنچ گئی، تب اس نے تھک ہار کر وہ پینٹنگ فروخت کر دی۔ بات یہ نہیں تھی کہ اسے مزید پیسے کا لالچ تھا، بلکہ سچ تو یہ تھا کہ اس نے ایک رات میں ہی اتنا پیسا کما لیا تھا جتنا وہ پوری زندگی بھی مزدوری کر کے نہیں کما سکتی تھی۔ مگر وہ سمجھ رہی تھی کہ اگر اس نے اس پینٹنگ کو فروخت نہ کیا تو یہ معاملہ مزید طول پکڑ جائے گا۔ رات سے صبح ہو جائے گی اور صبح سے شام، مگر کوئی نہ کوئی اس پینٹنگ کو لے کر ضرور جائے گا۔ مونیکا کو خود بھی اس میں انجانی سی کشش محسوس ہوتی تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ وہ خود نہیں جانتی تھی۔ اب اسے بہت تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ اسے گھر پہنچنا ہی تھا، اسی لیے اس نے آخری پینٹنگ بھی فروخت کر دی۔

اس کے پاس ایک ہی رات میں کروڑوں یورو آ چکے تھے۔ وہ بہت خوش تھی مگر اسے آندرے کے بنا سب ادھورا لگ رہا تھا۔ آندرے کی وجہ سے اس نے زندگی میں ایک مقام بنایا تھا اور اب دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے کی باری آئی تو آندرے ہی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بہت دیر سے اسے دکھائی نہیں دیا۔ مونیکا بے چین ہو کر آرٹ گیلری کی عمارت میں اسے تلاش کرنے لگی۔ اس عمارت کی تیسری منزل پر اس کی ایگزیبیشن ہوئی تھی۔ وہ تیسری منزل بھی اچھے خاصے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی مگر مونیکا کے سر پر آندرے کو تلاش کرنے کی دھن سوار تھی لیکن آندرے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ باقی عمارت مقفل تھی، بس وہی منزل آرٹ ایگزیبیشن کی وجہ سے اب تک کھلی ہوئی تھی اور اس منزل پر بھی آندرے نہیں تھا۔ مطلب وہ جا چکا تھا۔

یہ خیال آتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس کے ہینڈ بیگ میں بے شمار چیک تھے جو ان لوگوں نے دیے تھے جنہوں نے اس کے فن پارے خریدے تھے۔ گویا اس کے پاس دولت کے انبار تھے مگر نہیں تھا تو آندرے نہیں تھا۔ ایک طرف آندرے کے بچھڑ جانے کا دکھ، دوسری طرف اس پینٹنگ کو بیچنے کا جو پینٹنگ اس نے مصوری سیکھنے کے دوران سب سے پہلے بنانی شروع کی تھی اور سب سے آخر میں وہی پینٹنگ مکمل ہوئی تھی۔ یعنی اس پینٹنگ پر اس کی چھ ماہ کی محنت صرف ہوئی تھی اور اب وہ پینٹنگ پندرہ لاکھ یورو میں فروخت ہو چکی تھی۔

کسی آرٹسٹ کے لیے یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے کہ اس کے آرٹ پیس زیادہ سے زیادہ قیمت میں فروخت ہوں مگر پتا نہیں کیوں اس کے جانے کے بعد مونیکا کو یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ ایک خالی برتن کی طرح کھوکھلی ہو کر رہ گئی ہے۔ گویا وہ پینٹنگ، پینٹنگ نہیں تھی، اس کی روح تھی۔ اور ہوتی بھی کیوں نا؟ پینٹنگ میں جو لڑکی تھی، وہ ہو بہو اسی کا عکس تھی۔

مونیکا جب بھی آئینہ دیکھتی تھی، اپنے چہرے کے نقش و نگار کے حساب سے کینوس پر برش کو پھیرتی جاتی تھی۔ پھر چھ ماہ کے مسلسل صبر آزما مرحلے کے بعد اس نے ایک ایسی لڑکی کی تصویر بنائی تھی جس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور کوئی پینٹ برش پھیرتے ہوئے اس کے چہرے پر موجود آنسوؤں کو مٹانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس پینٹنگ سے لڑکی کا ہاتھ نکل کر اس شخص کا ہاتھ پکڑ رہا تھا۔ غرض وہ بہت عجیب و غریب تصویر تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ تصویر والی لڑکی زندہ ہو کر آنسو پونچھنے کی اداکاری کرنے والے کا ہاتھ پکڑ رہی ہے۔

مونیکا وہیں روتے روتے ایک جگہ بیٹھ گئی۔ رات گزرتی جا رہی تھی مگر آندرے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان دونوں نے اس عمارت کی وہ منزل پوری رات کے لیے کرائے پر لی تھی۔ اسی لیے اسے اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ اس کے پیچھے کوئی آتا مگر اسے آندرے کی فکر ستائے جا رہی تھی اور درحقیقت اب ڈر بھی لگنے لگا تھا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ رات تھکی تھکی سی سانسیں لے رہی تھی۔ کسی دم صبح ہونے کو تھی۔ اس کی آنکھ لگ گئی کہ اچانک ایک کھٹکا سا ہوا۔

☆☆☆

اچانک سے آرٹ گیلری کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ مونیکا چونک کر بیٹھ گئی۔ وہ تو ہمیشہ آندرے کی محفوظ پناہ میں سونے کی عادی رہی تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے اسے کسی کا خوف نہیں ہوتا تھا۔ پھر وہ بھلا کیسے نہ چونکتی؟ اس کا دل رو رہ کر بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کا حسن و شباب مثالی تھا۔ مال کے لٹیروں سے زیادہ عزت کے لٹیروں کا دھڑکا ہر لمحہ لگا رہتا تھا اور آج تو وہ واقعی بالکل تنہا سو کر ایسے لٹیروں کو دعوتِ عام دے رہی تھی۔ مگر پھر جیسے ہی اس نے اندر داخل ہونے والے کو دیکھا، اس نے

Scanned with CamScanner

سکون کا سانس لیا۔

وہ آندرے تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، شیو کچھ دنوں سے ویسے ہی بڑھی ہوئی تھی اور اس وقت وہ اور زیادہ بے ترتیب لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ اس کا چٹانی سینہ پھول پھول کر پچک رہا تھا جو اس بات کا غماز تھا کہ وہ کہیں بہت دور سے بھاگتا ہوا آیا ہے۔

مونیکا اس کی حالت دیکھ کر تڑپ گئی۔ وہ اپنی نیند بھول کر تیزی سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی اس کے سینے سے لگ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت بہہ رہے تھے۔ وہ خود تو خاموش تھی لیکن اس کے آنسو شکوہ کناں تھے کہ کیوں آندرے اس کو اس وقت چھوڑ گیا جب اسے سب سے زیادہ اس کی ضرورت تھی؟

آندرے نے اسے اس وقت سہارا دیا تھا جب وہ بے گھر تھی، بھوکی پیاسی تھی اور سڑکوں پہ ٹھوکریں کھا رہی تھی اور آج جب کامیابی اس کے قدم چوم رہی تھی اور دولت کے انبار اس کے قدموں میں پڑے ہوئے تھے، تب اسے وہ سب کچھ آندرے کے بنا ادھورا لگ رہا تھا۔ وہ احسان فراموش نہیں تھی بلکہ آندرے سے شدید محبت کرتی تھی۔ آندرے بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ مغربی تہذیب میں پل بڑھ کر جوان ہونے کے باوجود اس کے اندر جھجک تھی، شرم تھی۔ اس کے انداز میں چھپا چھپا سا پیام محبت تھا جو مونیکا کو اپنی طرف مزید کھینچتا تھا۔ اسے آندرے کی محبت، اس کا مونیکا کی حد سے زیادہ پروا کرنا، سب کچھ بہت ہی اچھا لگتا تھا۔

یہ محبت کا تقاضا تھا کہ دو محبت کرنے والوں کے درمیان خاموشی کو جگہ نہ دی جائے۔ مونیکا نے بھی وہی کیا۔ اس نے خاموشی کو اپنے اور آندرے کے درمیان جگہ نہیں دی بلکہ خاموشی کی دیوار گراتے ہوئے بولی۔

"کہاں چلے گئے تھے تم؟ جانتے ہو میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا۔ آرٹ گیلری کے سارے آرٹ پیس یکے بعد دیگرے فروخت ہوتے چلے گئے لیکن جو شخص میرے دل کی دھڑکن ہے، وہ میری دھڑکنوں سے دور تھا۔ تم بتاؤ، کیا ایسے میں، میں اپنی کامیابی سے خوش ہو سکتی تھی؟ اور تمہیں ایک افسوس کی بات بتاؤں؟" اتنا کہہ کر وہ سوالیہ نظروں اور بھیگی آنکھوں سے آندرے کو دیکھنے لگی۔

آندرے نے تھکی تھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "تمہاری وہ عزیز ترین پینٹنگ جسے تم نے

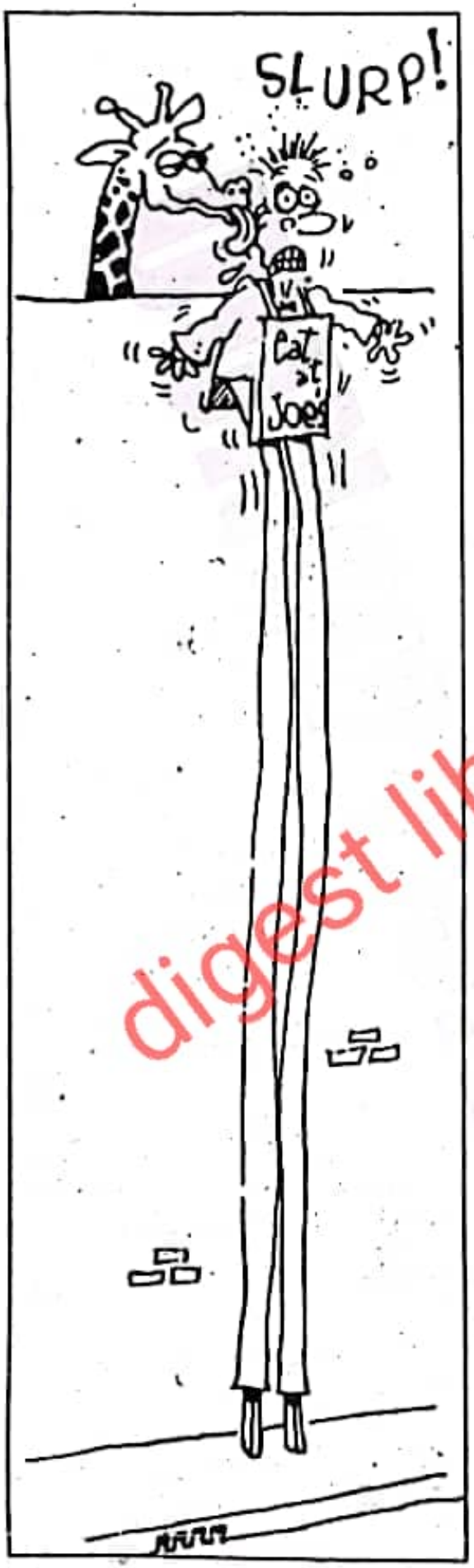

digest library.com

Scanned with CamScanner

''کرائنگ لیڈی'' کا نام دیا تھا، وہ بھی فروخت ہوگئی۔ جس کی وجہ سے کہیں بہت خالی پن محسوس ہو رہا تھا۔ میری جان! تم میری جانِ حیات ہو۔ تم اداس ہو اور میں تمہارے ساتھ رہ کر تمہیں جھوٹی تسلیاں دوں، اس سے اچھا یہ نہیں کہ میں تمہارے لیے کچھ ایسا کروں جس سے تم سچ میں خوش ہو جاؤ؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ رونا بند کر کے متجسس لہجے میں بولی۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ پینٹنگ میں تمہارے سامنے لا کر واپس رکھ دوں تو تم خوش ہو جاؤ گی نا؟''

وہ خوشی سے کھل گئی اور بے اختیار مسکراتے ہوئے تائید میں سر ہلا دیا۔

آندرے نے اب تک اسے اپنے بازوؤں میں نہیں بھرا تھا کیونکہ اس کے دونوں ہاتھ اس کی کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے لا کر اپنے پیچھے چھپائی ہوئی پینٹنگ اس کے روبرو کر دی۔ وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ پہلے اسے اس بات سے صدمہ پہنچا تھا کہ آندرے نے جوابی طور پر اسے سینے سے کیوں نہیں لگایا لیکن جب اس نے پینٹنگ دیکھی تو اسے سب سمجھ آ گیا۔ وہ اسے احسان مندی سے دیکھنے لگی اور آندرے نے مسکراتے ہوئے اسے سینے سے لگا لیا لیکن اس مرتبہ اس کے بازو مونیکا کے کمر کے گرد حائل تھے۔ وہ تھوڑی دیر تک زوتی رہی پھر مسکرا دی۔ یوں ہی دن نکل آیا۔

صبح ہونے پر وہ دونوں آرٹ گیلری کی عمارت سے باہر آ گئے۔ آندرے کے ہاتھوں میں ''کرائنگ لیڈی'' تھی اور مونیکا اس سے ذرا فاصلے پر چل رہی تھی۔ چونکہ آندرے وہ تصویر فروخت کے بعد چرا کر لایا تھا، اسی لیے یہ سیدھا سیدھا پولیس کیس بن سکتا تھا مگر وہ دن کی روشنی پھیلنے سے پہلے ہی آرٹ گیلری سے باہر آ گئے تھے۔ اسی لیے انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔ آندرے اور مونیکا بڑی آسانی سے وہاں سے نکل آئے۔ راستے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

مونیکا خاموشی سے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی سیٹ پر سو رہی تھی اور آندرے نے وہ تصویر عقبی سیٹ اور ڈرائیونگ سیٹ کے درمیان یوں فرش پر ڈالی ہوئی تھی کہ کسی باہر سے جھانکنے والے کو ایک نظر میں پتا بھی نہیں چل سکتا تھا۔ وہ اطمینان سے ڈرائیو کرتا جا رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ اپنے بنگلے میں واپس پہنچ گئے۔

آندرے نے ایک نظر سوتی ہوئی مونیکا پر ڈالی اور مسکرا کر اسے بازوؤں میں اٹھا کر اندر لے گیا۔ وہ صدر دروازے سے داخل ہوتا ہوا کچن اور لاؤنج کے درمیان موجود راہداری سے ہو کر اس کی خواب گاہ میں پہنچ گیا اور اسے بڑی احتیاط سے بستر پر لٹا دیا۔ وہ اب بھی ویسے ہی سکون سے سو رہی تھی حالانکہ وہ بڑی چونکی نیند سوتی تھی لیکن آندرے کے معاملے میں اس کا مزاج مختلف تھا۔ وہ دنیا کا واحد شخص تھا جو اسے مار بھی ڈالتا تو اس کی نیند خراب نہیں ہوتی کیونکہ وہ سب سے زیادہ آندرے پر اعتماد کرتی تھی۔ آندرے بھی اپنی خواب گاہ میں جا کر گہری نیند میں ڈوب گیا تھا۔

☆☆☆

جیک نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ پچھلی رات اس نے کچھ زیادہ ہی پی لی تھی جس کا خمار اب بھی چڑھا ہوا تھا۔ اس کے فلیٹ کی کال بیل مسلسل بج رہی تھی۔ وہ نشے میں جھومتا ہوا اٹھا اور گالیاں بکتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''ابے گدھے کے بچے! کیوں میرے کانوں کے پردے پھاڑ رہا ہے؟ آ رہا ہوں، ذرا رک بھی جا۔'' اتنا کہہ کر اس نے جھنجلاتے ہوئے دروازہ کھولا تو اسے وہ گدھے کا بچہ دکھائی دے گیا جو مسلسل دروازے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ سامنے اس کا عزیز از جان دوست آندرے کھڑا ہوا تھا۔

آندرے کو دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا خشک مزاج دوست بڑے عرصے بعد اس کے دروازے پر دستک دے گا مگر آندرے کی آمد اس کے لیے بے حد خوش آئند بھی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا اور اسے اندر داخل ہونے کا راستہ دیا۔

آندرے نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ادھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیرولائن اور بچے کدھر گئے اور یہ تم نے گھر کی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ جیک! کچھ بھی ہو جائے، تم کبھی نہیں سدھر سکتے۔ کتنا پیتے ہو، تمہارے پاس سے اب بھی شراب کی بو آ رہی ہے۔''

''ابھی سو کر اٹھا ہوں۔ کل بھی نہیں کی، تمہارے لیے دروازہ کھول دیا اور تمہارے نخرے ہی نہیں ملتے۔ جب دیکھو بوڑھی اماں کی طرح ستانے لگ جاتے ہو۔ اتنے عرصے بعد ملے ہو، اب بھی میری خیریت نہیں پوچھ

Scanned with CamScanner

رہے۔ کیرولائن اور بچے اپنی نانی کے ہاں گئے ہوئے ہیں اور میں بڑے عرصے بعد سکون سے شراب پی کر سو رہا تھا کہ تم نے میری نیند برباد کر دی اوپر سے سنائے بھی مجھے جا رہے ہو۔"

آندرے نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "جیک! میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں۔ مجھے احمق بنانے کی کوشش مت کرو۔ تم شراب چھوڑ ہی نہیں سکتے۔"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "میں نے شراب تقریباً چھوڑ ہی دی ہے۔ کیا تم اتنے عرصے بعد میری شراب چھڑانے کے لیے میرے گھر آئے ہو؟"

یکا یک آندرے کا مزاج بدل گیا اور وہ تمام نصیحتیں بالائے طاق رکھ کر سنجیدہ ہو گیا۔

"وہ... مجھے ایک لڑکی پسند آ گئی ہے اور مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں اسے خوش رکھنے کے لیے کیا کروں؟ اسی لیے میں کیرولائن کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ عورت ہے، عورت کے مزاج کو خوب سمجھتی ہوگی۔ شاید میری کچھ مدد کر سکے مگر چلو، تم بھی کچھ بڑے نہیں ہو۔ تم بھی تو ایک شوہر ہو۔ اتنے عرصے سے ایک بیوی کو رکھا ہوا ہے تو ظاہر ہے وہ تم سے کچھ نہ کچھ خوش تو ہوگی۔ تم ہی میری مدد کرو یار! بڑا الجھا ہوا ہوں میں۔" ایسا کہتے ہوئے اس نے اپنے سر کو بے اختیار تھام لیا۔

جیک اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے ہمدردی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "تم پریشان مت ہو۔ ہم ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور جا کر اس کے لیے اچھے سے کپڑے اور جوتے خریدیں گے۔ خواتین کو نت نئے ملبوسات اور خوبصورت سینڈلز میں بہت دلچسپی ہوتی ہے، اسے بھی ضرور ہوگی۔ ہم اس کے قد و قامت کے حساب سے اس کے لیے شاپنگ کریں گے۔ پھر ایک بہت اچھے سے ریسٹورنٹ جا کر تم دونوں کے لیے ایک خوبصورت سا کیبن بک کروائیں گے جہاں تم اسے پرپوز کر سکو۔ ڈنر پر جانے سے پہلے اس کے لیے ایک خوبصورت سا گلدستہ ضرور لے لینا۔ تم دونوں ایک شاندار کھانا کھانے کے بعد ایک دوسرے سے زیادہ قربت محسوس کرو گے۔ تب شاید تمہاری جھجک ختم ہو جائے اور اتنی ہمت پیدا ہو جائے کہ تم اس سے اپنی محبت کا اظہار کر سکو۔"

آندرے ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "تم نے میرے سینے سے ایک بھاری پتھر ہٹا دیا ہے۔ شکریہ یار!"

جیک مسکرا کر وہاں سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "مگر اتنا سب کرنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔ میں کل رات بھوکا ہی سو گیا تھا تو مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ میں فریش ہو جاؤں پھر باہر ہی کھانا کھائیں گے اور یہ سب کام بھی نمٹا لیں گے۔"

آندرے نے مسکراتے ہوئے اس کی تائید کی اور سینٹر ٹیبل پر پڑا ہوا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر لیا۔ قسمت سے اس نے جیسے ہی ٹی وی آن کیا، اس وقت نیوز چینل پر "کرائنگ لیڈی" کی چوری کی خبر نشر ہو رہی تھی۔ اس کے مسکراتے چہرے سے مسکان یکدم غائب ہو گئی اور اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے ٹی وی کا والیوم کم کر دیا تاکہ اس خبر کی آواز جیک کے کانوں تک نہ پہنچے ورنہ بہت بڑا مسئلہ ہو سکتا تھا۔ نیوز اینکر جینیفر جون تھی جو ایک زمانے میں آندرے کی کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ وہ اس پینٹنگ کی چوری کے متعلق تفصیلی خبر سناتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کل رات آرٹ ایگزیبیشن میں سب سے مہنگی فروخت ہونے والی پینٹنگ جس کا نام "کرائنگ لیڈی" بتایا جاتا ہے، وہ فروخت کے ایک گھنٹے بعد ہی چوری ہو گئی۔ پینٹنگ کے بدقسمت مالک کا کہنا ہے کہ اس نے اپنے تمام اثاثے داؤ پر لگا کر وہ پینٹنگ خریدی تھی۔ اگرچہ وہ بے انتہا دولت مند شخص ہے تاہم اس کی دولت مختلف کاروبار میں سرمائے کے طور پر پھنسی ہوئی ہے اور جو رقم اس کے پاس بینک اکاؤنٹ میں تھی، اس نے اپنے اکاؤنٹ سے ایک ایک فرینک خرچ کر کے وہ پینٹنگ خریدی تھی۔ اس پینٹنگ کا غائب ہو جانا اس کے لیے کسی صدمے سے کم نہیں ہے۔ میں شہریوں سے التجا کرتی ہوں، اگر کسی کو وہ پینٹنگ مل جائے تو متعلقہ مالک تک پہنچا دے۔ نیچے اسکرین پر ان کا نام اور ٹیلی فون نمبر درج ہے اور ان کا پتا بھی نیچے ٹکر میں لکھا ہوا آ رہا ہے۔ برائے مہربانی تمام ناظرین اس پتے کو نوٹ کر لیں۔"

جینیفر ایک ذرا توقف سے بولی۔ "پینٹنگ کے مالک کا کہنا ہے کہ آرٹ ایگزیبیشن کے دوران مسٹر آندرے کہیں غائب ہو گئے تھے۔ پینٹنگ خریدنے کے لیے انہیں وہ معاملات ان کے سیکریٹری سے طے کرنا پڑے۔ بہرحال یہ کوئی خاص بات نہیں مگر مسٹر آندرے کی گمشدگی پریشان کن ہے اور پینٹنگ کی چوری تشویشناک۔ وہ فروخت سے پہلے ہی غائب ہو گئے تھے

digest.library.com

Scanned with CamScanner

اسی لیے چوری کے لیے ان پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔"

اچانک سے اسکرین سادہ ہوگئی اور پھر ایک کامیڈی مووی کا سین دکھائی دینے لگا۔ تھوڑی دیر میں جیک نہا دھو کر باہر آ گیا تھا۔ آندرے کے سامنے ٹی وی چل رہا تھا مگر وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھا۔ اسے کھلی آنکھوں سے بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جیک بالکل ٹی وی کے سامنے سے چلتا ہوا آیا اور اس کے برابر بیٹھ گیا مگر آندرے ذہنی طور پر اتنا پریشان تھا کہ اسے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ جیک نے اس کے اندر یہ غیر معمولی تبدیلی بڑی شدت سے محسوس کی۔ اس نے ہمدردی سے آندرے کو دیکھا پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے ہولے سے پکارا۔

"آندرے! چلیں؟"

اس نے چونک کر خالی خالی نظروں سے جیک کو دیکھا پھر تائید میں سر ہلا دیا۔ اس کا رویہ عجیب ہوتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ بڑا پریشان حال اس کے دروازے پر پہنچا تھا پھر اس نے مونیکا کے سلسلے میں جیک سے مدد طلب کی تھی اور جیک کے یقین دلانے پر وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا مگر جتنی دیر میں جیک واپس آیا، آندرے خالی الذہن ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں ہر احساس سے خالی تھیں، اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ اسے آندرے کے بدلتے ہوئے تاثرات سے وحشت ہونے لگی تھی مگر وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ آندرے بڑی امید سے اس کے پاس آیا تھا۔

اس نے بڑے کرب سے اپنے سب سے پیارے دوست کو دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے چلنے کا کہا۔ آندرے میکانکی انداز میں اٹھا پھر وہ دونوں ڈرائنگ روم سے چلتے ہوئے گھر کے باہر آ گئے۔ جیک نے گھر کے دروازے کو لاک کیا اور اس کی چابی میٹ کے نیچے چھپا دی۔ تاکہ کیرولائن اس کی عدم موجودگی میں گھر آئے تو اسے کوئی پریشانی نہ ہو۔ آندرے بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ جیک کو اس کی خاموشی ہضم نہیں ہو رہی تھی مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟

جیک خاموشی سے ڈرائیو کرتا جا رہا تھا، پھر اس نے گاڑی ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے روک دی۔ آندرے کے تاثرات پھر بدل گئے اور وہ نارمل نظر آنے لگا۔ اس نے جیک کے ساتھ مل کر مونیکا کے لیے خوب ساری شاپنگ کی۔ اگرچہ عیسائیت میں دلہن سفید عروسی جوڑا پہنتی ہے تاہم آندرے کو سرخ رنگ بہت پسند تھا۔ اس نے مونیکا کے لیے خاص طور پر سرخ رنگ کا عروسی جوڑا خریدا۔ اس کے ساتھ جالی دار نقاب تھا، پھر اس نے اس کے لیے اچھی سی جیولری خریدی اور اسی جوڑے سے ہم آہنگ خوبصورت سے سینڈل بھی خریدے، کچھ اور شاپنگ بھی کی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ جب بھوک زیادہ ستانے لگی تو وہ کھانا کھانے چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے کھانے کا آرڈر دیا۔ انہوں نے کچھ خاص آرڈر نہیں کیا تھا۔ بس برگر، سینڈوچ اور دو کپ کافی تھی، اس لیے کھانا جلدی آ گیا۔ وہ دونوں ڈائننگ ایریا میں بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ جیک آندرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ آندرے جلدی جلدی کھانا کھا رہا تھا جیسے اسے مونیکا کے پاس پہنچنے کی جلدی ہو۔ جیک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آرام سے کھالو، تمہاری محبوبہ کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔ ویسے بھی ابھی ہمیں ایک اچھا سا کیبن تم دونوں کے ڈنر کے لیے بک کروانا ہے پھر کہیں جا کر تم اپنی محبوبہ کے پاس پہنچ سکو گے۔ ویسے برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

آندرے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ جیک ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "میں اس لڑکی سے ایک دفعہ ضرور ملنا چاہوں گا جس کے لیے تم اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہو۔ میں حیران ہوں کہ فتنوں کے اس دور میں تم دونوں نے اپنی پارسائی کو کیسے برقرار رکھا ہوا ہے جبکہ تم دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہو؟ کیا تم مجھے اس سے ملوانا پسند کرو گے؟"

آندرے نے فراخ دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہیں۔ مجھے خوشی ہوگی۔"

انہوں نے کھانے کا بل ادا کیا اور ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے باہر آ گئے۔

پھر وہ مختلف اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں کا دورہ کرنے لگے۔ کتنے ہی ہوٹلوں میں جانے کے بعد بھی وہاں وہ بات محسوس نہیں ہوئی جو ایک خوبصورت نازک سی لڑکی کو موہ لینے کے لیے کافی ہو۔ پھر انہیں ایک ہوٹل میں جا کر ذرا اطمینان ہوا۔ اس کے کیبن اتنے خوبصورت تھے جیسے وہاں چاندنی اتر آئی ہو۔ اس کا نام بھی "دامون" تھا..... یعنی "چاند۔"

Scanned with CamScanner

☆☆☆

وہ دونوں شاپنگ کرکے شاداں و فرحاں آندرے کے گھر لوٹے۔ وہ مسکراتے ہوئے جیک سے بولا۔

"دیکھنا ابھی میں تمہیں اپنی جانِ حیات سے ملواتا ہوں۔ وہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرت بھی ہے..... مونیکا..... مونیکا! دیکھو تم سے ملنے کون آیا ہے؟ میں آج تمہیں اپنے سب سے عزیز دوست سے ملوا کر تمہیں عزت بخش رہا ہوں کیونکہ تم میری عزت ہو۔ اچھا چلو، ناراض مت ہو۔ میں تمہیں لینے خود آتا ہوں۔"

وہ خود کلامی کرتا ہوا گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوگیا۔ پھر وہ تھوڑی دیر تک اونچی آواز میں محبت بھرے کلمات ادا کرنے لگا۔ دوسری طرف سے کوئی جواب سنائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید وہ اس سے شدید ناراض تھی مگر آندرے اپنی تمام محبتوں سے اس کو منا رہا تھا اور جیک..... وہ پیار بھری تکرار سن کر مسکرا رہا تھا۔ اس تکرار میں اس لڑکی کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ وہ خاموش تھی۔ شاید اسے خاموشی کی مار مار رہی تھی مگر آندرے کی تمام کوششیں اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھیں کہ وہ اس لڑکی کو کس قدر ٹوٹ کر پیار کرتا ہے۔ جیک کو اس کی قسمت پر رشک آرہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اپنا منفی رویہ کیرولائن کے ساتھ ضرور بدلے گا جو اس کی شراب نوشی کی عادت سے تنگ آکر میکے چلی گئی تھی۔ اسے اس وقت پتا نہیں کیوں شدت سے اپنی بیوی بچے یاد آرہے تھے۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اب تک وہ جس خاندان کو نظر انداز کرتا آیا تھا، درحقیقت وہی اس کا اصلی اثاثہ تھا۔ اس کی بیوی کیرولائن ایک باوفا اور سچی عورت تھی۔ اس کے بچے اس کے ساتھ مخلص تھے۔

وہ آندرے کو کئی سالوں سے جانتا تھا۔ اس کو یہ بھی پتا تھا کہ وہ کون سے کمرے میں سوتا ہے اور کون سے کمرے اس کے گھر میں مقفل پڑے ہوئے ہیں۔ لہٰذا وہ آندرے کے کمرے کو چھوڑ کر باقی گھر کا جائزہ لینے لگا۔ آندرے فرانس کا ایک نامور آرٹسٹ تھا اس لیے اس کے پاس دولت کی ریل پیل تھی۔ اسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اس نے پھر بھی اپنی بڑی سی کوٹھی میں کوئی ملازم نہیں رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنا کام خود کرنا پسند کرتا تھا۔ اس نے بس ایک ملازم عارضی طور پر رکھا ہوا تھا جو ہفتے میں ایک مرتبہ آکر گھر کی اچھی طرح صفائی کر جاتا تھا۔ آندرے اسے اس کام کے عوض اتنی رقم دیتا تھا کہ وہ اپنی بساط سے بڑھ کر اس کے گھر کی صفائی کرتا اور اسے دعائیں بھی دیتا۔

بہرحال جیک، آندرے کے کمرے کو چھوڑ کر باقی گھر کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھٹک گیا۔ کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ اس کمرے کو خوبصورت آرائشی سامان سے آراستہ کیا گیا تھا اور وہ سامان دیکھ کر اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کمرا کسی دوشیزہ کے زیرِ استعمال ہے۔ اس کمرے کی فضا عمدہ قسم کی خوشبوؤں میں رچی بسی تھی۔ وہ ذرا جھجکتے ہوئے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر موجود ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔ میک اپ کا وہ سامان بڑا قیمتی تھا۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ آندرے اس لڑکی سے اس قدر محبت کرتا ہے کہ اس کی پارسائی داغدار کیے بغیر اس پر پانی کی طرح پیسا بہا رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جیک کو پائیں باغ سے آنے والی آواز نے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ آندرے کی آواز تھی۔

"مونیکا..... مونیکا! اب مان بھی جاؤ۔ میرے دوست جیک سے ملنے کے لیے راضی ہو جاؤ۔ وہ کب سے

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ اور کتنی سزا دو گی مجھے؟"

جیک کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آندرے کی محبوبہ کوئی ہے کیونکہ وہ جب سے وہاں آیا تھا، اس نے ایک مرتبہ بھی اس لڑکی کی آواز نہیں سنی تھی۔ پھر آندرے نے خاموشی کے بدلے جواباً کہا۔

"ٹھیک ہے۔ وہ تھوڑی دیر میں تم سے مل کر چلا جائے گا۔ اب تو مان جاؤ۔"

اس وقت جیک کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ اس کی چھٹی حس اسے خبردار کر رہی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے کیونکہ آندرے کو جواب دینے والی آواز اسے سنائی نہیں دے رہی تھی مگر آندرے اس سے باتیں کر رہا تھا اور جیک اسے نہیں سن پا رہا تھا۔ جیک کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اشاروں کی زبان میں باتیں کر رہی ہے۔

اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ وہاں جا کر اس فریبی لڑکی کا فریب آندرے پر کھولنا چاہتا تھا۔ جو دنیا والوں سے منہ چھپائے، وہ فریبی ہی ہوتا ہے اور یقیناً وہ لڑکی بھی آندرے کی دولت کے لالچ میں اس کے ساتھ رہ رہی تھی اور اسے پیار کا جھوٹا جھانسا دے کر اسے احمق بنا رہی تھی۔ یہ خیال آتے ہی اس کے دل و دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ وہ بھاگ کر پائیں باغ میں پہنچ گیا۔ وہاں اس نے جو منظر دیکھا، وہ دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کی ٹانگوں سے جان نکل چکی تھی، اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔

چاندنی اجلی چاندنی میں سبز گھاس کے مخملی فرش پر پھولوں کے درمیان آندرے اپنی مشہور پینٹنگ "کرائنگ لیڈی" کو اس طرح پکڑے کھڑا تھا جیسے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا ہوا ہو۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے جیک سے اس کا تعارف کراتے ہوئے بولا۔

"یہ ہے میری محبوبہ مونیکا! میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں..... اور دیکھو یہ کیسی دیوانی ہے، مجھے تھوڑی دیر ہو گئی اور یہ رونے لگی۔"

جیک اسے مسکراتا ہوا دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا دوست آندرے یوں کسی تخیلاتی محبوبہ کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوگا۔ اس نے بھیگی آنکھوں سے آندرے کو دیکھا۔ آندرے اسے تاسف سے دیکھ رہا تھا۔

اس نے گلوگیر لہجے میں پوچھا۔ "اس شام آرٹ ایگزیبیشن میں تم نے اپنے سارے آرٹ پیس مونیکا کے نام سے کیوں ایگزیبیشن میں لگوائے تھے اور کیا یہ وہی کرائنگ لیڈی ہے جو فروخت ہوتے ہی چوری ہو گئی تھی؟"

"مونیکا نے وہ آرٹ پیس خود بنائے تھے، اسی لیے میں نے ایگزیبیشن اس کے نام پر رکھی تھی۔ تم کتنی فضول باتیں کرتے ہو جیک اور یہ "کرائنگ لیڈی" نہیں، میری محبوبہ مونیکا ہے۔ کرائنگ لیڈی تو پتا نہیں کہاں کھو گئی ہے۔"

آندرے کا الجھا ہوا جواب سن کر وہ مزید دلبرداشتہ ہو کر رونے لگا۔ پھر اس نے اپنی زندگی کا ایک بہت اہم فیصلہ کیا..... بہت ہی اہم۔ اس نے وہ پینٹنگ آندرے کے ہاتھ سے جھپٹ لی اور اسے کوڑے دان میں پھینک دیا۔

"مونیکا.....!" آندرے نے ایک زوردار چیخ ماری اور کوڑے دان میں جھانک کر "مونیکا" کو دیکھنے لگا۔

پینٹنگ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی سسکیاں پورے باغ میں گونجنے لگیں۔ جیک کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ مزید وہاں نہیں رکنا چاہتا تھا مگر اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔ آندرے نے کوڑے دان میں ہاتھ ڈالا اور پینٹنگ کے آنسو پونچھنے لگا مگر اس نے سختی سے آندرے کا ہاتھ پکڑ کر جھٹک دیا۔

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی آندرے! اب میں کبھی بھی تم سے بات نہیں کروں گی۔ گڈ بائے!" اس نے آنسو بھری آنکھوں سے آندرے کو دیکھتے ہوئے کہا اور ہمیشہ کے لیے پینٹنگ سے غائب ہو گئی۔

آندرے روتے ہوئے وہیں کوڑے دان کے پاس بیٹھ گیا۔ جیک نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اس کے گلے لگ کر روتے ہوئے بولا۔ "یار! تجھے اسے دھکا نہیں دینا چاہیے تھا۔ میں آج اسے شادی کی انگوٹھی پہنانے والا تھا۔"

جیک نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور بڑے کرب سے بولا۔ "معاف کرنا میرے دوست! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ خدا تجھے اس سے بھی بہتر لڑکی دے گا۔"

ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں پینٹنگ والا منظر گھوم گیا۔ اس نے خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور بڑے کرب سے آندرے کو زور سے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔

***

Scanned with CamScanner

بازی

محمد فاروق انجم

جرائم کی دلدل ایسی ہے کہ اس سے نکلنا ناممکن ہے... اس سے جتنا بچنا چاہو، یہ اتنا ہی اپنی جانب کھینچتی ہے... وہ بھی ایک بازی لگا کر پیسا کمانا اور جرم کی دنیا کو خیرباد کہنا چاہتے تھے... مگر انہیں شاید علم نہ تھا کہ یہ کھیل انہیں کتنا بھاری پڑنے والا ہے... کیونکہ ان کا مدِمقابل زور آور اور زبردست سوچ والا تھا۔

دوسرے رخ سے جوا کھیلنے والے نوجوانوں کی روداد

شام سے ذرا پہلے موسم بہت سہانا ہو گیا تھا، آسمان پر بادل چھا گئے تھے، ہواؤں نے خنکی میں اضافہ کر دیا تھا، سڑکوں پر ٹریفک غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی، لوگ موسم کا نظارہ کرنے باہر نکل آئے تھے یا پھر وہ روز کا معمول تھا۔

رینا نے اپنی جیکٹ کی زپ کھینچ کر بند کی، اپنے پرس سے موبائل فون نکال کر اس کی اسکرین روشن کر کے وقت دیکھا اور اسے پھر اپنے پرس میں رکھ کر سڑک کی دونوں جانب دوڑتی ہوئی ٹریفک کو دیکھا اور سوچنے لگی کہ اسے کب سڑک عبور کرنے کا موقع ملے گا۔

وہ سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ سڑک عبور کرتے ہی دوسری طرف ریلوے اسٹیشن کی عمارت دکھائی دے رہی تھی، اسے ٹرین میں سوار ہونا تھا اور ٹرین چلنے میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا اس لیے اس کے چہرے پر کسی طرح کی نہ تو پریشانی تھی اور نہ ہی الجھن۔

وہ تین ماہ قبل اس شہر میں اپنی ماں کے ساتھ اسٹیج ڈراموں میں قسمت آزمانے کے لیے آئی تھی۔ وہ

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

خوبصورت تھی اور اس سے کہیں زیادہ ہوشیار اور چالاک بھی۔ اس کے خاندان کے لوگ کسی نہ کسی طرح فن کے ساتھ منسلک تھے لیکن کوئی بھی ایسا نامور فنکار بن کر ابھر نہیں سکا تھا کہ دنیا اسے جانتی ہو۔ وہ جہاں تھے، اپنی روٹی روزی چلا رہے تھے۔

رینا کے اندر کچھ کرنے کی امنگ تھی اس لیے وہ اس بڑے شہر میں آگئی تھی لیکن تین ماہ میں اس نے دیکھ لیا کہ یہاں اس کی دال گلنے والی نہیں ہے۔ اس کی ماں کی ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے دوستی ہوگئی، وہ اس شہر میں کسی کام سے آئی تھی۔ اس نے رینا کو دیکھا اور کہا کہ وہ اسے لے کر کراچی آجائے، وہ اسے ڈراموں میں چانس دلا دے گی۔

رینا ایک اسٹیج ڈرامے میں ایک چھوٹا سا رول کر رہی تھی۔ وہ ڈراما مزید دو دن چلنا تھا۔ ایک دن قبل اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے ساتھ جو خاتون آئی تھی، اسے اس شہر میں ناگزیر وجوہات کی بنا پر رکنا پڑا اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کو اپنا سامان اٹھانے اور سفر میں کسی کا ساتھ ہونا ضروری تھا۔ اس نے رینا کی ماں سے کہا، وہ فوراً چلنے کو تیار ہوگئی کہ کہیں انکار کرنے پر وہ اس کی بیٹی کو چانس دینے سے منع نہ کردے۔

رینا چاہتی تھی کہ وہ ڈراما اسٹیج میں ہی چھوڑ کر ساتھ چلی جائے۔ اس کی ماں بھی اسے بار بار اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر رہی تھی لیکن پھر وہ رک گئی کہ اس ڈرامے کا پروڈیوسر اچھا آدمی تھا۔ اس کی نیت اور نظر دونوں صاف تھیں اس لیے اس نے سوچا کہ وہ ایسے آدمی کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ ویسے بھی وہ واحد آدمی تھا جس نے اسے اپنے ڈرامے میں چانس دیا تھا۔

آخری دو دن کا ڈراما کرنے کے بعد رینا نے اجازت لی اور پروڈیوسر نے اپنا آدمی بھیج کر ریلوے کا ٹکٹ منگوا دیا۔ مقررہ وقت سے قبل وہ ریلوے اسٹیشن کے لیے نکل گئی تھی۔

رینا اس بات سے بالکل بے خبر تھی کہ ایک کار مسلسل اس وقت سے اس کے تعاقب میں تھی جب وہ اپنی عارضی رہائش سے باہر نکلی تھی۔ وہ جس رکشے میں سوار ہوئی تھی، وہ کار اس رکشے کے پیچھے چلتی ہوئی اس جگہ تک پہنچ گئی تھی۔

ابھی رینا نے سڑک عبور نہیں کی تھی کہ بارش کے چھینٹے پڑنا شروع ہوگئے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کار اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی اور اس کے اندر سے ایک آدمی نکل کر خراماں خراماں چلتا اس کے عین عقب میں کھڑا ہوگیا تھا۔

اس آدمی کا چہرہ واضح تھا۔ اس کی عمر چالیس سے زیادہ تھی اور وہ شکل سے جرائم پیشہ لگتا تھا، اس نے جسم کے گرد گرم چادر لپیٹی ہوئی تھی۔

اچانک ٹریفک کی تیزی میں کمی آگئی کیونکہ ریڈ سگنل ہونے کی وجہ سے ایک طرف کی ٹریفک رک گئی تھی۔ رینا سڑک عبور کرکے درمیان میں کھڑی ہوگئی۔ وہ آدمی بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ کچھ دیر میں دوسری سڑک پر بھی ٹریفک کم ہوئی تو وہ تیزی سے چلتی دوسری طرف چلی گئی، وہ آدمی بھی اس کے پیچھے تھا۔

وہ اسٹیشن کے مین گیٹ کے پاس پہنچی ہی تھی کہ آدمی ایک دم اس کے بہت قریب ہوگیا اور چادر کے اندر ہاتھ میں پکڑا پستول رینا کی کمر کے ساتھ لگ گیا۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تمہاری کمر کے ساتھ میرا پستول لگا ہے۔''

''مجھے کیوں بتا رہے ہو، اسے ہٹا لو۔'' رینا نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

''ذرا رک کر اس گاڑی کی طرف دیکھنا۔'' اس آدمی نے کہا تو رینا رک گئی اور جس جانب اس نے اشارہ کیا تھا، اس طرف کھڑی وہ گاڑی دیکھی جس سے وہ آدمی باہر نکلا تھا۔

''کیا ہے اس گاڑی میں؟'' رینا نے پوچھا۔

''وہاں تک چلو، میں بتاتا ہوں۔'' وہ بولا۔

رینا نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔ ''کہیں تم مجھے اغوا تو نہیں کر رہے ہو؟''

''کچھ ایسا ہی ہے مس رینا!'' وہ مسکرایا۔

''تم میرا نام بھی جانتے ہو؟'' اسے حیرت ہوئی۔

''اب چپ چاپ گاڑی کی طرف چلو اور اچھی بچی کی طرح گاڑی میں بیٹھ جانا، شور کیا تو میرا پستول چپ نہیں رہے گا۔''

''میری ٹرین آچکی ہے اور مجھے جانا ہے۔''

''ہمیں حکم ہے کہ آپ کو جانے نہیں دینا اس لیے تو ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔'' اس نے کہا اور پستول کی نال اس کی کمر کے ساتھ لگا دی۔

رینا لاچاری سے کار کی طرف بڑھی۔ وہ حالات کا مقابلہ کرنا جانتی تھی اس لیے خوفزدہ ہونے سے زیادہ یہ سوچ رہی تھی کہ وہ کس کے کہنے پر اسے اغوا کرکے لے جا رہا ہے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر اسی طرح کا ایک آدمی بیٹھا تھا۔ رینا پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے ارد گرد نظر دوڑائی کہ اسے کہیں پولیس والا دکھائی دے تو وہ شور

Scanned with CamScanner

digest library.com

بچادے۔ اسے یہ بھی خوف تھا کہ کہیں وہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچادے۔ ارد گرد لوگ تھے جو ریلوے اسٹیشن کے مین دروازے کی طرف دوڑ رہے تھے کیونکہ ٹرین آچکی تھی اور روانگی کے لیے تیار تھی۔ وہ آدمی اس کے بالکل عقب میں تھا اور پستول اس کی پسلیوں میں لگا ہوا تھا اس لیے وہ ناچار کار میں بیٹھ گئی اور کار تیزی سے حرکت میں آگئی۔

☆☆☆

اس کی عمر پچاس سال سے زائد تھی اور چہرے پر معصومیت اس بات کی غماز تھی کہ وہ ایک سادہ طبیعت انسان ہے۔ لوگوں میں میل جول بھی ایسا تھا کہ سب کی رائے تھی، وہ دوسروں کا درد دل میں رکھنے والا ہے۔ اس کے برعکس وہ ایک ظالم اور سفاک انسان تھا، اس کا دوسرا روپ صرف وہی لوگ جانتے تھے جن کا اس سے سامنا ہوتا تھا۔ اسے اپنی طاقت پر اتنا زعم تھا کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

وہ ایک جرائم پیشہ شخص تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اسے ہر کوئی صابر بھائی کہتا تھا لیکن جرائم اور عام دنیا میں "بھائی" کے معنی بدل جاتے تھے۔ وہ ہر ناجائز کام پیسوں کے لیے کرتا تھا۔ اس کے آدمی جانے کہاں کہاں پھیلے ہوئے تھے اور ایک کال پر وہ کچھ بھی کرا دیتا تھا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ کے پیچھے ایسی سفاکی پوشیدہ تھی کہ جس کی تہ تک فی الحال کوئی پہنچ نہیں سکا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں اپنی مخصوص آرام دہ کرسی پر براجمان تھا اور اپنی انگلی میں پہنی پتھر کی انگوٹھی کو انگوٹھے کی مدد سے حرکت دے رہا تھا۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی نے اسی جگہ رک کر اشارہ کیا تو صابر بھائی کے چہرے پر تبسم کی خفیف لکیر ابھر کر معدوم ہوگئی اور اس نے اپنے سر کو جنبش دی۔ وہ آدمی باہر گیا اور ساتھ ہی رینا ان دو آدمیوں کے ساتھ کمرے میں نمودار ہوگئی۔

رینا کچھ فاصلے پر کھڑی سوالیہ نگاہوں سے صابر بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ دونوں آدمی اس کے عقب میں مستعد کھڑے تھے۔

"آنے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ اگر انہوں نے کوئی بدتمیزی کی ہے تو مجھے بتاؤ، ابھی تمہارے سامنے ان کو مرغا بنادوں گا۔" صابر بھائی کے لہجے میں مٹھاس تھی۔ اس کے بولنے کا انداز ایسا ہی تھا، دھیما اور شیریں۔ لہجے میں غصے کا پتا اس کے الفاظ سے معلوم ہوتا تھا۔

"تم مجھے پہلے بھی مل چکے ہو۔ تم نے مجھے ڈائریکٹر کے کمرے میں بلایا تھا اور گلدستہ دیا تھا۔" رینا کو یاد آیا۔

وہ مسکرایا۔ "شکر ہے میں تمہیں یاد ہوں۔ اب میری یاد کا اندازہ کرو تم۔ جس دن پہلی بار تمہیں اسٹیج پر دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ تم ایسی یاد میں بسیں کہ میں اپنے کئی اہم کام بھول گیا۔ میں تمہارے لیے جاتا تھا، تمہیں دیکھتا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ تمہارا ڈراما کب ختم ہوتا ہے۔ ڈراما ختم ہوا تو ایک نیا ڈراما میرے ساتھ شروع ہوگیا اور اس وجہ سے تمہیں اس طرح یہاں لانا پڑا ورنہ میں اس کے ہاتھ توڑ دوں جو تمہاری طرف پستول کرنے کی جرأت بھی کرے۔"

رینا کچھ آگے بڑھی۔ "مجھے کیوں دیکھتے تھے تم..... میرے ڈرامے کے بعد کون سا ڈراما شروع ہوگیا تھا؟"

"تم اطمینان سے بیٹھ جاؤ، میں تمہیں سب بتاتا ہوں۔" صابر بھائی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا جو اس سے کچھ ہی فاصلے پر اس کے عین سامنے رکھی ہوئی تھی۔

رینا بیٹھنا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی صابر بھائی کے دل میں جیسے ٹھنڈک پڑ گئی۔

وہ بولا۔ "میں مختصر بات کرنے کا عادی ہوں، مختصر بات سنتا ہوں۔ تمہیں دیکھا اور تم سے محبت کر بیٹھا۔ تمہیں پاس بلا کر گلدستہ دیا اور تمہاری ماں سے تمہارے ساتھ اپنی شادی کی بات کی۔"

"کیا.....؟ جھوٹ..... تم نے کب میری ماں سے شادی کی بات کی تھی؟" رینا ایک دم بولی۔

"اپنی اماں جان سے پوچھ لو۔ میرا تو وہ فون نہیں اٹھاتی، کراچی بھاگ گئی ہے۔" صابر بھائی نے اطمینان سے کہا۔

رینا نے اسی وقت غصے سے اپنا موبائل فون نکالا اور اپنی ماں کو کال کی۔ کمرے میں خاموشی تھی اس لیے بیل صاف سنائی دے رہی تھی۔

دوسری طرف سے رینا کی ماں کی آواز آئی۔ "ہاں رینا! تم ٹرین میں بیٹھ گئی ہو؟"

"اماں! تم نے میری شادی کے ایک لاکھ روپے لیے تھے؟" رینا نے متانت سے پوچھا۔

"تم کب تک پہنچ جاؤ گی؟" اس نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔

"میں نے پوچھا ہے تم نے میری شادی کرانے کے ایک لاکھ روپے لیے تھے؟" اس بار رینا نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"تم پہنچو..... کل اطمینان سے بات کریں گے، ٹینشن مت لو۔ تم میرے پاس آرہی ہو، سب باتیں ہوجائیں

Scanned with CamScanner

گی۔'' اس کی ماں نے بے پروائی سے کہہ کر کال منقطع کردی۔

رینا نے غصے سے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس نے سوچا، اسی لیے اس کی ماں اسے مجبور کررہی تھی کہ بس تم شو چھوڑ کر اس کے ساتھ چلو اور اس نے بھی فوراً کراچی جانے کی ٹھان لی تھی۔

''مجھے پتا چلا تھا کہ یہ تمہاری سگی ماں نہیں ہے۔ خیر، ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔'' صابر بھائی بولا۔ ''اب تم یہاں رہو، سکون کرو، کھاؤ اور موج کرو۔ تمہیں زرینہ کمرے میں لے جائے گی۔ کل ہم شادی کرلیں گے۔''

رینا غصے میں بھری ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کوئی چیز اٹھا کر صابر کے سر پر دے مارے لیکن وہ تین مردوں کی موجودگی میں ایسا کرنے سے قاصر تھی۔

ایک دم سے کمرے کا دروازہ کھلا اور دو نوجوان اس طرح داخل ہوئے جیسے وہ صابر بھائی کا کمرا نہ ہو بلکہ ان کے گھر کا صحن ہو۔ ان میں ایک کا نام شانی اور دوسرے کا نومی تھا۔ دونوں آوارگی میں صابر بھائی کی دنیا کا حصہ بن گئے تھے اور دونوں پر صابر بھائی بہت اعتبار کرتا تھا۔

شانی کی نگاہ تو رینا پر ہی جم گئی تھی۔ وہ خوبصورت تھی اور پرکشش ایسی کہ شانی پلکیں جھپکانا بھول گیا تھا۔

وہ دونوں اسی طرح آتے جاتے تھے لیکن اس وقت ان دونوں کا اس طرح سے کمرے میں آنا صابر بھائی کو اچھا نہیں لگا تھا۔

''تم دونوں کو کتنی بار کہا ہے کہ میرے کمرے میں اس طرح مت آیا کرو، یہ میرا کمرا ہے، کوئی راستہ نہیں ہے جو ایک طرف سے دوسری طرف جاتا ہے۔'' صابر بھائی کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس نرمی میں کتنا غصہ تھا۔

''آپ نے بلایا تو ہم آگئے۔'' شانی نے کہا۔ اس کی نگاہ رینا پر تھی اور رینا غصے میں بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی لیکن بے بس تھی۔

''زرینہ کو بلاؤ۔'' صابر بھائی نے کہا۔ ایک آدمی باہر گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑی عمر کی چاق و چوبند عورت آگئی۔

''رینا کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور اس کی خوب خدمت کرو۔ اس کے ساتھ رہنا اور جو کمرا اس کے لیے تیار کیا ہے، وہاں رکھنا۔'' صابر بھائی نے کہا۔

رینا اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی مگر اس کے علاوہ چارہ بھی نہیں تھا۔ صابر بھائی سے زیادہ اسے اپنی ماں پر غصہ آرہا تھا جس نے اسے بتائے بغیر ایک لاکھ روپے لے لیے تھے۔ وہ دل ناخواستہ اس کے ساتھ کمرے سے چلی گئی۔ جب تک رینا کمرے سے چلی نہیں گئی، شانی کی نظریں اس کے ساتھ ہی گھومتی رہی تھیں۔

جیسے ہی رینا کمرے سے باہر نکلی، صابر بھائی اپنی جگہ سے اٹھا اور شانی کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا اور اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''ایک بار میرے پالتو طوطے نے میری پسند کی بنی کھیر میں اپنی چونچ ماردی تھی، میں نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ میرا کتنا پالتو اور قریب ہے، میں نے اسی وقت اس کی گردن مروڑ دی تھی۔''

شانی نے گلا صاف کیا اور کھسیانے انداز میں مسکرا کر بولا۔ ''طوطے کو ایسا کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا، غلطی طوطے کی ہے۔''

''غلطی تسلیم کرنے کا موقع مل جائے تو پھر آئندہ ایسی غلطی کرنے کا مطلب موت ہے..... کیونکہ کچھ لوگ معافی صرف ایک بار دیتے ہیں، دوسری بار سزا کا فیصلہ ہی ہوتا ہے۔'' صابر بھائی نے کہہ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنے ساتھ آگے لے جاتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تم دونوں کو پانچ لاکھ روپے دوں گا، وہ تم نے اکبر سیٹھ کو پہنچانے ہیں اور اس میں کوتاہی نہیں کرنی ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ چاہیں تو میں اکیلا ہی دے آتا ہوں۔'' شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم دونوں جاؤ گے، یہ کام ایک گھنٹے کے اندر اندر کرنا ہے۔ وہ انتظار میں ہے ورنہ میرا کام رہ جائے گا۔'' صابر بھائی نے کہہ کر کرسی کے پاس رکھی ٹیبل بجائی اور ان دو آدمیوں کو جو رینا کو لے کر آئے تھے، جانے کا اشارہ کردیا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک آدمی آیا اور اس نے ایک لفافہ صابر بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ صابر بھائی نے شانی کو اشارہ کیا کہ وہ پکڑ لے۔ شانی نے نومی کو اشارہ کیا اور نومی نے وہ لفافہ پکڑ کر اپنے سینے سے لگالیا۔

صابر بھائی نے شانی کی آنکھوں میں اپنی سرخ آنکھیں پیوست کرتے ہوئے کہا۔ ''تم سمجھ گئے ہو، میں نے کیا کہا ہے؟ یہ لفافہ اس کے پاس جائے گا تو میرا کام بنے گا ورنہ کام بگڑ جائے گا اور بگڑنے کی بات میں اس لیے کررہا ہوں کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر یہ کام کرنا ہے۔''

''میں بالکل سمجھ گیا ہوں۔ پہلے کبھی کام میں کوتاہی نہیں ہوئی، اب بھی نہیں ہوگی۔'' شانی پُراعتماد لہجے میں

Scanned with CamScanner

digest library.com

بولا۔ اس نے دونوں کو جانے کا اشارہ کر دیا۔

جب وہ دونوں باہر نکل گئے تو صابر بھائی اپنے پاس کھڑے اس آدمی سے مخاطب ہوا جو لفافہ لے کر آیا تھا۔

"کل میری شادی ہے، تم نے سارے انتظامات دیکھنے ہیں۔ تم نے کیا کرنا ہے، یہ تمہیں جانی سمجھا دے گا۔"

اس آدمی نے بات سن کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

شانی اور نومی اپنی بائیک پر بیٹھے اور اس جانب نکل پڑے جہاں ان کو وہ بند پیسوں کا بھرا ہوا لفافہ پہنچانا تھا۔ شانی کے اعصاب پر رینا کا چہرہ چھایا ہوا تھا۔ ایسی خوبصورت اور پرکشش لڑکی دیکھ کر وہ اس کے خیال کو دماغ سے محو نہیں کر پایا تھا۔

"اس لڑکی کو دیکھ کر آج ایک بات دماغ میں بیٹھ سی گئی ہے۔ پیسا پاس ہو تو انسان دنیا کی جس خوبصورت لڑکی سے چاہے شادی کر سکتا ہے۔ نومی! اس مزدوری کو چھوڑ کر پیسا کمانے کے لیے کوئی بڑا کام کیوں نہیں کرتے ہم؟" شانی اس لڑکی کے خیالوں میں کھویا ہوا بات کر رہا تھا۔

"جو کام کر رہے ہیں، بس اسی کے بارے میں سوچو۔" نومی بولا۔

اچانک نومی کو لگا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ شانی نے ایک دم سے بریک لگا دیے تھے۔

"کیا ہوا؟" نومی نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"وہ دیکھو، جانتے ہو اس عمارت کے اندر جوا ہوتا ہے۔ چلو آج ایک بازی لگاتے ہیں۔" شانی نے سامنے ایک پرانی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس عمارت کے باہر کئی دکانیں تھیں۔

"پاگل تو نہیں ہو گئے؟ بازی لگانے کے لیے پیسا ہونا چاہیے۔" نومی نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہمارے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں، ایک چانس لیتے ہیں۔ جیت گئے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

"ہار گئے تو؟" نومی بائیک سے نیچے اتر کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ "وہ ہمیں جان سے مار دے گا۔"

"ہار گئے تو شہر چھوڑ کر بھاگ جائیں گے، کہیں اور ڈیرے جما لیں گے۔" شانی بولا۔

"اس کے ہاتھ زمین کے نیچے پہلی جڑوں سے زیادہ لمبے ہیں۔ وہ ہمیں ڈھونڈ نکالے گا۔"

"تم ہار کے بارے میں سوچ کیوں رہے ہو؟ جیت کے بارے میں سوچو۔ ایک چانس لیتے ہیں، جیت جائیں گے تو اس کا پیسا اس جگہ پہنچا کر باقی پیسا ہم اپنے پاس رکھ کر اپنا کام شروع کریں گے، گھر بسائیں گے اور اس غلامی والی دنیا کو خیرباد کہہ دیں گے۔"

"نہیں..... نہیں۔" نومی نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔

شانی نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ "ابھی چالیس منٹ باقی ہیں اس کے پاس پہنچنے کے لیے اور وہ جگہ یہاں سے پانچ منٹ کے فاصلے پر ہے۔ صابر بھائی کے پیسے سے بازی لگائیں گے۔ زندگی میں یہ چانس بھی لیتے ہیں۔"

"دیکھو شانی.....!" نومی نے کچھ کہنا چاہا لیکن شانی نے اسے بولنے نہیں دیا۔ بائیک ایک طرف لگائی اور دونوں اس پرانی عمارت کے اندر چلے گئے۔ دروازے پر کھڑا بڑی مونچھوں والا آدمی انہیں جانتا تھا، اس نے ان دونوں کو اندر جانے دیا۔ اندر جاتے ہی شانی نے اپنے موبائل فون کا سوئچ آف کر دیا۔

اندر کا ماحول ہی کچھ اور تھا، جگہ جگہ بازی لگ رہی تھی، جوئے کا بازار گرم تھا۔ ایک شور اور امیر زادوں کا رش دکھائی دے رہا تھا۔

نومی ڈر رہا تھا لیکن شانی ایک چانس لینے کی ٹھان چکا تھا۔ اس کا نتیجہ کیا ہو گا، اس نے اس بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔

"پیسے نکال۔" ایک جگہ رک کر شانی نے کہا تو نومی نے گھبرا کر اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا۔

شانی نے اس سے پیسے لے کر ایک لاکھ کی گڈی نکالی اور آنکھیں بند کر کے کچھ سوچا اور بازی لگا دی۔ اس ٹیبل کے اردگرد ایک درجن سے زیادہ لوگ موجود تھے اور سب اپنی اپنی بازی لگا رہے تھے۔

نومی کو اپنا دل اس وقت رکتا محسوس ہوا جب وہ ایک لاکھ روپے ہار گئے۔

شانی بھی ٹھٹکا۔ ایک لاکھ روپے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ اب تو واپسی کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ ایک لاکھ روپے واپس جیتنے کے لیے بازی لگانی ہی تھی۔ شانی نے ایک بازی اور لگا دی..... اس کے بعد تیسری اور چوتھی۔ وہ چار لاکھ روپے ہار گئے تھے۔

شانی اور نومی کے منہ لٹک گئے، دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، شانی کے ہاتھوں میں لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ نومی کو لگ رہا تھا کہ وہ گر جائے گا۔ صابر بھائی کی سفاکی سے وہ واقف تھے، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ زمین ان پر تنگ ہو جائے گی۔

Scanned with CamScanner

آخری ایک لاکھ روپے بچے تھے اور شانی نے اس پر بھی بازی لگادی..... حیرت انگیز طور پر وہ بازی جیت گیا اور اس کے پاس دو لاکھ روپے مزید آگئے۔ اس کے بعد تو جیسے قسمت نے ساتھ دینا شروع کردیا ہو..... وہ جیتنے لگے تھے۔ جب سات لاکھ روپے ہوگئے تو نومی نے کہا کہ وہ اب مزید کھیلنا بند کرکے ان ہی پیسوں پر اکتفا کرتے ہوئے پانچ لاکھ روپے اس جگہ پہنچا کر باقی دو لاکھ روپیہ اپنے پاس رکھ لیں۔

شانی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے آگے بھی کھیلنا شروع کردیا اور جیت اتنی مقدر ہوئی کہ ان کے پاس پندرہ لاکھ روپے ہوگئے۔

نومی نے اسی جگہ سے ایک سیاہ رنگ کا تھیلا لیا اور اس میں پیسے ڈال کر شانی کا بازو کھینچ کر ایک طرف لے گیا۔

''بس، اب نہیں..... نکلو اس جگہ سے۔'' وہ اسے کھینچ کر دروازے کی طرف لے جارہا تھا کہ ایک آدمی ان کے سامنے آگیا۔

''ایسے نہیں جانا..... ابھی گیم ہوگی اور کھیلنا پڑے گا۔'' وہ آدمی اس کا ساتھی تھا جو زیادہ پیسے ہارا تھا۔

''بس ہم نے جانا ہے، گیم ختم۔'' نومی نے اسے ایک طرف ہٹایا۔

''سنا نہیں، کھیلنا پڑے گا۔'' وہ غصے سے چیخا۔

شانی اور نومی نے اپنے پیچھے دیکھا تو تین اور آدمی اسی طرح کے کھڑے تھے۔ معاملہ بگڑ گیا تھا۔ وہ بازی کھیلنا چاہتا تھا یا نہیں، لیکن یہ وہ جان گئے تھے کہ وہ اپنی ہار کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اب وہ پیسا ان سے چھیننا چاہتے ہیں جو وہ جیت کر لے جارہے تھے۔

''بھاگنے کے لیے تیار رہنا۔'' شانی نے نومی سے سرگوشی کی اور اس آدمی سے بولا۔ ''چلو، کھیلتے ہیں۔''

جونہی وہ آدمی ٹیبل کی طرف جانے کے لیے بڑھا، دونوں نے دروازے کی طرف دوڑ لگادی۔ دونوں نے دروازے کو اتنی قوت سے کھولا کہ باہر کھڑے آدمی کو بھی سنبھلنے کا موقع نہیں ملا اور وہ باہر نکل کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

ان کے پیچھے پانچ آدمی تھے، ایک نے تو خنجر نکال لیا تھا۔ شانی اور نومی کو بائیک کی طرف جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ سامنے بھاگنے لگے، ان کے پیچھے وہ پانچ تھے۔ اچانک ایک بائیک والا بھی کہیں سے نکل کر ان کے پیچھے لگ گیا۔ پورے بازار میں ہلچل برپا ہوگئی۔ شانی اور نومی بھانپ گئے تھے کہ جس طرح سے وہ وحشیانہ انداز میں ان کے پیچھے بھاگ رہے تھے، وہ انہیں جان سے مار کر ہی دم لیں گے اور ایسا اس لیے بھی ممکن تھا کہ وہ سب شہر کے چھٹے ہوئے بدمعاش تھے۔ ان کی نظر پندرہ لاکھ روپے کی رقم پر تھی۔

شانی اور نومی کو اپنی جان بچانا مشکل ہورہا تھا۔ انہیں کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ وہ بھاگتے بھاگتے ریلوے اسٹیشن کے اندر چلے گئے۔ اس وقت ٹرین رینگ رہی تھی۔ وہ دوڑ کر اس میں سوار ہوگئے۔ ٹرین رفتار پکڑنے لگی۔

☆☆☆

دونوں ایک طرف بیٹھ گئے۔ ٹرین کی رفتار بہت تیز ہوگئی تھی۔ نومی نے اس کے کان کے پاس سرگوشی کی۔ ''ہم کہاں جارہے ہیں؟''

''معلوم نہیں۔ بھاگتے بھاگتے بغیر سوچے سمجھے ٹرین میں سوار ہوگئے ہیں۔ ان سے جان بچانی تھی، کسی اگلے اسٹیشن پر اتر جائیں گے۔'' شانی نے جواب دیا۔

''میں نے منع بھی کیا تھا کہ یہ کھیل مت کھیلو۔''

''یہ بھی تو دیکھو اس وقت ہمارے پاس دس لاکھ روپے ہیں۔'' شانی مسکرایا۔

''اس کے پانچ لاکھ کا کیا کرنا ہے؟''

''سوچتے ہیں، ابھی دماغ کام نہیں کررہا ہے۔'' شانی کہہ کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

بیس کلومیٹر کا سفر ٹرین نے اپنی رفتار سے طے کیا۔ اس کے بعد ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی اور پھر وہ رینگنے لگی۔ مختلف چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ دس کلومیٹر کا سفر اسی رفتار میں گزر گیا اور ایک چھوٹے شہر کا اسٹیشن آگیا۔ ٹرین رک گئی۔

دونوں باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ انجن میں خرابی پیدا ہوگئی تھی اور ڈرائیور سست رفتاری میں یہاں تک لے آیا تھا۔

''اب کیا کریں؟'' نومی نے پوچھا۔

''باہر نکلتے ہیں، کہیں سے چائے پیتے ہیں اور سوچتے ہیں کیا کرنا ہے۔'' شانی کہتا ہوا ایک طرف چلنے لگا۔ دونوں باہر نکلے۔ چلتے ہوئے شانی نے موبائل فون آن کیا تو ایک دم سے صابر بھائی کی کال آگئی۔

''صابر بھائی کی کال ہے۔'' شانی بولا۔

''اب بات کرو، مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو۔'' نومی نے کہا۔

''بات کرنے میں کیا ہرج ہے۔'' شانی نے کہتے ہوئے موبائل فون کان سے لگالیا۔ دوسری طرف سے صابر بھائی کی مخصوص نرم و شیریں لہجے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ دونوں ایک طرف رک گئے۔

Scanned with CamScanner

digest library.com

"میرے بچے اپنے پیسے لیں پہنچے اور تم دونوں بھی غائب ہوئے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کچھ لوگ تم دونوں کے پیچھے تھے اور تم دونوں بھاگ کر ٹرین میں سوار ہو گئے تھے۔"

صابر بھائی کی پکی معلومات پر شانی نے ہونٹ بھینچ لیے اور کہا۔ "صابر بھائی! بس لڑائی ہو گئی تھی اور بھاگنا پڑا۔"

"نہ..... نہ..... جھوٹ نہیں۔ تم دونوں نے جوا کھیلا تھا اور دس لاکھ روپے جیتے تھے۔ اب تم دونوں کے پاس میرے پندرہ لاکھ روپے ہیں، وہ لے کر میرے پاس آجاؤ۔"

"آپ کے پانچ لاکھ روپے ہیں۔"

"میرے پانچ لاکھ سے تم نے دس لاکھ روپے جیتے ہیں اس لیے وہ پیسا بھی میرا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ تم دونوں پیسے اور رینا کو لے کر کب تک میرے پاس پہنچ رہے ہو؟"

"رینا.....؟" شانی سوال کرتے ہوئے چونکا۔ "رینا کون اور یہ بیچ میں کہاں سے آگئی؟"

"رینا بھی فرار ہو گئی ہے اور میرا قوی امکان بلکہ یقین ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ہے۔"

"رینا ہے کون؟"

"وہی رینا جس کو دیکھتے ہی تم پتھر کے ہو گئے تھے، جس سے میں شادی کرنا چاہتا تھا۔ جس کو تم نے جانے کیا اشارہ کیا تھا کہ تم اسے بھی ساتھ لے گئے۔ رینا اور پندرہ لاکھ روپے لے کر میرے پاس آجاؤ ورنہ تم دونوں کے لیے میں زمین تنگ کر دوں گا۔ میں تمہیں دوبارہ دس منٹ کے بعد فون کرتا ہوں۔" اس نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ نومی نے بھی ساری بات سن لی تھی۔

"رینا کا الزام بھی ہم پر لگا دیا ہے۔ وہ کب بھاگی اور کہاں ہے، ہمیں کیا معلوم۔" شانی بولا۔

"میں یہاں ہوں۔" عقب سے آنے والی نسوانی آواز نے دونوں کو بری طرح سے چونکا دیا۔ دونوں نے بیک وقت پیچھے دیکھا تو رینا ان کے پیچھے کھڑی تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" شانی نے تحیر آمیز آواز میں پوچھا۔

"جب مجھے زرینہ کمرے میں لے کر گئی تو میں نے وہاں پڑا اسٹیل کا جگ اٹھایا اور اس کے سر پر دے مارا۔ وہ اسی وقت بے ہوش ہو گئی۔ میں وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی اور سیدھی ریلوے اسٹیشن چلی گئی۔ مجھے کراچی جانا تھا۔ جو ٹرین کھڑی تھی اس میں بیٹھ گئی پھر مجھے تم دونوں نظر آئے، پھر ٹرین خراب ہو گئی۔ ویسے بھی وہ ٹرین کہیں اور جا رہی تھی۔ تم دونوں باہر نکلے تو میں بھی باہر تم دونوں کے پیچھے آگئی۔ مجھے کسی طرح سے کراچی پہنچا دیں، مہربانی ہو گی۔" رینا نے تیسرے بیچ میں تفصیل بتا دی۔

"تم جانتی ہو کہ ہم صابر بھائی کے آدمی ہیں پھر بھی تم ہمارے پیچھے آگئیں؟" نومی نے کہا۔

"جب میں ایک طرف چھپ کر کھڑی تھی تو تم دونوں اپنی بائیک کی طرف جاتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ یہ پتا نہیں کب مرے گا اور کب اس سے جان چھوٹے گی، اس لیے میں سمجھ گئی کہ تم دونوں بھی اس سے تنگ ہو۔ ویسے بھی اس اجنبی شہر میں تم دونوں کے علاوہ میں کسی کو جانتی نہیں ہوں۔"

"تم ہمیں جانتی ہو؟" شانی نے پوچھا۔

"ہاں، جانتی ہوں۔ تم صابر بھائی کے آدمی ہو اور اس کے کمرے میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔" وہ مسکرائی۔

"پرانی جان پہچان ہے۔" شانی نے بھی مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہم پہلے ہی ایک مسئلے میں پھنسے ہوئے تھے اور اوپر سے تم بیچ میں آگئی ہو۔ اس کمینے کی بات تو بیچ ثابت ہو گئی کہ تم ہمارے ساتھ ہو۔"

"آپ مجھے کسی طرح سے کراچی پہنچا دیں، یہاں رہی تو یہ میری زندگی کو جہنم بنا دے گا اور کراچی جا کر مجھے کسی

متحدہ عرب امارات میں مقیم

اردو قارئین کے لیے خوشخبری

جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز کراچی (پاکستان)

کے چاروں رسائل

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،

ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت

ایک فون کال کے فاصلے پر

آپ کال کریں، مطلوبہ رسالہ آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔

اُردو بک ورلڈ ایف زیڈ سی۔ بزنس سینٹر، شارجہ پبلشنگ سٹی

فری زون، الزاہیہ، شیخ محمد بن زاید آر ڈی، ای 311 شارجہ

97150480573 4

URDU BOOKS WORLD FZC.
BUSINESS CENTRE
SHARJAH PUBLISHING CITY
FREE ZONE, AL ZAHIA,
SHEIKH MOHAMMED BIN ZAYED RD,
E311, SHARJAH, UNITED ARAB EMIRATES

Scanned with CamScanner

سے حساب بھی چکتا کرنا ہے اور کام بھی کرنا ہے۔" رینا نے اپنی ماں کا تصور کر کے دانت پیسے۔

"شانی! یہ بازار وہی نہیں ہے جہاں ولاور رہتا ہے؟" نومی نے ارد گرد دیکھتے ہوئے کہا۔

شانی نے بھی دیکھا۔ "ہاں یہ وہی بازار ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ جس ٹرین میں ہم سوار ہوئے تھے، اس کے بارے میں وہ معلومات لے چکا ہوگا۔ اسے یہ خبر مل چکی ہوگی کہ ٹرین خراب ہو کر اس شہر کے چھوٹے سے پلیٹ فارم پر کھڑی ہے اور ولاور کو وہ ہمارے بارے میں اطلاع کر چکا ہوگا۔" نومی سوچتے ہوئے بولا۔

"صابر بھائی کے کام کرنے کے طریقے کو ہم سے زیادہ کون جانتا ہے۔ نکلو یہاں سے فوراً۔" شانی نے ابھی کہا ہی تھا کہ اس کے موبائل فون کی میسج ٹون نے اسے روک لیا۔ اس نے موبائل فون کھولا تو اسے ایک تصویر موصول ہوئی۔ وہ دونوں اور درمیان میں رینا کھڑی تھی۔ تصویر کسی اچھے کیمرے سے لی گئی تھی۔ ابھی وہ تینوں متحیر اس کی تصویر کو دیکھ رہے تھے کہ صابر بھائی کی کال آ گئی۔

شانی نے فون کان سے لگاتے ہی کہا۔ "ہیلو۔"

"تم نے تصویر دیکھی؟ میرے آدمی نے یہ تصویر کھینچ کر مجھے بھیجی اور میں نے تمہیں بھیج دی۔ اب جہاں تم کھڑے ہو، وہاں میرے آدمی پہنچ چکے ہیں۔ تم تینوں چپ چاپ خود کو میرے آدمیوں کے حوالے کر دو، باقی بات بعد میں کریں گے۔" صابر بھائی کا لہجہ مٹھاس بھرا تھا۔

شانی نے متلاشی نگاہوں سے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ "صابر بھائی! ہمارا بھاگنے کا ارادہ نہیں تھا، ہم جان بچانے کے لیے بھاگے تھے۔ آپ کے پانچ لاکھ روپے....."

صابر بھائی نے فوراً بات کاٹ دی۔ "پانچ لاکھ روپے نہیں، پندرہ لاکھ روپے اور میری جان رینا!"

"صابر بھائی! ہم بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" شانی کی نگاہیں مسلسل دائیں بائیں گھوم رہی تھیں اور وہ ایسے آدمی کی تلاش میں تھا جو مشکوک دکھائی دے رہا ہو۔ فی الحال اسے کوئی ایسا دکھائی نہیں دیا تھا، اس کا مطلب تھا کہ باقی لوگ ابھی آ رہے تھے یا پھر وہ اس طرح سے موجود تھے کہ شانی ان کی شناخت نہیں کر سکا تھا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ اپنے آپ کو میرے آدمیوں کے حوالے کر دو۔" صابر بھائی نے اطمینان سے کہا۔

شانی کے عین سامنے سے رکشا گزرا تو ایک دم سے ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے دونوں کو اشارہ کیا اور وہ جلدی سے رکشے میں بیٹھ گئے۔

"فلیٹ منڈی چلو۔" شانی نے موبائل فون بند کر کے اس سے کہا۔

"جناب! یہ ساتھ ہی تو فلیٹ منڈی ہے۔" رکشا ڈرائیور نے کہا۔

رکشا ڈرائیور کا جواب سن کر وہ دونوں تذبذب میں ہی تھے کہ رینا جلدی سے بولی۔ "بھائی تم رکشا آگے بڑھاؤ، ہمیں جہاں اترنا ہوگا ہم بتا دیں گے۔"

جب رکشا اس جگہ سے کافی آگے چلا گیا تو انہوں نے رکشا رکنے کو کہا۔

"تم یہ پیسے پکڑو..... ہم اترتے ہیں۔" شانی نے سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا اور تینوں باہر نکل گئے۔ رکشا انہیں اس جگہ سے کافی آگے لے آیا تھا۔ وہ چلتے ہوئے سامنے سے دائیں مڑے تو ایک پارک سے کچھ آگے ایک پرانا سا کرایہ دکھائی دیا۔ وہ اس طرف چلے گئے۔ وہ کرایہ الگ تھلگ اور خالی تھا جس کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ اندر چلے گئے۔

نومی بولا۔ "دیکھو شانی! ہم جانتے ہیں کہ صابر بھائی کے تعلقات اور ہاتھ اس درخت کی شاخوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمارے سامنے کون صابر بھائی کا آدمی ہے اور کون ہمارا سجن ہے..... ہم نہیں جانتے۔ ہمارا بھاگنا مشکل ہو جائے گا۔"

"پھر کیا کریں؟" شانی نے اس کی طرف دیکھا۔

"صابر بھائی کے پاس چلتے ہیں اور سارا پیسا دے کر اس سے معافی مانگ لیتے ہیں۔" نومی نے مشورہ دیا۔

"میں نہیں جاؤں گی، مجھے کسی طرح سے کراچی کی ٹرین میں بٹھا دینا۔" رینا بولی۔

"جیتا ہوا پیسا صابر بھائی کو واپس ہی کرنا تھا تو بازی کیوں کھیلی؟ میں پیسا واپس نہیں کروں گا۔" شانی نے کہا۔

"وہ ہمیں مار دے گا۔" نومی بولا۔ "ہم ایک بہت بڑی غلطی کر بیٹھے ہیں۔ ہم کتنا بھاگ سکتے ہیں اور کب تک بھاگیں گے؟ ایک دن وہ ہمیں مار دے گا۔"

شانی سوچ میں پڑ گیا۔ ایک طرح سے نومی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، فرار ہونا ان کے لیے مشکل تھا۔ دس لاکھ روپے ایک بڑی رقم تھی، وہ اسے واپس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔

"میں تب بھی کہہ رہا تھا کہ جوا کھیلنے کا تمہارا فیصلہ غلط تھا۔ اچھا خاصا سکون تھا اور اب پھنس گئے ہیں۔" نومی پھر

Scanned with CamScanner

بولا۔ ''ہم اپنے آپ کو اس کے حوالے کردیں یا بھاگتے رہیں، وہ ہمیں دونوں صورتوں میں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اب ہمیں کچھ ایسا سوچنا پڑے گا کہ ہم نے زندہ رہنا ہے تو وہ زندہ نہ رہے۔''

''تم دونوں کب سے اس بھیڑیے کے ساتھ ہو؟'' رینا نے سوال کیا۔

''کئی سال ہوگئے ہیں۔'' نومی نے آہستہ سے جواب دیا۔

''کئی سالوں میں تم دونوں کو یہ تو پتا ہوگا کہ اس کی کمزوری کیا ہے؟ اس کمزوری کی دُم پر پیر رکھ دو، شاید ہم تینوں اس سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوجائیں۔'' رینا نے کہا تو دونوں نے ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس وقت اس کی کمزوری تو تم ہو، اس وقت تو وہ تمہارے لیے تڑپ رہا ہے۔'' شانی بولا تو رینا دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''ہم ایک سودا کرتے ہیں۔ رینا کو ایک جگہ بند کردیتے ہیں اور صابر بھائی سے کہتے ہیں کہ بیس لاکھ روپے اور دبئی جانے کے لیے دو ٹکٹ ہمیں دو اور رینا کو واپس لے لو۔''

''تم مجھے اس وحشی کے حوالے کردو گے؟'' رینا نے اس کی طرف آنکھیں نکال کر دیکھا۔

''تمہیں اس کے حوالے نہیں کریں گے بلکہ ایک ڈراما کریں گے۔ اس سے ایک بیگ میں بیس لاکھ روپے اور دو ٹکٹ دبئی کے منگوائیں گے، اسے ایک جگہ کا بتائیں گے کہ وہاں گاڑی میں پیسوں کا بیگ چھوڑ کر چلا جائے۔ میں وہاں پہنچوں گا اور گاڑی کو کچھ آگے لے جاکر نوٹوں کا بیگ نکالوں گا اور وہاں سے فرار ہوجاؤں گا۔ نومی اور تم اس شہر سے گاڑی رینٹ پر لے کر وہاں پہنچو گے۔ اسی گاڑی میں ہم سڑک کے ذریعے کسی بڑے شہر میں پہنچیں گے اور پھر ہر بڑے شہر سے گاڑی بدل کر کراچی پہنچ جائیں گے۔'' شانی نے اختصار سے پلان بتانے کی کوشش کی۔

''آئیڈیا اچھا ہے۔'' رینا خوش ہوکر بولی۔

''وہ رینا کا پوچھے گا؟'' نومی نے کہا۔

''میں بتادوں گا کہ رینا فلاں جگہ ہے، وہاں پہنچ جائے۔ وہ جگہ ہم بعد میں سوچ لیں گے۔ میں ابھی کال کرتا ہوں پھر کرائے پر گاڑی لے کر ہم اپنے شہر کے لیے نکل کر کسی محفوظ جگہ رک جائیں گے۔ میں اتر کر ساری کارروائی کرکے تمہیں کال کروں گا تم اس جگہ پہنچ جانا۔''

''ہم دبئی جائیں گے؟'' نومی نے سوال کیا۔

''نہیں۔'' شانی نے نفی میں گردن ہلادی۔

''پھر دبئی کے ٹکٹ کیوں منگوا رہے ہو؟'' اس نے جاننا چاہا۔

وہ مسکرایا۔ ''یہ صرف دھوکا ہے تاکہ اسے پتا چلے کہ ہم دبئی جارہے ہیں، اگر وہ کچھ کرنا بھی چاہے گا تو اس کی توجہ کا مرکز وہ ائرپورٹ ہوگا جہاں سے ہم دبئی جانے والے ہوں گے۔''

''کراچی جاکر کیا کریں گے؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''رینا کو اس کی ماں کے پاس چھوڑ کر وہاں سے کسی دوسرے ملک نکلنے کا انتظام کریں گے۔''

نومی سوچنے لگا۔ وہ مختلف پہلوؤں پر غور کررہا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ خطرہ بھی مول لیتے ہیں۔ شانی نے صابر بھائی کو کال کی۔

''صابر بھائی! ہم اب آپ کے ساتھ کام نہیں کریں گے اس لیے ہمیں نکلنے کا محفوظ راستہ دے دو اور رینا کو ہم آپ کے حوالے کردیتے ہیں۔'' ایک دو باتوں کے بعد شانی مطلب کی بات پر آگیا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' صابر بھائی نے متانت سے پوچھا۔

''آپ کا ایک آدمی گاڑی لے کر اس جگہ پہنچے گا جہاں کا میں بتاؤں گا۔ اس گاڑی میں بیس لاکھ روپے کا بیگ ہوگا، ساتھ دبئی جانے کے دو ٹکٹ ہوں گے۔ گاڑی چھوڑنے سے پہلے وہ آدمی لائیو ویڈیو سے ہمیں دکھائے گا کہ بیگ میں پیسے ہیں۔ گاڑی چھوڑ کر وہ چلا جائے اور ہم گاڑی کو اپنے قبضے میں کرتے ہی آپ کو بتادیں گے کہ رینا کہاں ہے..... آپ اپنے راستے اور ہم اپنے راستے۔'' شانی نے بتایا۔

صابر بھائی سوچنے لگا۔ ''جانتے ہو میرے لیے رینا کیا ہے؟ اگر تم نے دھوکا دیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''ہم کیوں دھوکا دیں گے۔ رینا آپ کی ہے، ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔'' شانی نے کہا۔

''ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔ بتاؤ گاڑی اور دو ٹکٹ کہاں بھیجوں؟'' صابر بھائی بولا۔

''آپ انتظام کریں، میں آپ کو ایک گھنٹے بعد کال کرتا ہوں۔'' شانی نے کہہ کر کال منقطع کردی۔

''میرے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کرنا، مجھے اس کے حوالے نہیں کرنا، میں تمہیں بتارہی ہوں۔'' رینا نے کہا۔

''ایسا نہیں ہوگا، تم بے فکر رہو اور نکلنے کی تیاری کرو۔'' وہ تینوں باہر نکلے اور دائیں بائیں دیکھ کر ایک رکشے

Scanned with CamScanner

digest library.com

کی طرف چلے گئے۔

اس رکشے نے انہیں اس جگہ پہنچا دیا جہاں سے کرائے پر کاریں ملتی تھیں۔ ایک کے ساتھ انہوں نے معاملہ طے کیا اور اس میں سوار ہو گئے۔ وہ کار اس شہر کی طرف روانہ ہو گئی جہاں صابر بھائی رہتا تھا۔

☆☆☆

صابر بھائی گہری سوچ میں تھا۔ اس کے پاس اس کا وہ آدمی کھڑا تھا جس کا نام شوکت تھا۔ اس کے تمام خاص اور اہم کام وہی کرتا تھا۔ جب شانی کی کال آئی تھی تو وہ بھی کال سن رہا تھا کیونکہ صابر بھائی نے اسپیکر آن کیا ہوا تھا۔

''رینا کے لیے ہمیں شانی کی بات ماننا پڑے گی ورنہ وہ رینا کو نقصان پہنچائے گا۔'' صابر بھائی بولا۔

''اجازت ہو تو ایک عرض کروں؟'' شوکت نے انکساری سے اجازت چاہی۔ صابر بھائی نے اشارہ کیا تو وہ بولا۔ ''ایک یہ ہی رینا کیا، زندگی میں اور بھی کئی حسین رینا آجائیں گی۔ ہم تینوں کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔''

اس کی بات سنتے ہی صابر بھائی نے وحشت ناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ شوکت گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس غصے میں بھی وہ اپنے اسی لہجے میں بولا۔ ''آئندہ تم نے رینا کے بارے میں ایسی بات کی تو کسی چوراہے میں کٹورا لیے دکھائی دو گے۔''

''میں معافی چاہتا ہوں۔'' شوکت جلدی سے بولا۔

''ایک بیگ لو، اس میں بیس لاکھ روپے ڈالو اور بیگ کو ایک گاڑی کے اندر رکھو۔ تم گاڑی لے کر جاؤ گے۔ کسی سے کہہ کر دو ٹکٹ دبئی کے بھی منگوا لو۔''

''جی بہتر۔'' اس نے اثبات میں مؤدبانہ گردن ہلائی۔

''کوئی گڑبڑ نہیں ہو، یہ کام صرف تم کرو گے۔ رینا کے جسم پر آئی خراش اس بات کا اشارہ ہو گی کہ میں تمہاری گردن اڑا دوں۔''

شوکت نے بہ مشکل تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں، میں کام ذمے داری سے کروں گا۔''

''اب جاؤ اور بیس لاکھ روپے بیگ میں ڈال کر میرے پاس آجاؤ تاکہ میں بھی تسلی کر لوں۔'' صابر بولا تو شوکت کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

جب گاڑی شہر کے اندر داخل ہو گئی تو شانی نے گاڑی کو ایک جگہ روکنے کا کہا اور باہر نکل کر صابر بھائی کو کال کر کے اس جگہ کے بارے میں بتایا جہاں انہیں پیسوں کے بیگ والی گاڑی ملنی تھی۔

صابر بھائی نے بتایا کہ گاڑی بیس منٹ میں اس جگہ موجود ہو گی اور ساتھ ہی یہ بھی تاکید کی کہ اگر رینا کے بارے میں کسی قسم کی غلط بیانی ہوئی تو وہ ایسا بھونچال برپا کر دے گا کہ ان کو اپنے اردگرد ایسی دیواریں کھڑی محسوس ہوں گی کہ کسی طرف جانا تو درکنار، سانس لینا بھی مشکل ہو جائے گا۔

صابر بھائی نے جس طرح سے بات کی تھی، ایک بار تو شانی کو بھی اپنی رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

شانی نے جس جگہ کے بارے میں بتایا تھا، وہ اس جگہ سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھی۔ وہ ڈبل سڑک تھی اور اس کے دائیں بائیں درخت اور بڑی بڑی جھاڑیاں ایستادہ دکھائی دیتی تھیں۔ اس طرف ٹریفک کا اتنا بہاؤ نہیں تھا۔ وہاں زیادہ تر ویرانی ہی دکھائی دیتی تھی۔

ان سے پہلے شوکت گاڑی لے کر وہاں کھڑا تھا۔ شانی پیچھے ہی گاڑی سے اتر گیا اور نوی گاڑی کو دوسری طرف لے گیا۔ وہاں ایک ریستوران تھا۔

شانی پیدل ہی اس گاڑی تک پہنچا۔ جونہی وہ گاڑی کے پاس گیا، شوکت گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

''بیگ کھولو۔'' شانی نے کہا۔ اس کا ایک ہاتھ جیکٹ کے ایک طرف اپنی پسلیوں کے ساتھ ایسے لگا ہوا تھا جیسے وہاں اس کا پستول ہو۔

اس نے بیگ کی زپ کھولی۔ شانی نے اچھی طرح نوٹ دیکھے اور اسے جانے کا اشارہ کر دیا۔ شوکت چلنے لگا۔ شانی گاڑی کے اندر بیٹھا اور اسے بیک کرتا ہوا پیچھے لے گیا۔ اس جگہ سڑک بل کھا رہی تھی اور شوکت اس کی نظر سے اوجھل ہو گیا تھا۔

شانی بیگ لے کر نیچے اترا اور نوی کو کال کر دی۔ دو منٹ کے بعد شانی گاڑی لے آیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھا اور وہ اس جگہ سے آگے نکل گئی، ساتھ ہی صابر بھائی کی کال آگئی۔

''تمہارا کام ہو گیا ہے؟''

''ہاں۔''

''رینا کہاں ہے؟''

''دبئی جانے کا ٹائم دو گھنٹے کے بعد ہے، سوار ہوتے ہی بتا دوں گا۔'' شانی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، میں انتظار کر رہا ہوں۔'' صابر بھائی نے بڑے اطمینان سے کہا۔

فون منقطع ہوتے ہی شانی نے مسکرا کر نوی کی طرف دیکھا۔ اب وہ اس کار میں خوشی کا کوئی ایسا نعرہ نہیں لگا سکتے

Scanned with CamScanner

تھے کہ ڈرائیور انہیں دیکھتا اور وہ اس کی نظر میں مشکوک ہو جاتے، اس لیے وہ تینوں اپنی خوشی کو دبائے ہوئے تھے۔

ان کی کار بڑی تیزی سے شاہراہ پر دوڑ رہی تھی۔ وہ ایک بڑے شہر کی طرف رواں دواں تھے جو چار گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اس شہر میں جا کر انہوں نے اس گاڑی کو چھوڑ کر نئی گاڑی لے لینی تھی اور اسی طرح انہوں نے کراچی پہنچ جانا تھا۔

ابھی شہر سے دس کلومیٹر کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ ایک کار تیزی سے انہیں کراس کر کے آگے نکل گئی اور دوسری کار ان کی گاڑی کے پیچھے چلنے لگی جبکہ ایک اور کار اس کار کے پیچھے سے نکلی اور ان کی کار کے برابر میں دوڑنے لگی۔

شانی اور نومی متحیر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی گاڑی اور آگے گئی تو ڈرائیور کو اپنی کار کی رفتار آہستہ کرنا پڑی کیونکہ سامنے ایک کار اس طرح سے کھڑی تھی کہ راستہ تو تھا لیکن جانے کس وقت وہ آگے پیچھے ہو جاتی اور حادثے کی وجہ بن جاتی۔

اس دوران ان کے برابر چلنے والی کار بھی آگے نکلی اور جو راستہ نظر آ رہا تھا، اس کار نے اسے بند کر دیا۔

شانی، نومی اور رینا کے چہروں پر حیرت تھی۔ ڈرائیور نے کار کھڑی کر دی، پچھلی کار ان کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ اس کار سے تین افراد باہر نکلے، انہوں نے آگے بڑھ کر کار کے دروازے کھولے اور تینوں کو باہر نکال کر اس کار کی طرف لے گئے جس سے وہ اترے تھے۔ ایک نے پیسوں کا بیگ نکال لیا اور ڈرائیور کو اشارہ کیا کہ وہ اس جگہ سے چلا جائے۔ بے چارہ ڈرائیور ڈر کر اس جگہ سے ایسے بھاگا جیسے وہ ایک لمحہ تاخیر کا شکار ہوا تو وہ اسے گولی سے اڑا دیں گے۔

ان تینوں کو انہوں نے الگ الگ تینوں گاڑیوں میں بٹھایا اور واپسی کے لیے چل دیے۔ سارا کام بڑی تیزی اور مستعدی سے ہوا تھا۔

گاڑیاں واپس اپنے شہر کی طرف دوڑ رہی تھیں۔ شانی اور نومی سوچ رہے تھے کہ انہوں نے ہر طرح کی احتیاط سے کام لیا تھا، پوری تسلی کی تھی کہ ان کے پیچھے کوئی ہے تو نہیں۔ انہوں نے راستہ بھی محفوظ چنا تھا پھر بھی وہ پکڑے گئے۔ کس نے مخبری کی تھی؟ دونوں کو لگا جیسے رینا نے انہیں دھوکا دیا تھا ورنہ وہ جان بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ کدھر گئے ہیں۔

☆☆☆

صابر بھائی کے چہرے پر کسی فاتح جیسی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اس کے سامنے وہ تینوں کھڑے تھے اور درمیان میں پیسوں کا بیگ رکھا تھا جس میں اب وہ پندرہ لاکھ روپے بھی شامل ہو گئے تھے جو پہلے سے شانی کے پاس تھے۔ صابر بھائی کے پیچھے اس کے تین آدمی اسلحے سمیت کھڑے تھے جبکہ شوکت چہرے پر مسکراہٹ سجائے صابر بھائی کے بائیں جانب کھڑا تھا۔

"تم کیا سمجھتے تھے کہ بھاگ جاؤ گے؟ تم تینوں کا خیال تھا کہ مجھے چکما دے دو گے، دبئی کے ٹکٹ لو گے اور نکلنے کی کوشش سڑک سے کرو گے؟" صابر بھائی کہہ کر باریک سی ہنسی ہنسا۔ "جان گئے ہو میری طاقت کے بارے میں؟"

شانی اور نومی ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکے تھے کہ صابر بھائی کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ کس راستے سے جا رہے ہیں۔

صابر بھائی بولا۔ "دیکھو، تم نے کہا دو ٹکٹ دبئی کے اور بیس لاکھ روپے بیگ میں ڈال کر پہنچا دو۔ میں نے تمہاری بات مانی اور بیگ تمہاری بتائی ہوئی جگہ پہنچا دیا، اپنی قیمتی گاڑی بھی چھوڑ دی۔ تم مجھے ایک بات کہتے کہ یہ کام نہیں کرنا تو میں وہ کام نہ کرتا — تم نے کہا نہیں تھا اس لیے میں نے وہ کام کر دیا اور تم تینوں تک آسانی سے پہنچ گیا۔" صابر بھائی پھر مسکرایا۔

شانی اور نومی مزید اس کی طرف متوجہ ہو گئے کہ وہ یہی تو جاننا چاہتے تھے کہ اس نے کیا کام کیا تھا جس سے وہ ان تک پہنچ گیا تھا۔

صابر بھائی نے مسکراتے ہوئے شوکت کو اشارہ کیا۔ شوکت آگے بڑھا اور اس نے بیگ کی زپ کھول کر اندر کسی خفیہ خانے سے ایک موبائل فون نکالا اور سامنے رکھ دیا۔ شانی اور نومی نے اس موبائل فون کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ اسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔

صابر بھائی بولا۔ "اگر تم کہتے کہ بیگ میں موبائل فون نہ ہو جس سے ہماری لوکیشن کا پتا چلے..... تو میں ایسا نہ کرتا۔ تم نے نہیں کہا تھا اس لیے میں نے موبائل فون رکھ دیا اور یہ لوگ لوکیشن پر پہنچ گئے۔"

شانی اور نومی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایسا منہ بنا لیا جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ ابھی انہیں صابر بھائی کے چنگل سے فرار ہونے کے لیے اس سے زیادہ دماغ اور سوچ کی ضرورت ہے۔

"اب میں تمہیں سزا دوں گا۔" صابر بھائی نے کہا۔

نومی جلدی سے آگے بڑھا اور بیچارگی سے بولا۔

"آپ میری بات کا یقین کریں، میں نے شانی سے کہا تھا

Scanned with CamScanner

digest library.com

کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ صابر بھائی ہمارے مائی باپ ہیں، انہیں چھوڑنا ایسے ہی ہے جیسے ہم سائبان چھوڑ دیں..... صابر بھائی! میں اس حق میں نہیں تھا لیکن یہ نہیں مانا..... میں زندگی کی آخری سانس تک آپ کے قدموں میں رہنا چاہتا ہوں۔"

شانی کو نومی کے اس تغیر پر حیرت ہو رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا دوست ایسا کہہ رہا ہے اور وہ بھی اپنی جان بچانے کے لیے۔

"اب سزا تم دونوں کو ملے گی۔" صابر بھائی نے اس کی بات سن کر اپنا فیصلہ سنایا۔

نومی، شوکت کی طرف بڑھا۔ "آپ بھی میرے مائی باپ ہو۔ میری سفارش کرو، یقین کرو کہ میں اتنا قصوروار نہیں ہوں جتنا شانی ہے۔"

"یہ واویلا چھوڑ دو نومی! سزا تو ملے گی۔" صابر بھائی نے پُرسکون انداز میں کہا لیکن شوکت کو بھی معلوم نہیں ہوا تھا کہ اس نے جو پستول اپنی پینٹ میں ٹھونسی ہوئی تھی، وہ نومی نے نکال لی تھی۔

اسی لمحے نومی نے شوکت کو ان تین آدمیوں کی طرف دھکا دیا اور پستول صابر بھائی کی کنپٹی پر رکھ کر اسے قابو کر لیا۔

"میں صابر بھائی کو گولی مار دوں گا اگر کسی نے کوئی شرارت کی۔" وہ دہاڑا۔

کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہوگا۔ جو جہاں تھا، وہ اسی جگہ رک گیا۔ شانی نے آگے بڑھ کر ان تینوں کی تلاشی لے کر ان سے اسلحہ لیا اور ان سب کو ایک طرف ہونے کا حکم دیا۔ وہ ایک طرف ہو گئے۔

صابر بھائی کی کنپٹی پر پستول لگا ہوا تھا اور اسے پتا تھا بازی پلٹ جائے گی۔ شانی کے کہنے پر رینا نے پیسوں کا بیگ اٹھایا اور وہ صابر بھائی کو کمرے سے باہر لے گئے۔ باہر جاتے ہی انہوں نے دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔

نومی نے صابر بھائی کی پشت پر پستول رکھا ہوا تھا اور وہ بے بسی سے ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ شانی آگے تھا اور اس کے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے۔ گیٹ پر مامور آدمیوں نے دیکھا تو شانی کے للکارنے پر وہ بھی ایک طرف ہو گئے اور شانی کے کہنے پر گیٹ کھول دیا۔

وہ تینوں صابر بھائی کو لے کر گاڑی میں بیٹھے، باہر نکلے اور باہر نکلتے ہی شانی نے گاڑی ایک طرف دوڑا دی۔

"سچ بتانا، اس گاڑی میں ٹریکر لگا ہے؟" نومی نے غصے سے پوچھا۔

"نہیں لگا۔" صابر بھائی کی آواز دھیمی تھی۔

"اگر ایسا کچھ ہوا تو میں تمہیں گولی مار دوں گا..... سمجھے۔"

"یقین کرو، میں سچ کہہ رہا ہوں کہ اس میں کوئی ٹریکر نہیں ہے۔" صابر بھائی بولا۔

شانی نے گاڑی کی رفتار بہت تیز رکھی تھی۔ وہ شہر سے باہر نکل گئی تھی۔ وہ تینوں مستعد تھے اور بار بار دائیں بائیں، آگے پیچھے دیکھ رہے تھے۔ گاڑی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔

"تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو۔" صابر بھائی نے اس حالت میں بھی انہیں دھمکایا۔

"ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔" شانی بولا۔

گاڑی مسلسل دوڑ رہی تھی، صبح سے شام ہو گئی تھی اور کئی گھنٹوں کا مسلسل سفر ہو گیا تھا۔ اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ ایک ویران سڑک تھی، دائیں بائیں جنگل تھا۔ شاذ و نادر کوئی گاڑی گزرتی نظر آ جاتی تھی ورنہ مکمل خاموشی تھی۔

شانی نے ایک جگہ گاڑی روک دی اور نومی سے کہا۔

"اسے نیچے اتارو، اتارنے سے پہلے اس کا موبائل فون اور پرس لے لینا۔"

نومی نے تلاشی لی اور جو کچھ ملا، نکال کر اسے گاڑی سے باہر اتار دیا۔ صابر بھائی گھبراہٹ اور خوف میں بولا۔

"مجھے کیوں اتار رہے ہو..... اس جنگل میں مجھے اکیلا چھوڑنے کا ارادہ ہے؟"

"ایسا ہی ہے، تم نے ہی کہا تھا کہ میری طاقت دیکھی ہے، اب دکھاؤ اپنی طاقت۔" نومی نے کہہ کر اسے ایک طرف دھکا دیا تو وہ سڑک پر جا گرا۔ نومی نے کار کا دروازہ بند کیا اور کار دھول اڑاتی آگے نکل گئی۔

صابر بھائی اس ویران بیابان میں اکیلا ہی چلایا۔

"رک جاؤ..... مجھے یہاں مت چھوڑو..... رک جاؤ.....!"

وہ پاگلوں کی طرح دوڑنے لگا، دوڑتے دوڑتے وہ گرا اور جسے اپنی طاقت پر زعم تھا، وہ خاک آلود ہو چکا تھا۔ وہ بہ مشکل اٹھا ہی تھا کہ اسے لگا جیسے کچھ خونخوار کتوں کے غرانے کی آوازیں آ رہی ہوں۔ وہ مکمل خوف کی تصویر بن چکا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے متوحش نظروں سے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو اس کی آنکھیں ابل کر جیسے باہر آ گئیں۔ خونخوار کتوں کا ایک ٹولا اسے بھنبھوڑنے کے درپے تھا۔

***

Scanned with CamScanner

بڑھاپا بھی کیا چیز ہے... جب آتا ہے تو ذہن کے پردے پر موجود تمام یادیں اور نقش دھندلانے لگتے ہیں... یادداشت ساتھ نہیں دیتی اور بوڑھے آدمی کو ناکارہ سامان کی طرح ایک محدود جگہ پر ڈال کر بھلا دیا جاتا ہے۔ یہی اذیت اسے اندر ہی اندر گھلا دیتی ہے اور اُسے اپنی دماغی صحت پر شبہ ہونے لگتا ہے... بس ایک آس کے سہارے ہی وہ جیتا ہے اور بالآخر زندگی تمام ہو جاتی ہے۔

ریٹائرمنٹ ہوم میں زندگی کے آخری ایام گزارنے والوں کی کتھا

فراموش

نسبتی خان

رات کے کھانے کے بعد ریٹائرمنٹ ہوم کی لائبریری میں ایک لاغر سا گلوکار اپنی بھاری آواز میں مشہور اوپیرا گیت "میسن ڈورما" گا رہا تھا۔ کبی اسٹون پچھلی قطار میں آرام سے کرسی پر بیٹھا گلوکار کی آواز سن رہا تھا۔ وہ شخص ٹوٹے پھوٹے انداز میں گا رہا تھا، آواز کبھی اونچی تو کبھی کمزور ہو جاتی۔ کبی کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ کراہ اٹھا اور پھر سوچنے لگا کہ اسے شکر گزار ہونا چاہیے کہ کوئی تو ہے جو اس یخ بستہ موسم میں بزرگوں کی دلجوئی کرنے آ گیا۔ لائبریری میں بیٹھے لوگ ایک ایک کر کے باتھ روم کی طرف جاتے، ان کی وہیل چیئرز چرچراتیں اور ایلومینیم کے عصا کرسیوں سے ٹکراتے۔ باہر کی طرف زیادہ تر کیئر ہیمن کی نوجوان خواتین جو ہیلپرز کے طور پر کام کر رہی تھیں، کمرے کے دروازے پر آ جا رہی تھیں اور ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ کبی اپنی یادداشت کے پردوں میں جھانک رہا تھا۔

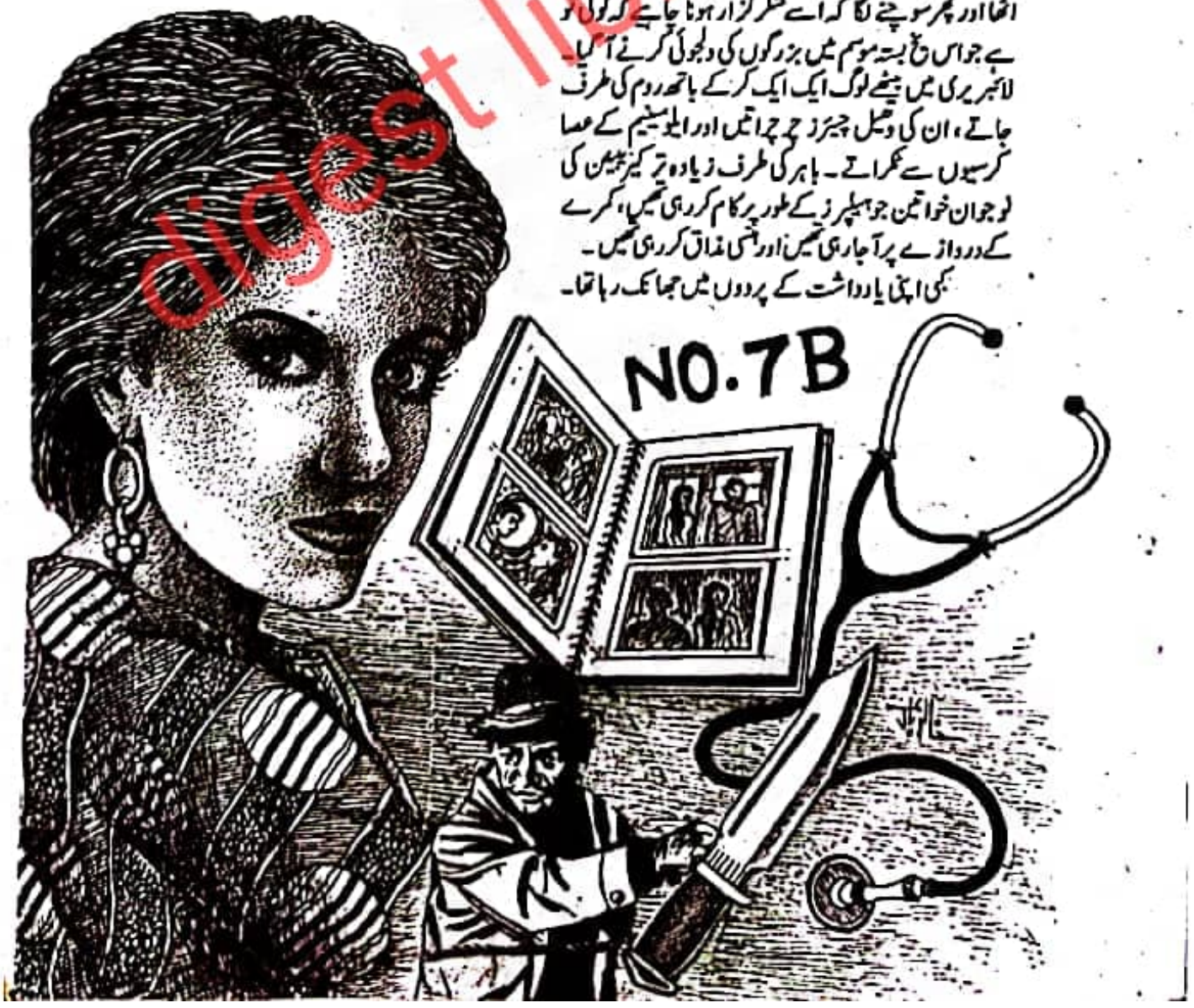

digest library.com

Scanned with CamScanner

اسے وہ دن یاد آنے لگے جب وہ اصل اوپیرا سنا کرتا تھا۔ جب پوچینی کے مشہور نغمے گائے جاتے اور فرانکو کوریلی جیسے بڑے گلوکار اپنی بھرپور آواز سے محفل کو جادوئی بنا دیتے۔ ان کی آواز ایسی طاقتور اور خوبصورت ہوتی تھی کہ دل موہ لیتی۔ کبی کو اچانک محسوس ہوا کہ آج کی یہ کمزور اور پھٹ پھٹاتی آواز ہمیشہ اس کی یاد میں نقش رہ جائے گی۔ جیسے کوئی نازک سی ڈوری ہوا کے جھونکے کے ساتھ ہل رہی ہو اور پھر کھڑکی کے شگاف سے نکل کر اڑ جائے۔

اس کے قریب بیٹھی عورت نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''وہ کتنا خوبصورت آدمی ہے۔''

کبی نے کندھے اچکائے۔ ''مجھے اس کی آواز پسند نہیں۔''

عورت نے وضاحت کی۔ ''میرا مطلب ہے، ڈاکٹر فوربش..... نیلے صوفے پر۔ میں نے دیکھا تم اسے دیکھ رہے تھے۔''

کبی نے بہانہ تراشا۔ ''میں تو پیانو کو دیکھ رہا تھا، وہ بے سُرا ہے۔''

مگر وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ فوربش واقعی پیانو کے پاس بیٹھا تھا۔ حالانکہ اس کی عمر ستر کے قریب تھی پھر بھی وہ لمبا، تگڑا اور دلکش دکھائی دیتا تھا۔ اس کے کپڑے سستے مگر شوخ رنگوں والے تھے لیکن اس کا جسم کبی کی طرح سکڑ کر ڈھیر نہیں ہوا تھا بلکہ اب بھی اپنی جوانی کی ساخت سنبھالے ہوئے تھا۔ کبی نے اپنے پہلو میں بیٹھی عورت سے کہا۔

''یہ فوربش وہی نیا آدمی ہے جو مسز پرنگی کے اوپر والے فلیٹ میں آیا ہے؟''

''ہاں، 7B۔'' عورت نے سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں سردیوں کے بادلوں کی طرح نیلی اور گال ہلکی سرخی لیے ہوئے تھے۔ اس کا نام مسز کنزی تھا اور اسے اس عمارت کے تقریباً سب لوگوں کی خبر ہوتی تھی۔ ''میں نے سنا ہے کہ 7B بڑا منحوس فلیٹ ہے۔''

کبی تلخی سے ہنسا۔ ''یہاں تو سب ہی بدقسمت ہیں۔ جو بھی اس عمارت سے لگتا ہے یا تو نرسنگ ہوم جاتا ہے یا زندگی کے آخری دن گزارنے سیدھا اسپتال۔ زندہ سلامت باہر نکلنے کا سوال ہی نہیں۔''

اتنے میں گلوکار پیانو پر جا بیٹھا۔ اس نے پانی کے چند گھونٹ لیے اور اپنی زندگی کی یادیں تازہ کرنے لگا۔

''یہ کبھی پرانا نہیں ہوتا۔'' اس نے کہا۔ ''بس شرط یہ ہے کہ آپ کے پاس گانے کے لیے کوئی نغمہ ہو۔'' پھر اس نے پیانو پر چند مانوس دھنیں چھیڑیں اور اعلان کیا کہ اب وہ اپنا پسندیدہ گانا ''ٹرائے فور یسٹر'' سنائے گا۔

کبی نے سر جھکایا اور پھر آہستہ آہستہ اٹھ کر لفٹ کی سمت بڑھ گیا۔

ہوا اتنی تیز چل رہی تھی کہ پوری عمارت لرزتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس دن صبح برف نے راستہ بند کر رکھا تھا۔ ایک گھنٹے تک ڈرائیو وے صاف نہیں ہو سکا اور اس دوران وہ وین بھی نہیں آسکی جو مریضوں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتی تھی۔ جب آخرکار راستہ کھلا تو کبی کو پتا چلا کہ سب بیکار تھا۔ زیادہ تر ڈاکٹر تو خود اپنے کلینک نہیں پہنچ سکے تھے۔ نوجوان ڈاکٹر پالمر بھی شہر کے دوسرے حصے میں پھنسا ہوا تھا۔ کبی کے دل میں ہلکی سی کسک جاگی۔ یہ جوان ڈاکٹر شاید کبھی نہ سمجھ پائے کہ چالیس کی دہائی کا ایک آدمی بھی زندگی کے ہر لمحے کو قیمتی خزانہ سمجھ کر جیتا ہے کیونکہ اس نے اپنی عمر کا نصف حصہ پیچھے چھوڑ دیا ہوتا ہے۔

کبی کا دوست للیش مین جو ایک ٹانگ سے معذور تھا، وہیل چیئر پر بیٹھا لفٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹے قد کی سخت چہرے والی عورت کھڑی تھی۔ کبی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''آج جلدی ریٹائر ہو رہے ہیں، پروفیسر؟'' پھر اس نے پوچھا۔ ''تم نے کبھی فلم شوٹ دی پیانو پلیئر دیکھی ہے؟''

للیش مین نے جواب دیا۔ ''یاد نہیں آرہا۔''

کبی بولا۔ ''آج گلوکار کو سن کر نہ جانے کیوں وہ فلم یاد آگئی۔''

للیش مین ہلکی سی خشک ہنسی ہنس دیا۔ ساتھ کھڑی عورت بالکل خاموش رہی۔ اس کا نام اینا تھا۔ وہ یوکرین کے شہر کیف کی رہنے والی تھی اور للیش مین اب اسی پر انحصار کرتا تھا۔ ڈھنگ کا کھانا بنانا تو دور، وہ انڈا بھی نہیں ابال سکتی تھی۔ بس ٹھنڈا سوپ، خشک روٹی اور کبھی کبھار مچھلی..... لیکن وہی اس کے کام آتی تھی۔ کبھی کبھار وہ اپارٹمنٹ سے چھوٹی موٹی چیزیں چرا لیتی۔ للیش مین کے کہنے کے مطابق اس کی بیٹی کئی برسوں سے اس سے نہیں ملی تھی۔

کبی جھک کر وہیل چیئر کے قریب آیا اور سرگوشی میں کہا۔ ''یہ نیا پرندہ تو خود کو فوربش کہتا ہے۔ لگتا ہے عورتوں کا دل جیتنے والا ہے۔ پہلے ہی مسز کنزی کے ساتھ گھل مل گیا ہے۔''

للیش مین نے شانے اچکا کر کہا۔ ''کنزی تو کوئی مشکل عورت نہیں ہے۔ خیر، اب مجھے کیا پروا۔''

اتنے میں لفٹ آگئی۔ للیش مین اپنی مددگار کے ساتھ چوتھی منزل پر اتر گیا۔ کبی آٹھویں منزل پر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اس کا اپارٹمنٹ دریا کی سمت تھا۔ پوری رات ہوا کھڑکی کے شیشوں پر دستک دیتی رہی۔ وہ بھی

Scanned with CamScanner

digest library.com

ریڈیو کھول لیتا، کبھی ٹی وی کے سامنے لیٹ جاتا۔ تنہائی اس کی پرانی ساتھی تھی۔ کبھی کا بیٹا دور کیلی فورنیا میں رہتا تھا اور صرف اتوار کے روز ہی اس سے فون پر بات ہو سکتی تھی۔

کبھی نے ایک پیالے میں دودھ گرم کیا، پرانی کامیڈی فلم لگائی اور ماضی میں کھو گیا۔ اسے یاد آیا کہ پہلی بار وہ اپنی بیوی روزی کو سنیما کب لے کر گیا تھا۔ فلم کا ہال، ٹکٹ کی کھڑکی، دوبارہ لگی فلم، برائن بیچ کا روشن تھیٹر اور وہ لمحہ جب فلم ختم ہونے پر روزی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ سب کچھ اتنا واضح تھا کہ جیسے کل کی بات ہو۔

لیکن پھر شک نے دل میں جگہ بنائی۔ کیا واقعی وہی فلم تھی یا کوئی اور فلم جس میں میلون ڈگلس اور جین آرتھر تھے؟ اگر ساٹھ سال پرانا اخبار مل بھی جاتا اور اس میں دوسرا اشتہار چھپا ملتا تو پھر کون صحیح ہوتا..... اس کی یادداشت یا اخبار؟ اور اگر یاد پر شک کر لیا تو پھر ڈاکٹر پالمر کو اس پر ضرور کچھ کہنے کا موقع مل جائے گا۔ ایک بات البتہ وہ مان چکا تھا، پالمر کی نیت صاف تھی۔

ڈاکٹر پالمر نے ایک بار کبھی سے کہا تھا۔ ''یادیں واپس لانا ایسا نہیں جیسے کسی لاکر سے پرانی فائل نکال لو۔''

پالمر ہمیشہ مسکرا کر بات کرتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سی گرمی اور کشش تھی۔ کبھی کو لگتا تھا کہ یہ مسکراہٹ کبھی اصلی ہوتی ہے اور کبھی صرف دکھاوا لیکن سچ یہ ہے کہ بعض اوقات وہ پالمر سے ذرا سا خوف بھی محسوس کرتا تھا۔

ڈاکٹر نے بات شروع کی۔ ''دیکھو، یادداشت دماغ میں ہر جگہ بکھری رہتی ہے۔ جیسے اربوں ڈبوں میں کھربوں تصویری پہیلی کے ٹکڑے پڑے ہوں۔ کچھ ٹکڑے صاف نظر آتے ہیں، کچھ بالکل غائب۔ مجھے آج بھی اپنی ماں کا سردیوں کا کوٹ یاد ہے۔ میں کہتا ہوں وہ ٹویڈ کا تھا جبکہ میری بہن کہتی ہے کہ وہ لوڈن کپڑے کا تھا۔ تمہارے بیٹے نے کہا کہ تم نے برائن بیچ ساٹھ اور ستر کی دہائی میں چھوڑا تھا مگر تم نے تو مجھے بتایا تھا کہ یہ انیس سو چوراسی میں ہوا۔''

کبھی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''میرا بیٹا تو تب پیدا بھی نہیں ہوا تھا، اسے کیا معلوم!''

ڈاکٹر نے نرمی سے کہا۔ ''اگر آپ کو اپنی یادداشت کی فکر ہے تو ایک چھوٹا سا ٹیسٹ ہے۔ آپ کو چند لفظ یاد کرنے ہیں اور ایک گھڑی کی تصویر بنانی ہے۔''

کبھی نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کیا اس سے پتا چل جائے گا کہ میں کب مروں گا؟''

ڈاکٹر ہنس پڑا۔ ''نہیں، یہ سب یادداشت کے لیے ہے۔''

کبھی نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''یہ 1984ء تھا۔''

اس نے ٹیسٹ دیا پھر ڈاکٹر کو بتایا کہ صدر کون تھا، ہفتے کا دن کون سا تھا اور تاریخ کیا تھی۔ نوجوان ڈاکٹر پالمر یہ سن کر مطمئن اور خوش نظر آیا۔

کھانے کے وقت کا منظر بھی نرالا ہوتا۔ بیوہ عورتیں بڑی بڑی میزوں پر اکٹھی بیٹھ جاتیں اور مرد حضرات جو تعداد میں کم تھے، یا تو اکیلے رہتے یا چھوٹے چھوٹے گروپ بنا لیتے۔

ایک نیا چہرہ فوربش صبح آٹھ بجے کبھی کی پرانی نشست پر بیٹھا تھا۔ وہ بنجامن سے باتیں کر رہا تھا جو بہ مشکل اپنی پتلون سنبھال پاتا تھا۔ کبھی نے سوچا زیادہ ہجوم بوجھ بن جاتا ہے اس لیے وہ چند نشستیں چھوڑ کر الگ جا بیٹھا۔

پہلے ہی ہفتے میں سب لوگوں نے اپنی زندگی کی کہانیاں سنا ڈالیں۔ جو باتیں اہم تھیں، وہ بھی اور جو معمولی تھیں، وہ بھی۔ اس کے بعد صرف باتوں کو بڑھا چڑھا کر دہرانا باقی رہ گیا۔

وہاں ایک بھاری بھرکم آدمی پیرسن بھی تھا جو دو لاٹھیوں کے سہارے چلتا تھا۔ وہ انڈیانا میں ٹرکی فارم چلاتا رہا تھا۔ صرف دو شاموں میں کبھی نے اس سے سیکھ لیا کہ ٹرکی کو کس طرح تیزی، صفائی اور مؤثر طریقے سے ذبح کیا جاتا ہے۔ چھٹی کے قریب آتے ہی پیرسن ایک ہی دن میں ہزاروں ٹرکی ختم کر سکتا تھا۔ اس کے پہلو میں ہمیشہ ٹیڈی ریکر بیٹھتا جو اپنی بے ربط اور نہ ختم ہونے والی گفتگو بڑبڑاتا رہتا تھا۔

اسی دوران روسی عورت، للیش مین کی وہیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے ناشتے کی میز کے پاس لے آئی۔

''تم کھاؤ، میں دکان جا رہی ہوں۔'' اس نے للیش مین کے گلے میں اسکارف کس کر کہا۔

''صبح بخیر۔'' کبھی نے مسکرا کر کہا۔

للیش مین نے بھی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دینے کی کوشش کی۔ ''جانتے ہو، مجھے کس مسئلے کے ساتھ رہنا پڑتا ہے؟ یہ عورت مجھ سے چھوٹی چھوٹی چیزیں چرا لیتی ہے، جو کچھ بھی بچ سکے اور جب میں اپنی بیٹی سے شکایت کرتا ہوں تو کیا ہوتا ہے؟''

کبھی نے حیرت سے کہا۔ ''کیا ہوتا ہے؟''

للیش مین نے تلخی سے کہا۔ ''میری بیٹی ڈاکٹر کو کہتی ہے کہ مجھے ڈپریشن کی دوا لکھ دے تاکہ میں چپ رہوں کیونکہ اگر میں شور مچاؤں گا تو یہ روسی عورت کسی اور کی چیزیں چرانے لگے گی اور پھر میری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں

Scanned with CamScanner

بچے گا۔ پھر مجھے بیت الخلا لے جانے والا کون ہوگا؟"
کبی نے کہا۔ "تمہاری بیٹی تمہاری دیکھ بھال نہیں کرتی؟"
"تم بڑے مزاحیہ آدمی ہو، اسٹون! وہ اس بات پر مجھ سے ناراض ہے کہ میں اپنی پنشن کی بچت اس عیش و آرام کے محل پر خرچ کر رہا ہوں۔"
"یہ جگہ واقعی مہنگی ہے۔" کبی نے آہستہ سے کہا۔
"میں نے تریسٹھ سال مسلسل کام کیا ہے، کیا مجھے اب اپنی زندگی کے آخری چند برس سکون سے نہیں گزارنے چاہئیں؟"
"کیوں نہیں، ضرور گزارنے چاہئیں۔" کبی بولا۔
للیش مین چائے کا ٹی بیگ کپ میں ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد وہ کامیاب ہوگیا۔
"میں نے حساب لگا لیا ہے۔ میرے پاس یہاں مزید چار سال رہنے کے پیسے ہیں۔ اس کے بعد مجھے میڈیکیڈ پر کسی نرسنگ ہوم جانا پڑے گا۔ سوچو تو، اتنے سالوں کی محنت کے بعد بھی آخر میں خیراتی مریض بننا پڑے گا..... اگر تب تک زندہ رہا تو۔ رہی میری بیٹی، تو اس کی نظر صرف میرے پیسوں پر ہے تاکہ وہ اپنے نالائق بچے کو کالج بھیج سکے یا پھر کوئی ساحلی فلیٹ خرید لے۔ درحقیقت وہ ایک انتہائی نالائق بچہ ہے۔"
کبی نے نرمی سے کہا۔ "پیسا تو بہرحال تمہارا ہے۔"
پھر اس نے سامنے بیٹھے نئے مہمان کو دیکھا۔
"صبح بخیر! آپ ڈاکٹر فوربش ہیں نا؟"
نیا آنے والا مسکرا کر بولا۔ "جی ہاں، صبح بخیر!"
"کیا آپ یہاں سیٹ ہو گئے ہیں؟"
"جی، شکریہ۔ مس کنزی نے سب کچھ سمجھا دیا ہے، خاص طور پر یہ کہ کون سا عملہ کیسا ہے۔"
اتنے میں مس سلور اندر آئیں۔ وہ سیدھی ڈاکٹر فوربش کی طرف بڑھیں۔
"ڈاکٹر فوربش! امید ہے آپ کا کمرا آپ کی توقعات کے مطابق ہے؟"
"جی، مس سلور! بس زیادہ تر رنگ و روغن اتر چکا ہے لیکن کوئی بات نہیں۔"
پھر وہ باقی سب کی طرف متوجہ ہوئیں۔
"کیا آپ سب نے ڈاکٹر جیک فوربش سے ملاقات کر لی ہے؟"
"ابھی کر رہے ہیں۔" کبی نے جواب دیا۔
"اچھا، پھر تعارف مکمل کروائیں۔"
کبی نے ہاتھ بڑھایا۔ "میں کبی اسٹون ہوں اور میرے برابر میں ہیں، فل للیش مین!"
سب نے خوشی کا اظہار کیا پھر کبی نے باری باری باقی سب کا تعارف کرایا۔
"للیش مین پرنٹنگ انکس کا کام کرتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی کتابیں پڑھانے اور احمق طلبہ سے الجھنے میں گزار دی۔ بنجامن ریلوے کے دھندے میں تھا۔ ویکب..... خیر، وہ ہمیشہ ٹرکی کھانے کا شوقین رہا۔ ہم سب نے اپنی اپنی زندگیاں جی لیں، اب آپ کی باری ہے۔ مس سلور نے کہا کہ آپ ڈاکٹر ہیں، کس شعبے کے ڈاکٹر؟"
فوربش نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں ماہرِ نفسیات ہوں۔"
للیش مین قہقہہ لگا کر بولا۔ "تو آپ بالکل صحیح جگہ آئے ہیں، یہاں دماغی مریضوں کی کوئی کمی نہیں۔"
فوربش نے سختی سے کہا۔ "ذہنی صحت مذاق کی چیز نہیں۔"
اس دوپہر لائبریری میں ایک پرانی فلم دکھائی گئی۔ فلم دیکھ کر کبی سوچ میں پڑ گیا۔ اسے لگا کہ شاید وہ روزی کو یہی فلم دکھانے لے گیا تھا جس میں میلون ڈگلس اور جین آرتھر تھے۔ تقریباً یقین تھا۔ فلم کے بعد کسی نے پیانو بجایا اور کچھ لوگ ناچنے لگے۔ فوربش، مسز کنزی کو ڈانس فلور پر لے گیا جبکہ مس سلور بھی آئی اور چند نوجوانوں کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے رقص کیا۔
آخر میں مسز کنزی، کبی کے پاس آئیں اور مسکرا کر بولیں۔ "امید ہے آپ جلد ہی ڈاکٹر فوربش کے اچھے دوست بن جائیں گے۔"
"ہم ایک دوسرے کو جاننے لگے ہیں۔"
"اس نے مجھے میرے بارے میں اتنا کچھ بتایا جو مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔"
وہ چلی گئیں تو للیش مین نے کہا۔ "یا شاید جن باتوں کا مجھے احساس نہیں تھا، انہیں میں نے کسی وجہ سے ہی بھلایا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے، اسٹون؟"
کھانے کے وقت فوربش ذرا کھل گیا۔ کبی نے پوچھا۔ "آپ کی خاص مہارت کیا تھی؟"
"اگر کوئی تھی تو وہ کپلز تھراپی تھی۔ یعنی میاں بیوی کے مسائل سلجھانا۔ یہاں اس کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ مسز کنزی نے بتایا کہ آپ سب بیویوں سے محروم ہو چکے ہیں۔"
"رکبی کے سوا، بیچارے نے کبھی شادی ہی نہیں کی۔"
فوربش نے اس کا طنزیہ ان سنی کر دیا۔ "تھراپسٹ کا

Scanned with CamScanner

کام آسان نہیں ہوتا۔ جو لوگ مشورے کے لیے آتے ہیں، اکثر مدد نہیں چاہتے۔ کچھ مریض اپنی پریشانیاں ڈاکٹر پر ڈال دیتے ہیں۔ شرمندگی کی بات ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ ہم سے بھی کبھی کبھار غلطیاں ہو جاتی ہیں۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔

"کئی سال پہلے میرے پاس ایک عورت آئی تھی۔ مجھے لگا تھا، میں اس کی مدد کر سکتا ہوں۔" فوربش بولا۔ "وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں تھی۔ وہ اسے چھوڑنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے سمجھایا کہ بہتر ہے وہ ایسا نہ کرے۔"

للیش مین ہنسا۔ "تو اس کے شوہر نے آپ کو کبھی معاف کیا؟"

"اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ نہ جاب، نہ خاندان اور اوپر سے ایک بچے کی ذمے داری۔" فوربش نے کہا۔ "اس کے شوہر کو یقین تھا کہ اس کا کسی سے افیئر چل رہا ہے۔"

"کچھ کا ہوتا بھی ہے۔" کبی نے کہا۔

"بات یہ نہیں ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہی اور بالآخر اس کے شوہر نے اسے قتل کر دیا۔"

پیئرسن جانے کیوں ہنس پڑا۔

"شوہر کا کیا ہوا؟" کبی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ پولیس نے کہا دوا کی زیادہ مقدار لینے سے حادثاتی طور پر موت ہوئی۔"

"آپ کو اس پر یقین نہیں تھا؟"

"میں نے اس کی باتیں سنی تھیں، مجھے اور دھیان دینا چاہیے تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ بار بی چیوریشس نہیں لیتی۔ میں نے اس کے شوہر کو بھی پہچان لیا تھا۔ وہ ایک چھوٹا اور حاسد آدمی تھا لیکن میں کچھ بھی ثابت نہیں کر سکا۔ باضابطہ طور پر یہ حادثہ تھا یا بے پروائی۔ اس طرح وہ بچ گیا۔" یہ کہتے ہوئے فوربش نے اپنے ساتھیوں کی طرف یوں دیکھا جیسے سوچ رہا ہو کہ شاید وہ بھی اتنے ہی چھوٹے اور حسد کرنے والے ہوں۔

کبی، للیش مین کے ساتھ بیٹھا تھا۔ کھڑکیوں کے نیچے زمین پر برف کے ذرّے بہتے دیکھ رہا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے وقت نے اس کی زندگی روک دی ہو۔ باہر موسم بدلتا رہتا لیکن اس کے دل اور حال میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی۔

اس نے کھڑکی کے شیشے میں خود کو دیکھا۔ اس کا چہرہ اب حیرت انگیز طور پر سفید پڑ گیا تھا اور ٹھوڑی ڈھیلی ہو چکی تھی۔ اس حالت میں حال کو بھول جانا بھی آسان ہو گیا تھا۔

للیش مین نے پوچھا۔ "کیا تم اپنی مرحومہ بیوی سے

میل یاتم

نشے میں دُھت ایک شرابی ایک بلڈنگ کی ایک کھڑکی تلے کھڑا بہت دیر سے بلند آواز میں رو رہا تھا اور چلا چلا کر اپنی بیوی کی منت کر رہا تھا کہ وہ دروازہ کھول دے۔ رات کے سناٹے میں اس کے شور شرابے سے تنگ آ کر آخر اوپر کی منزل سے ایک آدمی نے کھڑکی کھول کر جھانکا اور اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "اے او گدھے..... اُلو..... پاگل..... نشے میں تجھے اتنا بھی ہوش نہیں کہ تیرا گھر اگلی بلڈنگ میں ہے۔ اتنی دیر سے غلط کھڑکی کے نیچے کھڑا شور مچا رہا ہے۔"

"تو خود گدھا، اُلو، پاگل....." شرابی فوراً جواباً چلایا۔ "تجھے تو اتنا بھی پتا نہیں کہ تو خود غلط کھڑکی سے جھانک رہا ہے۔"

مختصر مختصر

☆ حیرت انگیز باتوں کے بارے میں ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ نئی نسل کے لیے بالکل حیرت انگیز نہیں ہوتیں۔

☆ دنیا میں جو چیزیں ہمیں مشقت سے بچانے میں سب سے اہم کردار ادا کرتی ہیں وہ مسترد شدہ تجاویز ہیں۔

☆ پانچ سال پہلے میرا بہترین دوست میری بیوی کو بھگا کر لے گیا تھا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ میں نے اس کی حرکت کی وجہ سے ہی اسے اپنا بہترین دوست سمجھا تھا۔ (ایک امریکی کا مکالمہ)

معیار

بگو بدمعاش نے جنگل میں خفیہ بھٹی لگائی اور ٹھرّا تیار کرنا شروع کیا۔ پہلی بار آزمائش کے طور پر اس نے ایک بوتل اپنے ایک جاننے والے دیہاتی کو بھیجی اور دوسرے روز اس سے رپورٹ مانگی۔ "کیسا تھا ہمارا ٹھرّا؟"

"ٹھرّا تو اچھا تھا۔" دیہاتی نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ "بس اسے پیتے ہوئے مجھے ذرا کھانسی آئی تو میری مونچھوں میں آگ لگ گئی۔"

(مرسلہ: نازیہ خان، مظفر آباد)

Scanned with CamScanner

digest library.com

بات کرتے ہو؟"

"نہیں، کبھی نہیں۔"

"میں بھی نہیں۔ میری بیوی مشکل مزاج عورت تھی۔ جب وہ زندہ تھی تب بھی ہم زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔" اس نے کبی کی طرف دیکھا۔ "اس لحاظ سے تم مجھے خوش قسمت کہہ سکتے ہو۔"

کبی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عورتیں افیئر چلاتی ہیں، مردوں کے بھی ہوتے ہیں۔ اس نے چالیس سال پہلے کی ایک طالبہ کو یاد کیا۔ کیا روزی نے بھی اس کا اندازہ لگایا ہوگا؟

"تمہاری بیوی کب دنیا سے رخصت ہوئی؟" ڈاکٹر فوربش نے پوچھا۔

کبی نے ذرا سوچ کر کہا۔ "شاید..... اسی کی دہائی میں؟"

☆☆☆

اتوار آیا اور چپ چاپ گزر گیا۔ اس نے بیٹے کو فون نہیں کیا۔ وقت کے فرق نے رابطہ مشکل کر دیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں جا بیٹھا اور کمپیوٹر کھول کر کچھ تلاش کرنے لگا۔ روز گڈمین کو گئے ہوئے مدت گزر چکی تھی، آن لائن بھی کوئی موت کی خبر نہیں تھی۔ اس کا بیٹا اس وقت کتنا بڑا ہوگا؟ گیارہ، بارہ برس سے زیادہ نہیں۔ روزی نے تو یقیناً اس کے لیے بلوغت کی تقریب رکھی ہوتی مگر کبی نے کبھی نہیں کی۔ پرانا خاندانی البم اور سارے کاغذات تو برسوں پہلے شعلوں کی نذر ہو چکے تھے۔ وہ ویسٹ چیسٹر والا گھر تھا۔ شاید وہ چند دن میں بیٹے کو فون کرے اور سوال آہستہ آہستہ پوچھے۔ "بیٹا ہم نے برلن چ کب چھوڑا تھا؟"

اس نے جان فوربش کو تلاش کیا۔ نام عام نکلا مگر نہ کوئی ریٹائرڈ ماہر نفسیات ملا، نہ میڈیکل ڈاکٹر۔ وہ کرسی سے اٹھا، ہاتھ منہ دھوئے اور اپنا بھاری اونی سویٹر پہن لیا۔

نیچے تین لوگ تاش کھیل رہے تھے۔

کبی نے پوچھا۔ "فوربش کہاں ہے؟"

ایک کھلاڑی نے جواب دیا۔ "مسز کنزی کے ساتھ ہے۔ تمہیں اس سے کوئی کام ہے؟"

کبی نے کہا۔ "پتا نہیں.....!"

للیش مین نے کہا۔ "کسی ماہر نفسیات کو ڈھونڈ رہے ہو؟ ذرا دھیان رکھنا، وہ تمہیں بھی وہی دوا دے دے گا جو اس نے مجھے دی تھی۔ دماغ کو سکون دیتی ہے، خوش کر دیتی ہے۔" وہ ہنسا اور اپنے دانت دکھائے۔ "دیکھو، مجھے دیکھ کر لگ رہا ہے کہ مجھے ذیابیطس کی فکر ہے؟ میں خوش ہوں۔"

ڈرگی پکڑنے والا پیرسن تین پتے رکھ کر بولا۔ "میں اس بندے پر کبھی بھروسا نہ کروں۔ وہ ایسا برتاؤ کرتا ہے جیسے اسے سب کچھ معلوم ہو۔ وہ جیسے کوئی راز جانتا ہو۔"

"کیسا راز؟" کبی نے پوچھا۔

للیش مین بولا۔ "سب کے پاس راز ہوتے ہیں، جیسے ایڈی کلائن کا پانچ سی والے کمرے میں کام کرنا۔ کچھ لوگ جن کے نام نہیں لوں گا، وہاں گئے بھی تھے۔"

"میں نہیں گیا تھا۔" بنجامن نے زور سے کہا۔

اس کے بعد بات چیت مشکل ہو گئی۔

کھانے کے بعد ایک اور فلم دکھائی گئی۔ مقامی تھیٹر گلڈ سے ایک نوجوان آیا تھا تاکہ فلم کا تعارف پیش کرے۔ وہ آتورز اور نئی فلمی تحریکوں پر بات کر رہا تھا، مورس اینگل اور فرانسوا تروفو کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں وہ غرور جھلک رہا تھا جو صرف اس شخص میں ہوتا ہے جس کے سامنے ابھی لمبی زندگی پڑی ہو۔ وہ اسی برس سے زائد عمر کی عورتوں سے فلرٹ کر رہا تھا اور اپنی کھوکھلی دلکشی کے ذریعے انہیں یہ احساس دلا رہا تھا کہ ان کے جسم اب زیادہ دیر ساتھ نہیں دے پائیں گے۔

کبی نے کچھ دیر فلم دیکھی پھر اٹھ کر جسم سیدھا کیا، پیٹھ پھیری اور بھول گیا کہ وہ کیا دیکھ رہا تھا۔ اسے فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ کبی نے پیچھے دیکھا۔ مس سلور صوفے پر بیٹھی خوشی خوشی فلم دیکھ رہی تھیں۔ فوربش اور مسز کنزی ساتھ بیٹھے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔

کبی چلتے چلتے بڑے ریسپشن ہال کے پار چلا گیا۔ سامنے دروازے کے پاس سیکیورٹی کھڑکی میں ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ کبی دفتروں کے ساتھ ساتھ چلتا گیا، اس نے دیکھا کہ مین سوئیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مس سلور کی میز اس کے بائیں طرف تھی، بالکل خالی۔ صرف ایک کمپیوٹر ٹرمینل پڑا تھا۔ کبی بیٹھ گیا۔

درمیانی دراز تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے دراز اپنی طرف کھینچا۔ مس سلور وہ خاتون تھیں جو اپارٹمنٹس دکھاتی تھیں، لوگوں کو سیٹ کرتی تھیں۔ ان کا چھوٹا سا پلاسٹک پاس کی (چابی) ایک گتے کے کور میں وہیں تھا۔ اس نے چابی اپنی جیب میں ڈال لی، دوبارہ لائبریری کے پاس سے گزرا تاکہ کنٹی کر سکے پھر ساتویں منزل کے لیے لفٹ لے لی۔

وہ کبھی 7B میں نہیں گیا تھا، نہ اس وقت جب مسز پرسکی زندہ تھیں اور نہ ہی ان سے پہلے والی خاتون کے زمانے میں، جن کا نام وہ یاد نہیں کر سکا۔ کبی نے پاس کی سے دروازہ کھولا، بتی جلائی اور پیچھے سے دروازہ بند کر دیا۔ وہاں

Scanned with CamScanner

دیکھنے کو زیادہ کچھ نہیں تھا، کمرے کے رہائشی نے لیونگ روم میں ایک چھوٹا سا اسٹڈی بنایا ہوا تھا جو اس کھڑکی کے پاس تھا جو دریا کی سمت کھلتی تھی مگر کھڑکی کے شیشے کے پار اتنا اندھیرا تھا کہ یقین کرنا مشکل تھا کہ باہر دریا موجود بھی ہے۔ دیواروں کے ساتھ پرانی کتابوں کے انبار لگے تھے، وہ کتابوں کے نام پہچان گیا..... فرائڈ، برونز، یونگ.....

ڈیسک کے بیچوں بیچ چمڑے کے کور والی ایک موٹی جلد رکھی تھی، یہ بالکل کبی کی زندگی سے غائب ہونے والی فیملی البم کی طرح تھی۔ صفحات موٹے اور سیاہ تھے اور زیادہ تر بلیک اینڈ وائٹ تصویروں سے بھرے ہوئے تھے۔

بچپن کی جھلکیاں، والدین یا دادا دادی.....؟ ایک نوعمر لڑکا، پھر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہوا، گریجویشن کا منظر، ایک نوجوان عورت، اینٹوں کا بنا گھر، ایک شیر خوار بچہ۔ نوجوان عورت کے بال سنہری تھے۔ دور سے دیکھنے پر اسے اس چہرے پر روزی کا گمان ہوا یا شاید اپنی ماں کا۔

خدوخال عام اور مشرقی یورپ سے جڑے ہوئے لگتے تھے۔ بچہ بھی سنہری بالوں والا تھا۔ اگلے صفحے پر ایک دھندلی فوٹو کاپی چپکی تھی جو کسی سستے اخبار کے تراشے سے لی گئی تھی۔

برائٹن ہاؤس وائف کی پراسرار موت!

ہارلی چیوریٹس کا شبہ!

اس کہانی کے ساتھ ایک ہلکے بالوں والے آدمی کی تصویر تھی جسے وہ بہ مشکل پہچان سکتا تھا۔ متن دھندلا اور پڑھنے کے قابل نہیں تھا۔

کبی نے اپارٹمنٹ کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اسٹڈی کے علاوہ باقی کمرا ہوٹل کے کمرے کی طرح تھا، کم فرنیچر والا جو عارضی رہائش کا سا تاثر دے رہا تھا۔ اس نے البم کا صفحہ پھاڑ کر دروازہ بند کر دیا۔

وہ نیچے آیا، پاس کی واپس مس سلور کے ڈیسک میں رکھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بیٹے کو ویسٹ کوسٹ فون کر کے کہے۔ "بیٹا! مجھے یہاں سے نکال لو۔" مگر بیٹے سے برسوں سے بات نہیں ہوئی تھی۔ اس کے پاس کبی کے لیے نہ تو وقت تھا نہ توجہ..... اور پھر بیٹے میں اتنی سمجھ کہاں تھی۔ مس سلور جو بھی کہتی، وہ آنکھیں بند کر کے مان لیتا۔ کیا باپ کو دوا کی ضرورت ہے؟ کوئی نرم مگر تیزی سے اثر کرنے والی اینٹی سائیکوٹک؟ شاید وہ ڈاکٹر پالمر کو بھی فوراً فون کرا دیتا۔

فلم ختم ہو گئی تھی۔ کبی نے اینا کو ایک لمحے کے لیے باہر بھیج دیا تاکہ وہ اطمینان سے للیش مین سے بات کر سکے۔

"اس آدمی کی ہر بات جھوٹ ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا؟"

"میں نے اس اپارٹمنٹ کی تلاشی لی جہاں وہ رہائش پذیر ہے۔ 7B آدھا خالی ہے، لگتا ہے وہ صرف عارضی طور پر آیا ہوا ہے۔"

للیش مین کے چہرے پر تشویش چھا گئی۔ "تو پھر یہ کون ہے؟"

"شاید یہاں اسے کوئی کام ہے۔" کبی ذرا سا جھک کر اس کے قریب آیا اور سرگوشی میں بولا۔ "میں تمہیں ایک بات بتاؤں..... اس کے پاس ایک اسکریپ بک ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ ان نرسوں میں سے ایک ہو سکتا ہے جو مریضوں کو ہمدردی کے بہانے زہر دے کر مار ڈالتی ہیں، یعنی ایک میکانما قاتل۔"

ایک لمحے کے لیے للیش مین کا منہ کھلا رہ گیا پھر اس کے چہرے پر سب کچھ سمجھ جانے کا تاثر ابھرا۔ اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"میری بیٹی تو چاہتی ہی یہی ہے کہ میں پیسوں کے ختم ہونے سے پہلے ہی مر جاؤں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ ایک دن تکیہ میرے منہ پر رکھ دے گی لیکن....."

کبی نے دل ہی دل میں سوچا..... 'تمہاری بیٹی، میرا بیٹا.....' اور فوراً ہی اس خیال کو جھٹک دیا۔

"یار اسٹون! یہاں ایسے پچاس لوگ ہوں گے جن کے بچے چاہتے ہیں کہ وہ مر جائیں۔"

کبی نے دھیرے سے کہا۔ "تمہاری بیٹی ایسا کبھی نہیں چاہ سکتی۔"

للیش مین نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "میں اسے تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ سیدھی سی بات ہے، اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔"

بیٹے کو بلانے کا فائدہ نہیں تھا۔ وہ بات کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ دل کی کسی پرانی چبھن نے اسے خاموش کر رکھا تھا۔

ناشتے پر فوربش نے الزام لگاتی نظر سے کبی کو دیکھا، کبی خاموش رہا۔ دوپہر کے کھانے کے وقت وہ گروپ سے بچنے کے لیے محلے میں نکل جاتا۔ شام کو جب وہ واپس آتا تو قدرے سکون محسوس کرتا کہ میز پر صرف للیش مین اور بنجامن ہوتے۔ ریکر بھی کبھی ساتھ بیٹھتا مگر لگتا جیسے اس کے پاس اپنی بہن سے کہنے کو کچھ باقی نہ رہا ہو۔

پھر ایک اور برف باری ہوئی اور للیش مین دوبارہ اسپتال پہنچ گیا۔ اب اس کی دوسری ٹانگ کاٹنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اگر گینگرین نے جان نہ لی تو جنرل انفیکشن یا

Scanned with CamScanner

بے ہوشی کی دوا ہی اس کے حواس چھین لے گی۔ کبی نے دوپہر سوچوں اور خیالوں میں گزار دی۔ اس کا ذہن بار بار روزی کی طرف پلٹ جاتا۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ وہ سوچتا، کیا وہ کبھی ساتھ میلوین ڈکس کی کوئی فلم دیکھنے گئے تھے؟ کیا روزی نے کبھی دل ہی دل میں اسے چھوڑنے کا سوچا ہوگا؟ نہیں، اس نے تو ایسا کبھی نہیں کہا۔ یہ بات کبی کو اچھی طرح یاد تھی مگر پھر بھی اکثر لگتا جیسے وہ دونوں کبھی بہت قریب تھے اور کبھی ایک دوسرے سے بالکل دور۔ کبی سوچتا رہا کہ شاید وہ بھی اچھا شوہر نہیں تھا۔ ضدی، اپنی رائے پر حد سے زیادہ اعتماد کرنے والا اور روزی..... شاید اس کی دلچسپیاں کچھ اور ہوں، کچھ ایسی جن تک کبی کی رسائی نہ ہو سکی۔ زندگی میں ایسا تو ہوتا ہی ہے۔

جب وہ اس معمولی صورت طالبہ سے کچھ زیادہ ہی قریب ہو گیا تھا، کیا تب روزی نے صاف کہا تھا کہ وہ اس سے نفرت کرتی ہے؟ پھر اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ وہ سوچ میں گم جدوجہد کرتا ہوا اپنا پرانا سویٹر پہننے لگا۔ جیب میں اس نے چپکے سے اسٹیک چاقو ڈال لیا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ کیوں؟ پھر دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔

''عزیز روزی! جو بھی ہوا..... مجھے معاف کر دینا۔''

''تمہارا بیٹا اور میں بات کر رہے تھے۔'' ڈاکٹر پالمر نے کہا۔

کبی نے نظریں اٹھا کر اسے گھورنے کی کوشش کی۔

''اسے تمہاری دوری کی وجہ سمجھ نہیں آتی۔'' پالمر نے کہا۔ ''غلطی تو تمہاری بیوی کی تھی، اس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔''

کبی نے آہستہ سے سر ہلایا۔

''کیا تمہیں یاد ہے؟''

''میں یاد نہیں کرنا چاہتا۔''

''وہ ایک موسیقار کے ساتھ بھاگ گئی تھی، یہ تمہارا بیٹا کہتا ہے۔ ان کی کار کو بس نے ٹکر ماردی تھی۔''

کبی نے چونک کر ڈاکٹر کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر آہستہ سے بول پڑا۔ ''میں تو یہ سمجھتا رہا تھا کہ وہ کسی تھراپسٹ کے ساتھ بھاگی تھی۔''

پالمر نے مسکرا کر نرمی سے کہا۔ ''تمہیں اپنے بیٹے کو فون کرنا چاہیے۔''

عمارت واپس آتے ہی اس کی معصومیت بھری مسرت کا احساس ماند پڑ گیا۔

نوربش کا وہ فوٹو البم..... یعنی اس تصویر میں وہ میں نہیں تھا، لیکن اگر میں نہیں تو آخر وہ کون ہو سکتا ہے؟

کیمرے کے للیش نے شاید اس نوجوان کے بالوں کو سنہری دکھا دیا ہو۔ اگر تم اس شخص کی عمر میں پچاس برس اور جوڑ دو تو وہ کس کی طرح لگے گا؟ ریکر کی طرح.....؟ نہیں، وہ بہت لمبا تھا۔ پیٹرسن.....؟ نہیں، وہ بھی نہیں۔ آخر انڈیانا کا ٹرکی فارم چلانے والا بروکلین میں کیا کر رہا ہوتا؟ نہ ہی بنجامن جو سالولا اور بھاری جسم کا تھا۔

پھر جیسے اچانک ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا۔

وہ فوراً ادبر کے ذریعے اسپتال پہنچا۔ للیش مین اب بھی زندگی سے جڑا ہوا تھا۔ اس کی بیٹی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ کمرے میں کہیں بھی منہ دبانے والا تکیہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ روسی عورت ایک طرف کھڑی تھی اور کبی جھک کر مریض کے قریب ہوا۔

''فل! یہ شخص جو اپنے آپ کو نوربش کہتا ہے.....!'' کبی نے البم کا صفحہ اس کے سامنے کھولا۔ ''یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔''

للیش مین نے نظریں چرائیں۔

''کیا یہ تمہیں یاد ہے، فل؟''

اس کے دوست نے چند لمحے صفحے کو گھورا اور پھر دھیمی آواز میں کہا۔ ''فرض کرو مجھے یاد ہے؟ وہ چاہتا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ دے۔''

''اور پھر؟''

''آخر کس کی بات کو سچ مانا جائے..... میری یا اس تھراپسٹ کی؟''

کبی نے اپنی جیب کو دبایا۔ اندر چھپا ہوا چاقو اس کے دل کی دھڑکن کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

''اگر تم نوربش سے حساب برابر کرنا چاہتے ہو تو مجھ پر بھروسا رکھو۔''

ریٹائرمنٹ ہوم میں کھانے کے برتن سمیٹے جا چکے تھے۔ لوگ اپنی اپنی کرسیوں سے اٹھ گئے تھے۔

کبی ایک میز پر تنہا بیٹھ گیا۔ اس نے روزی کے بارے میں نہیں سوچا۔ نہ اپنی اور اس کی پرانی زندگی کے بارے میں، نہ اس بات کے بارے میں کہ وہ کیوں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

یادداشت؟ وہ تو جائے بھاڑ میں۔

یادیں تو زخموں کی طرح ہوتی ہیں..... انہیں ہم بھلا دیتے ہیں کیونکہ ہم بھول سکتے ہیں۔

***

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

بیوہ نے کہا۔ ''بھائی صاحب! آپ کو میری بات اچھی لگے یا بری، میں کہوں گی ضرور۔ جب سے آپ کا بھتیجا اپنے غم کی بیٹی کو دیکھ کر گیا ہے، اس پر مصر ہے کہ شادی کروں گا تو اس سے۔ آج جب اس نے یہ باتیں کیں تو میں آپ کے پاس چلی آئی، اب آپ کچھ سوچیے گا نہیں۔''

شاہ شجاع نے کسی قدر تامل سے جواب دیا۔ ''خاتون! کیا یہ رشتہ بے جوڑ نہیں ہوگا؟''

کرمان شاہ جو آج بھی اس نام سے ایران میں موجود ہے، دشتِ لوط کے مشرق میں جنوب کی طرف۔ یہاں آپ کا خاندان حکمران تھا پھر آپ بادشاہ ہوگئے، عیش و عشرت، سیر و شکار، خواہشات کی فراوانی... جو چاہا پالیا، جو سوچا حاصل گیا۔ آخرت اور عقبیٰ نام کی کوئی شے اس بادشاہ کے لیے نہیں تھی۔ لہو و لعب ہی اس کا سب کچھ تھا... اللہ والوں نے بہت سمجھایا مگر انہوں نے کان نہ دھرے... پھر ایک انقلاب آگیا۔ اس انقلاب نے ہر شے کو اتھل پتھل کر دیا۔ وہ بادشاہ جس کی بادشاہی چند روزہ تھی، دیکھتے ہی دیکھتے صوفیوں کا بادشاہ بن گیا اور وہ آج بھی ہم میں زندہ ہے... چکی کے دو پاٹوں میں آجانے والا پس کر فنا ہو جاتا ہے مگر وہ دانا جو چکی کی کیلی سے متصل ہو جاتا ہے، بچ جاتا ہے۔ یہ اللہ والے بھی اس دانے کی طرح حق کی کیلی سے لگ کر واصل بحق ہو جاتے ہیں اور زمانہ انہیں زندہ رکھتا ہے۔

ایک واصل بحق درویش کے دلچسپ اور ایمان افروز واقعات

شاہ شجاع کرمانی

ضیا تسنیم بلگرامی

دوسرا حصہ

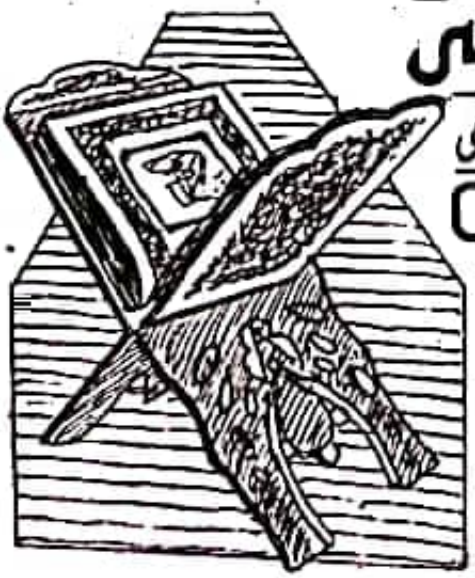

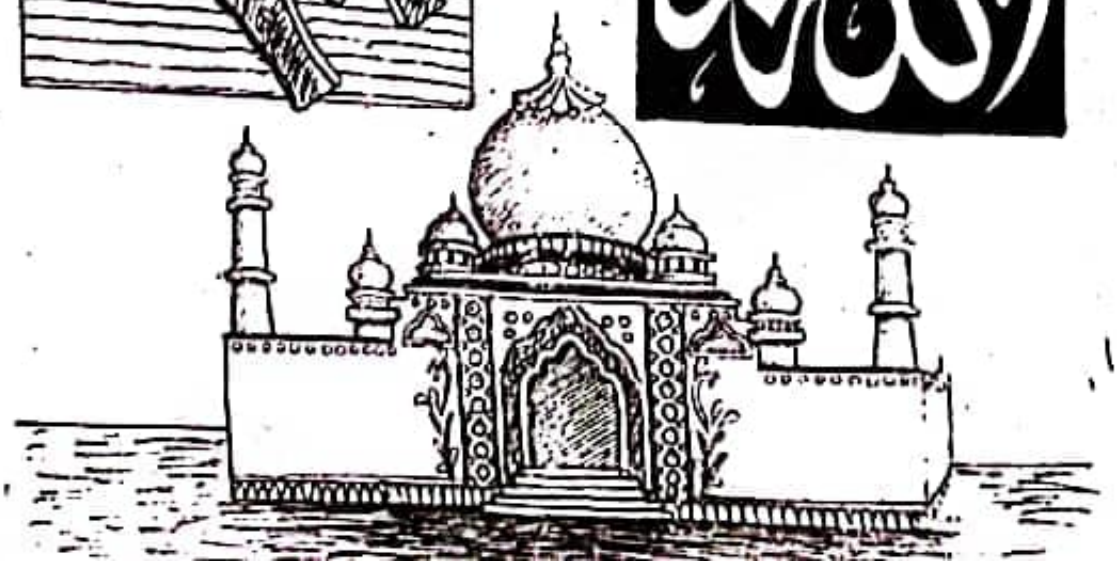

digest library.com

Scanned with CamScanner

بیوہ خاتون نے جواب دیا۔ ''بے جوڑ رشتہ! یہ کیا کہہ دیا تم نے؟ ماشاء اللہ یہ شہزادی ہے اور میرا بیٹا بادشاہ۔ یہاں سے جاتے ہی اللہ نے چاہا تو ملکہ بن جائے گی؟''

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''لیکن سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ جس چیز کو میں نے اپنے لیے پسند نہیں کیا، اپنی بیٹی کے لیے کیونکر پسند کر سکتا ہوں؟''

لیکن خاتون اپنی بات پر اڑی رہیں، بولیں۔ ''بھائی صاحب! میں کچھ نہیں جانتی، میں اپنی بیٹی کو گھر لے جانا چاہتی ہوں۔ میں اور کچھ نہیں سنوں گی۔''

شاہ شجاع بہت زیادہ فکرمند ہو گئے، بولے۔ ''اچھا، پھر آپ ایسا کریں کہ مجھے سوچنے کے لیے تین دن دیں۔ اس کے بعد کوئی حتمی جواب دے سکوں گا۔''

خاتون نے تین دن کی مہلت دے دی اور کہا۔ ''ٹھیک ہے، آپ کو تین دن دیے لیکن ایک بات میں ابھی سے بتائے دیتی ہوں کہ میں تین دن بعد بھی کوئی عذر نہیں سنوں گی۔ ایک ٹیک کام جو ہونا ہے، ضرور ہونا چاہیے۔''

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''آپ تین دن تو دیں مجھے۔ جو کچھ اللہ کرے گا، بہتر ہی کرے گا۔''

مرحوم بھائی کی بیوہ محل واپس چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی شاہ شجاع مسجد میں جا کے بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ اس معاملے سے کس طرح نمٹا جائے۔ انہوں نے کئی سال سے ایک نوجوان کو اس مسجد میں نماز پڑھتے دیکھا تھا، وہ اس وقت بھی نماز پڑھ رہا تھا۔ شاہ شجاع اس نوجوان کے زہد و تقویٰ سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے گھر سے ذرا فاصلے پر اس نوجوان کی جھونپڑی تھی۔ انداز شریفانہ، مزاج درویشانہ۔ شاہ شجاع کو یہ نوجوان بہت پسند تھا۔ آپ اس کے پاس بیٹھ گئے۔ جب وہ نماز پڑھ چکا تو اس سے پوچھا۔ ''صاحبزادے! تمہاری شادی ہو گئی یا نہیں؟''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''نہیں، ابھی تک میں نے شادی نہیں کی۔''

شاہ شجاع نے پوچھا۔ ''شادی کرو گے؟''

نوجوان ہنسنے لگا، بولا۔ ''جنابِ والا! آج آپ مجھ سے کوئی مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟''

شاہ شجاع اس نوجوان کو مسجد سے اٹھا کے باہر لے آئے اور کہا۔ ''نوجوان! میں تجھ سے مذاق کیوں کروں گا اور یہ مذاق میں نے آج تک کسی اور سے بھی نہیں کیا پھر تجھ سے کیوں کروں گا؟''

نوجوان خاموش ہو گیا۔ شاہ شجاع نے اس سے ایک بار پھر پوچھا۔ ''دیکھ، تو میری بات کا صاف صاف جواب دے۔ تو شادی کرنا چاہتا ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن مجھ جیسے نادار اور مفلس سے شادی کرے گا کون؟''

شاہ شجاع نے کہا۔ ''میں اپنی بیٹی سے تیری شادی کروں گا۔''

نوجوان اور زیادہ خوفزدہ ہو گیا، پوچھا۔ ''آپ اپنی بیٹی سے میری شادی کریں گے؟''

شاہ شجاع نے حیرت سے پوچھا۔ ''ہاں، مگر تجھ کو اس پر حیرت کیوں ہے؟''

نوجوان جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ نہیں پا رہا تھا۔ ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ والا! میں نے کئی بار آپ کے در پر شاہی سواری دیکھی ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس ملک کے اصل بادشاہ آپ ہی ہیں۔ آپ کی بیٹی شاہی خاندان کی لڑکی ہے، کیا وہ مجھ سے شادی کر کے خوش رہ سکے گی؟''

شاہ جہاں نے جواب دیا۔ ''یہ تو کیسی سادہ لوحی کی باتیں کرتا ہے، وہ میری بیٹی ہے اور میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں کہ وہ کہاں گزر کر سکے گی اور کہاں نہیں کر سکے گی۔''

نوجوان نے عرض کیا۔ ''ویسے تو میں بالکل تیار ہوں لیکن بس خوف یہی ہے کہ بعد میں کوئی جھگڑا نہ اٹھ کھڑا ہو۔''

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''ایسا نہیں ہوگا۔'' پھر پوچھا۔ ''تیرے پاس شادی کے لیے نقدی بھی ہے یا نہیں؟''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''میرے پاس صرف تین درم فی الوقت ہیں اور اس سے زیادہ کا میں بندوبست بھی نہیں کر سکتا۔''

شاہ شجاع نے کہا۔ ''چلو، یہ رقم بھی کافی ہے اب تم دن تاریخ مقرر کر لو۔''

نوجوان نے نہایت فدویانہ عرض کیا۔ ''چلیے اگر وہ تین درم ہی کافی ہیں تو مجھے بتائیے کہ اس کے علاوہ کیا کرنا ہوگا۔''

Scanned with CamScanner

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''ایک درم کی روٹیاں اور دوسرے درم کا سالن اور تیسرے درم سے عطر خرید لینا۔ باقی کام میں خود کر دوں گا۔''

شادی کی تاریخ دوسرے دن کی مقرر کر دی گئی۔

شاہ شجاع ادھر معاملہ طے کر کے اپنے گھر پہنچے اور بیوی سے کہا۔ ''میں نے اپنی بیٹی کا مسئلہ طے کر دیا ہے اور شادی کے لیے کل کی تاریخ مقرر کر دی ہے۔''

بیوی نے پوچھا۔ ''کہاں..... کس کے ساتھ..... کیا اپنے بھتیجے کے ساتھ؟''

شاہ نے جواب دیا۔ ''نہیں، بھتیجے کے ساتھ نہیں۔ مسجد میں ایک متقی پرہیزگار نوجوان آتا ہے، میں نے اسی سے یہ رشتہ طے کر دیا ہے۔''

بیوی نے کہا۔ ''وہ انکار تو نہیں کرے گی لیکن میرا خیال ہے کہ اگر اس سلسلے میں اس سے بھی پوچھ لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔''

شاہ نے جواب دیا۔ ''بے شک، وہ تو میں پوچھوں گا ہی۔ یہ کام میں خود کروں گا کیونکہ یہ بہت نازک کام ہے۔''

اس بات چیت کے بعد آپ اپنی بیٹی کے پاس گئے اور اس سے کہا۔ ''بیٹی! آج میں تجھ سے ایک اہم مسئلے میں کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

سعادت مند بیٹی نے جواب دیا۔ ''پوچھیے، ان شاء اللہ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔''

شاہ شجاع سوچنے لگے کہ بات کس طرح شروع کی جائے؟ آخر بولے۔ ''بیٹی! تجھ کو یہ بات تو معلوم ہی ہو گئی ہو گی کہ میرے بھائی کا بیٹا جوان دنوں اس ملک کا بادشاہ ہے، تیرا رشتہ مانگ رہا ہے اور اس نے اس سلسلے میں اپنی ماں کو بھی بھیجا تھا۔''

بیٹی نے شرمائے شرمائے لہجے میں جواب دیا۔ ''ہاں، مجھے معلوم ہے۔''

شاہ شجاع نے کہا۔ ''میں نے اپنے مرحوم بھائی کی بیوہ سے کہہ دیا ہے کہ میں ان کا تین دن بعد جواب دوں گا۔''

بیٹی نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش ہو گئی۔ آخر شجاع نے پوچھا۔ ''لیکن تین دن بعد میں اس کو کیا جواب دوں گا؟''

بیٹی نے جواب دیا۔ ''جس چیز کو آپ نے اپنے لیے پسند نہیں کیا، اس کو میرے لیے کیوں پسند فرما رہے ہیں آپ؟''

شاہ شجاع کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ''جزاک اللہ، سبحان اللہ! مجھے تجھ سے اسی جواب کی توقع تھی۔ واہ، واہ۔ اللہ نے کیا صالح سوچ عطا فرمائی ہے تجھ کو۔ میری طبیعت خوش کر دی تو نے۔''

بیٹی خاموش تھی اور شاہ شجاع بے حد خوش۔ اس کے فوراً بعد انہوں نے بیٹی کے سامنے اصل مسئلہ رکھ دیا۔ ''بیٹی! اب میں اصل مسئلہ تیرے سامنے رکھے دیتا ہوں۔ میں ایک ایسے نوجوان سے واقف ہوں جو انتہائی متقی اور پرہیزگار ہے۔ وہ درویش ہے اور جو شخص نوجوانی ہی میں درویش ہو جائے، اس کا اللہ کے نزدیک کیا مقام ہو گا، تو خود سمجھ سکتی ہے۔''

بیٹی خاموشی سے یہ سب سنتی رہی۔ آخر میں پوچھا۔ ''باوا جان! آپ نے بات پوری نہیں کی۔''

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ ''میں نے تیرا رشتہ اس نوجوان سے طے کر دیا ہے اور کل کا دن اس نیک کام کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ اب تیری جیسی بھی مرضی ہو۔''

بیٹی نے کہا۔ ''باوا جان! میں آپ سے زیادہ دانا بینا نہیں ہوں۔ آپ نے جو کچھ طے کر دیا ہے، میں اس سے متفق ہوں۔''

شاہ شجاع کو اپنی پاکباز بیٹی سے یہی توقع تھی۔ اس شادی میں کوئی تیاری بھی نہیں کی گئی۔ سیدھے سادے طریقے سے شادی کر دی گئی۔ نکاح خود شاہ شجاع نے پڑھایا۔ براتیوں میں آس پاس کے چند شریفوں کو شریک کر لیا گیا تھا۔

نوجوان اپنی بیوی کو اپنے جھونپڑے نما گھر میں لے گیا۔ اس چھوٹے سے گھر کا کائی نو بیاہی دلہن نے جائزہ لیا۔ اس خالی گھر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ دولہا کا ایک عزیز تک اس گھر میں نہیں تھا۔ دلہن نے شوہر سے پوچھا۔ ''کیا آپ اس گھر میں اکیلے رہتے ہیں؟''

احساسِ کمتری میں مبتلا شوہر نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں اس گھر میں تنہا رہتا ہوں، اس لیے کہ میں اس دنیا میں اکیلا ہی ہوں۔ یہاں میرا کوئی عزیز، رشتے دار نہیں ہے۔''

digest library.com

Scanned with CamScanner

دلہن نے ایک طرف کونے میں ایک گھڑا رکھا ہوا دیکھا، پوچھا۔ ''اس میں پانی ہے؟''
جواب دیا۔ ''ہاں، تھوڑا بہت پانی تو اس میں موجود ہوگا۔ کیوں، کیا پانی درکار ہے آپ کو؟''
دلہن نے کہا۔ ''نہیں، میں تو اس گھر کا اور اس گھر کے ساز و سامان کا یوں ہی جائزہ لے رہی ہوں۔''
نوجوان کچھ اور ہی سمجھا۔ اس نے عاجزی و انکساری سے کہا۔ ''خاتونِ محترم! میں آپ کے مزاجی کرب سے کسی حد تک واقف ہوں۔ آپ شہزادی ہیں، آپ کو میرا یہ گھر پسند آنا بھی نہیں چاہیے۔ میرا آپ کا کوئی جوڑ بھی تو نہیں۔ میں نے انکار کر دیا تھا لیکن آپ کے والد مانے ہی نہیں۔ میں ابھی شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔''
دلہن نے شاید ان باتوں کو صحیح طور پر سنا بھی نہیں۔ گھڑے پر ایک سوکھی روٹی رکھی تھی۔ دلہن نے اس روٹی کو اٹھایا، پوچھا۔ ''یہ روٹی، یہ سوکھی روٹی یہاں کیوں رکھی ہے؟''
نوجوان دولہا نے جواب دیا۔ ''یہ روٹی ہے، کل کی پکی ہوئی ہے۔ کل میں بازار سے دو روٹیاں لایا تھا۔ ایک کل ہی کھالی تھی اور دوسری یہ آج کے لیے بچالی تھی۔''
دلہن نے بیزاری کا اظہار کیا اور کہا۔ ''براہِ کرم آپ مجھے میرے والدین کے گھر پہنچا دیں۔''
دولہا کو اس بات سے بڑا دکھ پہنچا اور کہا۔ ''خاتون! آپ میری دلہن ہیں اور آج ہی اس گھر میں آئی ہیں۔ آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔''
دلہن نے مختصراً جواب دیا۔ ''براہِ کرم آپ مجھے میرے والدین کے گھر پہنچا دیں۔''
دولہا نے اپنی بیوی کے چہرے پر موجود عزم و ثبات کو دیکھا تو کانپ گیا، بولا۔ ''میں اپنے اس انجام سے اچھی طرح واقف تھا لیکن آپ کے والد شاہ شجاع مانے ہی نہیں۔ کہنے لگے میری بیٹی بہت متقی اور پرہیزگار ہے۔ میں باتوں میں آگیا۔''
دلہن نے پوچھا۔ ''آپ اپنے کس انجام کی بات کر رہے ہیں؟''
نوجوان شوہر نے جواب دیا۔ ''میں جانتا تھا کہ آپ شہزادی ہیں، آپ کا اپنا ایک مزاج ہوگا۔ میں نے تو پہلے ہی یہ سوچ لیا تھا کہ آپ اس جھونپڑے میں خوش نہیں رہیں گی لیکن شوق اور لالچ نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ اگر آپ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں تو میں ہمیشہ کے لیے ادھورا اور پریشان رہ جاؤں گا۔''
دلہن نے کہا۔ ''میں آج ہی اپنے والدین کے پاس اس لیے واپس جا رہی ہوں کہ شادی سے پہلے میرے باپ نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ میں تیری شادی ایک غریف نوجوان سے کر رہا ہوں۔ اب میں اپنے باپ پر حیران ہو رہی ہوں کہ انہوں نے ایک ایسے نوجوان کو غریف کیونکر کہہ دیا جو اللہ پر بھروسا نہیں کرتا اور روٹی کا کل کے لیے انتظام کر رکھتا ہے۔''
نوجوان بہت شرمندہ ہو گیا، بولا۔ ''آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے اور میں معافی چاہتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔''
دلہن نے جواب دیا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ جو چاہیں کریں لیکن میں ایسے گھر میں نہیں رہوں گی جہاں کل کی فکر کی جا رہی ہو۔ اب اس گھر میں یا تو میں رہوں گی یا پھر روٹی رہے گی۔ اب میں اسی گھر میں رہنا پسند کروں گی جہاں کل کی فکر ہی نہ ہو۔ بس یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔''
شوہر نے اعلان کر دیا۔ ''اس گھر میں ہم دونوں رہیں گے۔ روٹی جو جھگڑے فساد کی جڑ ہے، میں اس جڑ سے دور رہنا چاہتا ہوں۔'' اس کے بعد روٹی کو خیرات کر دیا گیا اور دونوں میاں بیوی اطمینان سے رہنے لگے۔
رات کے پچھلے پہر ان دونوں نے بربط کی آواز سنی۔ انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ بہن، بھائی کی بربط نوازی سے خوب واقف تھی۔ شوہر سے کہا۔ ''ذرا باہر تو جائیے، دیکھیے شاید یہ میرا بھائی بربط بجا رہا ہے۔''
شوہر نے باہر جا کے دیکھا تو یہ واقعی ان کا برادرِ نسبتی تھا۔ بہن نے بھائی سے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''بھائی! یہ تم نے کیا حال بنا رکھا ہے؟ کیا تمہیں اللہ سے ڈر نہیں لگتا جو یہ بربط لیے آوارہ و سرگرداں پھرتے رہتے ہو؟''
بھائی نے جواب دیا۔ ''اللہ تو نہایت محبت کرنے والا مہربان ہے۔''
بہن نے کہا۔ ''بھائی! بربط بجانا چھوڑ دو اور باوا جان کے نقشِ قدم پر چلو۔ اسی میں عافیت ہے، اسی میں نجات ہے۔''
بھائی نے بے مروتی سے کہا۔ ''بہن! میں آپ کا ادب کرتا ہوں۔ جس طرح میں آپ کے معاملات میں دخل نہیں دیتا، اسی طرح آپ کو میرے معاملات سے غیر متعلق رہنا چاہیے۔ ہم دونوں کی راہیں الگ الگ ہیں اس لیے ہمیں ایک دوسرے

Scanned with CamScanner

کے معاملات زندگی میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے۔"

بہن نے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی، بولی۔ "بھائی! اگر میں تمہاری بہن نہ ہوتی تو شاید خاموش ہو جاتی لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ تم دین اور دنیا میں برباد ہو جاؤ۔"

بھائی نے جواب دیا۔ "اچھا، اب میں جاؤں گا اور دیکھو بہن! تم آئندہ مجھے اس طرح نہیں بلاؤ گی۔ اگر بلاؤ گی تو میں نہیں آؤں گا۔"

بہن نے کہا۔ "لیکن میں باز نہیں آؤں گی۔ تم اپنا کام کرتے رہو، میں اپنا کام کروں گی۔ میں یہ پوچھتی ہوں کہ آخر تمہیں تکلیف کیا ہے؟"

بھائی نے ایک سرد آہ بھری اور جواب دیا۔ "بہن! جب میں یہ سوچتا ہوں کہ یہاں کی حکومت میرے باپ کے پاس تھی تو میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ اس حکومت کو ہمارے ہی پاس ہونا چاہیے تھا۔ حکومت میں جو مزہ، جو کیف ہوتا ہے اس کو میں اس غربت میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔"

بہن کو بھائی کی باتیں تکلیف پہنچا رہی تھیں۔ اس نے جواب دیا۔ "میں کچھ کہوں گی تو نہیں لیکن ایک بات پیشگوئی کے طور پر تمہارے دل و دماغ میں اتار دوں گی۔ دنیا میں کچھ نہیں رکھا، یہ دھوکے فریب کی دنیا ہمیں دھوکے فریب کے علاوہ اور کیا دے گی؟"

بھائی نے اپنے بربط کو ساتھ لیا اور مزید کوئی بات کہے بغیر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

بازاروں، گلی کوچوں میں شاہ شجاع کے بیٹے کا بڑا چرچا تھا۔ لوگ اس کو شاہ شجاع کے حوالے سے پہچانتے تھے اور عزت دیتے تھے۔ اس کا جدھر سے بھی گزر ہوتا، لوگ اس سے بربط بجانے کی فرمائش کرتے۔

شاہ شجاع نے بیوی سے کہا۔ "اگر صاحبزادے کے یہی لیل و نہار رہے تو میں اس بستی کو بھی چھوڑ دوں گا اور کسی ویرانے میں چلا جاؤں گا۔"

بیوی نے پوچھا۔ "کسی ویرانے میں جا بسنے سے آپ کو کیا فائدہ پہنچے گا؟"

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ "اس سے ہمیں یہ فائدہ پہنچے گا کہ لوگ ہمیں شرمندہ نہیں کریں گے۔"

بیوی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "اس میں بھی ایک خرابی ہے کیونکہ آج آپ جس جگہ کو ویرانہ کہیں گے، جب آپ وہاں بسیں گے تو وہ جگہ بھی رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ شہر کی شکل اختیار کر جائے گی اس لیے آپ کو جو کچھ کرنا ہے، یہیں کیجیے۔"

شاہ شجاع کی سمجھ میں یہ بات آ گئی، کہا۔ "تم بھی ٹھیک ہی کہتی ہو۔ پھر یہ بتاؤ کہ میں اپنے بیٹے کے لیے کیا کروں کہ یہ سُدھر جائے؟"

بیوی نے جواب دیا۔ "دعا..... آپ اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں دائر کر دیجیے اور دیکھیے کہ وہاں سے کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے۔"

شاہ شجاع نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسی وقت اپنا یہ مقدمہ اللہ کی عدالت میں دائر کر دیا اور گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "اے اللہ! یہ میرے لیے کتنے کرب اور اذیت کی بات ہے کہ میں اپنے بیٹے کو راہِ راست پر نہیں لا سکتا۔ اب مجھ پر رحم فرما اور میرے بیٹے کو سیدھی راہ دکھا۔"

جب یہ اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں دائر کر رہے تھے، ان کا بیٹا بربط لیے بازار میں گاتا پھر رہا تھا اور شائقین اس کے آگے پیچھے داد دے رہے تھے۔ اس ہجوم میں ایک بزرگ نے بربط نواز بیٹے سے کہا۔ "کچھ جانتا ہے کہ تیرا باپ کیا کر رہا ہے؟"

لڑکے نے پوچھا۔ "میرا باپ کیا کر رہا ہے؟"

بزرگ نے جواب دیا۔ "تیرے باپ نے تیرے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ہے اور عنقریب پیشیاں پڑنے والی ہیں۔"

بربط نواز بیٹے نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میرے باپ کو اس کے سوا آتا ہی کیا ہے۔ جب پیشیاں پڑیں گی تو میں سوال جواب کر کے عدالت کو حیران کر دوں گا۔"

بزرگ نے کہا۔ "نالائق! وہ مقدمہ کسی دنیاوی عدالت میں نہیں، خدا کی عدالت میں دائر کیا گیا ہے۔ وہاں پیشیاں

Scanned with CamScanner

پڑیں گی مگر تجھ کو ان کا پتا تک نہیں چلے گا۔"

لوگوں نے شور کر دیا۔ "بربط بجاؤ، بربط سناؤ۔ بڑے میاں اوقت نہ ضائع کرو، دور ہٹو۔"

بڑے میاں نے ہنس کر جواب دیا۔ "واہ، واہ۔ کیا بات کہی ہے تم لوگوں نے۔ میں کام کی باتیں کرتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ وقت نہ ضائع کرو اور جب یہ شاہ شجاع کا بیٹا بربط نوازی کر کے اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتا ہے تو یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کے وقت کا صحیح استعمال ہو رہا ہے۔ اللہ تمہیں ہدایت دے اور عقلِ سلیم عطا فرمائے۔"

بربط نوازی جاری رہی اور بربط نواز شہزادے کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اللہ کی عدالت میں مقدمے کی آخری تاریخ پڑ گئی اور فیصلے کا دن آ گیا۔

نصف رات گزر چکی تھی۔ چاند غائب تھا، آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا۔ شاید یہ چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ بربط نوازی میں رات کا نصف حصہ گنوانے کے بعد شہزادہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ راستے میں ایک مکان کو اس نے جگمگاتے ہوئے دیکھا۔ یہاں کسی کی شادی ہوئی تھی اور دولہا اپنی دلہن سے باتیں کرتے کرتے سو گیا تھا۔ بربط نواز شہزادے پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ اس نے اس مکان کی دیوار کے سائے میں بربط بجانا شروع کر دیا۔ دلکش اور دلوں میں اتر جانے والی آواز کانوں میں رس گھولنے لگی اور ایک سماں بندھ گیا۔

گھر میں نئی نویلی دلہن ابھی تک جاگ رہی تھی۔ بربط کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ بے چین ہو کر دروازے پر آ گئی اور جھانکنے لگی۔ شہزادہ بربط نوازی میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ اسے کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ کچھ دیر بعد اندر سوئے ہوئے شوہر کی آنکھ بھی کھل گئی۔ اس نے اپنے آس پاس بیوی کو تلاش کیا۔ جب وہ کہیں نظر نہ آئی تو چپکے سے اٹھا اور اسے تلاش کرتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ بربط کی آواز دولہا کے کانوں میں بھی رس گھول رہی تھی۔ اس نے دروازے کے پاس اپنی بیوی کو اس حال میں دیکھا کہ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس میں سے بیوی کا چہرہ ذرا سا نکلا ہوا تھا۔ دروازے کی درز سے اس نے جھانک کر بربط نواز کو دیکھا اور پہچان لیا کہ یہ تو شاہ شجاع کا بربط نواز بیٹا ہے جو آج کل بازاروں اور گلی کوچوں میں آوارہ و سرگرداں پھر رہا ہے۔ اگر باپ نے بروگ نہ لیا ہوتا تو یہی لڑکا یہاں کا شہزادہ اور ولی عہد ہوتا۔ اس کو یہ دیکھ کر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ اس کا کر کچھ بھی نہ سکتا تھا۔ اس نے بیوی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے پوچھا۔ "تو یہاں کیا کر رہی ہے؟"

بیوی نے چونک کر اپنے پیچھے شوہر کو جو دیکھا تو گھبرا گئی اور کھسیا کر جواب دیا۔ "آپ بھی تو بربط کی آواز سن رہے ہیں، کیسا سماں بجاتا ہے یہ لڑکا۔"

شوہر کے دل میں حسد اور رقابت کی آگ جل اٹھی، بولا۔ "ادھر آ، چل اندر، تجھ سے تو میں بعد میں باتیں کروں گا پہلے میں اس نوجوان سے بات کر لوں۔"

بیوی نے شوہر کی خوشامد شروع کر دی، کہا۔ "خدا کے لیے اس نوجوان سے کچھ نہ کہیے گا کیونکہ اس کی کوئی خطا نہیں۔ میں یہاں اپنی مرضی سے آئی تھی اور پھر یہ کہ اگر آپ نے اس کے خلاف کچھ کہا تو یاد رکھیے گا کہ یہ یہاں کے بادشاہ کا چچازاد بھائی ہے اور ہم سب کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔"

شوہر نے کہا۔ "تو اندر تو جا۔ میں اسے ماروں گا نہیں، بس ذرا غیرت دلاؤں گا۔ امید ہے کہ اس سے بات بن جائے گی۔"

لیکن بیوی کو اپنے شوہر کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، بولی۔ "میں دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوں، آپ ان سے باتیں کیجیے جا کر۔"

شوہر بیوی کو چھوڑ کر باہر چلا گیا اور بربط نواز شہزادے کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

بربط نوازی ختم ہو گئی اور شہزادہ کھڑا ہو گیا۔ شوہر کو غصہ چڑھا ہوا تھا۔ اس نے شہزادے کا گریبان پکڑ لیا اور اس کو جھٹکا دے کر پوچھا۔ "یہ یہاں کیا ہو رہا ہے نوجوان؟"

شہزادے نے جواب دیا۔ "بربط بجا رہا ہوں۔ کیوں، کیا آپ کو اس پر اعتراض ہے کسی قسم کا؟"

شوہر نے ایک جھٹکا اور دیا اور کہا۔ "اعتراض، ایسا ویسا اعتراض۔ میں ابھی بتاتا ہوں تجھ کو کہ مجھ کو کس قسم کا اعتراض ہے۔"

شوہر یہ کہہ کر نوجوان سے دھینگا مشتی کرنے لگا۔ شہزادے نے کہا۔ "یہ کیا کرتے ہو، شور و غل ہو گا، محلے کے لوگ جمع

digest library.com

Scanned with CamScanner

ہو جائیں گے اور تجھ سے پوچھیں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے تو تو کیا جواب دے گا؟"

شوہر کی سمجھ میں یہ بات آ گئی، بولا۔ "اچھا اس وقت تو میں تجھ کو چھوڑ دوں گا، اب تو یہاں سے چلا جا لیکن جانے سے پہلے ہمیں ایک بات بتاتا جا۔"

شہزادے نے پوچھا۔ "وہ کیا؟ پوچھو، میں ضرور جواب دوں گا۔"

شوہر نے پوچھا۔ "کیا تو شاہ شجاع کا بیٹا ہے؟"

شہزادے نے جواب دیا۔ "ہاں، میں انہی کا ننگِ خاندان بیٹا ہوں۔"

شوہر نے مزید سوال کیا۔ "اور جیسا کہ میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ تیرا باپ تجھ سے بے حد ناراض بھی ہے؟"

شہزادے نے جواب دیا۔ "ہاں، یہ بات بھی درست ہے۔"

شوہر نے کہا۔ "جب وہ بھی درست ہے اور یہ بھی درست ہے تو کیا بات ہے کہ تو اپنے ننگِ خاندان کام سے باز بھی نہیں آتا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟"

شہزادے کو رونا آ گیا، بولا۔ "اپنے پاس حکومت تھی، وہ باپ نے اپنے بھائی اور بھتیجے کو دے دی۔ میں نے اپنے غم غلط کرنے کے لیے بربط کا سہارا لیا تو اس کا اپنے والد کے ساتھ ایک زمانہ دشمن ہو رہا ہے۔ اب تو ہی بتا کہ میں کیا کروں، کہاں جاؤں؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "اب تم سیدھے سیدھے گھر جاؤ اور توبہ و استغفار کرو۔ شاید خدا کو تمہاری توبہ پسند آ جائے۔"

شہزادے نے بربط سنبھالا اور آہستہ سے کہا۔ "تو نے ٹھیک کہا۔ شاید خدا کو میری ادا پسند آ جائے اور میں توبہ پر مائل ہو جاؤں۔"

شہزادے نے گھر جا کر بربط توڑ دیا اور اندر بند ہو کے روتا رہا۔ رو رو کر اس نے اپنی آنکھیں سجا لیں۔ شاہ شجاع کو جب یہ بتایا گیا کہ اُن کا بیٹا اندر رو رہا ہے اور اس نے بربط توڑ کر پھینک دیا ہے تو انہیں بڑی حیرت ہوئی، پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

بیوی نے جواب دیا۔ "اس میں ذرا سا بھی جھوٹ نہیں ہے۔ میں نے ٹوٹا ہوا بربط خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ آپ اندر جائیں اور میں نے جو کچھ کہا ہے اس کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیں۔"

شاہ شجاع نے اپنے بیٹے کے پاس کھڑے ہو کر پوچھا۔ "کیا ہوا بیٹے! تو کیوں رو رہا ہے؟"

بیٹے نے اشک آلود نظروں سے باپ کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کر سینے سے لگ گیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔

شاہ سجاد نے اپنے بیٹے کو بھینچ لیا اور پشت کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "نہ رو میرے بیٹے! میں تیرے کرب سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جو میں جانتا ہوں، تو نہیں جانتا۔ جس حکومت کو میں نے چھوڑ دیا، اس کے فرخشوں سے تو واقف نہیں۔ وہ ہمارے لیے عذاب تھا اور تیرے لیے خواب۔ اس میں بڑی مصیبتیں تھیں۔ گھڑی دو گھڑی کا عیش اور ہمیشہ کا عذاب۔ تو نے بربط بجانا شروع کیا۔ میں نے تجھ کو ایک آدھ بار منع کیا، اس کے بعد خاموش ہو گیا۔ اب تو نے خود ہی بربط کو توڑ ڈالا تو میں تجھ سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟"

بیٹے نے جواب دیا۔ "اب میں اس دنیا سے بیزار ہو چکا ہوں۔ مجھ کو وہ راستہ دکھائیے کہ میں سکون حاصل کر سکوں، میری بے چینیوں میں کمی واقع ہو اور میں خود کو اپنی نظروں میں گرا ہوا نہ محسوس کروں۔"

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ "نہ گھبرا میرے بیٹے اب ٹھیک ہو جائے گا۔"

بیٹا ایک بار پھر سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ شاہ شجاع بھی رونے لگے۔ بیٹے سے کہا۔ "امتحانات اور آزمائشوں کا سلسلہ جاری ہے، خدا جانے یہ سلسلہ کب ختم ہو گا؟"

بیٹے نے کہا۔ "میں نے بربط نوازی سے توبہ کر لی ہے۔ کیا میری توبہ قبول ہو جائے گی؟"

شاہ شجاع نے جواب دیا۔ "بیٹے! وہ غفور الرحیم بھی ہے اور ستار العیوب بھی۔ اس سے مایوس نہ ہو۔"

اب بیٹے نے باپ کے ساتھ ان کی نگرانی اور سرپرستی میں مجاہدہ اور تزکیۂ نفس شروع کر دیا اور اپنے باپ شاہ شجاع کے بقول کہ جو مقام و مرتبہ چالیس سال میں حاصل نہ ہو سکا تھا، اسے ان کے بیٹے نے چالیس دن میں حاصل کر لیا تھا۔

☆☆☆

Scanned with CamScanner

اب شاہ شجاع نے سیاحت شروع کر دی تھی۔ گھر میں بیٹا تو موجود ہی تھا۔ آپ مختلف شہروں میں گئے اور صوفیوں سے ملاقاتیں کیں۔ شاہ شجاع کا شہرہ ان سے پہلے ہی جگہ جگہ پہنچ چکا تھا۔ اسی عہد کے مشہور صوفی یحییٰ بن معاذ سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر بے حد خوش ہوتے۔

یحییٰ بن معاذ لوگوں میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن آپ نے شاہ شجاع کو دعوت دی کہ میری مجلسِ وعظ میں آپ تشریف لائیں۔ آپ نے انکار تو نہیں کیا لیکن مجلسِ وعظ میں گئے نہیں۔ حضرت یحییٰ بن معاذ کو آپ سے شکایت ہو گئی کہ بلانے پر آئے نہیں۔ ایک دن آپ بغیر بلائے وہاں چلے گئے اور اس ہجوم میں ایک جگہ چپ چاپ چھپ کر بیٹھ گئے۔ یحییٰ بن معاذ انہیں نہیں دیکھ سکے اور اپنے وعظ میں مشغول رہے۔

کچھ دیر بعد یحییٰ بن معاذ کی زبان جواب دے گئی اور وعظ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ جب کئی بار کوششوں کے باوجود وہ کچھ نہ بول سکے تو اعلان کیا اور کہا۔ "میرا خیال ہے اس مجلس میں کوئی ایسا شخص بھی موجود ہے جو مجھ سے بڑا واعظ ہے۔ اگر ہے تو وہ میرے سامنے آجائے۔"

شاہ شجاع ان کے سامنے چلے گئے۔ یحییٰ بن معاذ نے کہا۔ "تو یہ آپ ہیں جس نے میری زباں بندی کر دی تھی۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اسی وجہ سے میں آپ کی مجلسِ وعظ میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔"

آپ کی اپنے ہم عصروں سے خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ اسی عہد کے ابو حفص نام کے ایک مشہور صوفی نے آپ کو خط میں لکھا۔ "جب میں نے اپنے کل نفس اور مصنوعوں پر نگاہ ڈالی تو مایوسیوں کے سوا کچھ نہ ملا۔"

آپ نے جواب میں لکھا۔ "حضرت! میں نے آپ کے مکتوب کو اپنے قلب کے لیے آئینہ بنا لیا ہے کیونکہ میں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر نفس سے مخلصانہ مایوسی ہو گی اور جب نفس سے مایوسی ہو جائے گی تو اللہ کی یاد ہو سکے گی اور جب اللہ کی یاد مکمل ہو گی تو استغنا پیدا ہو گا اور مستغنی ہونے کے بعد ہی اللہ کا وصل ہو سکتا ہے۔"

اسی طرح ایک موقع پر فقر کے بارے میں بتایا کہ فقر خدا کا ایک راز ہے اور جب تک فقراء اس کو پوشیدہ رکھتے ہیں، امین ہوتے ہیں مگر جب راز افشا ہو جاتا ہے تو اس سے فقر سلب کر لیا جاتا ہے۔

آپ نے فضل اور ولایت کے بارے میں کسی دوسرے صوفی کو لکھا۔ "یاد رکھو، اہلِ فضل کا فضل اور اہلِ ولایت کی ولایت اسی وقت قائم رہتی ہے جب تک وہ اپنے فضل اور ولایت کو فضل و ولایت تصور نہیں کرتے۔"

آپ نے ایک بار اپنے بارے میں فرمایا۔ "میری مثال اس مرغ جیسی ہے جس کو یخ میں پرو کر آگ پر رکھ دیا جائے اور چاروں طرف سے آگ دہکا دی جائے۔"

آپ طویل عمر گزارنے کے بعد وصال فرما گئے۔ آپ کی قبر پر فقراء زیارت کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے۔ علی سیر جانی آپ کے مرید تھے اور ان کا قاعدہ تھا کہ مزار پر کھانا پکوا کر تقسیم کیا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر آپ نے دعا کی۔ "اے اللہ! اس وقت کسی مہمان کو بھیج دے تاکہ میں اس کے ساتھ کھانا کھاؤں۔"

تھوڑی دیر بعد کسی طرف سے ایک کتا آیا اور آپ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ آپ نے اس کو دھتکار کر بھگا دیا۔ جب کتا چلا گیا تو کسی نے دل میں کہا۔ "واہ، کیا خوب آدمی ہو۔ خود ہی مہمان کی تمنا کرتے ہو اور جب مہمان آتا ہے تو اس کو دھتکار کر بھگا دیتے ہو۔"

علی سیر جانی مضطربانہ اٹھے اور کتے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ کئی دن کی جستجو کے بعد وہ کتا ایک جنگل میں مل گیا۔ آپ نے کھانا اس کے آگے رکھ دیا اور کہا۔ "میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

کتے نے کھانا نہیں کھایا۔ احساسِ ندامت سے علی سیر جانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور توبہ و استغفار کرنے لگے۔

کسی نے ان سے کہا۔ "اے علی سیر جانی! تم نے اس کے ساتھ جو حرکت کی تھی، وہ اگر شاہ شجاع کے مزار سے ہٹ کر کرتے تو وہ سزا دی جاتی کہ تم زندگی بھر یاد رکھتے۔"

ختم شُد

مضمون کے مآخذ

تذکرۃ الاولیاء۔ شیخ فرید الدین عطار۔ روضۃ الریاحین۔ ابی محمد عبداللہ بن اسعد یمنی۔ کشف المحجوب۔ حضرت داتا گنج بخش۔ طبقات الاولیاء۔ علامہ عبدالوہاب الشعرانی۔ حکایات شیریں۔ مدیر مجلہ الیمنہ۔ لاہور

digest library.com

Scanned with CamScanner

ایک دکھیاری ماں کے نوجوان بیٹے کی نشے میں مبتلا ہونے کی داستان

نشہ ایک ایسی لعنت... جس کو اس کی لت پڑ گئی اسے اچھے بُرے، صحیح غلط کی تمیز نہ رہی... یہاں تک کہ رشتوں کی پہچان بھی بھول گیا... کیا ماں باپ، کیا بہن بھائی... سب اس کی نظر ہو گئے... نہ جانے اب تک کتنی زندگیاں اس کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں... اور نہ جانے کتنی اور چڑھنا باقی ہیں...؟

گمشدہ

صبا مغل

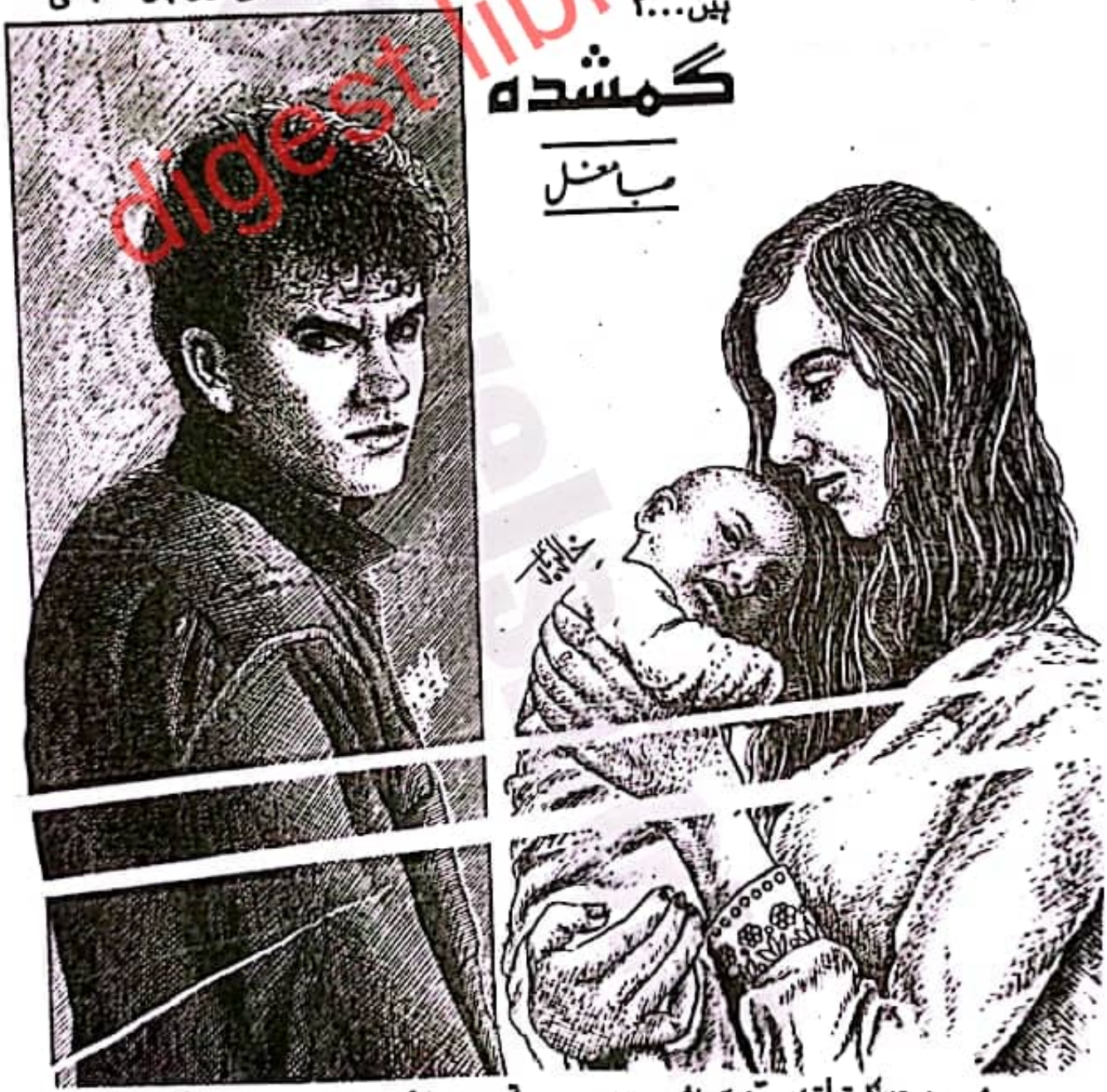

میرے چچا انکل توفیق کا پتے کا آپریشن ہوا تھا اور وہ ہاسپٹلائزڈ تھے۔ انہیں مکمل صحت یاب ہونے میں ابھی چند دن درکار تھے۔ چچی کے کہنے پر اس دوران مجھے ان کی دکان پر وقت دینا تھا۔ اچھرے بازار میں ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ چونکہ آفس میں آج کل میری نائٹ ڈیوٹیز چل رہی تھیں اس لیے صبح گیارہ بارہ بجے کے بعد چند گھنٹوں کے لیے دکان پر بیٹھنے میں مجھے کوئی قباحت نہ تھی اور آج یہاں دکان پر میرا پہلا دن تھا۔

کتنا منفرد تجربہ تھا۔ کچھ خواتین تو خالصتاً خریداری کی غرض سے ہی دکان میں داخل ہوتی ہیں جبکہ ایک بڑی تعداد

digest library.com

Scanned with CamScanner

ایسی خواتین کی بھی ہوتی ہے جن کا سرے سے خریداری کا کوئی ارادہ ہی نہیں ہوتا۔ کچھ دیر تک بغیر اپنی ڈیمانڈ بتائے اِدھر اُدھر دیکھنے اور ہینگرز میں لگے کپڑے ٹٹولنے کے بعد وہ جس طرح چپ چاپ دکان میں داخل ہوتی ہیں، ویسے ہی چپ چاپ نکل بھی جاتی ہیں اور پھر کچھ خریدار خواتین ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو ڈیل کرنا جگر گردے کا کام ہوتا ہے۔ وہ نہ کچھ خریدتی ہیں اور نہ ہی آسانی سے جان چھوڑتی ہیں۔

آج دکان پر میرا پہلا دن تھا۔ چچا نے شام کی چائے لگوائی ہوئی تھی۔ ایک بچہ باقی آس پاس کے دکانداروں کی طرح میرے لیے بھی اپنی طرح کا ہی چھوٹا اور دبلا پتلا سا کپ کاؤنٹر پر رکھ کر گیا تھا۔ میں ابھی کپ کی جانب ہاتھ بڑھا ہی رہا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر خاتون دھپ سے دکان میں داخل ہوئی۔

''آپ نے میرے بچے کو تو نہیں دیکھا۔ چار سال کا بیٹا ہے میرا..... م..... میری انگلی تھام کر میرے ساتھ چل رہا تھا، اچانک ہی کھو گیا ہے۔''

وہ خاتون غالباً بری طرح بوکھلائی ہوئی تھی۔ چاندی رنگ، کھچڑی بال اس کی بوسیدہ سی چنری سے نکل کر چہرے اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ مرا ہجوم جگہ پر اس طرح بچے کا کھو جانا چند بدترین سچویشنز میں سے ایک ہے۔

''نہیں ماں جی! ادھر تو کوئی بچہ نہیں آیا۔ آپ حوصلہ رکھیں۔ بچہ مل جائے گا یا یوں کریں کہ بازار کی مسجد میں اعلان کروا دیں۔''

دکان کا مسئلہ نہ ہوتا تو شاید میں خاتون کے ساتھ ہی بچہ ڈھونڈنے نکل پڑتا۔ وہ جیسے آئی تھی، ویسے ہی سرعت سے آگے بڑھ گئی۔ میں کافی دیر تک کسی اعلان وغیرہ کا [illegible] رہا۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں دل ہی دل میں اس خاتون کے لیے دعا گو بھی رہا۔ اگلے دن آفس میں میری [illegible] کی وجہ سے دکان مجھے تھوڑا جلدی بند کرنا پڑی۔ میں اپنا لیپ ٹاپ اور سامان سمیٹ رہا تھا جب چائے والا بچہ آ گیا۔

''چھوٹے! یہ چائے آج میری طرف سے تم پی لو۔ میں تو بس نکل رہا ہوں۔'' چھوٹا خوشی خوشی باہر نکل گیا اور میں نے شٹر کے تالے اور چابی پکڑی۔ یہی وقت تھا جب دروازہ کھلا اور کل والی خاتون دھپ سے اندر آئی۔

''آپ نے میرے بچے کو تو نہیں دیکھا۔ چار سال کا بیٹا ہے میرا۔ میری انگلی تھام کر چل رہا تھا میرے ساتھ۔ اچانک ہی کھو گیا ہے۔''

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی سین ری وائنڈ ہوا ہو۔ وہی حلیہ، وہی تاثرات، وہی الفاظ۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ میں ابھی کچھ کہنے بولنے کے لیے الفاظ ہی ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

''نہیں دیکھا ہوگا..... تم نے بھی۔''

یہ کیا معاملہ تھا؟ کیا یہ خاتون اب تک بازار میں اپنے بچے کو ڈھونڈ رہی ہے یا پھر..... شاید یہ عورت سنکی ہے۔ آج تو مجھے آفس پہنچنے کی جلدی تھی تاہم میں نے ارادہ کیا کہ کل ذیشان سے اس بارے میں ضرور پوچھوں گا۔ ساتھ والی دکان ذیشان کی تھی۔ اس کے ساتھ اس سے کل بھی میری سلام دعا تھی۔

اگلے روز شام کے بعد دکان بند کر کے میں آفس کے لیے نکلا تو ذیشان کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے وہ خاتون یاد آ گئی اور میرے قدم چاروناچار اس کی دکان کی جانب بڑھ گئے۔ آج دکان پر ذیشان کے ساتھ اس کے والد گرامی بھی موجود تھے۔ اب ضعیف العمری کے پیش نظر وہ زیادہ تر گھر میں ہی رہتے تھے اور پچھلے سات آٹھ ماہ سے ذیشان ہی باقاعدہ طور پر دکانداری کرتا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد انہوں نے مجھے ٹھنڈے گرم کی پیشکش کی۔

''بہت مہربانی۔ میں ابھی چائے پی کر نکلا ہوں۔'' فوراً ہی میں اصل مدعے پر آتے ہوئے بولا۔

''ذیشان یار! یہ خاتون کون ہیں؟'' میں نے گزشتہ روز اور پرسوں ہونے والا واقعہ اس کے گوش گزار کیا۔

''ہاں یار! یہ بیچاری سنکی عورت ہے۔ ہفتے میں [illegible] آدھ دسے کے علاوہ تقریباً روز ہی آتی ہے اور ایک ہی وقت پر آتی ہے۔ مانگتی کچھ بھی نہیں بس بیچاری [illegible] بچہ [illegible] ہے۔

''تو واقعی کیا اس کا کوئی بچہ گم ہو گیا تھا؟'' اس خاتون کا ستا ہوا پریشان چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا۔

''یار! صحیح طرح سے پتا نہیں پر وہ میرے ورکر انعام نے بتایا تھا کہ شاید اس کا بچہ فوت ہو گیا تھا۔ تبھی اس کا ذہنی توازن بھی خراب ہو گیا اور اب ایسے ہی بیچاری اپنا بیٹا ڈھونڈتی رہتی ہے۔ دکھی کہانی ہے بیچاری کی۔'' ذیشان نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

میں دیکھ رہا تھا اس کے والد صاحب کے چہرے پر ایک ہیجان کی کیفیت تھی۔ ان کے ڈھلکے چہرے کی سلوٹوں میں ایک درد کروٹیں لینے لگا تھا جس میں ترس اور دکھ کے ملے جلے تاثرات تھے۔

Scanned with CamScanner

"ایشان پترا اصل بات تو تمہارے علم میں بھی نہیں ہے۔" انہوں نے اپنی سرخ و سپید ڈاڑھی میں خلال کرتے ہوئے کہا۔ "اس نصیب جلی کا بچہ اگر مر گیا ہوتا تو شاید اسے کبھی نہ کبھی سکون آ ہی جاتا۔"

"تو بابا جان پھر اس کا کیا معاملہ ہے؟" ایشان نے پوچھا۔

اس دن گرمی نے ریکارڈ قائم کیا تھا اس لیے شام کے اس سمے بھی بازار میں رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ عمر رسیدہ حاجی انوار صاحب نے اس حواس باختہ دیوانی عورت کی جو روداد سنائی، وہ کچھ یوں تھی۔

زبیدہ محض انیس بیس سال کی تھی جب اس کا جواں سال شوہر فیکٹری کے آگ کے حادثے میں عدم سدھار گیا۔ زبیدہ کی گود میں دلاور تھا۔ والدین وفات پا چکے تھے۔ ایک بھائی تھا جس نے اپنا کنبہ چلانے کے ساتھ ساتھ جس قدر ممکن ہو سکا زبیدہ اور اس کے بچے کا بھی دھیان رکھا۔ پندرہ سولہ سال تک زبیدہ نے سلائی مشین چلا کر اپنے بیٹے کو پڑھایا لکھایا۔ دلاور اس کی جان تھا۔ وہی تو تھا جس نے اسے جینے کا مقصد دیا تھا۔ اس کی بے رنگ زندگی میں چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور امیدوں کے رنگ بھرے تھے۔ وہ اس کے لیے واہمی ہونے کی حد تک محتاط تھی۔ اس کے کالج سے گھر آنے کے وقت پر وہ دروازے پر آ کھڑی ہوتی اور جب تک وہ گھر نہ آ جاتا کڑی دھوپ میں بھی آنکھوں پر ہاتھ کا سائبان بنا کر اس کی راہ تکتی رہتی۔ ایک مرتبہ بچپن میں وہ اچھرہ بازار میں گم ہو گیا تھا۔ اس واقعے کا خوف زبیدہ کے دل میں ایسا بیٹھا تھا کہ وہ ہر وقت اس کے حوالے سے وہم میں مبتلا رہتی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد دلاور کو بہت اچھی یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ ماں بیٹے کے دن رات کی محنت رنگ لا رہی تھی۔ دلاور اب پارٹ ٹائم جاب بھی کرتا تھا اور زبیدہ نظر کی کمزوری کی وجہ سے سلائی نہیں کر پا رہی تھی۔ یونیورسٹی کی فیس فنانشل فنڈز ملنے کے باوجود ان کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ چنانچہ زبیدہ نے دلاور سے چھپ چھپا کر اپنے علاقے کے ساتھ لگتے ایک پوش علاقے کے گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو یہی بتایا کہ ایک خاتون کا گھر میں بوتیک ہے۔ وہ خاتون اس سے کڑھائی سلائی کا کام لیتی ہے اور اچھی اجرت دیتی ہے۔ وہ بیٹے سے جھوٹ بولنے پر دل ہی دل میں ندامت محسوس کرتی تھی لیکن وہ مجبور تھی۔ صبح سویرے یونیورسٹی کے لیے جب وہ دلاور کو دروازے پر الوداع کہنے آتی تو اس کی اپنی ساری تھکن توانائی میں بدلتی محسوس ہوتی۔

وہ دلاور کا یونیورسٹی میں دوسرا سال تھا جب مشقت کے پانیوں اور امیدوں کی ہواؤں سے آگے بڑھتی ان ماں بیٹے کی زندگی کی کشتی اچانک ہی طوفانوں کی زد میں آ گئی۔ کچھ عرصے سے زبیدہ کو بیٹے کی زندگی میں تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات، موبائل فون کا زیادہ استعمال پھر سونے اٹھنے کی روٹین..... کچھ تھا جو تیزی سے بدل رہا تھا۔

ایک دن دلاور نے ماں کو رات کے کھانے پر بتایا کہ اسے یونیورسٹی میں ایک لڑکی پسند آ گئی ہے۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ماں کو لڑکی کی تصویر بھی دکھائی۔ وہ چست شرٹ پہنے ایک ماڈرن لڑکی دکھائی دیتی تھی لیکن اچھی شکل و صورت کی تھی۔ زبیدہ نے اس معاملے کو ٹھنڈی اور روشن خیالی سے سنبھالنے کی کوشش کی۔

"کیوں نہیں بیٹے! یہ تو تمہاری زندگی کا فیصلہ ہے۔ جب پڑھائی مکمل کر کے کمانے لگو گے تو ہم دونوں مل کر اس کا ہاتھ مانگنے اس کے گھر جائیں گے لیکن فی الحال اس حوالے سے پیش قدمی کرنا مناسب نہیں ہوگا۔"

دلاور کو بات سمجھ آ گئی۔ وہ خاموش ہو گیا پھر چند دن بعد زبیدہ نے محسوس کیا کہ جب صبح وہ اس کا کمرا ترتیب دینے جاتی ہے تو ایک عجیب سی بو محسوس ہوتی ہے۔ اس کے دھونے والے کپڑوں سے بھی کسی ہی بدبو اٹھتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی قمیص جب وہ سونگھتی تو بے چین ہو جاتی۔

"یہ میرے بیٹے کی خوشبو نہیں ہے۔"

دلاور اب اکثر لیٹ آتا تھا اور کبھی کبھی کام کی زیادتی کا بہانہ کر کے گھر سے باہر ہی رات گزارتا تھا۔ ایک دوپہر وہ دلاور کی پسند کا کھانا بنا کر فارغ ہوئی تو گھر کی بیل بجی۔ ڈاڑھی، ٹوپی اور شلوار قمیص میں ایک خوبرو نوجوان اس کے دروازے پر کھڑا تھا۔

"ماں جی! میں یونیورسٹی میں دلاور کا بیچ فیلو ہوں یعنی..... اس کی کلاس میں پڑھتا ہوں۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے لیکن حالات سے واقف ہونا آپ کا حق ہے۔"

اس نے زبیدہ کو جو کچھ بتایا، وہ اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچنے کے لیے کافی تھا۔ دلاور یونیورسٹی کے کچھ فلاں قسم کے طلبا کے ساتھ مل کر آئس کا نشہ کرنے لگا تھا۔ اس رات اس نے پہلی بار بیٹے پر ہاتھ اٹھایا۔ اس کی چوڑی چھاتی پر بے دریغ مکے برسائے اور پھر اسی کے ساتھ لگ کر روتی رہی۔

"مجھے میرے سر کی قسم! میری عزت کا واسطہ ہے کہ آج کے بعد اس لعنت کے قریب بھی نہیں جائے گا۔" ماں

digest.library.com

Scanned with CamScanner

نے اپنی چادر بیٹے کے قدموں میں رکھ دی اور ہاتھ جوڑ لیے۔ چٹان جیسی ماں کو روتا دیکھ کر دلاور تڑپ اٹھا اور ماں سے وعدہ کیا کہ آج کے بعد وہ اس مکروہ چیز کو کبھی ہاتھ نہیں لگائے گا اور ان لوگوں میں کبھی نہیں بیٹھے گا جنہوں نے اسے اس کی لت لگائی..... پھر کچھ عرصے کے لیے سب کچھ ٹھیک لگنے لگا۔ بس یہ چند دن کی خاموشی تھی۔ ایسی خاموشی جو طوفان کے آنے سے پہلے ہوتی ہے۔ ایک دن دلاور گھر آیا تو وہ بری طرح نشے میں ڈول رہا تھا۔ زبیدہ بہ مشکل اسے کمرے تک پکڑ کر لائی اور اس پر چیخنی چلائی۔

"یہ سب آپ کا قصور ہے اماں! آپ نے کہا تھا کہ اسٹف نہ لو اور اس نے مجھے چھوڑ دیا۔" وہ بچے کی طرح بلکنے لگا۔

"کس نے چھوڑ دیا؟" زبیدہ رونے کے دوران تقریباً چیختے ہوئے بولی۔

"عالیہ نے چھوڑ دیا ہے مجھے۔ وہ کہتی ہے کہ اگر میری پسند کی تفریح میں تم میرا ساتھ نہیں دے سکتے تو زندگی میں کیا دو گے۔ اس نے چھوڑ دیا ہے مجھے۔" وہ ہیجانی انداز میں بولے چلے جا رہا تھا۔

زبیدہ کی چھوٹی سی پرسکون دنیا تہ و بالا ہو گئی تھی۔ وہ دکھ اور درد سے نڈھال تھی۔ لڑکیوں نے جن کے ساتھ زندگی گزارنا ہوتی ہے، انہیں نشے جیسی لعنت سے دور رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ کیسی لڑکی تھی جو نشے بازی میں دلاور سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔

زبیدہ غم سے چور تھی۔ کوئی ساتھ دینے والا نہیں تھا۔ جو قریبی رشتے دار تھے، وہ اپنی اپنی زندگی کی چکی میں پس رہے تھے۔ اس لاچار ماں نے بیٹے کی یونیورسٹی جا کر بھی دہائی دی لیکن وہاں بھی اس کی فریاد سننے والا کون تھا۔ حکام بالا خود کو ایسے معاملات سے بالکل بری الذمہ سمجھتے تھے۔ وہ بچہ جسے اس نے اپنے لہو سے سینچا تھا، جس کے بغیر اس کی صبح ہوتی تھی نہ شام اور وہ بچہ جس کے لیے اس کی ماں ہی ساری دنیا تھی، اب کئی کئی دن گھر نہیں آتا تھا۔ اسی دوران زبیدہ کا اکلوتا بھائی بھی دنیا سے چلا گیا۔ وہ بے جان جسم کی طرح گھر میں پڑی رہتی۔

دس پندرہ دن بعد دلاور گھر کا چکر لگاتا اور کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر لے جاتا اور ماں کی لاکھ منت سماجت کرنے پر رکتا نہیں تھا۔ یہ بھی سننے میں آ رہا تھا کہ دلاور نے اس نشے باز، آوارہ لڑکی کے ساتھ تعلق بھی بنا رکھا ہے۔

زبیدہ ذہنی طور پر بیمار پڑ گئی تھی۔ کبھی محلے کے کسی گھر جا کر بیٹے کا پوچھنے لگتی، کبھی گلی کے نکڑ پر بنی پرچون کی دکان کی سیڑھیوں پر آ کر پہروں بیٹھی رہتی۔ کوئی پوچھتا تو کہتی کہ دلاور یونیورسٹی سے آنے والا ہے۔ اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ ایک دن دلاور گھر آیا۔ پراگندہ بال، بڑھی ہوئی شیو اور بوسیدہ کپڑوں میں۔ اب وہ اسے بالکل اجنبی لگتا تھا۔ آج عرصے بعد اس کے چہرے پر اپنائیت سی تھی۔ اس نے ماں سے چند کاغذات پر دستخط بھی کروائے۔ اس نے بتایا کہ وہ گھر کا اوپر والا حصہ کرائے پر دینا چاہ رہا ہے۔ اس طرح ان کو کچھ آمدن ہو جایا کرے گی۔ اس واقعے کے دو روز بعد وہ گھر میں خوش خوش داخل ہوا اور بولا۔

"آجا اماں! تمہیں نیا سوٹ دلا دوں اور ضرورت کی چند چیزیں خرید لو۔"

وہ اپنی ماں کو ایک کھٹارا سی بائیک پر بٹھا کر لے گیا۔ کچھ ضرورت کی چیزیں خرید کر دیں اور دارالامان کے دروازے پر چھوڑ آیا۔ آفس کے نشے کی لت میں وہ اپنے باپ دادا کی واحد وراثت، اس دنیا میں اپنے اور اپنی ماں کے سر کی واحد چھت، اس تین مرلہ مکان کو بیچ آیا تھا۔

دارالامان کے مچھروں بھرے اور تعفن زدہ ماحول میں غیر آرام دہ بستر پر لیٹی وہ اکثر بے خودی کے عالم میں بڑبڑاتی۔ "میرا بچہ کھو گیا..... میرا معصوم دلاور کھو گیا..... بس ذرا سا میرا دھیان ہٹا تھا..... کوئی اسے لے گیا۔"

دارالامان کے ساتھ ہی چند فرلانگ کے فاصلے پر اچھرہ بازار تھا۔ ایک دفعہ اس کا بیٹا، اس کا دلاور چند لمحوں کے لیے کھو گیا تھا وہاں..... پھر ایسا ہونے لگا کہ اس کی بپھری ہوئی سوچیں، زخمی جگر کی ٹیسیں اسے اکثر کھینچ کر اس بازار کی گلیوں میں لے جاتیں اور وہ دیوانوں کی طرح اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کو ڈھونڈنے لگتی۔

اس بیچاری عورت کی کہانی نے میرے ذہن کو جیسے سن کر دیا تھا اور میرا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ مجھے آفس سے دیر ہو رہی تھی۔ میں ڈیشان کی دکان سے نکل کر بائیک اسٹینڈ کی طرف بڑھا تو مجھے وہی ادھیڑ عمر خاتون عجلت میں ایک دکان کی طرف بڑھتی دکھائی دی۔ وہی محتسہ خالی، وہی مخصوص حلیہ، وہی حواس باختگی۔

"آپ نے میرے بچے کو دیکھا ہے..... چار سال کا ہے میرا بیٹا..... میری انگلی پکڑ کر چل رہا تھا میرے ساتھ..... اچانک کھو گیا ہے....." اس کی بے چین آواز اڑتی ہوئی میرے کانوں تک پہنچی۔ میں عجب یاس کے عالم میں دیکھتا چلا گیا.....

***

Scanned with CamScanner

بے زبان

صائمہ دانش

محبت ایسی طاقت رکھتی ہے جو انسان تو انسان... جانوروں کو بھی اپنی جانب متوجہ کرلیتی ہے... مانا وہ بے زبان ہوتے ہیں مگر وہ بھی بولتے ہیں... اپنی حرکات و سکنات سے پیار کا اظہار ہی ان کی زبان ہوتی ہے... وہ بھی اپنے مالک کا وفادار تھا... اس کے جانے کے بعد بھی وہ اسی کا بن کے رہا... اور حقِ محبت ادا کر دیا۔

ایک بے زبان جانور کی اپنے مالک سے وفاداری کا قصہ

بسٹر کو کھڑکی تک پہنچنے سے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ شمس آ چکا ہے۔

وہ شمس کے تمباکو کی خوشبو سونگھ سکتا تھا، اس کے بالوں میں لگی مشک بھری صابن کی خوشبو بھی لیکن ان سب پر دہشت، سڑے ہوئے انڈوں اور دھابت کی بو حاوی تھی اور اس کا مطلب ہوتا ہے موت۔

بسٹر کھڑکی سے آفس کے فرش پر کودا۔ اسے چھلانگ مارنا بالکل بھی پسند نہیں تھا، چاہے وہ یہ چھلانگ ہزار بار لگا

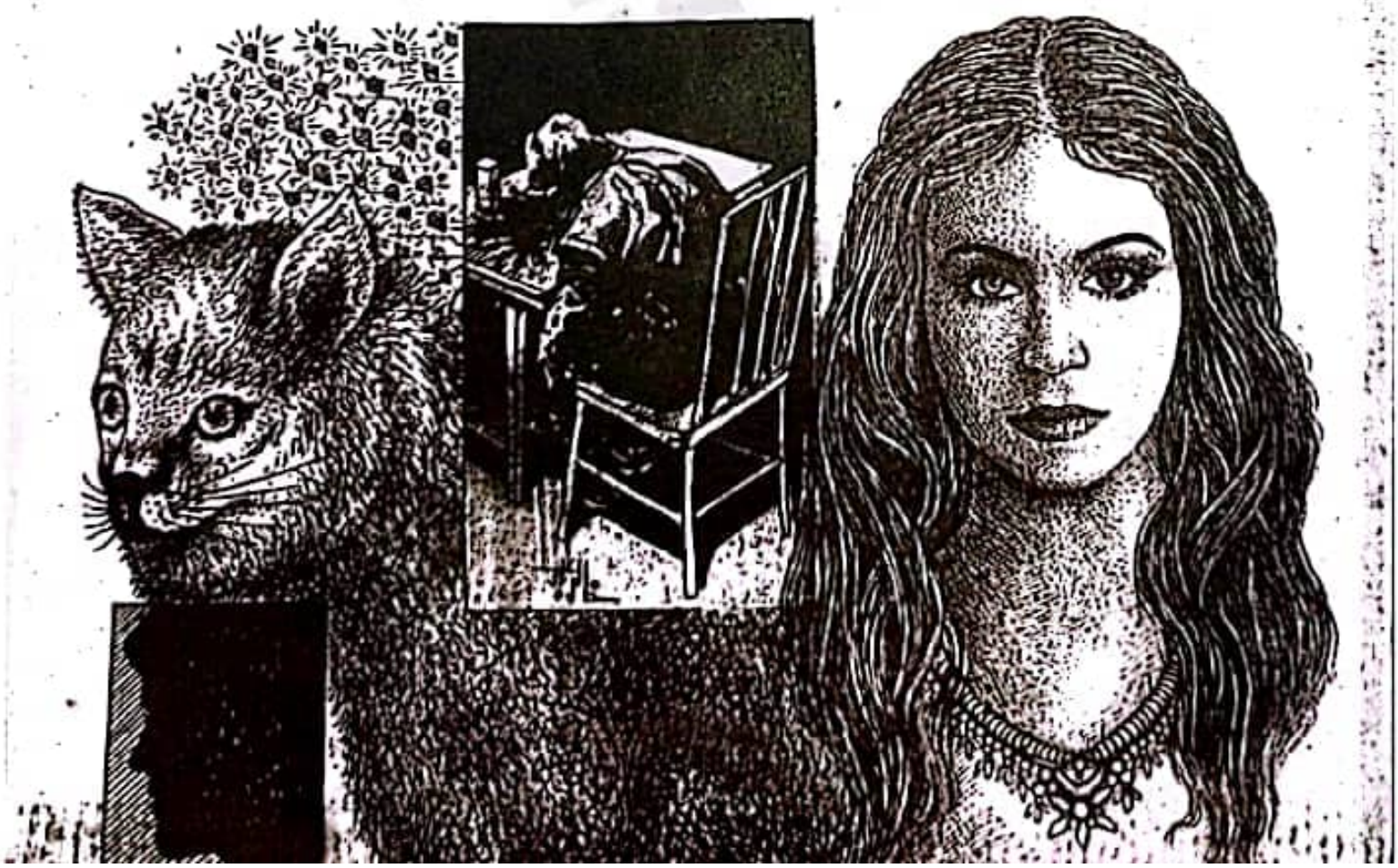

digest library.com

Scanned with CamScanner

digest library.com

چکا ہو۔ اس کی نظری پھرتی جوانی کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی تھی اور اپنی ایک آنکھ کھو دینے کے بعد وہ کبھی مکمل طور پر سنبھل نہ سکا۔

بسٹر نے خود کو سنبھالا، اپنی درد کرتی کمر کو کوسا اور آہستہ سے سیدھا ہوا۔ جب وہ میز پر اترا تو اس کی پچھلی ٹانگیں فضا میں جھول گئیں اور اس نے توازن قائم رکھنے کے لیے جدوجہد کی۔ وہ سنبھل گیا مگر شرمندگی کی تپش اسے جلا گئی۔ خوش قسمتی سے کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔

شمس اب کبھی کچھ نہیں دیکھ سکے گا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا تھا، سر میز پر جھکا ہوا۔ چراغ کی روشنی اس کی کنپٹی میں بنے سوراخ پر مرکوز تھی۔ میز پر خون جما ہوا تھا جس میں دھات کی تیز، مانوس مہک تھی۔ بسٹر یہ خوشبو پرندوں اور چوہوں میں محسوس کر چکا تھا..... ہاں وہی، مگر ذرا مختلف۔

شمس کے ہاتھ میں گن تھی جو سڑے انڈوں کی طرح بدبودار تھی۔

بسٹر، شمس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ آنکھ آدھی کھلی، پوری طرح چوکس۔ میز پر ایک کاغذی کلپ پڑا تھا جسے نیچے گرانے کی خواہش اس نے بہ مشکل روکی۔

انسان کی موجودگی کا کوئی اور نشان باقی نہ تھا، سوائے اس کی مدھم ہوتی خوشبو کے۔

اب کوئی خواب باقی نہیں رہا تھا جس کی وہ حفاظت کرتا۔ جس وقت شمس کو اس کی ضرورت تھی، وہ کسی جوان خوبصورت بلی کے پیچھے تھا جو اس پر دھیان بھی نہیں دیتی تھی۔ وہ ایک احمق، نکما، بوڑھا، بیوقوف بلا ہے۔ اس نے ایک بار پھر خود کو کوسا۔ شمس کے ساتھ گزارے خوشی کے سارے لمحے راکھ ہو گئے تھے۔ بسٹر نے چاندنی میں ڈوبے اس چھوٹے سے دفتر کا جائزہ لیا۔ کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

بسٹر کی نظر فرش پر ٹھہر گئی جہاں شمس کا خفیہ دراز تھوڑا سا، شاید ایک انچ کھلا ہوا تھا۔

تجسس!

بسٹر جان بوجھ کر شمس کے خون پر سے چلتا ہوا فرش پر کودا اور سرخ پنجوں کے نشان پیچھے چھوڑتے ہوئے دراز کی طرف بڑھا۔ اسے ایک اندیشہ تھا کہ یہ بات اہم ہے اور ہر کسی کو پتا چلنا چاہیے۔ یہاں تک کہ ہیٹر کو بھی۔ اس نے دروازہ مکمل کھولنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ شمس جا چکا تھا اور بسٹر کو بھوک لگ رہی تھی۔ یہاں اس کے لیے کچھ نہیں تھا مگر وہ اپنے مالک کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

وہ جھجکتے ہوئے شمس کی گود میں آ کر بیٹھ گیا۔ بسٹر اس کے ساتھ لپٹ گیا جیسے وہ اپنی بو کی کوشش کر رہا تھا، شمس کی نرم آواز اور اس کے کھردرے ہاتھ کو تصور میں لانے کی جو اکثر اس کے کانوں کو نرمی سے سہلاتا تھا۔ بسٹر کی خیند بے سکونی سے بھری ہوئی تھی جو اس کے غم کو کم کرنے میں ناکام رہی۔

☆☆☆

ڈوٹی بڑی مشکل سے چیخ کو روکے ہوئے دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

گیرتھ اپنی میز پر مردہ پڑا تھا، اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے لاش کی طرف بڑھی۔

گیرتھ کی گود سے بلا اچھل کر نکلا تو اس بار وہ بے ساختہ ہی چیخ پڑی۔ وہ اپنا بیگ گھماتے ہوئے بلے کے پیچھے دوڑی، اسے کھڑکی سے باہر کنارے کی طرف ہنکانے لگی۔ اسے امید تھی کہ وہ خستہ حال جانور گلی میں گر جائے گا۔ ڈوٹی نے گیرتھ کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

بیچارہ!

فرش میں بنا خفیہ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے کبھی بھی یہ دروازہ کھلا نہیں دیکھا تھا۔

ڈوٹی نے گھٹنے ٹیک کر اسے مکمل طور پر کھولا۔ اس کی انگلی کسی چپچپے مادے سے ٹکرا گئی۔ خفیہ دروازے کے نیچے گیرتھ کا فرش میں لگا سیف کھلا ہوا تھا۔ اندر کاغذات اور نقدی کی ایک پتلی سی گڈی تھی لیکن کوئی زیورات نہیں تھے۔

ڈوٹی نے سیف کو بند کیا اور خفیہ دروازے کو واپس اپنی جگہ پر بند کر دیا۔

اس نے کھڑے ہو کر اپنا دامن ٹھیک کیا اور سوچوں کو ترتیب دینے لگی۔ کسی نے تو اس کی چیخ ضرور سنی ہو گی۔ وقت کم تھا۔

اس نے دفتر کا جائزہ لیا۔ ریڈیو آن تھا، آہستہ سے شور کر رہا تھا۔ میز پر دو شاٹ گلاسز رکھے تھے، قریب ہی ایک خالی بوتل اور ایک گلاس پر اس کی لپ اسٹک کا نشان۔

وہ اپنی کہانی دہرانے لگی۔ سادہ سی تھی، زیادہ ترجیح۔

"مس واکر!"

یہ پہلی منزل کا کلرک تھا۔ وہ بدصورت شخص جو ہر صبح سیڑھیاں چڑھتے وقت اس کی ٹانگوں کو گھورتا رہتا تھا۔

"کوئی چیخ سنائی دی؟" اس نے کہا۔

"پولیس کو بلاؤ۔" ڈوٹی نے کہا۔ اس کی آواز کپکپائی مگر اس سے اگلے بڑھا۔ "مسٹر اسٹون نے خود کو گولی مار لی ہے۔"

☆☆☆

دفتر میں انسان جمع ہو گئے، چمکتی روشنیوں کے ساتھ،

Scanned with CamScanner

جو بسٹر کی آنکھوں کو چبھتی تھیں۔ ہیٹر صوفے پر بیٹھی تھی، ساتھ میں ایک مرد تھا۔ وہ منہ سے دھواں چھوڑتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

"اسی حالت میں ملا۔"

"کوئی نوٹ تھا؟"

بسٹر باہر کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ شمس کی خوشبو اب ختم ہو چکی تھی کیونکہ دفتر میں اجنبی لوگ تھے اور ہیٹر کی تیز گلاب و یاسمین کی خوشبو غالب تھی۔

ایک شخص نے جو شمس کی لاش کا معائنہ کر رہا تھا، اچانک ہی اوپر دیکھا اور ساکت ہو گیا پھر اس نے براہِ راست بسٹر کی طرف دیکھا۔ جانتے ہوئے نہیں مگر اس کے انداز سے لگا جیسے وہ کچھ جانتا ہو۔

بسٹر نے اپنی ایک صحیح آنکھ میچتے ہوئے خود کو بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

وہ شخص بسٹر کی طرف بڑھا۔ وہ مضبوط تھا اور پیاز کی طرح مہک رہا تھا۔ بسٹر جھک کر بیٹھ گیا۔ کھڑکی سے گلی تک گہرائی بہت تھی مگر وہ کنارے سے پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ پیاز والا شخص رک گیا۔ اس نے بسٹر کو چھونے کی کوشش نہیں کی۔

پیاز کی آواز۔ "پس..... پس۔" بسٹر نے سنا مگر وہ بھاگنے کے لیے تیار تھا۔

پیاز والا شخص جھک کر بیٹھا، اپنے ہاتھوں سے منت بھرے اشارے کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

پھر بولا۔ "پس..... پس۔"

اگر کمرا انسانوں سے بھرا نہ ہوتا خاص طور پر ہیٹر سے، تو شاید بسٹر تھوڑا پھیل جاتا یا اپنے پنجے چاٹنے لگتا لیکن بسٹر کسی انسان سے مانوس نہیں ہونا چاہتا تھا..... کبھی نہیں..... لیکن اصول تو اصول ہوتے ہیں۔

دھوئیں بنانے والے انسان، آ، آ، آ، "لفٹ..... بسٹر!"

"جی، کیپٹن؟!" اسپجز نے جواب دیا۔

"مس واکر بیان دینے کے لیے تیار ہیں۔" کیپٹن اسپوکن نے کہا۔

اسپجز اس جگہ سے اٹھا جہاں وہ بلے کو بلا رہا تھا۔ وہ ڈولی کے پاس آیا اور اپنی نوٹ بک نکالی۔ وہ ایک چوکور بدن کا اور ٹھگنے قد کا آدمی تھا لیکن اس کے کندھے چوڑے تھے۔ اس کی نوٹ بک اس کے بڑے ہاتھوں میں غائب ہو گئی۔

اسپجز نے وہی سوالات کیے جو ڈولی پہلے ہی بتا چکی تھی۔ اس کا نام، اس کا پتا، وہ گیرتھ اسٹون کے لیے کتنے عرصے سے کام کر رہی تھی۔

"مس واکر! کیا آپ کے پاس دفتر کی چابی ہے؟" اسپجز نے پوچھا۔

"جی ہاں، آج صبح میں اسی سے اندر آئی تھی۔" اس نے کہا۔

"آپ نے مقتول کو آخری بار کب دیکھا تھا؟"

یہ بھی ایک ایسا سوال تھا جو وہ پہلے ہی اپنے بیان میں بتا چکی تھی۔

"گزشتہ رات، تقریباً آٹھ بجے۔" اس نے کہا۔

"کیا آپ عام طور پر اتنی دیر تک کام کرتی ہیں؟"

"میں کچھ کاغذات مکمل کر رہی تھی۔" ڈولی نے کہا۔

"پھر گیرتھ، مسٹر اسٹون تقریباً سات بجے آئے۔"

"وہ کیسا برتاؤ کر رہا تھا؟" اسپجز نے پوچھا۔

ڈولی کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیسے جواب دے۔

اسپجز نے اپنے سوال کو آسان کرتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ خوش تھا..... یا الجھا ہوا؟"

"وہ تو بہت خوش تھا۔" ڈولی نے کہا۔ "اس نے ایک پرانا انشورنس کیس حل کر لیا تھا۔ وہ قیمتی زیورات برآمد کر چکا تھا جو جنگ کے فوراً بعد تقریباً دس سال پہلے چوری ہو گئے تھے۔"

"مس واکر! کیا اس نے آپ کو وہ زیورات دکھائے؟" کیپٹن اسپوکن نے پوچھا۔

اسپوکن درمیانے قد کا، دبلا پتلا اور غیر معمولی طور پر خوش لباس شخص تھا۔ اس نے اپنی ٹوپی سر کے پیچھے کی جانب رکھی تھی، بالکل ویسے جیسے ایلن لیڈ اپنی گینگسٹر فلموں میں کیا کرتا تھا۔ لیڈ اب بھی متاثر کن تھا اور یہ پولیس کیپٹن بھی۔

"آپ مجھے ڈولی کہہ سکتے ہیں۔" اس نے اسپوکن کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے پاس زیورات ایک بڑے فولڈ بٹوے میں تھے۔"

"ڈولی! اب زیورات کہاں ہیں؟" اسپوکن نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" ڈولی نے جھوٹ بولا۔

اسپجز نے کچھ عام نوعیت کے سوالات کیے جبکہ اسپوکن ان لیب اہلکاروں سے بات کر رہا تھا جو میز پر فنگر پرنٹس تلاش کر رہے تھے۔

"یہاں خون کے نشانات ہیں۔" اسپوکن نے کہا۔

"غیر اخیال ہے، بلّا یہ خون اندر لے آیا۔" اسپجز نے کھڑکی میں بیٹھی بلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے پنجوں کے نشانات ہر طرف دیکھے ہیں۔"

اسپجز اپنی نوٹ بک کو اٹھا کر لوٹا۔ "اب، مس واکر!" اس نے کہا۔ "کیا مسٹر اسٹون کے پاس زیورات

digest library.com

رکھنے کے لیے کوئی محفوظ جگہ تھی..... کوئی سیف؟"

ڈولی نے جواب نہیں دیا۔ وہ اسپوکن کو خون کے نشانوں کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ جھکا۔

"یہاں کوئی سیف نہیں ہے۔" ڈولی نے جلدی سے کہا۔

اسپوکن نے فرش پر دباؤ دیا تو ایک چھپی ہوئی دراز کھل گئی۔ اس نے ڈولی کو تیز نظروں سے گھورا۔

"یہ جھوٹ بولنے کی بچکانہ کوشش تھی۔" اس نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے۔ یہ گیرتھ کا راز تھا۔" ڈولی نے قدرے شرمندگی سے کہا۔

"آپ کو اب اس کے راز رکھنے کی ضرورت نہیں۔" اسٹیو نے کہا۔

"یہاں خون میں ایک فنگر پرنٹ ہے۔" اسپوکن نے کہا۔

"میرا خیال ہے، میرے فنگر پرنٹس تو پورے دفتر میں ہوں گے۔" ڈولی نے خود سے کہا۔ اسے یاد آیا کہ دراز بند کرتے وقت کچھ چبھا سا لگا تھا۔

"یقیناً ہوں گے۔" اسٹیو نے کہا اور اپنے افسر کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"کیا آپ کے پاس سیف کا کوڈ ہے؟" اسپوکن نے پوچھا۔

"نہیں۔" ڈولی نے کہا اور وہ سچ بول رہی تھی۔

اسپوکن نے کہا کہ وہ کسی کو بلائیں گے جو سیف کھول سکے پھر وہ واپس ڈولی کے قریب آیا اور مسکرا کر پوچھا۔ "جب مسٹر اسٹون نے زیورات دکھائے تو اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس نے ایک نئی بوتل نکالی اور مجھے ایک ڈرنک کی پیشکش کی۔" ڈولی نے کہا۔

"کیا یہ معمول کی بات تھی..... مسٹر اسٹون کے ساتھ شراب پینا؟" اسپوکن نے پوچھا۔

ڈولی کو اس بات پر غصہ آیا کہ [illegible] مسکراہٹ [illegible] خوش، وکٹس اور نوجوان لڑکوں جیسی تھی۔ جب وہ اس پر مرکوز ہوئی تو ڈولی کو لگا کہ وہ وہی کرے جو وہ چاہتا ہے۔

"نہیں، عام بات نہیں تھی۔" اس نے کہا۔ "میں نے اسے کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔"

"کیا اس نے تمہیں اس نظر سے دیکھا؟" اسٹیو نے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔" ڈولی نے سرد لہجے میں کہا۔

"امید ہے آپ برا نہیں منائیں گی، ڈولی!" اسپوکن نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں پوچھنا پڑتا ہے۔"

اس کی آواز سے گویا سورج واپس نکل آیا۔

"تم نے مسٹر اسٹون کے ساتھ کتنے جام پیے؟"

اسپوکن نے پوچھا۔

"صرف ایک۔ مجھے نکلنے میں دیر ہو رہی تھی۔"

"کسی ملاقات کے لیے؟" اسٹیو نے پوچھا۔

"بس، کچھ دوستوں کے ساتھ، ہوکا ہوٹس۔" ڈولی نے کہا۔ اسے لگا کہ وہ انہیں قائل نہیں کر پا رہی۔

"لگتا ہے تمہارے بعد اس نے خوب پی لی۔" اسٹیو نے کہا۔ بوتل پوری خالی تھی۔

"ٹاکسیکولوجی اس کی تصدیق کرے گی۔" اسپوکن نے کہا تو ڈولی کو اچھا لگا کہ اسپوکن پراعتماد اور بااختیار ہے۔

تحقیقات مکمل ہوئیں تو اسپوکن نے ڈولی کو اپنا کارڈ دیا۔

"اگر تمہیں کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، میرا نمبر یہاں ہے۔" اسپوکن نے کہا اور کارڈ دیتے ہوئے اس کی انگلیوں کو چھوا۔

ڈولی جانتی تھی، وہ فون کرے گی۔

☆☆☆

شمس جا چکا تھا اور بسٹر اب شکار کے قابل نہیں رہا تھا۔ شمس کی دی گئی خوراک سے موٹا ہونے والا بسٹر اب مختصر ہی گشت کیا کرتا تھا۔ باغیچوں کے چھڑکاؤ سے پانی پیتا اور دھوپ میں عمارت کی چھت پر اس پنجرے کے نزدیک بیٹھتا جہاں بیوقوف پھڑپھڑاتے پرندے قید تھے۔ پہلے وہ انہیں تفریح کے لیے بھی مارنے کی خواہش نہیں رکھتا تھا مگر اب اس کا پیٹ کچھ اور کہتا تھا لیکن جیسے ہی وہ پنجہ پنجرے کی سلاخوں میں ڈالتا، پرندے شور مچاتے اور ہٹ جاتے۔

بھوک سے بدتر تھی اس کی گہری ہوتی تنہائی۔ جب تم کسی انسان سے مانوس ہو جاتے ہو تو آخر تک ساتھ رہتے ہو۔ یہی بلیوں کے اصول ہیں۔ وہ شمس سے مانوس ہونے کا مجاز ہی نہ تھا۔ اس نے پہلے ہی قسم کھائی تھی کہ اب کسی کے قریب نہیں جائے گا مگر وہ شمس کو چاہنے لگا۔ اب بس..... [illegible] وہ دوبارہ اپنے دل کا دروازہ کسی کے لیے نہیں کھولے گا۔

مگر شمس کے ساتھ زندگی کا ایک مقصد تھا۔ محض سونا، کھانا اور گھومنا نہیں تھا بلکہ جاننا تھا۔ بسٹر کو شمس کی باتیں یاد آتی تھیں۔ باتیں..... جن کا مفہوم کچھ نہیں تھا مگر بسٹر محسوس کرتا کہ وہ اہم ہیں۔ شمس بولتا جاتا پھر اچانک رکتا، انگلیاں چٹخاتا اور خوشی سے مسکراتا۔ وہ بسٹر کی ٹھوڑی کے نیچے ہلکا سا کھجاتا اور پھر ٹوپی لیتا اور دفتر سے روانہ ہو جاتا۔

بسٹر کی اصل ذمے داری تب شروع ہوتی جب شمس سوتا۔ وہ اس کے پہلو میں لیٹ کر اس کے خوابوں میں داخل ہو جاتا، ان خوفناک طوفانوں میں جو ناقابلِ بیان تھے۔

Scanned with CamScanner

بسٹر حفاظت کرتا تاکہ شمس کی روح آزاد ہو کر اڑ سکے، رازوں کو کھول سکے۔ شمس کے جاگنے پر ہی بسٹر کو نیند نصیب ہوتی۔

بسٹر نے آہستہ سے اپنے جسم کو نیچے گرایا، آنکھ بند کی اور سورج کی گرمی کو اپنی ہڈیوں میں اترنے دیا۔ اس نے اپنے پنجے اندر سمیٹ لیے اور پیٹ کو گرم ٹائلوں پر پھیلا دیا جو اتنے گرم تھے کہ جلانے لگے۔ وہ کبھی بھی اتنا گرم نہیں ہو پاتا تھا، اب نہیں۔ وہ شمس کی خوشبو یاد کرنے کی کوشش میں ایک دنیا سے دوسری دنیا میں ڈولتا رہتا۔

مگر خوشبو کسی اور کی تھی..... ہیٹر کی، جو اسے اپنے پرس سے بھگاتی تھی اور گلاب وچنبیلی کی شدید خوشبو سے بھری رہتی تھی۔

بسٹر ہڑبڑا کر جاگا۔ اس کی ناک پھڑ پھڑائی، اسے اب بھی گلاب وچنبیلی کی خوشبو آرہی تھی، کئی بلاک دور سے۔ ایک ایسی جگہ سے جہاں یہ پہلے کبھی نہ تھی۔

تجسس!

بسٹر نے اپنی ناک کی راہ پر چلنا شروع کیا، آہستہ دوڑتے ہوئے، اپنے پیٹ اور دل کی خالی جگہ کو نظر انداز کرتے ہوئے۔

☆☆☆

اسٹیو نے اپنی کتاب زور سے بند کی اور موکامبو کلب کے تڈھم خدوخال پر نظر دوڑائی۔ جنوبی امریکی رنگوں کی بھرمار، باربرشاپ کی طرز کے ستون اور سنہری گملوں میں رکھے ہوئے پودے۔

ہفتے کا دن اور دوپہر کا ٹائم تھا۔ کلب ایک چوتھائی سے بھی کم بھرا ہوا تھا۔ موکامبو کی چمک جنگ کے بعد ماند پڑ گئی تھی۔ اب سمجھدار لوگ سیروز جایا کرتے تھے۔

کمرے کے اس پار اسے حرکت محسوس ہوئی۔ شیشے کے پیچھے قید بے چین، عجیب وغریب پرندے جو کلب کی پہچان تھے۔ شاید یہ بولنے والے پرندے ہوں، شاید اسے ان کا انٹرویو لینا چاہیے۔ ان کے پاس بھی اتنی ہی باتیں ہوں گی جتنی ان ممیوں کے پاس جن سے اسٹیو کلب میں دوچار ہوتا رہتا تھا۔

وہاں اسے یہی معلومات ملیں کہ ہاں انہوں نے مس واکر کو دیکھا تھا۔ وہ یہاں کی مستقل گاہک تھی۔ اس نے کئی مردوں کے ساتھ مشروب پیے اور کئی کے ساتھ رقص کیا۔ وہ اکیلی ہی روانہ ہوئی۔ وقت مختلف ہوتے تھے لیکن کبھی بھی آدھی رات کے بعد تک نہیں رکی۔

انقلابات زمانہ

ہالی وڈ کے قریب ایک گلی کے کونے پر دو کتوں کی ملاقات ہوئی۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں اپنی دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔" دوسرے کتے نے جواب دیا۔

"کیسی ہے وہ؟" پہلے کتے نے تجسس سے پوچھا۔

"سنہری رنگ کی ہے، ٹیریئر ہے، دو فٹ لمبی ہے، دُم چھوٹی ہے، لیڈی کہہ کر آواز دو تو متوجہ ہوتی ہے۔" دوسرے نے کہا۔

"اچھا..... اچھا۔ اس کی پیشانی پر سیاہ دھبا ہے اور ذرا لنگڑا کر چلتی ہے؟" پہلے کتے نے مزید نشانیاں بتائیں۔

"ہاں، ہاں..... وہی۔" دوسرے نے تائید کی۔

"میں تو خود اس کا انتظار کر رہا ہوں۔" پہلا کتا بولا۔

دوسرے نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ "کیا زمانہ آگیا ہے۔ ہماری مادائیں بھی ہالی وڈ کی عورتیں ہوتی جارہی ہیں۔"

(مرسلہ: شاہانہ فیض، کراچی)

سچائی

کمیونسٹ روس کے بکھرنے سے پہلے کا ذکر ہے۔ ایک اسکول میں ٹیچر نے بچے کے جذبہ حب الوطنی کا امتحان لیتے ہوئے پوچھا۔ "تمہاری ماں کون ہے؟"

"عظیم سرزمین سوویت یونین!" بچے نے جواب دیا۔

"اور تمہارا باپ کون ہے؟"

"عظیم گورباچوف!"

"بڑے ہو کر تم کیا بننا چاہتے ہو؟"

"یتیم۔" بچے نے جواب دیا۔

ضروری کام

سپر اسٹور میں ایک نوجوان سیلز مین کے طور پر ملازمت حاصل کرنے کا خواہشمند تھا۔ مالک نے اس کی صلاحیتوں کا عملی مظاہرہ دیکھنے کے لیے ایک شیلف سے ایک ڈبا اتارا اور نوجوان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔ "اسے شیلف سے اتارنے کے بعد تم کیا کرو گے؟"

نوجوان نے ڈبے کو غور سے دیکھا اور بولا۔ "میں سب سے پہلے اس پر سے گرد صاف کروں گا۔"

اُسے سیلز مین رکھ لیا گیا۔

(مرسلہ: ملک اسلم، لاہور)

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

یہ ایک مناسب عذر کے لیے کافی تھا۔ کلب آنا اسٹیز کے لیے وقت کا زیاں ثابت ہوا تھا۔ کوئی وجہ نہیں تھی کہ گیرتھ اسٹون جیسا سخت جان پرائیویٹ انویسٹی گیٹر خودکشی کرے۔ اس نے کوئی نوٹ بھی نہیں چھوڑا۔ کیا اس عورت مس واکر نے اسے بارایا اسے معلوم ہے کہ کس نے یہ قتل کیا؟ اسے ڈوئی کا پیچھا کرنا چاہیے۔ اس کی کہانی کی تصدیق نہیں ہوئی لیکن اسپوکن نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا تھا اور ظاہر ہے کہ وہ لیتا کیونکہ تاریک گلیوں میں لوگوں کا پیچھا کرنا ہی اس کی خاصیت تھی۔

"آپ ڈرنک لینا چاہیں گے، لیفٹیننٹ؟"

اسٹیز نے مڑ کر دیکھا۔ مائلز، بارٹینڈر۔

"میں ڈیوٹی پر ہوں۔"

"لیکن کیا آپ ایک ڈرنک لینا چاہیں گے؟" مائلز نے پھر پوچھا۔

اسٹیز نے سر ہلایا تو مائلز نے دو گلاس رکھ دیے۔

"میں نے آپ کو شعبۂ قتل میں شمولیت پر مبارکباد نہیں دی۔" مائلز نے گلاس میں مشروب انڈیلتے ہوئے کہا۔

"ہاں، میں نے وہ پکڑ دھکڑ کا کام چھوڑ دیا۔" اسٹیز بولا۔ "اب وہ کام کوئی اور کرتا ہے۔"

"ہمیشہ کوئی جگہ خالی نہیں رہتی، کوئی نہ کوئی آ ہی جاتا ہے۔"

اسٹیز خوش تھا کہ وہ بدعنوانی، لڑکیوں اور نشہ آوروں کی دنیا سے نکل چکا تھا، سب کچھ چھوڑ چکا تھا۔

اس نے دوسرا گلاس بھی آہستہ سے پی لیا۔

"آپ ڈوئی واکر کے بارے میں پوچھ رہے تھے؟" مائلز نے کہا۔

"تم کچھ جانتے ہو؟"

"شاید۔"

اسٹیز نے پانچ ڈالر کا نوٹ بار پر رکھا۔ مائلز نے اسے نہیں اٹھایا۔

"یہ مشروب کے لیے ہے۔" اسٹیز نے کہا۔

"مشروب میری طرف سے ہے۔"

"تو یہ مری سسٹرز کو دے دینا۔" اسٹیز نے نوٹ آگے کیا۔

"مجھے تمہارے پیسے نہیں چاہئیں۔" مائلز نے کہا۔ "میں تم پر ایک احسان کرنا چاہتا ہوں۔ تم احسان یاد رکھتے ہو، ہے نا؟"

اسٹیز نے کچھ نہیں کہا، بس عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔

"اسپوکن بے شک بھاڑ میں جائے لیکن تم اچھے ہو۔" مائلز نے کہا۔

"تو بات کرو گے یا نہیں؟"

"ضرور۔" مائلز نے مشروب کے گلاس سمیٹتے ہوئے کہا۔ "وہ کل رات یہاں تھی، کئی لوگوں سے بات کرتے ہوئے۔"

"شکر ہے کہ میں نے اس کے لیے پیسے نہیں دیے۔" اسٹیز نے کہا اور نوٹ واپس اٹھا لیا۔

"لیکن اس کے ساتھ ایک نیا آدمی تھا جس کا نام فرینکی تھا۔"

اسٹیز نے اپنی بک دیکھی۔ یہ نام نیا تھا۔

"ڈوئی پورے کمرے میں گھومی لیکن تبھی جب فرینکی جا چکا تھا۔ وہ اسی کے لیے آئی تھی۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"کیونکہ وہ دیر سے آئی تھی اور فرینکی اس پر جھنجلایا ہوا تھا۔" مائلز نے کہا۔ "پھر جب وہ پہنچی تو دونوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔"

"کس بات پر؟"

"پتا نہیں، مرد عورتیں، کوئی لیٹ ہو جائے۔ میں نے سب کچھ نہیں دیکھا۔ میری بھی نوکری ہے..... ہے نا؟ لیکن میں نے دیکھا کہ فرینکی نے اس کی کلائی مروڑی اور ڈوئی نے اسے کچھ دیا پھر وہ چلا گیا۔"

"کب؟"

"دس کے بعد لیکن ساڑھے دس سے پہلے۔"

"کیا مس واکر نے اس بارے میں کچھ کہا تھا؟"

"نہیں۔" مائلز نے کہا۔ "وہ ڈری ہوئی تھی لیکن یہاں موجود ہر شخص اسے تسلی دے رہا تھا۔"

"فرینکی نامی اس بندے کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟" اسٹیز نے پوچھا۔

مائلز نے اس کا حلیہ بیان کیا۔ "لمبا قد، گریسر (چکنے بالوں والا) جیل سے نکلا ہوا لگ رہا تھا۔ شاید اس شہر میں نیا ہو۔"

"شاید اس کے پاس کوئی پیرول آفیسر ہو۔" اسٹیز نے کہا اور اپنی نوٹ بک بند کی۔ "میں پتا کرتا ہوں۔ ان معلومات کے لیے شکریہ۔"

مائلز نے کہا۔ "اگر تم ڈوئی کو دیکھو تو اسے کہنا کہ وہ کمینہ اس کے قابل نہیں۔ اسے کہنا کہ اکیلی آئے..... ڈرنک میری طرف سے۔"

"پہلے اسے اسپوکن سے الگ کرنا ہوگا۔" اسٹیز نے کہا۔

"ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے۔" مائلز نے بے پروا انداز میں کہا۔ "اسے کہنا ضرور۔"

اسٹیز نے مائلز کو ہوائی بوسہ دیا اور چلا گیا۔

Scanned with CamScanner

☆☆☆

ہیٹر وہاں تھی، حالانکہ اسے وہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ بسٹر کا علاقہ تھا اور وہ باہر سے آئی تھی۔ تجسس کے دفتر کو اپنی خوشبو سے بھرنے کے بعد کہیں اور چلی گئی تھی۔ ہیٹر جیسے بے جوڑ چیز ہو، جیسے کسی میز پر رکھا فاؤنٹین پین جو اصل میں فرش پر ہونا چاہیے۔

بسٹر اس عمارت کو جانتا تھا۔ یہاں بہت سی بلیاں تھیں جن میں وہ ملکہ بھی شامل تھی جس نے بسٹر کو مسحور کیا تھا۔ اب وہ حرارت نہیں تھی مگر بسٹر کو اس کی خوشبو یاد آتے ہی جھرجھری آ گئی۔ یہاں ایک نر بلا بھی تھا جو سب کھانا ہڑپ کر جاتا تھا، بسٹر سے زیادہ سخت جان اور تیز۔ اب زیادہ تر بلیاں ایسی ہی تھیں۔

بسٹر منہ کھولے عمارت کی منڈیر پر چکر لگا رہا تھا۔ اس ملکہ کی مدھم پڑ چکی خوشبو کو سونگھ رہا تھا جو گلاب اور چنبیلی کی مہک میں مدغم ہو گئی تھی۔ ایک نڈی نے اس کی توجہ بھٹکائی، پھر خود کو چاٹنے کا عمل شروع ہو گیا اور اس سے اس کا عزم مکمل طور پر مٹنے لگا۔

تجسس کی خوشبو کی یاد مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ یہاں کیوں تھا؟ پھر بسٹر کو تجسس کے پرانے چمڑے کے صوفے پر موجود کمبل کی مہک یاد آ گئی اور وہ خواب جو دونوں نے ایک ساتھ دیکھے تھے۔ تجسس ایک اچھا آدمی تھا، وفادار اور مہربان۔ اس کی یاد باقی رہنی چاہیے، چاہے یہ تکلیف دہ ہی کیوں نہ ہو۔

بسٹر آگے بڑھتا گیا۔

تقریباً ایک بند کھڑکی سے اس نے ہیٹر کو دیکھا اور ایک اجنبی مرد کو۔

"اسے مارنے کی کیا ضرورت تھی؟" ہیٹر بول رہی تھی۔

"تمہیں کیا لگا، کیا ہوگا؟" مرد نے اتنا کہا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ہیٹر بستر سے اٹھ کر اس کے پیچھے گئی۔

بسٹر کھڑکی سے اندر گھس آیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ تمباکو کی مہک شدید تھی جو ہیٹر کے سگریٹ پینے کی تھی لیکن یہ بستر کی چادر اور دیواروں کے پرانے کاغذ میں بھی رچی بسی تھی۔ اسے تیل یا پیٹرول کی بو بھی محسوس ہوئی۔ ہیٹر کی گلاب اور چنبیلی کی خوشبو واضح طور پر موجود تھی، ناقابلِ فراموش۔ بسٹر کو یہ خوشبو پچھلی رات ہی محسوس کرنی چاہیے تھی مگر وہ اس ملکہ کے چکر میں پاگل ہو گیا تھا۔

پاس کے کمرے سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور ہیٹر کی چیخ جیسی آواز، جیسے دو نر بلیاں لڑائی کو تیار ہوں۔ بسٹر نے کھڑکی کی طرف دیکھا، فرش سے فاصلے کا اندازہ لگایا۔ اسے چھلانگ پر بھروسا نہ تھا، خاص کر جب کھڑکی تقریباً بند تھی۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا لیکن بھاگ نہ سکا۔ کچھ تھا جو اسے کرنا تھا۔

لیکن بسٹر کو معلوم نہیں تھا وہ کیا ہے۔

وہ بستر پر چھلانگ مار کر کودا، اندازہ غلط تھا، بھاری ہو کر گرا۔ بستر پر ہیٹر کا کوٹ پڑا تھا۔ بستر سے ایک مردی مہک اٹھ رہی تھی۔ ایک سیاہ خول جیسا بٹوا بستر پر کھلا پڑا تھا جس میں دکش، گول اور چمکدار شیشے کے ٹکڑے سجے ہوئے تھے۔

تجسس!

ان ٹکڑوں میں تجسس کی خوشبو کی ہلکی سی جھلک باقی تھی اور بسٹر اس یاد سے لوٹ کھڑا گیا۔ یہ قیمتی پتھر تجسس کے خوابوں میں مدتوں سے چمکتے آ رہے تھے، ہمیشہ اس کی پہنچ سے باہر۔

انہوں نے بسٹر کو چھونے پر مجبور کیا۔

اگلے کمرے سے مرد کی آواز زور سے آ رہی تھی اور عورت کی چیخ و پکار کو دبا رہی تھی۔ بسٹر کی پیٹھ میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ جانتا تھا کہ اسے جانا چاہیے لیکن وہ پتھر بہت خوبصورت تھے اور وہ یہاں کے نہیں تھے۔

اس نے ایک پتھر کو ہلکے سے ٹھوکر ماری جو بٹوے سے نکل کر بستر پر جا گرا۔ وہ بستر پر بھی ٹھیک نہیں لگ رہا تھا اس لیے اس نے دوبارہ ٹھوکر ماری، پھر تیسری بار اور وہ لکڑی کے فرش پر جا گرا۔ وہ ایک دلکش آواز کے ساتھ لڑھکنے لگا۔

بسٹر کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسے پورے فرش پر ادھر ادھر مارے لیکن ابھی بٹوے میں مزید پتھر موجود تھے۔

اس نے انہیں زیادہ زور سے مارنا شروع کیا۔ انہیں بستر پر بکھیر دیا، ایک ایک کر کے اور بڑھتی ہوئی مہارت کے ساتھ، اس نے انہیں نیچے گرا دیا۔ جب آخری پتھر زمین پر گرا تو بسٹر اس کے پیچھے کود پڑا جیسے کسی شکار میں پوری طرح محو ہو۔

اس نے ایک پتھر کو میز کے نیچے مارا اور اس کے پیچھے دوڑا مگر وہ قالین میں الجھ گیا اور میز سے ٹکرا کر ایک طرف گر پڑا۔ وہ پتھر گم ہو گیا اور اس کی عزتِ نفس بھی، لیکن بسٹر نے فوراً دوسرا پتھر دیکھ لیا جو ننگے فرش پر چاندنی میں چمک رہا تھا۔ اس نے اسے بستر کے نیچے مارا پھر ایک اور.....اور ایک اور۔

اب بسٹر ایک بچے کی طرح کھیل رہا تھا، ایسے جیسے وہ کبھی

digest library.com

Scanned with CamScanner

کسی کے سامنے ظاہر نہ کرتا، حتیٰ کہ شمس کے سامنے بھی نہیں۔

ایک پتھر باقی رہ گیا تھا۔ بسٹر نے چھلانگ لگائی، زور سے پتھر پر آ گرا اور وہ پتھر میز کے نیچے چلا گیا اور وہ خوشی سے ایک طرف لڑھک گیا۔

اس نے فوراً سیدھا ہو کر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ اپنی عزت بحال کرتے ہوئے، اس نے اپنے پنجے کو چاٹا اور اسے اپنی بیکار دائیں آنکھ پر پھیرنے لگا۔

تب ہی وہ مرد کمرے میں داخل ہوا۔

☆☆☆

اسپوکن کے ساتھ تین سال تک نائب کے طور پر کام کرنے کے بعد اسٹیو اصولوں کے معاملے میں نرم ہو گیا تھا۔ قتل کے شعبے میں شمولیت ایک نیا آغاز تھا اور وہ اصولوں پر عمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کتابی طریقہ کار یہاں کام نہیں آتے تھے۔ جن لوگوں سے بات کرنا ہوتی تھی، وہ پولیس سے بات نہیں کرتے تھے۔ خاص طور پر اس علاقے میں۔ فرینکی کے بارے میں پوچھنے پر دروازے اس کے منہ پر بند کر دیے گئے۔ حتیٰ کہ جہاں وہ کسی دروازے میں اپنا پاؤں ڈالنے میں کامیاب ہو بھی گیا تو اسے اس آدمی کے پیچھے اس کے خستہ حال کمرے میں دوڑنا پڑا اور کھڑکی سے نکلنے سے پہلے اسے کمر پر سے پکڑنا پڑا۔

جو بھی گناہ وہ غریب انسان کر چکا تھا، وہ اتنا برا ضرور تھا کہ وہ دو منزلہ کھڑکی سے چھلانگ لگانے کو تیار تھا لیکن اسٹیو کو پروا نہیں تھی۔ اب وہ اعتراضات زیادہ نہیں سنتا تھا اور اس کے ہاتھ بھی نرم ہو چکے تھے لیکن اسے صرف ایک پرانا زخم چھیڑنا پڑا اور اسے جو چاہیے تھا، وہ مل گیا۔

جنوبی سانتافی کی پٹڑیوں کے قریب ایک عارضی ہوٹل میں فرینکی کا پتا۔

اس نے فون پر اطلاع دی تو اسپوکن نے کہا کہ وہ دو اہلکاروں کے ساتھ آ رہا ہے۔ اسٹیو انتظار کرنے لگا لیکن پھر وہ چیخ سنائی دی اور اسٹیو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گیا، پستول نکالتے ہوئے۔

ڈوٹی واکر فرش پر تھی، ایک کرسی پر جھکی ہوئی۔ چہرہ بازوؤں میں چھپا ہوا۔

اسٹیو نے اپنا پستول نیچے کیا اور اس کی طرف بڑھا۔ پیچھے سے فرینکی نے اس پر حملہ کر دیا۔

ایک بار پھر اصول نظر انداز کیے گئے۔ یہ اس کی بے وقوفی تھی کہ اس نے پہلے فرینکی کو نہیں دیکھا۔

فرینکی نے اسٹیو کا ریوالور اس کے ہاتھ سے جھٹک دیا اور اس کی چوڑی چھاتی کے گرد بازو ڈال کر اسے زمین پر دے مارا۔

فرینکی کا چکنا سر اسٹیو کی ٹھوڑی سے ٹکرایا۔

فرینکی واٹسن جیل میں فٹ ہو گیا تھا۔ پیرول آفیسر کے مطابق اس نے دو سال کا ٹنی جیل میں گزارے تھے اور لگتا تھا کہ وہاں اس نے صرف وزن ہی اٹھایا تھا۔

فرینکی نے اسٹیو کو کرسی پر پچھاڑا۔ دونوں ڈوٹی کے ساتھ الجھ گئے۔

"گن لے لو، ڈاٹ!" فرینکی چلایا۔ "گن لے لو!"

اسٹیو اپنی پیٹھ کے بل تھا اور فرینکی اس کے سر اور گردن پر اندھا دھند گھونسے برسا رہا تھا۔ اس نے اس کی ناک توڑنے کی کوشش کی۔ اسٹیو کی ناک کبھی نہیں ٹوٹی تھی اور جوتوں کے علاوہ وہی اس کا فخر تھی۔ وہ کسی گریبر کو اسے توڑنے نہیں دے گا۔

اسٹیو نے فرینکی کو ایک جھٹکے سے دور پھینکا اور خود اٹھ کھڑا ہوا۔ فرینکی سنبھل کر پھر جھپٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔

"رک جاؤ۔" ڈوٹی چیخی۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑی تھی۔ اسٹیو کے ریوالور کو کبھی فرینکی پر، کبھی اسٹیو پر تان رہی تھی۔

"اسے گولی مار دو، ڈاٹ!" فرینکی چلایا۔

اسٹیو نے ڈوٹی کی ہچکچاہٹ دیکھی اور فرینکی پر جھپٹ پڑا۔ دونوں اگلے کمرے میں جا گرے اور بستر پر لوٹنے لگے۔ اسٹیو کا ایک ہاتھ فرینکی کے چہرے پر تھا اور دوسرے سے وہ ہتھکڑیاں تلاش کر رہا تھا۔

یہ پھر ایک اور قانونی غلطی تھی۔

ڈوٹی نے اسٹیو کو اس کی ہی گن زور سے دے ماری۔

"تمہیں اسے گولی مار دینی چاہیے تھی۔" فرینکی نے اسٹیو کے نیچے سے نکلتے ہوئے کہا۔

"میں کسی پولیس والے کو نہیں مارنے والی۔" ڈوٹی نے کہا۔ فرینکی نے گن کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"لیکن ہو سکتا ہے میں تمہیں مار دوں۔" ڈوٹی نے کہا، اپنی جگہ پر جمے رہتے ہوئے، گن فرینکی پر تانتے ہوئے۔

"بے بی اتم تو ہوش کھو بیٹھی ہو۔"

"ابھی دکھائی ہوں ہوش کھونا کیا ہوتا ہے۔" ڈوٹی نے کہا پھر گن سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "ادھر جاؤ اور دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔"

فرینکی نے پیچھے ہٹتے ہوئے ہاتھ اٹھا دیے۔

"ہمارے پاس بہ مشکل پانچ منٹ ہیں، سب ٹھیک

کرنے کے لیے، ڈاٹ!" اس نے کہا۔ "تم مجھے وہ جواہرات دے دو تو ہم اب بھی بچ سکتے ہیں۔"

"وہ میرے پاس نہیں ہیں۔ وہ بستر پر پڑے ہیں۔"

"بکواس۔" فرینکی بولا۔

"خود دیکھ لو۔"

بستر پر بٹوا کھلا پڑا تھا مگر جواہرات غائب تھے۔

"ڈرامے بند کرو، ڈاٹ! جو کچھ چرایا ہے، واپس دے دو۔" فرینکی نے کہا۔

"تم نے مجھے پولیس والے کو مارنے پر مجبور کیا۔" ڈوٹی نے کہا۔ "اور تم نے گیرتھ کو بھی مار دیا۔"

فرینکی ہنسا۔ "معصوم جھوٹی ڈوٹی! جو جواہرات کے بارے میں بکتی پھرتی تھی اور جس نے اپنے باس کے دفتر کی چابی خود ہی مجھے دی۔"

"تم نے میری کلائی مروڑی تھی۔"

"وہی بات ہے۔" فرینکی بولا۔ "اور جب میں نے کل رات چابی واپس کی تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ تم تو بہت پیار جتا رہی تھیں۔"

"تم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ تم نے اسے مار دیا۔ مجھے خود اس کی لاش ملی۔ تم خبردار تو کر سکتے تھے۔"

فرینکی بہت ہی بے پروا انداز میں بولا۔ "تمہارے لیے یہ ایک سرپرائز ہونا چاہیے تھا۔" اس نے کہا۔ "میں تمہیں اس سب سے دور رکھنا چاہتا تھا۔"

"لیکن اسے مارنے کی کیا ضرورت تھی؟" ڈوٹی اب رو رہی تھی۔ "وہ تو ایک بہت اچھا اور بوڑھا آدمی تھا۔"

"اس نے مجھے لفنگا کہا اور بولا اگر میں پہلے زمانے میں اس سے ملتا تو وہ میرا پستول چھین کر مجھے مزہ چکھا دیتا۔" فرینکی نے کہا۔ "بوڑھا خود ٹھیک سے کھڑا بھی نہیں ہو پا رہا تھا پھر بھی بڈھے کی شیری کر رہا تھا۔ میں نے اسے دکھایا اور اسے سیف کھولنے پر مجبور کیا پھر اسے باقی وہسکی پلائی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔"

"تمہیں اسے مارنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"اس نے مجھے دیکھ لیا تھا، بے بی! اور ہو سکتا ہے میں نے تمہارا نام بھی لیا ہو۔ وہ ہمیں پہچان لیتا۔ لیکن اگر لوگ سوچیں کہ ایک بوڑھا جسے اس کی سیکریٹری نے ٹھکرا دیا، شراب پی کر خود کو مار بیٹھا تو پولیس شاید مان لے، خاص طور پر جب دروازہ بند ہو۔"

ڈوٹی نے آنسو پونچھے تو فرینکی نے موقع بھانپ لیا۔ اس نے جھٹکے سے اس کی کلائی مروڑتے ہوئے پستول چھین لیا اور اسے ایک گھٹنے پر گرا دیا۔

"اب بتاؤ، میرے جواہرات کہاں ہیں، ڈاٹ؟"

بسٹر بستر کے نیچے دبک کر بیٹھا تھا جہاں وہ اس وقت دوڑ کر چھپ گیا تھا جب وہ آدمی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ زیورات والا کھیل اب ذہن سے نکل چکا تھا۔ ہیٹر، پیاز والا اور وہ نیا آدمی سب قریب تھے، چلا رہے تھے۔ اس نے خود کو زمین سے جتنا ممکن ہو سکتا تھا نیچے کرنے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور کان چوکنے ہوئے تھے۔

اس نے دیکھا کہ آدمی نے ہیٹر کو گھسیٹتے ہوئے اگلے کمرے میں لے جا کر اس کے چہرے پر تھپڑ مارا۔ ہیٹر زمین پر ڈھیر ہو گئی جبکہ وہ آدمی غصے میں چیخ رہا تھا۔ بسٹر نے شیشے ٹوٹنے اور فرنیچر کے الٹنے کی آواز سنی۔

وہ بستر کے نیچے سے باہر نکلا، جتنا ممکن ہو سکے زمین کے ساتھ لگا ہوا۔ پیاز والا بستر پر سو رہا تھا۔ بسٹر کھڑکی کی طرف بڑھا اور انجانی چھلانگ کا اندازہ لگایا۔

آدمی دوبارہ کمرے میں آ کر چلایا۔

"بھاگ، بسٹر.....!" اس نے خود سے کہا اور فرش پر دوڑا اور کھڑکی کی طرف چھلانگ لگائی۔ اس کا سر کھڑکی کے فریم سے ٹکرا گیا۔ اگلے پنجے کھڑکی کی چوکھٹ پر تھے مگر پچھلی ٹانگیں دیوار پر پھسل رہی تھیں۔ وہ آدھا کمرے میں تھا اور آدھا کھڑکی میں، شرم اور خوف سے گھرا ہوا۔ وہ کھڑکی سے نکل پار ہا تھا۔ اسے نکلنا ہی تھا۔ وہ آدمی بالکل پاس آ چکا تھا۔

بسٹر پیچھے زمین پر گر گیا، مڑا اور دیکھا کہ وہ آدمی دروازے اور اس کے درمیان تھا۔ بسٹر دہشت سے اندھا ہو چکا تھا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے دوڑا، چیختے ہوئے بلے کی طرح اور آدمی کے پاس سے گزرتا ہوا اگلے کمرے میں نکل گیا۔

ایک طرف دروازہ کھلا تھا مگر دوسری طرف کھڑکی۔ نجات اور کھڑکی کی طرف دوڑا لیکن ہیٹر وہاں موجود تھی۔ وہ ہیٹر کو بالکل بھول چکا تھا، مس کو بھی۔ ہیٹر کو اچانک سامنے دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور پھر دروازے کی طرف مڑا مگر وہ آدمی وہاں تھا، راستہ روک کر۔

اس کا جبلی ردعمل غالب آیا۔ اس کے پنجے قالین پر چلے اور وہ آدمی پر جھپٹا۔ آدمی کے ہاتھ اوپر گئے اور اس نے اپنا پستول گرا دیا۔ بسٹر نے اپنے پنجے اور دانت اس کے سینے اور چہرے میں گاڑ دیے۔ ایک ہی وقت میں وہ بھاگنا بھی چاہتا تھا اور اسے مار ڈالنا بھی۔

digest library.com

Scanned with CamScanner

آدمی چیختا ہوا گھوما، بسٹر کو نوچنے لگا تاکہ اسے خود سے الگ کر سکے۔ وہ پیچھے ہٹا، دروازے سے باہر لڑکھڑایا اور اس کا پیر پھسل گیا۔

پھر وہ دونوں سیڑھیوں سے لڑھکتے چلے گئے۔

☆☆☆

"آپ ٹھیک ہیں، مس واکر؟" اسپوکن نے پوچھا۔

اسٹیو بستر سے اٹھ کر ایک گھٹنے پر بیٹھا اور سر سہلایا۔

"ہاں، میں ٹھیک ہوں، کیپٹن اشکریہ۔" اسٹیو نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا جسے شاید اسپوکن نے سنا بھی نہیں ہوگا۔ وہ تو ڈوٹی کو تسلی دینے میں مصروف تھا۔

اسٹیو اٹھا اور فریجکی سے گرا ہوا اپنا ریوالور اٹھایا، اسے ہولسٹر میں رکھ دیا۔ یہ وضاحت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ ایک مشتبہ شخص نے اس سے ہتھیار کیسے چھین لیا۔ بعد میں وقت ملے گا یہ طے کرنے کا کہ اس سارے معاملے میں ڈوٹی کی کتنی ذمے داری بنتی ہے۔ اسپوکن کا بازو اگر ڈوٹی کے کندھے پر ہے تو لگتا ہے وہ اسے رعایت دینے کو تیار ہے۔

اسٹیو نے کمر سیدھی کی اور جھک کر اپنا ہیٹ اٹھایا جو فرش پر پڑا تھا۔ بستر کے پائینتی کے قریب اسے ایک قیمتی پتھر دکھائی دیا مگر اب وہ بس کر چکا تھا۔ اسے اسپوکن کے لیے چھوڑ دیا۔ ویسے بھی سارا کریڈٹ اسے ہی لینا تھا۔

اسٹیو اپارٹمنٹ سے نکلا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے فریجکی کے اوپر سے گزرا جو نیچے گر گیا تھا۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔

باہر اسپوکن کے وردی والے اہلکاروں میں سے ایک سڑک پر جمع ہوتی بھیڑ کو [illegible] رہا تھا۔ اسٹیو نے بھیڑ میں سے راستہ بنایا اور عمارت کے پچھلے طرف چلا گیا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگائی، کوٹ کی جیب سے ایک مڑا تڑا سگریٹ نکالا، ماچس جلائی اور ایک سکون بھرا کش لیا۔

اس نے اپنے سر کے پچھلے حصے کو سہلایا اور ہاتھ پر لگے خون کو دیکھا۔ وہ جگہ جہاں ڈوٹی نے مارا تھا۔

"کیا دن تھا۔" اس نے سوچا۔ تب اس نے آنکھ کے کنارے سے کچھ حرکت محسوس کی۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" اس نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی اس کا ہاتھ فوراً ریوالور کی طرف بڑھا۔

غور سے دیکھنے پر پتا چلا ایک مانوس بلی چاندنی میں نہائی بیٹھی تھی۔

"تم شہر کے اس حصے میں کیا کر رہے ہو، بلے؟" اسٹیو نے کہا۔ اس کی جیسے جان میں جان آئی ہو۔ وہ وہیں جھک گیا، بلے سے چند فٹ کے فاصلے پر۔

"کیا تم یہاں تک اپنے پنجوں پر چل کر آئے ہو؟ تم میں تو بڑی ہمت ہے۔"

اس نے بلی کے گندے اور الجھے ہوئے بال اور اس کی خراب آنکھ پر جمے مٹی کو دیکھا۔

"تم تو مکمل بکھرے ہوئے ہو، پس پس۔ ایسے لگتا ہے جیسے تم راکی مارسیانو سے لڑ کر آئے ہو۔"

اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں کہ شاید کوئی ٹریٹ مل جائے مگر کچھ نہ ملا۔ تب اس نے اپنا ہاتھ نرمی سے اور بغیر کسی امید کے آگے بڑھایا۔ اس نے اپنی انگلیوں کو حرکت دی، زبان کو دانتوں پر مار کر ہلکی کلکنگ آوازیں نکالیں۔

بسٹر کا دل بیٹھ گیا۔ کیا پیازوالے کو معلوم تھا؟ اس نے التجا بھرا اشارہ کیا اور وہی آوازیں نکالیں۔ بسٹر کو کسی اور انسان کی ضرورت نہ تھی۔ وہ دوبارہ اس تکلیف سے نہیں گزرنا چاہتا تھا۔

پیازوالے نے انگلیاں ہلائیں۔ اس کی آنکھوں میں نرمی تھی۔

بسٹر نے جیسے اپنے اختیار کے خلاف اپنے اگلے پنجے آگے پھیلائے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی ایک الٹی محراب کی صورت اختیار کر گئی اور پھر وہ بیٹھ گیا۔ بالکل پہنچ سے باہر۔

"پس پس۔"

بسٹر نے بے پروائی سے آدھی آنکھ بند کر لی۔ [illegible] نے پیازوالے کے سر کے پچھلے حصے سے دھات کی سی خوشہ محسوس کی۔ [illegible] یہ وہ ادی تھا جسے تحفظ کی ضرورت تھی۔

پیازوالے نے وہی کلکنگ آواز نکالی۔ وہ بسٹر کو صبر سے دیکھتا رہا۔

اسے معلوم ہے۔

بس..... کمبخت۔

بسٹر اٹھ کھڑا ہوا جیسے اب اسے خود پر کنٹرول نہ رہا ہو۔

اس نے پیازوالے کی ٹانگوں کے گرد عدد آٹھ کی شکل میں چکر لگائے۔ یہ مقدس قدم تھے۔ پھر وہ اپنی جگہ پر لوٹ گیا اور اپنا پیٹ ننگا کر دیا۔

اسٹیو نے اس کے پیٹ کو چھوا تو بسٹر نے اسے پنجہ مارا، ناخن تھوڑے سے باہر نکال کر یہ جتانے کے لیے کہ کون حاکم ہے۔ پھر اس نے اپنی ٹھوڑی سہلوانے کے لیے آگے کی۔ خود سے عزم دہراتے ہوئے۔

یہ آخری انسان تھا۔

✖✖✖

Scanned with CamScanner

دیس پردیس

ناہید سلطانہ اختر

دوسرا حصہ

دنیا ایک ایسی قیام گاہ جس میں بسے انسان اپنی اپنی خواہشوں کے اسیر ہیں... کوئی حالات کی سختی کا شکار... تو کوئی سب کچھ مل جانے پر شاداں و فرحاں... کچھ ایسے جنہیں زمانے سے جھڑکیاں اور لعن طعن ہی ملتی ہے... ہونے کا سہاگا غربت بھی ان کے ہم رکاب رہتی ہے... ایسے میں جب منزل کا تعین نہ ہو تو وہ آسمان میں بھٹکتے پنچھیوں کی طرح بے سمت سفر ہوجاتا ہے... بہتر مستقبل، آسودہ زندگی اور دولت کمانے کی چاہ اسے وطن سے دور نگر نگر گھومنے پر مجبور کردیتی ہے اور وہ پردیس میں قسمت آزمانے چل پڑتا ہے... وہ سمجھتا ہے کہ وہاں کی سڑکیں شیشے کی ہوتی ہیں اور دولت اس پر بکھرے پڑے رہتے ہیں جنہیں جتنا مرضی اٹھالو... مگر یہ اس کا خام خیالی.... ہوتی ہے... کیونکہ اپنا دیس اپنا ہی ہوتا ہے... وہ طرح طرح کی صعوبتیں اٹھاتے اٹھاتے شدت سے وطن سے دوری اور اپنوں کے نہ ہونے کا احساس ہوتا ہے... اور یہی کلفتیں سہتے بالآخر زندگی کی شام ہوجاتی ہے... مگر مسافر اپنی منزل سے کوسوں دور ہی ہوتا ہے۔

دلوں میں امنگ، آنکھوں میں سہانے خواب

سجائے پردیس میں قسمت آزمانے والوں کی داستان

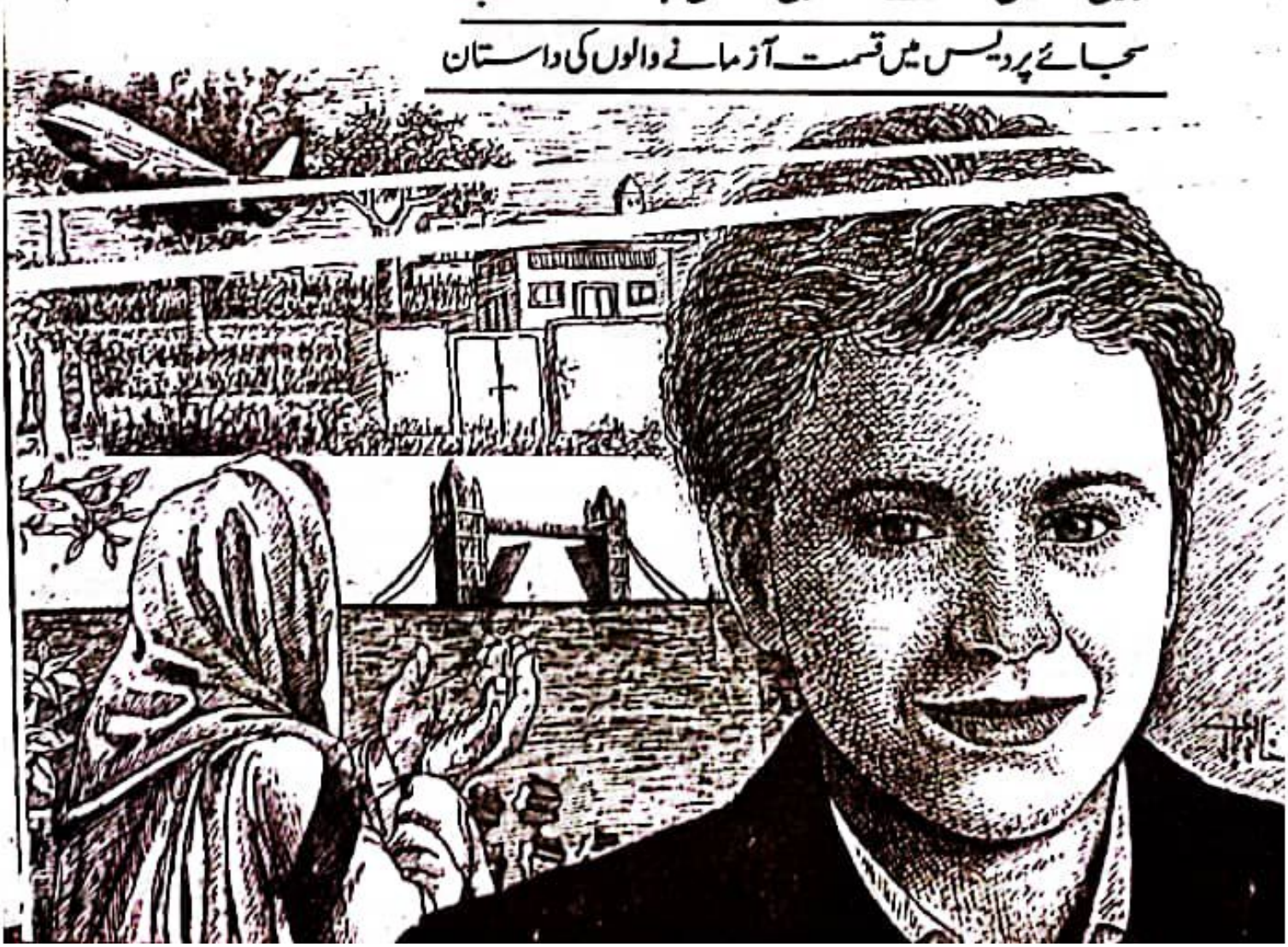

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

ماں اور بہنوں کے علاوہ سبھی نے رجب علی کے لندن جانے کی خبر کو دیوانے کی بڑ سمجھا لیکن جب واقعی اس کا پاسپورٹ بننے کو دے دیا گیا تو کیا بھائی، بھاوجیں، بہنوئی، رشتے دار، اہل محلہ اور یار دوست، سبھی رجب کو تحیر اور رشک سے دیکھنے لگے۔

''ابے! تو سچ مچ لندن جا رہا ہے؟'' دوست رجب علی سے پوچھتے۔

''تو کیا جھوٹ موٹ۔'' وہ جواب دیتا۔

''یار! میرے لیے بھی راستہ بنانا۔'' کوئی جگری یار گڑگڑاتا۔

''ہاں، ہاں فکر مت کر۔ پہلا نمبر تیرا ہی۔'' رجب علی کہتا۔

''ابے! میرے باؤجی بولتے ہیں، لندن میں پیسا ہی پیسا ہے، جتنا چاہو سمیٹ لو۔ کچھ میرے حصے کا بھی جیب میں ڈال لینا یار!''

''حفیظ سموسے والا بتا رہا تھا، وہاں سڑکیں شیشے کی ہیں۔'' رجب دوستوں کو بتاتا۔

''ابے لے..... لوگ چلتے کیسے ہوں گے شیشے کی سڑکوں پہ۔ شیشہ ٹوٹ کر پاؤں میں چبھ جائے تو پاؤں زخمی۔''

''بوٹ پہن کر جاؤں گا۔''

''ابے تو، تو بوٹ پہن لے گا، گاڑیاں کیسے چلتی ہوں گی شیشے کی سڑکوں پر۔'' کوئی دانا دوست فکرمندی سے کہتا۔

''ٹک ٹیک ہوتی ہے میری جان!'' دوستوں کی محفل میں بیٹھا کوئی دوست اپنی فراست جھاڑتا۔ ''موت کے کنوئیں میں موٹر سیکل والا موٹر سیکل کیسے چلا لیتا ہے.....؟ ٹک ٹیک سے..... بس ویسے ہی لندن میں بھی ڈرائیور ٹک ٹیک سے چلاتے ہوں گے گاڑیاں شیشے کی سڑکوں پہ..... ابے یہ جو مالے انگریز ہیں نا، میرے باؤجی بولتے ہیں ان کا دماغ بہت چلتا ہے۔''

''میرے دادا بولتے ہیں، انگریزوں کی عورتیں گڑیوں کے مانند ہوتی ہیں۔ دادا نے ہندوستان میں دیکھ رکھی ہیں بہت۔''

''لے بھئی رجب! تیرے کو تو اُدھر لندن میں مفت شو۔'' کوئی پھکڑ سا لڑکا رجب علی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی آنکھ مارتا۔

''بھائی اپن ایسے نہیں۔'' رجب علی کہتا۔

آپا کی مالی معاونت سے رجب علی کا پاسپورٹ بن گیا تھا۔

آپا نے جوڑ توڑ، قرض ادھار کر کے رجب علی کے ٹکٹ اور دیگر اخراجات کے لیے بھی پیسے اکٹھے کر لیے۔ علیم صدیقی نامی رجب کے اسی شناسا نے جس نے اس کے دل میں نہ صرف لندن جانے کی ڈالی تھی بلکہ سرکارِ برطانیہ سے اس کے نام کا دعوت نامہ بھی منگوا دیا تھا، ہوائی جہاز کا سفری ٹکٹ خریدنے میں بھی راہنمائی دی۔

آپا اسے اپنے ساتھ لائٹ ہاؤس لنڈا بازار لے گئی۔ کوٹ، پتلون، پوری آستین کا اونی سویٹر، ٹوپا، پھر اپنی بستی کے بازار میں گھوم پھر کر اسے ایک بش شرٹ، بند جوتے اور سفری بیگ بھی خرید دیا۔

ان تیاریوں کے پیش نظر بھائیوں، بھاوجوں اور بہنوئیوں کو سچ مچ اس کے لندن جانے کا یقین آ گیا۔ بھائیوں کی رجب علی کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے دن تو تکار مبہم خاموشی میں بدل گئی۔ بھاوجوں کی نگاہوں میں رجب علی کے لیے التفات ڈولنے لگا۔ چھوٹی بھابی ایک روز اس کے لیے دو پراٹھے چنگیر میں لے آئی، بڑی بھابی نے ایک روز دھیرے سے کہا۔ ''رجب! لندن جا کے اپنے بھائی کو بھی بلانے کی کوشش کرنا۔''

''فکر مت کرو بھابی! ایک ایک کر کے سب کو بلاؤں گا۔'' بڑی بھابی کا التفات پا کر رجب ماں سے کیے خود لندن سے جلد واپس آنے کا وعدہ بھول گیا۔

منجھلی کے میاں نے رجب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں داب کر فرمائش داغی کہ رجب جب واپس آئے تو لندن سے اس کے لیے بدیسی لال پری کی بوتل لانا نہ بھولے۔

''دولہا بھائی! پری کیا، میں تو جن بھی لے آؤں گا۔'' رجب نے بہنوئی سے ازراہِ مذاق کہا۔ تب رجب علی کو یہ علم نہ تھا کہ جن نام کی بھی کوئی شراب ہوتی ہے۔

ماں رجب علی کے سفر کی تیاری دیکھ کر ملول تھی۔ اداسی آپا کو بھی تھی مگر اپنے مردانہ وار مزاج کے باعث، وہ اپنے دکھ کا اظہار نہ کر رہی تھی۔ ریحانہ چھپ چھپ کر روتی کہ اس کا پیارا، راج دلارا بھائی دور جا رہا تھا۔ منجھلی بہن کو اپنے ہی آلام سے فرصت نہ تھی تاہم بہن تو تھی۔ چوبیس گھنٹوں میں گھڑی دو گھڑی کو جتنی بار اسے رجب علی کے جانے کا خیال آتا، وہ سوچتی کہ ماں اس کے بنا کیسے رہ پائے گی؟

سارے محلے میں رجب علی کے لندن جانے کی خبر ہر گھر کا موضوعِ سخن بنی ہوئی تھی۔ رجب علی جو خستہ حال اکثر ننگے پاؤں ہی بستی کی گلیوں میں مٹرگشت کرتا پھرتا

Scanned with CamScanner

digest library.com

تھا، جسے اپنے گھر میں بھائیوں کی سلواتوں، بھاوجوں کی بے رخی اور بہنوئی کے طنزیہ جملوں کا سامنا رہا کرتا تھا، جسے سرکاری نل سے پانی کے دو ڈول بھرنے کے لیے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا..... اور جسے سرکاری گٹر کے بیٹھ جانے کی ڈھکنے پر اور اس کے اردگرد جمی محلے کے لوگوں کی محفل میں پچھلی صف میں بھی بہ مشکل جگہ دی جاتی تھی، یکا یک "وی آئی پی" بن گیا۔

ماں اب بھی گاہے بہ گاہے اس کی منت سماجت کرنے لگتی۔ "نہ جا ماں صدقے! پردیس کا لٹا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اپنے گھر میں روکھی سوکھی کھالے آدمی وہ اچھا۔ اب دیکھ تیرے دونوں بھائی صبح کو اپنے بال بچوں کے لیے روزی کمانے نکل کر شام کو ان کے ساتھ تو آبیٹھتے ہیں۔ تیری بھی شادی کردوں گی، مانگ تو بیٹھی ہے تیری۔"

"خالو کا تو پتا ہے نا تمہیں۔ تین بھائیوں کی ایک ہی بہن ہے تمہاری بھانجی ---- باپ کی لاڈلی۔ تم دیکھ لینا، شرطوں پر شادی کریں گے وہ اپنی بیٹی کی مجھ سے۔" رجب علی ایک روز بول ہی پڑا۔

"بڑا سیانا ہے تو۔" ماں نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"بڑوں کی سی باتیں کررہا ہے۔"

"ہاں تو، گلیوں میں جو رلا کھلا ہوں۔ تم لوگ تو سمجھتے تھے بس آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے، اسے برے بھلے کی کیا تمیز۔ میں نے بڑوں کی باتیں بھی سنی ہیں، ان سے سیکھا ہے۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ میں تیری خالہ، خالو سے ابھی بات کرلیتی ہوں شادی کی۔ دیکھتی ہوں کتنی شرطیں رکھتا ہے تیرا خالو۔"

"نہیں، نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔ ابھی میں جارہا ہوں، مجھے جانے دو۔"

"نہ..... اب تو میں ضرور بات کروں گی۔ شادی نہ سہی، تیرے نام کا چھلا تو ڈال دوں میں مہرن کی انگلی میں۔"

آپا کو پتا چلا تو وہ بولی۔ "اماں! ساری تیاری ہوگئی، اب جانے دو اسے، کسی اور چکر میں نہ ڈالو۔"

"تو سمجھنے کی کوشش کر۔ بات چھیڑنے سے ایک تو تیرے خالو کی نیت معلوم ہوجائے گی کہ وہ بیٹی دینے کے لیے کیا شرطیں رکھتا ہے۔ اتنا تو مجھے پتا ہے، وہ ہے لٹریلا آدمی۔ دوسرے یہ کہ مہرن کے ہاتھ میں چھلا ڈالنے سے رجب بھی بندھ جائے گا۔ ہوسکتا ہے پردیس جانے سے رک ہی جائے۔"

"بھول ہے تمہاری۔ وہ کسی قیمت پر نہیں رکے گا اور پھر یہ جو اتنا ادھار فرض لے رکھا ہے لوگوں سے اس کے جانے کے لیے، اس کا کیا ہوگا؟ جن سے لیا ہے وہ بوٹیاں نوچیں گے میری۔"

"خیر، تیرے خالو کو تو دیکھنا ہے کتنے پانی میں ہے۔"

"تمہاری مرضی اماں!"

ماں نے بہن، بہنوئی سے رجب اور مہرن کی مانگ کو پکا کرنے کی بات کرنے میں دیر نہیں کی۔ رشتہ پکا کردینے کی بات کرکے بہنوئی کی شرائط سے آگاہ ہونا تو محض بہانہ تھا، ماں رجب کو پردیس جانے سے روکنے کی کوئی بھی تدبیر کرلینا چاہتی تھی۔ ماں، آپا کے سوا اپنے کسی اور بیٹا، بیٹی کو اعتماد میں لیے بغیر اگلے ہی دن بہن کے گھر پہنچی اور مہرن سے رجب کی مانگ پکی کردینے کی بات کی۔ بہنوئی نے نہ کوئی شرط رکھی، نہ آسرا دیا بلکہ نہایت نخوت سے کہا۔

"میری بیٹی پڑھ لکھ رہی ہے۔ میں کسی جاہل کو اپنی بیٹی نہیں دے سکتا۔"

بہنوئی کا جواب سن کر ماں دھک رہ گئی۔ "بھائی! رجب روزی کمانے لندن جارہا ہے۔"

"لندن جاکے کون سا کوئی عالم بن جائے گا تمہارا بیٹا!"

"دونوں کی خیر مانگ ہے۔" ماں جو بہنوئی کے جواب سے صدمے میں تھی، آخری امید کے طور پر بولی۔

"رہنے دو آپا! میں ان باتوں میں آکر اپنی بیٹی رجب کو نہیں دینے والا۔" بہنوئی نے بے مروتی سے کہا۔

ماں، بہن کے گھر سے مایوس اور نم دیدہ واپس لوٹی۔

"بس اماں! چپ کرکے بیٹھ جاؤ، زبان کو تالا لگالو۔ آئندہ رجب اور مہرن کی مانگ کا ذکر بھی نہ کرنا۔ یہی رجب اگر آج لکھ پتی ہوتا تو خالو چرم چاٹ کر اسے اپنی بیٹی دیتے۔ رجب کو ابھی کچھ نہ بتانا، جب موقع آئے گا، بتادیں گے۔ وہ ٹھیک ہی کہتا ہے، غریبی رذالت ہے۔ تگڑا کرکے اسے لندن جانے دو، واپس آئے گا تو اس کی منگنی، شادی کا سوچنا۔"

"راتوں کو نیند نہیں آتی مجھے اس خیال سے کہ رجب ابھی سیانا نہیں۔ کیونکر رہے گا پردیس میں۔"

"سیانا نہیں تو بالکل بے عقلا بھی نہیں۔ مرد ذات کا کیا ہے اماں! سڑک پر بھی رات گزار لیتا ہے۔ لگر لڑکی کی ہوتی ہے۔ ریحانہ جب تک اسکول سے گھر واپس نہیں آجاتی، لگر ہی رہتی ہے۔ زمانہ خراب ہے۔"

Scanned with CamScanner

"میں تو کہوں، ریحانہ کے لیے کوئی شریف آدمی دیکھ کر باندھ دے اسے۔"

"آپا تو تھا رشتہ..... اس نے رونا پیٹنا ہی ڈال دیا تھا۔ خیر، فی الحال تو رجب کی بات کرو۔"

"دل پر پتھر رکھنا پڑے گا مجھے۔" ماں روہانسی ہو کر بولی۔

"رکھ لو اماں او ویسے بھی اب تو ساری تیاری ہو چکی۔"

"اللہ کے سپرد" ماں نے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔

رجب علی نے روانگی سے ایک دن پہلے فنی حجام سے حجامت کرائی، بھیگی مسوں پر استرا پھروایا۔ آپا کے دیے پیسوں سے خوشبودار صابن کی نئی ٹکیہ خرید کر لایا۔ نہایا دھویا اور آپا کی ہدایت پر صابن کی استعمال شدہ ٹکیہ ایک کاغذ میں لپیٹ کر اپنے سفری بیگ کی چھوٹی جیب میں رکھ لی۔ بال سوکھ گئے تو ماں نے سرسوں کے تیل سے اس کے بال چپڑے، جھانوے سے اس کے پیروں کی ایڑیاں صاف کیں، چھوٹی قینچی سے اس کے ہاتھ پیروں کے ناخن کاٹے اور بار بار اپنے دوپٹے سے اپنی نم ہو جانے والی آنکھیں بھی پونچھتی رہی۔

"رو کیوں رہی ہو اماں..... پیسے بھیجا کروں گا تمہیں۔" رجب نے ماں کو تسلی دی۔

"تو مجھے پیسوں کا بھوکا سمجھتا ہے؟" ماں کی آواز میں آنکھوں کی نمی گھلی تھی۔

"جلدی واپس آؤں گا۔"

"کتنی جلدی؟ صبح کا نکلا جب تو دوپہر کی روٹی کھانے گھر آتا تھا، میری نظریں صبح سے دوپہر تک دروازے پر لگی رہتی تھیں۔" ماں سسکنے لگی۔

"ارے اماں!" اس نے ماں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ ماں سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟" وہ مسکرایا۔

"تیری تصویر بھر رہی ہوں اپنی آنکھوں میں..... اور ہاں، وہ وعدہ یاد رکھیو۔"

"کون سا وعدہ؟"

"میم نہ لانے کا۔"

"میں نے جوتے کہا ہے آپا سے۔"

"جوتے..... اچھے گھر میں گھسنے نہ دے گی وہ۔"

"میم کو تو تم اندر بلا لو گی نا؟" رجب کو مذاق سوجھا۔

"ٹکا۔" ماں نے اسے پیار سے دیکھا۔

"ٹکا کا مطلب آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا، آج تم بتا ہی دو۔"

"ٹکا کا مطلب ہوتا ہے بچہ۔" رجب ہنس دیا۔

"میری بھولی ماں!" اس نے ماں کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

اس رات سرکاری گٹر کے ڈھکنے پر رجب کے اعزاز میں محلے کے لڑکوں کی طرف سے الوداعی محفل دیر تک سجی۔ وہ لڑکے بھی جو پہلے اسے ٹیوب کے ماہر کہہ کر اپنے لیے جگہ بنایا کرتے تھے، سمٹ سمٹا کر رجب کو جگہ دے رہے تھے۔ بکن نے بھی اپنی دکان اس محفل کے برخاست ہونے تک کھولے رکھی۔ آنکڑے سے لٹکا مٹی کے تیل کا ہنڈا دکان بند ہونے تک جلتا رہا۔ محفل برخاست ہونے پر تمام لڑکوں اور بکن نے رجب کو گلے لگا کر خدا حافظ کہا۔ دو تین جگری دوستوں نے منہ اندھیرے اس کے ساتھ ہوائی اڈے تک جانے کا عندیہ بھی ظاہر کیا۔ بعضوں نے دبی زبان سے اور بعض نے واشگاف کہا۔

"یار! تیرے پاؤں تک جائیں لندن میں تو ہمارے لیے بھی کوئی جگہ بنانے کی کوشش کرنا۔"

"فکر نہ کر۔" رجب نے خوشدلی سے اردو اور پشتو کو باہم جوڑ دیا مگر وہ خود پریشان تھا کہ خدا جانے لندن جا کر وہ خود اپنے لیے بھی جگہ بنا پائے گا کہ نہیں۔

دوستوں کی محفل سے اٹھ کر گھر پہنچا تو ماں اور آپا جاگ رہی تھیں۔

"چار روٹیوں میں بھاجی اور اچار لپیٹ کے رکھ دیا ہے میں نے، دو وقت تو کھا ہی لے گا۔ وہاں کون سی کوئی تیری ماں بہن بیٹھی ہے تجھے روٹی کھلانے کو۔" ماں نے کہا۔

"ٹھیک ہے اماں!"

"میں نے میتھی ٹکیاں اور نمک پارے بنا دیے ہیں۔ تیرے بیگ میں رکھ دیں دونوں چیزیں..... اور ہاں، چنے مُرمُرے بھی ہیں ایک تھیلی میں، کنگھا اور منجن بھی رکھ دیا ہے، دانت روز مانجھنا۔" آپا نے کہا۔

"آپا میری جمعہ کی نماز والی ٹوپی بھی تو ہے، وہ رکھ دی؟"

"جاتے ہوئے اوڑھ لینا سر پر۔"

"ٹھیک ہے۔"

چارپائی پر لیٹا تو ماں تیل کی بوتل لے کر پائنتی آ بیٹھی اور اس کا پاجامہ پنڈلیوں سے اوپر کرنے لگی۔

"کیا کر رہی ہو اماں؟"

"تھوڑا تیل لگا دوں تیری ٹانگوں اور پیروں پر،

Scanned with CamScanner

وہاں اللہ جانے کتنا پیدل پھرنا پڑے گا تجھے۔"

"رہنے دو۔" وہ اٹھ بیٹھا۔

"ماں صدقے! لیٹا رہ، تو دو بالشت کا تھا، اس وقت بھی میں تیری ٹانگوں کو مضبوط کرنے کے لیے تیل سے مالش کرتی تھی..... لیٹ جا میرا بچہ..... تھوڑی نیند تجھ لے۔ منہ اندھیرے تو جانا ہی ہے تجھے۔" ماں کی آواز رندھ گئی۔

اس نے ماں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ہونٹوں سے لگا لیے۔ دل نے بے صدا کہا۔ "بہت یاد آؤ گی ماں!" وہ ماں کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا مگر اپنی مردانگی ثابت کرنے اور ماں کو حوصلہ دینے رکھنے کی خاطر اس نے اپنے ضبط کا بندھن ٹوٹنے نہ دیا۔

ماں اس کی پنڈلیوں اور پیروں کو تیل کی مالش کرتی رہی اور وہ سو گیا۔ منہ اندھیرے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ منجھلی بھابی اپنے میاں اور بچوں کی خبر گزاری سے ہی فرصت نہ ملتی تھی، اس کے کمرے میں بھی لائٹیں جل گئی۔ بچے بڑے سب رجب علی کو خدا حافظ کہنے کے لیے ائیرپورٹ جانے کو تیار ہونے لگے۔ دونوں بھائیوں نے پچھلے روز طے کر لیا تھا کہ صبح کو سارے گھر والوں کے لیے ناشتا ان دونوں کی طرف سے ہوگا۔ چولہے جل رہے تھے، بڑی بھابی پراٹھے پر پراٹھا توے سے اتار رہی تھی۔ چھوٹی کے چولہے پر چائے کی کیتلی رکھی تھی اور وہ کٹورے میں انڈے، پیاز اور سبز مرچیں پھینٹ رہی تھی۔

عجیب بات تھی۔ اس سے پہلے ہر صبح کو دونوں بھائیوں کے چولہوں سے اٹھتی چائے کی جو خوشبو رجب کو للچایا کرتی تھی، آج سارے گھر والوں کے لیے اکٹھی چائے بنانے کو پڑوس سے مستعار لی گئی بڑی کیتلی میں ابلتی چائے کی خوشبو سے رجب کو متلاہٹ سی ہو رہی تھی۔ شاید یہ انجانے دیس سفر کا خوف تھا جو چائے کی دل پسند مہک سے متلاہٹ کا سبب بن رہا تھا۔

منجھلا بھائی تھال میں پراٹھے، ایک پلیٹ میں انڈوں کا آملیٹ، ایک کٹورے میں آلو کی بھاجی اور چھوٹی کٹوری میں اچار لے آیا۔ سب نے اکٹھے ناشتا کیا۔ رجب علی کا دل تو نہ چاہ رہا تھا مگر میزبانوں کا دل رکھنے کو اس نے زبردستی ناشتا کیا۔ ماں بار بار اپنے دوپٹے سے آنکھیں پونچھتی رہی۔

آس پاس گھروں سے ہمسائیاں رجب کو رخصت کرنے آ گئیں۔ دعائیں، امام ضامن، آنسو اور رجب علی کے ماتھے اور سر پر پیار۔

گھر والوں کے ہمراہ رجب علی گھر سے نکلا تو محلے کے مرد رجب علی کو رخصت کرنے کے لیے کھڑے تھے۔ بعضوں کے ہاتھ میں پھولوں کے ہار بھی تھے جو یکے بعد دیگرے رجب کے گلے میں ڈالے گئے۔ چند دوست حسب وعدہ ائیرپورٹ تک جانے کو تیار تھے۔

"بس کا کٹ اپنا اپنا ہوگا۔" بڑے بھائی نے کہا۔

"ہاں، ہاں۔" دوستوں کی طرف سے باجماعت جواب آیا۔

محنت کشوں کی آمدورفت کے لیے بسیں منہ اندھیرے ہی چلنا شروع ہو جاتی تھیں۔ بس کے اڈے پر منجھلا بھائی ٹائم کیپر کو گزشتہ روز ہی کہہ گیا تھا کہ منہ اندھیرے سارے گھر والوں نے ہوائی اڈے تک جانے کے لیے دوسری بس کے اڈے تک جانا ہے۔ بس کھڑی تھی۔ بچے، بڑے سب بس میں سوار ہوئے۔ بس چل پڑی اور اس نے ہوائی اڈے تک لے جانے والی بس تک پہنچا دیا۔ دوسری بس سے اتر کر پیدل مارچ ہوئی۔

رجب علی کو لندن جانے کی ترغیب دینے والا شخص پہلے ہی سے ہوائی اڈے پر موجود تھا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا اور درمیانی عمر کا آدمی بھی ڈھیلی سی پتلون اور کوٹ پہنے، ٹائی لگائے ٹھرے اپنے کندھے پر ایک بیگ لٹکائے کھڑا تھا۔ رجب علی اپنے مہربان اور اس کے ساتھی کو دیکھ کر نہ صرف حیران ہوا بلکہ پریشان بھی ہوا۔

"آپ بھی جا رہے ہیں؟" اس نے اپنے مہربان سے پوچھا۔

"نہیں بیٹا! میں نہیں جا رہا۔ یہ میرے ایک جاننے والے ہیں، یہ جا رہے ہیں اسی فلائٹ سے انگلینڈ۔ میں نے سوچا انہیں تم سے ملوا دوں۔ دونوں ساتھ ہو گے تو سفر اچھا کٹ جائے گا۔ جہاز میں سیٹ دینے والے سے کہنا، تم دونوں کو برابر برابر سیٹ دے دے۔"

"جی..... ٹھیک ہے۔"

"اچھا، یہ تمہاری فیملی ہے؟" رجب علی کے مہربان نے اس کے ہمراہ آنے والے جلوس کو طائرانہ نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری والدہ، بہن بھائی اور ان کے بچے ہیں..... اور وہ سارے دوست۔" رجب علی نے بتایا۔

"ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ اماں، ان کا نام راجا کمسن ہے، خیال رکھنا ان کا۔"

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

"جی..... جی۔" رجب علی نے نہایت سعادت مندی اور گرمجوشی سے کہا۔

"میں اب چلتا ہوں، دفتر بھی جانا ہے۔ ٹھیک ہے، راجا صاحب! اللہ کے سپرد۔ وہ سامنے دروازہ ہے، آپ لوگ اندر چلے جاؤ۔"

"مہربانی۔" راجا گھمن نے دست بستہ کہا اور رجب علی کے مہربان کے جانے کے بعد ہمہ تن رجب علی کی طرف متوجہ ہوا۔ "منا! چلیے فیر۔"

ہوائی اڈے پر حفاظتی اقدامات مفقود تھے۔ جانے والوں کے ساتھ انہیں رخصت کرنے کے لیے آنے والے بھی روانگی ہال میں کشاں کشاں جا رہے تھے۔ وہ بھیڑ تھی کہ خدا کی پناہ۔ ایک بادردی اہلکار کی راہنمائی پر رجب علی اور راجا گھمن ہی نہیں، رجب علی کے گھر والوں اور یار دوستوں نے بھی مسافروں کی سفری دستاویزات کی پڑتال اور اسباب سفر جہاز پر روانہ کرتے اہلکاروں کے روبرو کھڑی مسافروں کی قطار میں لگنے کا قصد کیا مگر راہنمائی کرنے والے بادردی اہلکار نے کہا۔ "صرف مسافر لائن میں لگیں، باقی لوگ الگ کھڑے ہو جائیں۔"

ہال میں ملک کے قومی پرچم کی ہم رنگ سبز اور سفید یونیفارم میں ملبوس سر پر سبز ترچھی کیپ والی فضائی میزبان نوجوان اور خوبرو حسینائیں دیکھنے والی آنکھوں کی نگاہوں کا مرکز و محور بنی ہوئی تھیں۔ کیا شان تھی ان حسیناؤں کی اور کیسا غرور تھا ان کی آنکھوں میں اور چہروں پر۔ بعض شوقین اور "ویلے" مرد تو صرف انہی کو دیکھنے کے لیے ہال میں موجود تھے۔ رجب علی کے دوستوں کو رجب علی کی قسمت پر رشک محسوس ہو رہا تھا۔

"ابے! جہاز میں رجب کو یہی چائے پانی دیں گی۔" رجب کے ایک دوست نے دوسرے کو دیکھ کر آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

پاسپورٹ اور سامان کی پڑتال کے بعد جہاز کی طرف جانے سے پہلے منجھلی کے میاں نے رجب کو سمجھایا۔ "جہاز میں زیادہ کھانا پینا مت، میں نے سنا ہے اوپر جا کر چکر آنے سے الٹیاں لگ جاتی ہیں۔"

'زیادہ.....!' رجب علی نے دل ہی دل میں سوچا۔ 'میں نے الٹیاں کر کے کوٹ پتلون کو گندا کرنا ہے۔ میں تو دیکھوں گا بھی نہیں کھانے پینے کی کسی چیز کو۔'

جہاز میں رجب کو کھڑکی والی سیٹ ملی جبکہ راجا گھمن کو اس کے برابر والی۔

"چچا! آپ کو کوئی چھوڑنے نہیں آیا؟" رجب نے راجا گھمن سے پوچھا۔

اس نے پہلے نفی میں سر ہلایا پھر بولا۔ "منا! میرا علاقہ دور ہے۔ میں آپوں آیا۔" راجا گھمن اپنی بولی کو رجب علی کی زبان میں مدغم کرتے ہوئے بولا۔

جہاز میں فضائی میزبان خواتین سبز و سفید تتلیوں کے مانند ادھر سے اُدھر لپکتی پھر رہی تھیں۔ رجب علی اداس تھا۔ ماں، آپا اور دوسروں سے دور جانے کے دکھ سے اس کی آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں۔ اپنی آنکھوں میں بار بار اتر آنے والی نمی کو فضائی میزبانوں اور ہم سفروں سے پنہاں رکھنے کو اس نے اپنا چہرہ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ دور ہوائی اڈے کی عمارت کی چھت پر ایک جم غفیر کھڑا تھا۔ اچانک اسے منجھلا بھائی اپنے چھوٹے بیٹے کو گود میں لیے دکھائی دیا۔ رجب بے تابی سے اماں، آپا، ریحانہ اور دوسروں کی تلاش میں اپنی نگاہیں دوڑانے لگا۔ ماں نظر آ گئی سفید لٹھے کا ٹوپی والا برقع اوڑھے، ایک ہاتھ الوداعی انداز میں ہلاتی اور دوسرا ہاتھ برقعے سے نکال کر دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھتی۔ پھر آپا دکھائی دی..... بڑی بھابی..... ریحانہ..... منجھلی کا میاں..... اس کا جگری دوست طفیل..... اور..... اور اس کا دل بیٹھنے لگا۔ سمندر پار کہاں دیکھنے کو ملیں گے یہ سب لوگ۔ اس کی بصارت آنسوؤں سے دھندلا گئی۔

جہاز کا کپتان مسافروں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا، محفوظ اور آرام دہ پرواز کا یقین دلا رہا تھا۔ سبز و سفید یونیفارم والی خوبرو فضائی میزبان مسافروں کے روبرو کھڑی انہیں پرواز سے قبل اور دورانِ پرواز حفاظتی اقدامات سے آگاہ کر رہی تھی۔ کسی ہنگامی صورتِ حال میں جہاز سے اخراج کے راستے سمجھا رہی تھی۔ رجب علی کا دل ڈرنے لگا۔ کیا ہوگا اگر جہاز گر پڑا۔ اوہو، جہاز سے تو ریل اچھی۔ آسمان سے گر کر ہڈی پسلی چورا ہونے کا ڈر تو نہیں ہوتا۔ اللہ مالک ہے، اب تو بیٹھ گئے جہاز میں۔ اسے آپا کے منہ سے بہت سے مواقع پر سنی مثل یاد آئی..... اوکھلی میں سر دے لیا تو موسلوں کا کیا ڈر!

فضائی میزبان دائیں بائیں یہ دیکھتی خراماں خراماں گزر رہی تھی کہ مسافروں نے حفاظتی سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی یا نہیں۔ رجب کے ساتھ بیٹھا راجا گھمن سیٹ بیلٹ کی تلاش میں اچک کر دائیں بائیں ہاتھ مار رہا تھا اور رجب علی سیٹ بیلٹ باندھنے کا طریقہ سر سے گزر جانے کی

Scanned with CamScanner

digest library.com

شرمندگی میں بیلٹ کے پٹے دائیں بائیں سے کھینچ کر اپنے سیٹ پر دبوچے بیٹھا تھا۔ خوبرو فضائی میزبان نے پہلے راجا بکھن کی بیلٹ باندھی پھر رجب علی کو سیٹ بیلٹ باندھنے میں مدد دی۔

جہاز کے انجن چل پڑے، اندھیرا ہو گیا۔ بہت تیز آواز تھی۔ جہاز حرکت میں آ گیا، تیزی سے دوڑنے لگا..... زمین چھوڑ دی اور ایک جھٹکے سے اوپر اٹھ گیا۔ رجب علی کا دل اچھل کر گویا حلق میں آ گیا۔

رجب علی نے سر گھما کر کھڑکی سے باہر دیکھا، زمین دور ہوتی جا رہی تھی۔ زمین پر موجود ہر شے لمحہ بہ لمحہ چھوٹی سے چھوٹی ہوتی جا رہی تھی۔ اماں، آپا، دوسرے بہن بھائی، ان کے بچے، یار دوست سب زمین پر رہ گئے تھے۔

وہ اوپر جا رہا تھا، زمین پر موجود اپنے عزیزوں سے دور جا رہا تھا۔ زمین پر موجود اس کے پیارے نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ مکان، گاڑیاں، سڑکیں، سب کھلونوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ سمندر دکھائی دیا، ایک سمندر نیچے..... دوسرا اس کی آنکھوں میں..... پھر نیچے دکھائی دیتا سمندر کہیں پیچھے رہ گیا اور جہاز سفید چمکیلے بادلوں میں آ گیا۔

'یارا میں تو اماں سے جلدی واپسی کا وعدہ کر کے جا رہا ہوں۔ دل نہ لگا تو ایک دن بھی لندن میں نہیں رکوں گا..... پھر بھی دل اتنا دکھ رہا ہے..... مرنے والے لوگ جنہیں دوبارہ واپس ہی نہیں آنا ہوتا، دنیا میں اپنے لوگوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے دور جاتے ہوئے کیسے دم دیتے ہوں گے؟' رجب علی دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ بے شمار دنوں تک بڑے بھائیوں کی صلواتیں اور مغلظات سنتے رہنے والا رجب علی جسے ماں بھولا اور آپا باؤلا سمجھا کرتی تھیں، زمین سے پاؤں ہٹنے اور فضا میں پرواز کرتے ہی دانشمندی کا آغاز کر رہا تھا۔ فکرِ امروز و فردا سے بے نیاز عمر میں وہ اچھے دنوں کی چاہ میں ترکِ وطن کر کے پردیس جا رہا تھا۔

جہاز کی بجھی بتیاں اب روشن تھیں۔ جہاز کی فضا اشتہا انگیز خوشبوؤں سے مہکنے لگی تھی۔ فضائی میزبان حسینائیں اور ان کے اکا دکا ساتھی مرد مسافروں کو ناشتا پیش کر رہے تھے۔

''منا اہن میں جوتیاں لاکی سناں'' ہنوز سیٹ بیلٹ کے شکنجے میں کسے راجا بکھن نے اپنے نیم سقیم وجود کو حرکت دیتے ہوئے رجب سے کہا۔

''چچا میں سمجھا نہیں، کیا کہا آپ نے؟'' رجب علی آہستہ سے بولا۔

''اوئے پاگل اجوتیاں تار دیاں؟'' راجا بکھن نے پوچھا۔

''کیوں چچا؟''

''منا! پہلی واری بند جوتیاں تسمے والیاں پائی آں، مینوں عادت نئیں۔'' راجا بکھن نے رجب سے آسان زبان میں اپنا مطلب بیان کیا۔

''دیکھ لو، مرضی ہے۔ جہاز اڑ رہا ہے، جوتے اِدھر اُدھر سرک گئے تو کہاں ڈھونڈتے پھرو گے؟''

راجا نے جھک کر جوتے اتار دیے۔

مسافروں کو ناشتا تقسیم کرتی فضائی میزبان جوڑی رجب علی اور راجا بکھن کے نزدیک پہنچنے لگی تو رجب نے راجا سے سرگوشی میں کہا۔ ''چچا! کچھ کھانے پینے کو نہ لینا۔''

''کیوں؟'' راجا نے نظر بچا کر ''کیوں'' ذرا لمبا کیا۔

''الٹیاں لگ جائیں گی۔''

''واہ جی واہ۔ کیوں نہ لیواں۔ پس پوٹ (پاسپورٹ) بنایا، کوٹ، پتلون، جوتیاں لتیں۔ دو ہزار توں کچھ کم ٹکٹ دے دتے..... کیوں نہ کھاواں؟'' راجا بکھن نے رجب کی بات کا برا منایا تھا۔

رجب علی نے ناشتا لے تو لیا مگر جی پر جبر کیے کچھ کھانے پینے سے گریز کیا۔ راجا بکھن نے سارا ناشتا نہایت تندہی سے چٹ کر ڈالا بلکہ رجب کو بھی اپنی کہنی مار کر ناشتا کرنے پر اکسانے کی کوشش کی۔ رجب نے نفی میں سر ہلا دیا۔ راجا نے اس کی ٹرے بھی صاف کر ڈالی۔ بعد میں چائے بھی پی، فرمائش کر کے سوڈا واٹر بھی پیا۔ رجب علی اس کا ندیدہ پن دیکھ کر دل ہی دل میں کھولتا رہا۔

اپنا اور رجب کا ناشتا ہڑپ کیے اور اوپر تلے چائے اور سوڈا واٹر پیے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ راجا بکھن بار بار پہلو بدلنے لگا۔ اس نے رجب کو بتایا، اس کا دل متلا رہا تھا۔

''چچا! اس لیے منع کر رہا تھا میں تمہیں کچھ کھانے پینے سے۔ تھیلی لے لو، الٹی آئے تو اس میں کر دینا۔''

راجا بکھن تھیلی کی تلاش میں ہی تھا کہ اسے قے آ گئی۔ راجا کے اپنے کوٹ پتلون کا جو حال ہوا، سو ہوا، رجب پر بھی خوب چھینٹیں پڑیں۔

''چچا! میں نے منع کیا تھا نا تمہیں۔'' رجب غصہ ہوا۔

''منا! سارا ہے اٹھارہ سو دتے نے ٹکٹ واسطے۔''

راجا نیم وا آنکھوں سے رجب کو دیکھتے ہوئے بولا۔

ارد گرد بیٹھے مسافر راجا بکھن کے قے کر دینے پر برا منہ بنا رہے تھے۔ بعض نے اپنی ناک دبوچ لی تھی۔ کسی

Scanned with CamScanner

نے ناک پر رومال ڈھانپ لیا تھا۔ ایک فضائی میزبان نے رجب علی کو کاغذی رومال دیا جس سے اس نے اپنے اوپر آنے والی آلودگی کو صاف کرنے کی کوشش کی۔

''سر آپ پیچھے آجائیں، وہاں ایک دو سیٹیں خالی ہیں۔'' میزبان خاتون نے رجب سے نہایت تمیز سے کہا۔

سر.....! وہ اسے ''سر'' کہہ رہی تھی۔ سر تو بڑے لوگوں کو کہا جاتا ہے۔ رجب علی پیچھے والی سیٹ پر جانے کو اٹھنے لگا تو راجا مکھن نے اس کا بازو پکڑ لیا اور بولا۔ ''نہ منّا..... اتو نے کدھرے اور نہیں جانا، میرے سنگی نے تینوں میرا کھیال رکھنے دا بولا سی..... میرے نال بیٹھ۔'' راجا مکھن نے رجب کے اپنے ہم زبان نہ ہونے کے باعث ملی جلی زبان اختیار کر لی تھی۔

''یہاں کیسے بیٹھوں چچا! میں نے تمہیں منع کیا تو تھا کھانے پینے سے۔'' رجب خفا ہوا۔

''منّا! ساڈھے اٹھارہ سو روپیہ.....'' راجا مکھن نے کے زیر اثر قدرے کمزور سی آواز میں بولا اور اس نے منہ نیچے کر کے سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اپنے پیروں کے بیچ ناک سنک دی۔

رجب علی کو اب اور کچھ دیر اس کے ساتھ بیٹھے رہنے کا یارا نہ رہا۔ وہ راجا کے قدموں میں بکھری آلائش پھلانگ کر جانے لگا تو راجا نے اپنا بازو اس کی راہ میں حائل کر دیا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہ منّا! میں نے تجھے نہیں جانے دینا۔''

''سر آپ اٹھیں، ٹوائلٹ جا کر خود کو صاف کریں۔'' ایک ائر ہوسٹس نے راجا مکھن سے کہا پھر رجب کو معذرت خواہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں صفائی کروا لی ہوں اور آپ دونوں ہی کو کہیں اور شفٹ کرتی ہوں۔''

جہاز میں موجود بیت الخلا سے راجا مکھن ہانپتا ہوا واپس لوٹا۔ فضائی میزبان تب تک رجب کو جہاز کے عقبی حصے میں خالی نشست پر منتقل کر چکی تھی۔

''اب اس آدمی کو میرے ساتھ نہ بٹھانا باجی!'' رجب علی نے میزبان خاتون سے کہا۔

آلائش کی صفائی کے بعد راجا کو سمجھا بجھا کر اس کی پہلی نشست پر ہی بٹھایا گیا۔ ناشتے کے بعد اکثر مسافر تکیہ اور کمبل لے کر سو گئے، بعض اخبار پڑھنے لگے، بعضوں نے رسائل کی ورق گردانی شروع کر دی۔ فضائی میزبان چاق و چوبند جاگ رہے تھے اور مسافروں کو ہر ممکن سہولت فراہم کر کے خود کو باکمال اور پرواز کے لاجواب ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔ پرواز ہموار تھی۔ رجب علی پیچھے چھوڑ آنے والوں کی یاد میں ڈوبا آئندہ کے لیے فکر مند بیٹھا تھا۔ اس کے کوٹ کی جیب میں کل پینسٹھ روپے پاکستانی رقم پڑی تھی جو دونوں بھائیوں، بجھلی اور آپا نے باہم جوڑ کر اسے اچھے برے وقت کے لیے دی تھی۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو جہاز کی فضا پھر اشتہا انگیز خوشبو سے مہک اٹھی۔ رجب علی کو بھوک لگ رہی تھی، اس پر مستزاد دل کو للچائی اشتہا انگیز خوشبو! مگر راجا مکھن کا حال دیکھ کر رجب پھر کچھ کھانے سے گریزاں رہا مگر شاباش تھی راجا مکھن کو جسے رجب نے فضائی میزبان سے کھانے کی ٹرے بھی لیتے دیکھا اور اپنی سیٹ سے ذرا کی ذرا اچک کر آگے دیکھنے پر راجا کو ہمہ تن کھانے میں مصروف بھی پایا۔ رجب منتظر ہی رہا کہ کب راجا کے دوبارہ الٹی کر دینے کی خبر سنائی دے مگر ایسا نہیں ہوا۔ شاید راجا مکھن کا معدہ فضائی سفر کے ہچکولوں کا عادی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سفر لمبا تھا۔ راستے میں جہاز کچھ وقت کو ایک مسلم ملک کے ہوائی اڈے پر رکا۔ رجب علی کے پیٹ میں چوہوں کی دوڑ اپنے عروج پر تھی۔ بھوک برداشت کرنے کا تو وہ عادی تھا مگر برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس نے ایک میزبان خاتون سے پوچھا۔ ''ابھی کتنا سفر اور ہے باجی؟'' خاتون کے جواب نے اسے ہولا دیا۔ ابھی تو آدھا سفر ہوا تھا اور بھوک زوروں پر تھی۔ اپنے دیس میں تو اماں اور آپا تھیں اسے روٹی دینے کو، پردیس میں کون بیٹھا تھا اس کا پیٹ ٹٹولنے کو۔

جہاز کے دوبارہ اڑنے کے بعد کھانے پینے کا دور چلا تو رجب نے ٹرے لے ہی لی۔ ٹرے میں ایک دو چیزیں وہ اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس نے کھانا شروع کیا تو ہاتھ نہیں رکا۔ کھانے کے بعد وہ خاصی دیر دم سادھے الٹی آنے کے خوف میں رہا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

جہاز منزلِ مقصود پر پہنچا تو رجب علی نے دیکھا، راجا مکھن اور خود اس جیسے بھی اور بہت سے برآمد ہوئے تھے جہاز سے۔ کوئی اکیلا، کوئی دکیلا، بھانت بھانت کی بولیاں بولتے، اپنے جسموں پر لنڈا کے جامے چڑھائے..... سادہ لوح، اجڈ اور گنوار جو بہتر معاش کی تلاش اور اچھے دنوں کی چاہ میں اپنی جیبوں پر بار ڈال کر، قرض ادھار لے کر ایسی سرزمین پر آن اترے تھے جس کی نہ ثقافت سے آگاہی تھی انہیں، نہ جس کے اصل باشندوں کی زبان سے واقفیت تھی۔

Scanned with CamScanner

اپنا اپنا رختِ سفر اٹھائے وہ حیرانی سے چٹی چمڑی والی اس قوم کے مرد و زن کو اپنے اردگرد نہایت چابکدستی سے چلتے پھرتے دیکھ رہے تھے جس نے انہیں طویل عرصہ اپنی حاکمیت میں محکوم بنائے رکھا تھا اور ان کی آزادی سے قبل دوسری جنگِ عظیم میں ملکہ عالیہ کی راجدھانی کی بگڑی صورت کی تعمیرِ نو کے لیے اپنے نوآزاد محکوموں کو دعوتِ عام دے رکھی تھی۔ نہ ویزے کا جھنجٹ، نہ زیادہ پوچھ گچھ..... آتے جاؤ..... بلکہ جہاز سے اترنے کے بعد کچھ جیب خرچ بھی..... اور بعد میں روزگار ملنے تک گزارہ الاؤنس بھی۔ محکوموں کے نزدیک تو یہ عیاشی ہی عیاشی تھی۔

رجب علی اور راجا مکھن کے آگے پیچھے ہیتھرو کے ہوائی اڈے پر جہاز سے اترنے والے مسافروں میں اکثریت وطنِ عزیز کے دور دراز علاقوں سے آئی تھی۔ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے، ٹولیوں میں کھڑے وہ گوروں کو دیکھ رہے تھے اور ائرپورٹ سے نکل کر آگے جانے کے لیے باہم صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ بعضوں کے پاس پرچیوں پر ان کی اگلی منزل کا پتا لکھا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر پوچھ پاچھ کر سب وکٹوریہ اسٹیشن جانے کو کوچ میں سوار ہوئے تو رجب علی اور راجا مکھن بھی کوچ میں بیٹھ گئے۔ کوچ میں سفر کا ٹکٹ سرکارِ برطانیہ کی فراہم کردہ رقم سے لیا گیا۔

"تم آگے کہاں جاؤ گے چچا؟" وکٹوریہ اسٹیشن پہنچنے پر رجب نے راجا مکھن سے پوچھا۔

"میڈھے نال منّا!" راجا بولا۔

"چچا! میرے کو تو خود معلوم نہیں، کہاں جانا ہے۔ وہ جو تمہیں ہوائی اڈے پر میرے ساتھ کرنے آئے تھے، انہوں نے بولا تھا..... جاؤ گے تو ڈھونڈنے سے کوئی نہ کوئی راستہ مل جائے گا..... چلو ڈھونڈتے ہیں کوئی راستہ۔"

راجا مکھن نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکالا اور کھول کر رجب کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

"یہ میڈھا سگی اے۔"

"چچا! میرے کو تو پڑھنا نہیں آتا۔" رجب علی قدرے شرمندگی سے بولا۔

راجا نے رجب کے بازو پر ہاتھ مارا اور اپنے ساتھ آنے والوں میں سے ایک نوجوان کو اشارے سے اپنی طرف آنے کا اشارہ دیا۔ وہ آ گیا۔ "جی سر؟"

راجا نے کاغذ اس کے سامنے کر دیا۔ "شاہ اللہ دتّا!" راجا نے زور سے سر ہلایا اور اپنے دانتوں کی نمائش کی۔

ریفری

باکسنگ کا مقابلہ زوروں پر تھا۔ دونوں باکسر ایک دوسرے پر زبردست حملے کر رہے تھے۔ ایک باکسر کی دائیں آنکھ مصنوعی تھی۔ مقابلے کے دوران اس کی وہ مصنوعی آنکھ نکل کر نیچے گر پڑی۔

راؤنڈ ختم ہونے پر ریفری نے وہ آنکھ ڈھونڈ کر باکسر کو دی اور بولا۔ "تمہاری بہادری کی داد دیتا ہوں۔ تم آنکھ نہ ہونے کے باوجود بہادری سے مقابلہ کر رہے ہو۔ اگر خدانخواستہ تمہاری دوسری آنکھ بھی ضائع ہو جائے تو تم کیا کرو گے؟"

کھلاڑی ہنسا اور اطمینان سے بولا۔ "ریفری بن جاؤں گا۔"

(مرسلہ: عاصمہ احمد، سرگودھا)

اثرات

ایک بہت بڑے صنعت کار اور بزنس مین کی بیوی نے ایک روز اپنے وکیل کو طلب کیا اور گلوگیر آواز میں کہا۔ "بہتر ہے آپ مجھے میرے شوہر سے طلاق دلوا دیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ہماری یہ پارٹنرشپ چلتی رہے لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے شوہر کو ایک ایسی کمپنی سمجھ کر اس کے ساتھ شادی کی تھی جس کی ڈائریکٹر میں ہوں گی لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس کے تمام شیئرز تو مارکیٹ میں بکے ہوئے ہیں۔ میرے حصے میں تو صرف چند ہی شیئرز آتے ہیں اور ان کی قیمت بھی بالکل گری ہوئی ہے۔"

(مرسلہ: شاہینہ بتول، لاہور)

پاؤں نہیں سر

جلال الدین ملک شاہ سلجوقی نے عمر خیام کو لکھا۔ "میرے پاؤں میں موچ آ گئی ہے اور میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔ امورِ سلطنت رک گئے ہیں۔ برائے مہربانی کسی اچھے طبیب کا پتا بتایئے۔"

عمر خیام نے بادشاہ کو لکھا۔ "ظلِ الٰہی! آپ امورِ سلطنت سے نمٹنے کے لیے اپنا پاؤں نہیں سر استعمال کریں۔"

(مرسلہ: مہتاب احمد، حیدرآباد)

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

"بریڈفورڈ کا ایڈریس ہے۔" نوجوان نے مزید کہا۔

دفعتاً ایک شخص لپکا ہوا ان تک پہنچا اور اس نے کہا۔ "پاکستان سے آئے ہو؟ کہاں جانا ہے؟" راجا نے وہی کاغذ اس کے سامنے کر دیا۔

"بریڈفورڈ۔" وہ بولا اور اس نے اسٹیشن پر کھڑی ایک ٹرین کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "وہ ٹرین کھڑی ہے۔ ٹکٹ کی کھڑکی بند ہونے والی ہے۔ لاؤ پیسے دو میں ٹکٹ لادوں۔"

راجا نے رجب علی کو دیکھا۔

"جلدی کرو۔" وہ شخص بولا۔ "ورنہ کھڑکی بند ہو جائے گی اور ٹرین نکل جائے گی۔"

نو واردانِ انگلستان میں سے ایک درمیانہ عمر مرد اس شخص کی طرف آیا اور اس سے کہا۔ "بھیا! مجھے بھی ٹکٹ دلادو۔"

"پیسے دو۔" اس نے کہا۔

جتنی دیر میں اس نو وارد نے اپنی جیب سے پیسے نکالے، رجب علی نے کوچ کے ٹکٹ کے بعد جیب میں موجود رقم میں سے کچھ رقم چپکے سے کوٹ کی اندرونی جیب میں منتقل کر لی۔ رونی پانی کا آسرا بھی تو رکھنا تھا۔ پاکستانی رقم یہاں چلتی نہیں دکھتی تھی۔

راجا مکھن نے ٹرین کا ٹکٹ خریدنے کے لیے رجب کی اعانت سے ناامید ہو کر جیب میں پڑی برطانوی کرنسی اس شخص کے سامنے کر دی۔ اس نے کچھ رقم لی، باقی راجا کو واپس کر دی پھر رجب کی طرف متوجہ ہوا۔ رجب نے کوٹ کی جیب سے رقم نکال کر اس کے سامنے کر دی۔

"یہ تو کم ہے۔" اس نے کہا۔

"بھائی صاحب! میرے پاس تو یہی ہے۔"

"پانچ پونڈز ملے ہوں گے تمہیں جہاز سے اترنے کے بعد۔" اس شخص نے کہا۔

"ادھر اسٹیشن آتے ہوئے باقی پیسے گاڑی میں گر گئے۔" رجب مسکینی سے بولا۔

"تم نہیں جا سکتے۔" وہ شخص بولا تو رجب سے زیادہ راجا چونکا۔

رجب علی شش و پنج میں پڑ گیا۔ ایک بار جھوٹ بولنے کے بعد کوٹ کی اندرونی جیب سے پیسے نکالنا اسے شرمندگی اور ذلت سے دوچار کر سکتا تھا۔

"رجب لاؤ، باقی پیسے میں اپنی طرف سے ڈال دیتا ہوں۔" وہی شخص خود ہی مہربان ہوا۔

رجب علی کی جان میں جان آئی۔ راجا مکھن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "مٹا اتوں مینڈھے نال رہنا۔"

ٹکٹ آ گئے۔ رجب علی، راجا مکھن اور ان کے ساتھ بعض اور نو واردان بھی ٹکٹ خرید کر دینے اور ٹرین میں بٹھانے والے شخص کو دعائیں دیتے ٹرین میں سوار ہو گئے۔ کوئی اس شخص کو فرشتہ قرار دے رہا تھا، کوئی کہہ رہا تھا بڑا اچھا بندہ ہے۔ نہایت گرمجوشی سے ہاں میں ہاں ملائی جا رہی تھی۔ اس شخص کو غائبانہ دعائیں دی جا رہی تھیں [illegible]

بعد میں عقدہ کھلا کہ ان دنوں انگلستان میں بعض ہم وطن ٹھگ اپنے ہی سادہ لوح ہم وطن نو واردانِ انگلستان کو راہنمائی کی آڑ میں لوٹنے کے لیے اسی طرح سرگرم تھے۔ ٹکٹ کی دگنی قیمت وصول کر کے وہ شخص اپنی دہاڑی لگا گیا تھا مگر رجب علی اپنی ناتجربہ کاری کے باوجود لٹنے سے بچ گیا تھا۔ شاید ہزاروں میل دور بیٹھی ماں کی دعاؤں کی بدولت۔

☆☆☆

ٹرین میں سفر کرتے ہوئے رجب علی بیشتر وقت ٹرین کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ وہ حیران بھی تھا، مایوس بھی۔ یہ تھا لندن جس کی اتنی کہانیاں مشہور تھیں۔ سوختہ لندن! اکثر عمارتوں پر سیاہی پھری تھی۔ لندن سے اچھا تو اس کا اپنا کراچی تھا..... عروس البلاد..... شہروں کی دلہن..... جہاں دن چمکتے تھے اور راتیں جگمگاتی تھیں۔ سمندر کے رخ سے آنے والی ٹھنڈی ہوائیں ماں کی لوری کی طرح سلا دیتی تھیں۔ ٹرین میں سفر کرتے ہوئے گھر والوں کی یاد نے اس کی آنکھیں بھگو دیں۔ جہاز میں کھائے پیے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ پیٹ میں چوہوں کی میراتھن دوڑ شروع تھی۔

ٹرین کا سفر بھی تمام ہوا۔ رجب علی اور راجا مکھن دونوں لنگڑے اور اندھے کی کہانی کی طرح ایک دوسرے کا سہارا بنے اور راجا کے کوٹ سے مستقلاً اس کے ہاتھ میں منتقل ہوئے "نسخۂ شفا" کو بار بار راہگیروں کو دکھاتے، گوروں کی زبان کو اپنے سروں پر سے گزارتے، بعض ہم وطن، ہم زبان راہنماؤں سے راستہ سمجھتے، بھولتے بھٹکتے بالآخر راجا کے سگے شاہ اللہ دتا تک پہنچ گئے۔ دونوں کی "بھیں" کافی دیر بعد کھلی۔ راجا نے شاہ سے رجب کا تعارف کرایا۔

شاہ اللہ دتا کو انگلستان آئے تقریباً پانچ برس ہو گئے تھے۔ پاکستانی تارکِ وطن اور راجا مکھن کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ اس نے دو منزلہ مکان خرید کر اس میں کئی کرایہ دار رکھے ہوئے تھے جو سنہری دنوں کی چاہ میں اپنا

Scanned with CamScanner

digest library.com

گھر، اپنے لوگ اور اپنا وطن چھوڑ کر دیارِ غیر میں آبسے تھے۔ ان میں مسلمان بھی تھے، ہندو اور سکھ بھی۔ کوئی پاکستان سے آیا تھا، کوئی بھارت سے تو کوئی برما سے۔ شاہ اللہ دتا نے پاکستان سے آئے اپنے ایک بھتیجے اقبال شاہ کو اپنے گھر کا کیئر ٹیکر بنا رکھا تھا۔

شاہ اللہ دتا خود فیکٹری ورکر تھا۔ اپنا گھر خرید کر کرائے دار رکھنے سے اسے معقول آمدن ہو جاتی۔ اس کا بھتیجا گھر اور کرائے داروں کے معاملات کا نگران تھا۔ راجا مکھن کو گھر کے دروازے پر اقبال شاہ نے ہی ریسیو کیا تھا۔ اسے دیکھ کر گرمجوشی کا اظہار کیا تھا اور رجب علی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔

اس گھر کے اندر بڑا حبس زدہ ماحول تھا۔ ایک ایک کمرے میں کئی کئی مکین فرش پر بچھے گدوں پر ملگجے بچھونے اور ان بچھونوں پر لیٹے، بیٹھے جوان، ادھیڑ عمر اور بوڑھے مرد۔ سگریٹ کی بو اور گھر سے باہر یخ بستہ شام۔ گھر میں موجود افراد نے راجا مکھن اور رجب علی سے فرداً فرداً علیک سلیک کی، حال چال پوچھا، سیاق وسباق دریافت کیا۔ کہاں سے آئے ہو، پیچھے کون کون ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اقبال شاہ نے دونوں کو چائے دی پھر کھانے کا بندوبست کرنے لگا۔ شاہ اللہ دتا نے بتایا، اس گھر میں نئے آنے والوں کو پہلی روٹی ان کی ضیافت کے طور پر دیے جانے کی روایت تھی اور اس دعوت میں سب شریک ہوتے تھے۔ کھانا پکانے کی باری مقرر تھی۔ دو افراد مل کر باقی سب کے لیے کھانا پکاتے، اقبال شاہ نگرانی کرتا۔

کھانے کا بندوبست کرتے ہوئے اقبال شاہ نے فرداً فرداً ہر شخص سے پوچھا۔ "کسی کنی ٹاپاں کھاسو؟"

رجب علی کی باری آئی تو وہ ہونقوں کی طرح اقبال شاہ کا منہ دیکھنے لگا پھر محجوب ہو کر بولا۔ "ٹاپاں اوہ کیا ہوتا ہے؟"

اقبال شاہ اور اس کے ساتھ بعض دوسرے بھی ہنس دیے۔

"سرکار روٹیاں..... کتنی روٹی کھاؤ گے؟"

رجب اپنی ناہی پر جھینپ کر بولا۔ "دو۔"

اقبال شاہ نے کہا۔ "پوچھ کر اس لیے بتاتا ہوں کہ روٹی ضائع نہ ہو۔"

"اس روٹی کے لیے ہی تو ہم اپنوں سے دور پردیس میں آپڑے ہیں۔" ایک نوجوان بولا۔

رجب علی نے چونک کر اس کی طرف نگاہ کی۔ اس کی زبان اور لہجے سے رجب کو آشنائی کا احساس ہوا۔ نوجوان مسکرا دیا۔ "میرا نام جلیل ہے، میں بھی کراچی سے آیا ہوں۔ کھارادر میں ہے ہمارا گھر۔"

"یہ اپنا نام جلیل بتاتا ہے پر ہم لوگ اس کو ڈلیل بولتا ہے۔" کمرے میں موجود افراد میں سے ایک نے کہا اور زور سے ہنسا۔ چند اور بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئے۔ جلیل کچھ شرمسار ہو گیا۔

"اسلام کہتا ہے لوگوں کو الٹے سیدھے ناموں سے پکار کر ان کا مذاق مت اڑاؤ۔ ہو سکتا ہے تم جن کا مذاق اڑا رہے ہو وہ تم سے بہتر ہوں۔" کونے میں بیٹھے ایک شخص نے کہا۔

"چھوڑو مولوی محبوب!" جلیل کا مذاق اڑانے والا شخص اپنی حرکت پر نادم ہونے کے بجائے بے باک ہوا۔

کھانے میں پتلے شوربے والا مرغی کا سالن اور بڑی بڑی روٹیاں تھیں۔ سب ایک ساتھ کھانے کو بیٹھے۔ شاہ اللہ دتا نے راجا مکھن اور رجب کو اپنے نزدیک بٹھا کر تعظیم دی۔ رجب نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا شوربا ڈالا اور چنگیر سے روٹی اٹھائی۔ راجا نے کھانے سے پورا انصاف کرنے کی کوشش کی۔ روٹی کے بڑے بڑے نوالوں سے بوٹیاں توڑتے اور شوربے میں ڈبوتے ہوئے اس نے سالن کا ڈونگا رجب کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "ہڈی چاکھن..... ہڈی چاکھن۔"

رجب علی ڈونگے میں چمچ چلاتے ہوئے پتلے شوربے میں مرغی کی بوٹیوں کو اِدھر اُدھر ہٹا کر راجا مکھن کو دل ہی دل میں برا بھلا کہنے لگا جو خود تو بوٹیاں ٹھونس رہا تھا اور اسے ہڈی لینے کو کہہ رہا تھا۔

"چچا! ہڈی تو کوئی ہے نہیں اس میں۔" رجب شوربے میں ہڈی کی تلاش سے مایوس ہو کر بولا۔

اقبال شاہ ہنس دیا۔ "سیدھے بادشاہ! مکھن چاچا ہمارے علاقے کا ہے، ہماری زبان میں بوٹی کو ہڈی بولتے ہیں۔"

رجب علی نے شوربے سے ایک بوٹی اپنی پلیٹ میں ڈال لی۔ عجب تھے یہ لوگ۔ بوٹی کو ہڈی بولتے تھے، ہڈی کو کیا بولتے ہوں گے۔

کھانے کے بعد سونے کا وقت آیا تو راجا مکھن کو شاہ اللہ دتا اپنے کمرے میں لے گیا۔ رجب علی کو ایک بوسیدہ گدے اور انسانی جسم کی بساند میں بسے ایک کمبل میں اس شخص کے ساتھ جگہ ملی جسے جلیل نامی شخص کا مذاق اڑانے والے آدمی نے مولوی محبوب کہا تھا۔ وہ ایک گورا چٹا، کلین شیو نوجوان تھا۔ رجب علی سے دھیمی آواز میں بات کرتے

Scanned with CamScanner

ہوئے اس نے بتایا کہ وہ کراچی کے علاقے ناظم آباد سے آیا تھا۔ پڑھا لکھا تھا، کراچی کے ایک بینک میں ملازمت کررہا تھا لیکن بہتر معاش کی خاطر انگلستان آگیا تھا۔ اب سرکارِ برطانیہ کے گزارہ الاؤنس پر گزارہ کررہا تھا۔

رات سرد تھی۔ نیچے گدا اور اوپر کمبل ہونے کے باوجود رجب علی رات بھر سردی سے ٹھٹھرتا رہا۔ صبح جاگا تو گھر میں چند نئی صورتیں دیکھیں۔ پتا چلا یہ وہ لوگ تھے جو رات کو کام کرنے کے بعد صبح واپس لوٹے تھے۔ صبح چائے کے وقت اقبال شاہ نے اسے اس گھر میں اپنا قیام وطعام جاری رکھنے کی شرائط سے بنا تکلف آگاہ کیا۔ اس گھر میں مقیم رہنے کی صورت میں اسے قیام کی سہولت حاصل کرنے کا کرایہ بھی ادا کرنا تھا اور کھانے پینے کے اخراجات بھی دینا تھے، نیز اپنی باری آنے پر گھر کی صفائی ستھرائی اور کھانا پکانے میں بھی حصہ بٹانا تھا۔

''جس دن تمہاری باری ہوگی، تم اور تمہارے ساتھ ایک اور بندہ مل کر گھر کی صفائی کروگے اور کھانا پکانے کی باری والے دن دونوں بندے سارے لوگوں کے لیے روٹی سالن پکاؤ گے۔ روٹی پکانی آتی ہے؟'' رجب نے نفی میں سر ہلایا۔

''کوئی بات نہیں، سیکھ لوگے۔ تمہارا ساتھی بندہ سکھادے گا۔ یہاں سب کو روٹی بنانی پڑتی ہے۔'' اقبال شاہ نے کہا۔

مالک مکان شاہ اللہ دتا اور کیئر ٹیکر اقبال شاہ کے علاوہ اس گھر میں راجا محسن اور خود اس سمیت اٹھارہ مرد تھے۔ اس کا مطلب تھا، اپنی باری آنے پر رجب علی کو ایک اور بندے کے ساتھ مل کر اٹھارہ افراد کے لیے سالن اور ''ناپاں'' پکانی تھیں مگر اس سے بڑا اور گمبھیر مسئلہ یہ تھا کہ اس گھر میں قیام وطعام کے اخراجات وہ روزگار ملنے تک کیسے ادا کرے گا۔ اقبال شاہ نے اس کی یہ فکر یہ بتا کر رفع کردی کہ حکومتِ برطانیہ اپنی مملکت کے ہر بیروزگار شخص کو روزگار ملنے تک ہفتہ وار گزارہ الاؤنس دیتی ہے جسے ''ڈول منی'' کہا جاتا ہے اور ڈول منی سے ایک بیروزگار آدمی کا اچھا خاصا گزارہ ہوجاتا ہے۔

رجب علی کو اقبال شاہ کی بات سے قدرے اطمینان تو ہوا مگر خوشی نہ ہوئی۔ وہ یہاں گزارہ کرنے تھوڑی آیا تھا۔ گزارہ تو پاکستان میں بھی جوں توں ہو ہی رہا تھا۔ اپنے لوگوں اور اپنی زمین سے دور وہ پیسا کمانے اور بہتر مستقبل کی چاہ میں آیا تھا۔ اسے اپنے اور ماں کے لیے اچھا گھر بنانا تھا، ماں کو حج کرانا تھا۔ بھائیوں کی روز روز کی جھک جھک سے نجات تو مل گئی تھی، اب ان کے ساتھ کھڑے ہونے کے قابل بننا تھا۔ مہرن سے شادی کے لیے اس کے گہنے بنانا تھے۔ ریحانہ کی شادی کرنا تھی اور آپا کے احسانوں کا بدلہ اتارنے کے لیے انہیں بھی کچھ دینا دلانا تھا..... اور وطن میں اپنے لیے کوئی باعزت روزگار بھی جمانا تھا۔ شادی کے بعد وہ مہرن کو چھوڑ کر پردیس میں تھوڑی پڑا رہے گا۔ اتنی بہت سی ذمے داریاں تھیں، ڈول منی سے کیا کام چلتا تھا۔ پیسا کمانے کے لیے روزگار تلاش کرنا ضروری تھا۔

☆☆☆

لندن کے بارے میں وطن میں سنی گئی ساری باتیں دور کے ڈھول سہانے ثابت ہوئیں۔ نہ لندن کی سڑکیں شیشے کی تھیں، نہ سڑکوں پر ٹوٹ اور سکے بکھرے پڑے تھے۔ وہ جہاں جاتا، جنگ سے متاثرہ سوختہ عمارتیں دیکھتا، البتہ مقامی لوگ سرخ وسپید تھے۔ گوری گوری، گلابی گلابی حسینائیں جو سارا وقت گھٹ پٹ چلتی رہتیں۔ گدڑے گڑیوں کے سے بچے، بیگ اٹھائے اور بچوں کی طرح چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بوڑھی عورتیں اور انہی کی طرح قدم گنتے بڈھے..... مگر بوڑھے مرد وزن کی سست رفتاری کے علاوہ باقی سب کچھ تیز رفتار تھا۔ صبح سے شام تک بھاگتی دوڑتی زندگی بلکہ تیز رفتار ترقی کے لیے راتیں بھی جاگتی تھیں۔

رجب علی دوسرے ہی دن کام کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ دشت نوردی کی عادت تو پرانی تھی، میلوں پیدل چلتا جاتا۔ انگریزی زبان سے نابلد ہونے کے باعث مقامی لوگوں سے اشاروں میں کام چلانا پڑتا۔ ہم زبان بھی اکثر مل جاتے۔ ان سے بات کرکے خوشی ہوتی اور راہنمائی بھی مل جاتی۔ چند دن میں اقبال شاہ، جلیل اور محبوب صاحب سے بھی قدرے بے تکلفی ہوگئی۔ اقبال شاہ کا مزاج دوستانہ تھا۔ جلیل سادہ اور مفاہمت پسند تھا۔ محبوب کی شخصیت میں وقار تھا۔ رجب علی اس کے نام کے ساتھ صاحب کا لاحقہ لگانا ضروری سمجھتا۔

رجب علی نے ایک روز اقبال شاہ سے پوچھا۔

''اقبال بھائی! کیا اس شہر کو کبھی آگ لگی تھی؟''

''نہیں..... کیوں؟'' اقبال شاہ نے اس کے سوال کا جواب نفی میں دیا پھر اس سوال کا سبب پوچھا۔

''گھر، فیکٹریاں، دفتر، جہاں جاتا ہوں، دیواریں باہر سے کالی دکھائی دیتی ہیں جیسے انہیں آگ لگی ہو۔''

Scanned with CamScanner

digest library.com

"نہیں سنی! میں نے تو نہیں سنا کہ یہاں کبھی آگ لگی ہو، پر یہ ضرور سنا ہے کہ گوروں نے کئی سال جنگ لڑی ہے۔"

"کس سے؟"

"سالوں کی..... جس سے بھی لڑی ہو، پر اس جنگ میں بہت لوگ مرے اور کافی تباہی ہوئی۔"

"میں نے تو سنا تھا اِدھر سڑکیں شیشے کی ہوتی ہیں اور سڑکوں پر اتنا پیسا پڑا ہوتا ہے کہ جتنا جی چاہے اٹھالو۔" اقبال شاہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "بھولے بادشاہ! یہ جھوٹی سچی کہانیاں سن کر ہی تو ہم ماں کے ہاتھ کی روٹی چھوڑ کر پردیسی بن جاتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے ناپاں؟"

"ہاں جی..... کسی صحیح ارشاد فرمایا..... ناپاں۔"

"میں تو سمجھا تھا ناپاں انگریزی کھانا ہوتا ہوگا۔"

"تہاڈی سمجھ بلے بلے۔"

ناپاں!

رجب علی کو ماں یاد آئی۔ مٹی کے چولہے کے پہلو میں بیٹھی اور روئی سینکتی ماں۔ روئی سینکتی تو روٹی پوری کی طرح پھولتی اور روئی کی خوشبو گھر بھر میں پھیل جاتی۔ ماں جیسی روئی شاید آپا بھی نہ پکا سکتی تھی۔ دہکتے چولہے کے نزدیک بیٹھ کر ماں کے ہاتھ کی سینکی روئی پر ترکاری، اچار اور یہ بھی نہ سہی تو پیاز سے کھانا رجب علی کے لیے عیاشی سے کم نہ تھا۔

شاہ کے گھر میں مقیم افراد سے رجب علی کو "ڈول منی" لینے کا طریقہ کار معلوم ہوگیا۔ کام ملنے تک اسی پر گزارہ کرنا تھا۔ جس دن اس کی گھر داری کی ڈیوٹی نہ ہوتی، وہ صبح ہی کام کی تلاش میں گھر سے نکل جاتا۔ کبھی جیلیں، کبھی محبوب صاحب، کبھی دونوں اور کبھی کوئی اور بھی اس کے ساتھ ہوتا۔ ساتھ جانے والے کبھی اس کا ساتھ چھوڑ کر راستہ بدل لیتے، کبھی ہمت ہار کر بیٹھ جاتے، کبھی تھک کر پلٹ جاتے مگر وہ نہ ہمت ہارتا، نہ تھکتا۔ چلتا ہی جاتا۔ فیکٹریاں، فاؤنڈریاں، اسپتال، دفاتر کہیں تو کام ملنا تھا۔ یس، نو، سوری، پلیز، تھینک یو، ایکسکیوزمی یہ چند الفاظ تھے جو وہ اب تک سیکھ پایا تھا۔ جہاں جاتا، مقامی زبان سے ناآشنائی اور کسی مہارت سے ناواقفیت اس کے آڑے آتی۔ پیدل چل چل کر اس کی ٹانگیں دکھ جاتیں اور پاؤں شل ہوجاتے۔ اپنی قیام گاہ پر واپس پہنچتا تو ڈول منی پر تکیہ کرنے والے لمبی تان کر خراٹے بھر رہے ہوتے یا تاش کی بازی جمی ہوتی اور سگریٹ کے کش پر کش لگائے جارہے ہوتے۔ ٹیپ ریکارڈر پر کوئی فلمی گیت لگا ہوتا تاہم بعض کام سے لگے ہوئے تھے اور چند اس کی طرح کام ڈھونڈ رہے تھے۔

ایک شام وہ دن بھر کام کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد واپس لوٹا تو ڈول منی پر تکیہ کرکے بیٹھے ایک شخص نے اس سے کہا۔ "تو ملکہ کا داماد ہے پھر کیوں پریشان پھرتا ہے۔"

"کیا مطلب!" رجب علی نے حیران ہوکر اسے دیکھا۔

"ڈول منی مل رہی ہے، شاہ جی کو کرایہ مل جاتا ہے، اپنا کھانا پینا ہوجاتا ہے، سگریٹ مل جاتی ہے۔ کام کے لیے بیوقوف پریشان ہوتا ہے۔"

رجب علی کو آپا یاد آئی۔ وہی ایسی باتیں سمجھاتی تھی اسے۔

"میری بہن کہتی تھیں جو مزہ اپنے بازوؤں سے کمانے میں ہے، وہ دوسرے سے لے کر کھانے میں نہیں۔"

رجب علی کا مخاطب زور سے ہنسا اور بولا۔

"اسٹوپڈ!"

"کیا کہا؟" رجب علی نے اسے ٹیڑھی نظر سے دیکھا۔

"تجھے بیوقوف کہہ رہا ہے۔" جلیل بولا۔

"ہُن حرام کو ایسا ہی دکھتا ہے۔"

اس شخص نے اٹھ کر رجب علی کا گریبان پکڑ لیا۔ کمرے میں موجود دیگر افراد نے دونوں کا بیچ بچاؤ کرایا۔

رجب علی کو راجا کھن کے بارے میں یہ تو معلوم ہوچکا تھا کہ وہ اچھا خاصا جائی تھا مگر شاہ کے گھر میں تنور کی عدم دستیابی کے باعث رجب اس کی مہارت کا ذائقہ چکھنے سے محروم تھا۔ ساؤتھ آل سے راجا کا ایک رشتے دار جو ساؤتھ آل میں دیسی کھانوں کا ہوٹل چلا رہا تھا، شاہ کے گھر آیا اور راجا کو اپنے ہوٹل کے تنور پر کام کرنے کے لیے لے گیا۔ رجب کو راجا کے مقدر پر رشک آیا، گھر بیٹھے نوکری مل گئی تھی اسے۔ سچ ہے بندے کو کوئی مہارت، کوئی ہنر ضرور آنا چاہیے۔

☆☆☆

رجب علی کو گھر سے پردیس آئے کافی دن ہوگئے تھے۔ نہ اسے گھر والوں کی کوئی خیر خبر تھی نہ انہیں اس کے روز و شب کا کچھ علم۔ شاہ کے گھر میں موجود کرائے داروں کے گھر سے خطوط آتے دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ اس وقت کے لیے کچھ لکھ پڑھ لیا ہوتا تو کام آتا۔ ریحانہ تنگ دل کہ اس نے بڑی بہنوں کی طرح ناکارہ مردوں سے شادی کرکے اپنی زندگی کو مشکل بنانے کے بجائے پڑھنا شروع کردیا تھا۔

گھر والوں کو اپنی خیریت سے مطلع کرنے کے لیے وہ پوسٹ آفس سے ایک ایروگرام خرید لایا اور عاجزانہ لہجے

Scanned with CamScanner

میں محبوب صاحب سے کہا۔ ''میرے گھر والوں کو خط لکھ دیں گے؟''

''ہاں، ہاں..... کیوں نہیں۔'' محبوب صاحب نے کہا۔ رجب کا اٹھنا بیٹھنا، تمیز، شرافت اور روزگار کے لیے اس کی مستقل دھن سے محبوب صاحب متاثر ہو چکے تھے۔

خط لکھنے کے لیے علیحدہ کاغذ کی حاجت نہ تھی۔ ایروگرام مکتوب لکھنے اور لفافہ دونوں کا کام کرتا تھا۔ رجب علی نے اماں اور آپا دونوں کے نام مشترکہ خط لکھوایا، اپنی خیر و عافیت کی خبر دی اور امید بندھائی کہ جلد ہی کام مل جائے گا۔ آخر میں سب بہن بھائیوں اور بھابیوں کو سلام اور ان کے بچوں کو پیار لکھوایا۔ اہلِ محلہ کو درجہ بدرجہ سلام۔

خط ارسال کرنے کے بعد رجب مطمئن ہو گیا کہ خط آدھی ملاقات ہوتی ہے۔ اب اسے جوابی خط کا انتظار تھا۔

رجب علی کو روزگار کی تلاش میں سرگرداں دیکھ کر باروزگار ساتھیوں میں سے ایک نے ایک دن اسے پندرہ پونڈ زنی ہفتہ جاب کی نوید سنائی اور پوچھا۔ ''کرو گے؟''

رجب علی جسے فی الحال سرکار کی جانب سے ملنے والی دو پونڈ ز سترہ شلنگ ڈول منی بھی خدا کی غیبی مدد محسوس ہوتی تھی، پندرہ پونڈز ہفتہ کی جاب کا سن کر کھل اٹھا۔ ''ہاں، ہاں..... کیوں نہیں..... کروں گا..... کہاں ہے جاب؟''

بتانے والے نے کہا۔ ''قبرستان میں قبریں کھودنے کی جاب ہے۔''

رجب علی کو موت اور مردوں سے بہت خوف آتا تھا۔ بستی میں کوئی مرجاتا تو وہ خبر سنتے ہی اماں یا آپا کے کمرے میں بیٹھ جاتا۔ جس گھر میں موت ہوتی، دنوں اس گلی کا رخ نہ کرتا۔ قبرستان جانے کے نام سے بھی اسے خوف آتا تھا۔ جاب کی نوعیت سن کر اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور خوشی کافور ہو گئی۔ ''نہیں انکل..... اپندر پونڈز ہوں یا بیس پونڈز، یہ جاب میں نہیں کر سکتا۔''

شاہ جی کے گھر میں رجب علی ایک کمرے میں مزید چار کرائے داروں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اس رات جب وہ کمرے کے فرش پر پہلو بہ پہلو بچھے پانچ بستروں میں اپنے لیے مخصوص بستر میں سونے کو لیٹا تو روزانہ کی طرح گھر اور گھر والوں کی یاد اس کے دل میں اتر آئی۔ تادیر کروٹیں بدلتا رہا پھر نیند آ گئی۔ رات کے کسی پہر آنکھ کھلی تو روزانہ کی طرح کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ایک ساتھی لیکٹری میں نائٹ ڈیوٹی پر تھا، باقی تین گہری نیند میں تھے۔ کمرے میں پھیلی تاریکی میں کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔

اس تاریکی میں اپنی نگاہ دوڑاتے ہوئے رجب کے دل میں ایک عجیب سا خیال سرایت کر گیا۔ 'یہ کمرا بھی تو ایک قبر ہی ہے جس میں اس وقت ہم چار مردے لیٹے ہیں۔' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ 'یار! زندہ ہوتے ہوئے بھی قبر کی طرح تنگ اور اندھیرے کمرے میں لیٹ کر کسی اور جاب کا انتظار کرنے سے قبریں کھودنے کا کام ہی بہتر۔' اس نے سوچا۔

صبح اٹھ کر اس نے جاب بتانے والے ساتھی سے کہا۔ ''انکل! آپ نے جو جاب بتائی ہے، میں کروں گا۔''

''تمہیں کیتھلی جانا ہوگا۔ وہاں چرچ کے پادری سے ملنا، وہی جاب دے گا۔''

''او کے۔'' رجب علی نے یہ کہنا بھی سیکھ لیا تھا۔

اپنے اسی ساتھی سے کیتھلی جانے اور چرچ کا پتا سمجھنے کے بعد رجب اسی روز کیتھلی پہنچا۔ شام ہو چکی تھی، قبرستان میں ہیبت ناک ہیئت والا ایک آدمی گھومتا دکھائی دیا۔ اس نے رجب علی کو دیکھ کر اپنی گرجدار آواز میں کچھ کہا۔ اس کی بات رجب کے سر سے گزر گئی۔

''جاب..... جاب!'' رجب علی نے اسے اشارے سے سمجھایا کہ وہ گورکن کی جاب کے لیے آیا تھا۔ اس شخص نے قبرستان کے احاطے ہی میں ایک عمارت کی طرف اشارہ کر کے سمجھایا کہ جاب کے لیے اسے وہاں جانا ہوگا۔

قبرستان کے سناٹے میں ہر گام پر تیز ہوتی دل کی دھڑکن کو لگام دینے کی کوشش کرتے ہوئے رجب اس عمارت تک پہنچا۔ باہر ستون پر لگی گھنٹی بجائی تو پہلے کتا زور سے بھونکا پھر دروازہ کھلا اور ایک دیوقامت شخص باہر نکلا اور اس نے اپنی رعب دار شخصیت کے برعکس نرم لہجے میں کچھ کہا جو رجب سمجھ نہ پایا، البتہ اس نے اپنا مدعا کچھ اشارے اور کچھ زبان سے بیان کر دیا۔ ''جاب..... جاب!''

اپنے مخاطب کو مقامی زبان سے ناآگاہ دیکھ کر پادری نے کہا ''سوری'' پھر اشاروں کی زبان میں بتایا کہ جس جاب کے لیے وہ آیا تھا، وہ پہلے ہی کسی اور کو دے دی گئی تھی۔

رجب علی مایوس واپس لوٹا، تاہم اس تجربے نے قبرستان سے اس کا خوف رفع کر دیا۔ کیسا ستھرا، منظم اور سرسبز تھا گوروں کا قبرستان جہاں بیٹھ کر سستانے کو جی چاہے۔

جلیل نے رجب علی کو بتایا کہ وہ اور محبوب صاحب کسی اور گھر میں شفٹ ہونے جا رہے تھے جہاں کرایہ تو شاہ جی کے گھر سے کچھ زیادہ تھا مگر فرشی بستر کے بجائے بیڈ کی سہولت میسر تھی اور ''لبر'' کے لیے ٹاپاں پکانے کی ڈیوٹی سے

Scanned with CamScanner

بھی فراغت تھی۔ کرائے دار اپنے طعام کا آپ ذمے دار تھا۔ جلیل اور محبوب صاحب دونوں ہی اس کی طرح عروس البلاد کراچی سے آئے تھے، ہم زبان تھے۔ دونوں سے مدہب کی اچھی بن گئی تھی۔ اس نے ان سے کہا۔ "اگر اس گھر میں ایک اور کرائے دار کی گنجائش ہو تو میں بھی آپ کے ساتھ وہیں چلتا ہوں۔"

جگہ تھی سو رجب علی بھی ان کے ساتھ اسی گھر میں شفٹ ہو گیا۔ ٹاپاں پکانے سے نجات ملی۔ گھر کشادہ تھا اور شاہ جی کے گھر میں بسی انسانی جسم کی بو سے پاک۔ کرائے داروں کو سنگل بیڈ کی سہولت بھی دستیاب تھی۔ کھانے پینے کا بندوبست خود کرنے میں کفایت کا پہلو بھی تھا۔ شاہ جی کے گھر کی طرح نہیں کہ کھاؤ یا نہ کھاؤ، پسند آئے یا نہ آئے، پیسے دینا لازم۔

اس گھر میں ان تینوں سمیت کل چھ کرائے دار تھے۔ ایک نوجوان جوڑا اور چار مرد۔ گھر کی مالکہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی جو نچلی منزل پر رہتی تھی۔ اوپر تین کمروں میں سے ایک کمرا نوجوان میاں بیوی کے پاس، باقی دو کمروں میں دو دو کرائے دار بٹے ہوئے تھے۔ رجب اور جلیل ایک کمرے میں منتقل ہوئے، محبوب صاحب دوسرے کمرے میں چلے گئے تاہم ان کا زیادہ وقت انہی دونوں کے ساتھ گزرتا۔ محبوب صاحب ایک فاؤنڈری میں ملازمت کر رہے تھے۔ جلیل بقول خود ملکہ کا وظیفہ خوار تھا۔ وظیفہ خوار تو رجب علی بھی تھا مگر جلیل کی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے کے بجائے وہ مسلسل کام کی تلاش میں تھا۔ دو پونڈز سترہ شلنگ ڈول منی اس کی منزل نہیں تھی۔ وہ تو یہاں پیسا کمانے آیا تھا۔ خوب سارا، ڈھیر سارا پیسا۔ ڈول منی سے دس شلنگ گھر کا کرایہ نکل جاتا، تقریباً ایک پونڈ کھانے پینے پر خرچ ہوتا، ایک پونڈ روزگار کی تلاش میں بس یا ٹرین کے کرائے پر۔ بقیہ سات شلنگ بلکہ کبھی کبھی جوڑ توڑ کر کے وہ سات کے بجائے دس شلنگ بھی بچا لیتا۔ پانچ شلنگ ماں کو بھیجتا اور پانچ آپا کو وہ قرضہ اتارنے کے لیے جو آپا نے اس کے پردیس جانے کے لیے ادھر ادھر سے لے رکھا تھا۔

گھر والوں سے اس کے رابطے کا واحد ذریعہ خط تھا جو صبر آزما انتظار کے بعد گھر والوں کی طرف سے جواب لاتا۔ خط ریحانہ لکھتی تھی۔ رجب سوچتا، وہ بھی کچھ پڑھ لکھ جاتا تو خط لکھوانے کے لیے اسے محبوب صاحب کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔ جلیل میٹرک پاس تھا۔ رجب نے اس سے پڑھنا لکھنا شروع کر دیا تاکہ گھر والوں کو خط لکھنے کے لائق تو ہو جائے مگر پڑھنا لکھنا کوئی جادو کی چھڑی تھوڑی تھی کہ جلیل گھماتا اور وہ خط لکھنے کے لائق ہو جاتا، تاہم ابتدا تو ہوئی۔ الف، ب، پ سے وہ دو اور سہ حرفی الفاظ کی مشق پر آ گیا۔ خط لکھنے کے لائق ہونے کے لیے لکھائی کی مشق بھی شروع ہو گئی۔ انگریزی بول چال سمجھنے کی استعداد صفر تھی۔ خود انگریزی بولنا انگلیوں پر گنے الفاظ تک محدود تھا۔ اشاروں کی زبان سے کام چلاتا مگر زبان دانی کی رکاوٹ اس کی ہمت کے آڑے نہ آئی۔ روزانہ کام کی تلاش میں نکل جاتا۔

جلیل اکثر کہتا۔ "تو پاگل ہے جو کام ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ مجھے دیکھ، ڈول منی سے گھر کا کرایہ بھی دیتا ہوں، کھاتا پیتا بھی ہوں، کبھی کبھار سینما بھی چلا جاتا ہوں۔" جلیل سے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3000 روپے

بیرونِ ممالک کے لیے زرِ سالانہ 50,000 روپے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ

مرزا اکمر عباس

0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

digestlibrary.com

Scanned with CamScanner

چونکہ استادی کا رشتہ قائم ہو چکا تھا، رجب علی اس سے کسی بحث میں نہ الجھتا۔

گھر کے دوسرے کمرے میں محبوب صاحب پڑوسی ملک سے آئے شخص پرکاش کے ساتھ مقیم تھے۔ پرکاش بھی ڈول منی پر بیٹھا تھا، کبھی کام کی تلاش میں بھی نکل جاتا۔ ایک روز وہ بھی رجب علی کے ساتھ ہولیا۔ حالات اس کے بھی تقریباً وہی تھے جو رجب علی کے۔ انگریزی سے نابلد اور کوئی مہارت صفر۔ دونوں پا پیادہ دیر تک ل ایریا میں دروازے جھانکتے پھرے، کام نہ ملا۔

رجب اور گھومتا مگر پرکاش ہمت ہار گیا اور بولا۔

"بابا! بہت ہمت ہے تمہاری، میں تو تھک گیا ہوں۔ باقی راستہ بس میں چلتے ہیں۔"

رجب علی کو آئس کریم والا نظر آیا۔ اس کا دل للچا گیا۔

"ایک کام کرتے ہیں، بس سے گھر جانے کے بجائے آئس کریم کھاتے ہیں اور پیدل گھر جاتے ہیں۔"

"میرا پاؤں دکھتا ہے یار!" پرکاش بولا۔

"ٹھنڈی ٹھنڈی آئس کریم..... کھاتے جائیں گے، باتیں کرتے جائیں گے..... گھر پہنچ جائیں گے۔" رجب علی نے اسے للچانے کو کہا۔

"چل لیتے ہیں۔" پرکاش راضی ہو گیا۔

دونوں نے آئس کریم لی اور آئس کریم کھاتے چلنے لگے۔ رجب علی لمبے لمبے ڈگ بھرتا، پرکاش ٹھہر ٹھہر کر چل رہا تھا۔ ل ایریا میں اس وقت لنچ کا وقفہ تھا۔ فیکٹریوں میں کام کرنے والے باہر کھا پی رہے تھے۔ دفعتاً رجب علی کو احساس ہوا کہ بعض لوگ عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے عقب میں دیکھ رہے تھے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پرکاش لوگوں کی مسکراہٹ سے بے نیاز انگلی سے آئس کریم چاٹ رہا تھا۔ رجب تھم گیا۔

"کیا کر رہے ہو پرکاش بھائی! آئس کریم کوئی ایسے کھاتے ہیں۔"

"یہ ہمارے دیش کی کلفی نہیں ہے بابا! انگلش آئس کریم ہے۔ ہم سالی کو ایسے ہی کھائے گا۔"

"لوگ ہنس رہے ہیں۔"

"ہنسنے دے یار! پاگل ہے یہ انگریج لوگ۔ کلفی کو ڈنڈی دینے کی جگہ کپی میں ڈال کے بیچتے ہیں۔" کون کو پرکاش کپی کہہ رہا تھا۔

تب رجب علی کو کیا معلوم تھا کہ آئندہ زندگی میں آئس کریم کھاتے ہوئے اس واقعے کی یاد اسے برسوں پیچھے لے جا کر مسکرانے پر مجبور کر دیا کرے گی۔

☆☆☆

رجب علی ایک روز کام کی تلاش میں دن بھر مارا مارا پھرنے کے بعد گھر واپس لوٹا تو جلیل نے دروازہ کھولنے پر بتایا۔ "تیرا کوئی مہمان آیا ہے پاکستان سے۔"

"میرا مہمان!" وہ چونکا۔ "پاکستان سے؟" کون ہو سکتا تھا؟

وہ حیران اور متجسس کمرے میں پہنچا تو سر سے پیر تک پاؤں تک کمبل تانے کوئی شخص اس کے بستر پر لیٹا تھا۔ رجب علی کے تجسس نے بہت آہستگی سے اس کے چہرے پر سے کمبل ہٹانے پر مجبور کر دیا۔ ارے! وہ تو سلیم تھا، غریب نواز ہوٹل کے مالک کا بیٹا۔ سلیم اٹھ بیٹھا۔ اسے دیکھ کر کمبل کو ایک طرف پھینک کر اٹھا اور گرمجوشی سے اس سے لپٹ گیا۔

"اچانک..... بغیر بتائے..... اور یہاں کیسے؟" رجب پردیس میں بستی کے کسی آشنا کو غیر متوقع طور پر دیکھ کر حیرانی سے بولا۔

"یار! ابو نے کسی سے کہہ سن کر میرا بھی بندوبست کر دیا۔ تیرے گھر سے تیرا پتا لیا اور پہنچ گیا۔"

"بتا تو دیتے، میں تمہیں لینے آ جاتا۔"

"ابے! کہاں آتا..... بڑی دور کا سفر ہے بھائی، اپنا تو جہاز میں بیٹھے بیٹھے تیل نکل گیا۔"

"کل ہی گھر والوں کا خط آیا ہے، انہوں نے بھی کوئی ذکر نہیں کیا تمہارے آنے کا۔"

"میں نے منع کر دیا تھا انہیں۔ بتا کے آتا تو تیرے کو اتنی خوشی ہوتی جتنی اس وقت ہو رہی ہے؟ ابے! میری امی بولتی ہیں، کیا خوشی اس چاند کی جو ہو انتیس تاریخ کا اور کیا خوشی اس دوست کی جو آئے بہت دور سے۔"

"یہ تو ہے..... اچھا، ہاتھ منہ دھو لو، میں تمہارے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"کچھ نہیں بھائی! فل ہوں..... جہاز میں بس کھاتا پیتا ہی رہا۔ ابو نے راستے کے لیے خوب ساری دال موٹھ پاپڑ، بسکٹ اور تل کے لڈو ساتھ کر دیے تھے، راستے میں کھاتا رہا۔ ہاں، تیرے گھر والوں نے احمد کا سوہن حلوا اور میٹھی ٹکیاں بھیجی ہیں تیرے لیے..... دیتا ہوں تجھے۔"

"دے دینا..... دے دینا، جلدی نہیں۔"

"ابے! تجھے جلدی نہ ہو، پر میرے کو تو امانت سونپنے کی جلدی ہے۔" سلیم نے اپنا سفری بیگ کھول کر ایک تھیلی میں لپٹی چیزیں رجب علی کو تھما دیں۔

Scanned with CamScanner

digest library.com

"ٹھیک ہے۔" رجب نے کہا۔
"کیا بولا؟"
"شکریہ۔"
"ابے چل..... دوستوں کو شکریہ کون بولتا ہے۔"
سلیم جو پاکستان میں رجب علی کو کبھی منہ بھی نہ لگاتا تھا، خود کو اس کا دوست قرار دے رہا تھا۔ بہت زعم تھا اسے ہوٹل کے مالک کا بیٹا ہونے پر۔
جلیل جو چپ چاپ ان دونوں کا ملنا دیکھ رہا تھا، ان کی باتیں سن رہا تھا، اٹھا۔ "رجب! میں چائے بنانے جا رہا ہوں تمہارے مہمان کے لیے۔"
"تمہارا بھی ہوں بھائی!" سلیم بے تکلفی سے جلیل سے بولا۔
"ہاں ہاں کیوں نہیں، پاکستان سے جو یہاں آئے، ہمارا ہے۔" جلیل نے کہا۔
"میں بنالوں گا جلیل!" رجب بولا۔
"چپ کر..... تو اپنے مہمان سے گپ شپ کر۔"
"پھر وہی بات..... بھائی تمہارا بھی ہوں..... پاکستان میں ریڈیو پر بولتے ہیں نا..... حبیب بینک، میرا بینک..... میرا بینک..... پھر ایک بچہ بولتا ہے..... میلا بھی تو ہے۔" اپنی بات کے اختتام پر سلیم زور سے ہنسا۔
جلیل چائے بنانے کچن کی طرف چلا گیا۔
چائے کی پیالی میں بسکٹ ڈبو کر کھاتے ہوئے سلیم نے رجب کو بتایا، جہاز میں اس کے ساتھ بیٹھا شخص دو ڈھائی سال سے انگلستان میں تھا اور اب اپنے بال بچوں کو بھی یہاں لانے کے لیے ان کے پاسپورٹ وغیرہ بنوانے کے لیے آزاد کشمیر گیا تھا۔ وہ خود یہاں ڈاکیارڈ میں کام کر رہا تھا اور اس نے دورانِ سفر سلیم سے کہا تھا اگر وہ اپنے جس دوست کا پتا پاکستان سے لے کر چلا ہے، اس سے مل کر اور اس کے گھر والوں کی بھجوائی سوغات اسے دے کر اس کے پاس آجائے تو وہ اسے بھی ڈاکیارڈ میں کام پر لگوا دے گا۔
رجب علی کو سلیم سے یہ بات سن کر اس کی قسمت پر رشک آیا کہ اسے سفر کے دوران ہی ایک اہم سفر کے ذریعے کام ملنے کی امید بندھ گئی اور ایک وہ تھا کہ کام کے لیے مارا مارا پھر رہا تھا۔
"تم نے اس سے اس کا پتا لیا؟" رجب نے سلیم سے پوچھا۔
"ہاں، ہاں۔" سلیم اٹھا اور اس نے اپنے بیگ کی جیب سے ایک کاغذ نکال کر رجب کو تھما دیا۔ رجب نے تھوڑی بہت اردو تو پڑھنا سیکھ ہی لی تھی۔ "م..... ر..... م..... ت..... ض..... چھوٹی ی..... کیا بنے گا جلیل؟"
"مجھے دکھاؤ۔" جلیل بولا۔
رجب نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ جلیل کی طرف بڑھا دیا۔
"آدمی کا نام مرتضیٰ ہے۔ چیشم ڈاکیارڈ پر کام کرتا ہے۔ رہتا جلنگھم میں ہے۔ اپنے گھر کا ایڈریس اس نے لکھ دیا ہے۔"
"جلنگھم کہاں ہے؟"
"محبوب صاحب سے پوچھنا، انہیں معلوم ہوگا۔ ویسے نام تو میں نے بھی سنا ہے چیشم..... جلنگھم۔"
محبوب صاحب نے چیشم جانے کے لیے سلیم کی راہنمائی کی۔ اگلے دن سلیم اپنے سامان کے ساتھ چیشم جانے کو روانہ ہونے لگا تو رجب علی نے اس سے کہا۔
"تمہیں کام مل جائے تو میرے لیے بھی کوئی کام دیکھنا۔"
"فکر مت کر۔"
"خط لکھ دینا مجھے، میں آجاؤں گا۔ خط لکھنا آتا ہے نا تمہیں؟"
"کچا پکا۔"
"جیسا بھی..... اشارہ ملتے ہی آجاؤں گا۔ خط فوراً ملتا ہے ادھر، دیر نہیں لگتی۔"
"ابے! وہی جس کے پاس میں جا رہا ہوں، بتا رہا تھا یہاں کسی کام میں دیر نہیں ہوتی۔ خانت کام کرتے ہیں ادھر کے لوگ۔"
رجب علی نے دلگرفتہ ہوتے ہوئے سوچا، اسے کام ملنے میں دیر کیوں ہو رہی تھی بھلا۔
سلیم چلا گیا۔

☆☆☆

ماں کا خط آیا تھا۔ بڑے بھائی کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ نومولود کو ملا کر چار بیٹے ہو گئے تھے اس کے۔ منجھلے بھائی کو جاڑے کا بخار چڑھا ہوا تھا۔ چھوٹی بھابی اس پر دم کرانے مسجد کے مولوی کے پاس لے گئی تھی۔ آپا اسی طرح محنت مزدوری میں لگی تھی۔ منجھلی کا اپنے سات بچے سنبھالنے کے ساتھ میاں کی گالی گلوچ اور مار پیٹ سہنے کا وہی معاملہ تھا۔ ریحانہ اپنی جماعت میں پہلے نمبر پر رہی تھی۔ اسے اگلی سے بھی اگلی جماعت میں بٹھا دیا گیا تھا۔ ناصحہ کے ہاں جڑواں بچے ہوئے تھے، ایک بیٹا ایک بیٹی..... غریب نواز

Scanned with CamScanner

ہوٹل والے کے بیٹے سلیم کے لندن جانے کی خبر اور یہ کہ اس کی ماں تیرا پتا مانگنے آئی تھی جو کچھ رٹو کد کے بعد دے دیا گیا۔ برابر والی خالہ حاجرہ اس وقت پاس بیٹھی سلام دعا لکھوا رہی تھی۔

سادہ لوح ماں کا خط بس کچھ اسی طرح کا ہوتا تھا۔

☆☆☆

سلیم نے اپنے دوسرے خط میں لکھا، اسے ڈاکیارڈ پر کام مل گیا تھا۔ رجب علی کے لیے اس کا کہنا یہ تھا کہ کوشش سے اسے کام تو مل ہی جائے گا مگر رہنے کے لیے جگہ کی بہت تنگی تھی۔ اگر وہ اپنی رہائش کا بندوبست کر سکتا تھا تو آجائے۔

ملکہ کے دیس میں گرمی کے مہینوں میں بھی موسم ٹھنڈا تھا۔ پاپیادہ باہر نکلنے پر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے انگھیلیاں کرنے لگتے۔ جلیل نے بتایا سردی میں تو دانت سے دانت بجنے لگتے اور برف پڑتی تو بندے کا نام پوچھ لیتی۔ پاکستان میں تو دو ڈھائی ماہ کو جاڑا آتا اور اپنا نام بتا کر چلا جاتا۔ باقی سال موسم نرم گرم رہتا۔ گرمی کے موسم میں دن میں گرم و مرطوب ہوائیں چلتیں، راتیں ٹھنڈی ہو جاتیں۔ گھر کے صحن میں جھلنگی چارپائی پر بنا کچھ اوڑھے لپٹے سونے میں مزہ آجاتا۔ یہاں تو گرمی کے مہینوں میں بھی ٹھنڈ تھی۔

رجب علی نے اللہ کا نام لے کر سلیم کے پاس جانے کی تیاری کی۔ لنڈا کا کوٹ پتلون اور کوٹ کے نیچے پوری آستینوں کی شرٹ کل آسرا تھا اسے گرمی کی ٹھنڈی ہوا سے بچانے کو۔

جلیل نے کہا۔ ''یہاں تو، تو گھر میں بیٹھا ہے، وہاں رہنے کی جگہ نہ ملی تو اس ٹھنڈ میں مر جائے گا۔''

''مر جاؤں تو محبوب صاحب سے خط لکھوا دینا میرے گھر والوں کو۔ ان کے پاس میرے گھر کا پتا ہے۔''

''سوچ لے۔ ہو سکتا ہے تو واپس آئے تو یہاں تیری جگہ کوئی اور کرائے دار آچکا ہو۔''

''اللہ مالک ہے، کام ملے گا تو جگہ بھی مل جائے گی۔''

رجب علی گھر کی مالکن کو اپنے جانے کی خبر دے کر اللہ کا نام لے کر جلنگھم روانہ ہو گیا۔ جلیل نے اسے اپنا استعمال شدہ ایک سویٹر اور محبوب صاحب نے گرم ٹوپی اور اونی جراب کی جوڑی دی۔ جلیل اور محبوب صاحب کی اعانت رجب علی نے خاصی ہچکچاہٹ اور شرمساری سے قبول کی۔ آپا سمجھایا کرتی تھی کہ آدمی کو اپنے دوستوں سے بھی حتی الامکان کوئی احسان نہیں لینا چاہیے، نظر جھکانی پڑتی ہے۔

ٹھنڈک تھی، سفر تھا مگر رجب علی کو روزگار کی چاہ تھی۔ ٹرین میں بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ مرد و زن، بوڑھے، جوان اور بچے۔ اکثریت گوری تھی مگر گندمی اور سیاہ فام بھی تھے۔ گوری اکثریت اپنے آپ میں گم تھی۔ کوئی اخبار اپنے سامنے کیے، کوئی کسی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے۔ کسی کے زانو پر بریف کیس دھرا تھا، کسی کے نزدیک بچہ گاڑی میں نرم و ملائم بچہ سو رہا تھا۔ گوروں کو کسی کی طرف دیکھنے یا تاڑنے کی عادت نہ تھی مگر گندمی رنگت والے دوسروں کو دیکھ رہے تھے، تاڑ رہے تھے۔ لمبے تڑنگے سیاہ فام جوان اور سر پر بالوں کی ان گنت چوٹیوں والی سیاہ فام لڑکیاں اپنی اپنی بولی بول رہے تھے۔

ٹرین جلنگھم پہنچ گئی۔ رجب علی ٹرین سے اترا تو خنک ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔ بارش کے آثار ہونے کے باوجود اسٹیشن پر زندگی گرمجوشی کے ساتھ رواں دواں تھی۔ رجب علی کی جیب میں سلیم کے دونوں خطوط موجود تھے جن پر خط بھیجنے والے کا پتا بھی درج تھا۔ کچھ دیر تاک کر اس نے ایک شخص کو جو چہرے مہرے اور حلیے سے پاکستانی یا ہندوستانی ہی لگتا تھا، روکا اور سلیم کے ارسال کردہ خط پر خط بھیجنے والے کا پتا دکھا کر اس سے راہنمائی چاہی۔ اس نے اسٹیشن سے باہر بس میں سوار ہو کر اس علاقے تک جانے کا مشورہ دیا جہاں سلیم کی رہائش تھی۔

رجب علی اسٹیشن سے باہر آیا تو اسٹیشن کے برعکس سڑک پر سناٹا تھا۔ بس اسٹیشن پر چند افراد تھے۔ آسمان گہرے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اپنا بیگ اٹھائے وہ بھی بس اسٹیشن پر جا کھڑا ہوا۔ بس آئی تو چند مسافر اترے اور بس کا انتظار کرتے مسافر سوار ہوئے۔ وہ بھی سوار ہونے والوں کے ساتھ بس میں بیٹھ گیا۔

مطلوبہ مقام تک پہنچنے کے بعد وہ پوچھتا پاچھتا اس گھر تک پہنچ گیا جہاں سلیم رہائش پذیر تھا۔ سلیم نے اپنے خط میں ٹھیک ہی لکھا تھا، رہنے کے لیے جگہ کی بہت تنگی تھی۔ گھر کے ایک کمرے میں سلیم چار دیگر مردوں کے ساتھ ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔ رجب علی کو کمرے سے باہر راہداری میں ایک پرانے گدے پر جگہ مل گئی۔ باتھ روم جانے کے لیے کمرے میں مقیم افراد کو اس کے اوپر سے پھلانگ کر باتھ روم میں آمد و رفت رکھنا پڑتی۔

سلیم کے کمرے کے ساتھیوں کو رجب علی کے بارے میں پتا چلا کہ وہ ڈاکیارڈ پر کام ملنے کی امید میں بریڈ فورڈ سے جلنگھم آیا ہے تو انہی میں سے ایک نے اسے بتایا

Scanned with CamScanner

digest library.com

کہ اگر اسے یہاں کام نہ ملے تو وہ ایشفورڈ چلا جائے۔ وہاں بیچلرز نام کی فیکٹری میں آسانی سے نوکری مل جاتی تھی۔

رجب علی کو ڈاکیارڈ میں نوکری نہ مل سکی۔ اس نے وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنا سامان اسی گھر میں چھوڑا اور ایشفورڈ پہنچ گیا۔ بیچلرز فوڈ فیکٹری میں اسے واقعی نوکری مل گئی۔ پردیس آنے کے بعد یہ اس کی پہلی نوکری اور پہلی بڑی خوشی تھی..... وہ باروزگار ہو گیا تھا۔

کام صفائی کا تھا۔ انگریز چارج ہینڈ نے اسے اشاروں سے بتایا کہ اس کے اوقات کار رات کو دس بجے سے صبح چھ بجے تک ہوں گے۔ پہلے دن ایک اسٹور کی صفائی کرنا تھی۔ اسٹور بہت بڑا تھا اور گندا بھی۔ رات دس بجے سے صبح چھ بجے تک رجب علی نے مسلسل کام کیا۔ اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے ایک نہیں، تین مرتبہ اسٹور کی صفائی کی۔ صبح کو جب چارج ہینڈ آیا تو اسٹور کو چمکتا دیکھ کر خوش ہو گیا۔ رجب کی طرح رات کو کام کرنے والے افراد نے چارج ہینڈ کو جب یہ بتایا کہ رجب ایک مرتبہ صفائی کے بعد بیٹھا نہیں بلکہ دوسری اور تیسری مرتبہ بھی اس کی صفائی کی تو چارج ہینڈ ہنسا اور اس نے اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا کھڑا کر کے اسے شاباش دینے کے ساتھ اپنی زبان میں کچھ کہا جو اس وقت تو رجب نہ سمجھ پایا لیکن آئندہ زندگی میں جب وہ انگریزی سمجھنے اور بولنے پر قادر ہوا تو اسے بیچلرز میں اپنی پہلی نوکری کے روز اوّل اس کے کام سے خوش ہو کر چارج ہینڈ کا اپنا انگوٹھا کھڑا کر کے شاباش دینا اور انگریزی میں کچھ بولنا یاد آتا تھا۔ اس کا دل چارج ہینڈ کے الفاظ کی ترجمانی یوں کرتا۔ ''تم ایک محنتی اور ایماندار آدمی ہو۔''

محنت اور ایمانداری ساری زندگی رجب کا مسلک رہا۔ آپا اسے سمجھاتی تھی کہ محنتی اور ایماندار آدمی کبھی پیچھے نہیں رہتا۔

تقریباً ایک ماہ اس طور گزرا کہ رات دس بجے اپنی ڈیوٹی کا وقت شروع ہونے سے پہلے رجب بیچلرز پہنچ جاتا اور صبح چھ بجے ڈیوٹی کا وقت ختم ہونے کے بعد جلنگھم چلا جاتا..... اسی گھر میں جہاں سلیم رہ رہا تھا، اس نے بھی مالک مکان سے بات کر کے دوسرے کمرے میں اپنے لیے جگہ لے لی تھی مگر روزانہ جلنگھم سے ایشفورڈ جانا اور ایشفورڈ سے جلنگھم واپسی تھی وقت طلب اور محنتی دوڑ۔

بیچلرز میں ہربچن سنگھ نامی ایک سکھ کارکن کا بھی یہی معمول تھا۔ روزانہ جلنگھم سے ایشفورڈ جانا اور ایشفورڈ سے جلنگھم واپسی۔ ٹرین سے آتے جاتے اکثر دونوں کا ساتھ رہنے لگا۔ ایشفورڈ میں بیچلرز فیکٹری کے راستے میں ایک فارم کے نزدیک پرانی کیریوان ناکارہ کھڑی تھی۔ ہربچن کو روزانہ سفر کی مشقت سے بچنے کے لیے نرالا خیال سوجھا۔ اس نے رجب سے کہا۔ ''یہ کیریوان یونہی بیکار کھڑی ہے۔ اگر ہم دونوں اس میں رہنے لگیں تو روزانہ جلنگھم سے ایشفورڈ آنے اور واپس جلنگھم جانے سے بھی جان چھوٹے گی اور وقت کے ساتھ پیسے کی بچت بھی ہوگی۔''

رجب علی نے ہربچن کی بات کو مذاق سمجھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا مذاق ہے ہربچن!''

''اوئے نہیں یار! میں سیریس ہوں۔'' ہربچن بولا۔

''گاڑی میں کون رہتا ہے ہربچن؟''

''یار! یہ گاڑی سفری گھر ہوتا ہے، شوقین لوگ جب یہاں ہالیڈیز منانے یا گھومنے پھرنے کے لیے سفر پر نکلتے ہیں تو ہوٹل موٹل میں رہنے کے بجائے کیریوان میں جاتے ہیں۔ جدھر مرضی آئی رک گئے، جب مرضی آئی چل پڑے۔ اس میں سونے کی جگہ بھی ہوتی ہے، کچن بھی، اسٹور بھی۔''

''اور.....؟'' رجب علی کہتے کہتے رک گیا۔

''سمجھ گیا..... اس کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ ٹوائلٹ تو بندے کی مجبوری ہے یار! یہ گاڑی گوروں کا شوق ہے۔ تجھے پتا ہے اسے کیا بولتے ہیں؟''

''کیا؟''

''گورے اسے کیریوان بولتے ہیں، پر ہم دیسی لوگوں نے تو اسے سیدھا سادہ کاروان ہی کہنا ہے۔''

''کیریوان..... کاروان۔'' رجب علی نے دہرایا۔

''تے فیر کی کھیال اے..... پتا شتا لگایئے مالک دا؟''

''دیکھ لو۔''

''ویکھنا کی..... مالک مل جائے، ہمیں کرائے پر دے دے تو دونوں آدھا آدھا کرایہ دے کر رہ لیں گے اس میں۔''

''ٹھیک ہے۔''

کاروان کے مالک کا اتا پتا مل گیا، بات بھی ہو گئی۔ رجب علی اور ہربچن سنگھ جلنگھم سے ایشفورڈ میں کھڑی کیریوان میں منتقل ہو گئے۔ روزانہ سفر کی صعوبت سے بھی جان چھوٹی، نیند اور آرام کے لیے زیادہ وقت ملنے لگا۔ دن سونے میں گزرتا، رات کو فیکٹری میں چائے مل جاتی۔ لنچ میں کھا لیتے، کبھی ابلے ہوئے آلو اور ابلے ہوئے ٹماٹر کھا کر گزارہ کر لیتے اور کبھی چاکلیٹ کی عیاشی بھی ہو جاتی۔

دو ڈھائی ماہ اسی طور گزرے پھر موسم کے تیور بدلنا

Scanned with CamScanner

شروع ہوئے۔ خنک ہواؤں میں ٹھنڈک سرایت کر گئی۔ دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہونے لگیں۔ باہر نکلنے پر ہاتھ بغلوں میں دبانے پڑتے۔ رجب کو تو سردی کا احساس ہمیشہ ہی سے کچھ زیادہ تھا۔ کیریوان خراب تھی، اسے گرم رکھنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ سردی بڑھی تو ہربچن کے مشورے پر رجب علی نے بھی سردی میں خود کو گرم رکھنے کا حل یہ نکالا کہ دونوں فیکٹری میں اپنی ڈیوٹی کا وقت شروع ہونے سے چار چھ گھنٹے پہلے ہی فیکٹری پہنچ جاتے اور وہاں گرم ٹوائلٹس میں بیٹھ کر خود کو گرم رکھتے۔

برف باری شروع ہوئی تو دن کے چند گھنٹے کیریوان میں گزارنا بھی مشکل ہو گیا۔ ٹھنڈک جسم سے دل میں اترتی اور اعصاب شل کر دیتی۔ دانت سے دانت بجتے، بدن ٹھٹھرا جاتا۔ رجب علی نے ایسی ٹھنڈ پاکستان میں کب دیکھی تھی۔ پہلی بار تجربہ ہوا کہ گرمی کا مقابلہ آسان مگر ٹھنڈ تو بندے کو مار دیتی ہے۔ فیکٹری کے ٹوائلٹس میں بیٹھ کر سردی کا مقابلہ کرنا بھی آسان نہ رہا۔ رجب اور ہربچن صبح چھ بجے فیکٹری میں اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر کیریوان میں پہنچتے تو سردی اور نیند دونوں میں گھمسان کا رن پڑا ہوتا۔ نیند جیت جاتی۔ اپنے اپنے کمبل میں لپٹے وہ سکڑے پڑے رہتے۔ عجیب موسم تھا۔ کیریوان سے باہر نکلتے تو سرد ہواؤں کے جھکڑ، دھند اور اداسی۔ آپا کہا کرتی تھی، سردی میں جی چاہتا ہے انسان اکیلا نہ ہو، لوگ آس پاس ہوں۔ آگ جل رہی ہو، ہاتھ تاپ رہے ہوں اور باتیں کر رہے ہوں۔ آپا کی اس بات کی گہرائی رجب کی سمجھ میں پردیس آنے کے بعد موسم سرما کی شدت میں آئی تھی۔ وہ اکیلا تھا، ہربچن سے بھلا کتنی باتیں کی جا سکتی تھیں اور ہر دکھ سکھ کی بات تو نہیں کی جا سکتی تھی نا اس سے۔ اتنا ہی ساتھ بہت تھا کہ وہ دونوں ایک ساتھ فیکٹری آتے جاتے تھے، اکٹھے کیریوان میں رہ رہے تھے اور کبھی کبھی ہربچن اسے لکھنے پڑھنے میں بھی مدد دے دیتا تھا۔ اردو کے ساتھ اب وہ انگریزی حروف سے بھی آشنا تھا۔ شکستہ انگریزی خط میں اپنا نام لکھ سکتا تھا۔ یہ نام ہی اس کا دستخط بن گیا تھا۔

برف باری کے اسی موسم میں دونوں ایک روز فیکٹری سے آنے کے بعد نیند کے شدید غلبے سے مغلوب ہو کر کیریوان میں ایسے سوئے کہ آنکھ کھلی تو پتا چلا کیریوان چہار اور برف میں جکڑی ہوئی تھی۔ شیشوں پر برف، دروازے منجمد، ٹھنڈک تھی کہ الاماں۔ دونوں نے بس یہ جانا کہ دم گھٹا اور گئے۔ مدد کے لیے پکاریں تو کسے..... اور کون جانے کہ اس ناکارہ کیریوان کے اندر بھی کوئی رہتا اور جیتا ہوگا۔ دونوں اپنے اپنے کمبل میں لپٹ کر بیٹھ گئے۔ رجب اللہ کے حضور التماس کر رہا تھا۔ ہربچن اپنے عقیدے کی ڈور پکڑے گڑگڑا رہا تھا۔ فیکٹری میں اپنی ڈیوٹی پر جا سکنا تو ممکن ہی نہ تھا، دروازے منجمد تھے۔ کب شام آئی، کب رات ہوئی، کیریوان کے اوپر جمی برف نے پتا نہ چلنے دیا۔ ہربچن کی گھڑی سے وقت کا پتا چلتا رہا۔ چھ..... سات..... آٹھ..... نو..... دس بج گئے۔ چارج ونڈو تو گالیاں دے رہا ہوگا کہ بنا بتائے دونوں ایک ساتھ غائب۔ رات بھر دونوں کبھی بیٹھتے، کبھی لیٹتے رہے۔ موت کا خوف تھا کہ خدا کی پناہ۔ معجزہ ہی ہوا کہ دونوں کی رات سانس لیتے کٹ گئی اور اس سے بڑا معجزہ یہ کہ کئی دن کے بعد اگلے روز سورج نکل آیا۔ برف پگھلنے لگی..... کیریوان کی ونڈ اسکرین پر سے، کھڑکی کے شیشوں سے، دروازوں پر سے۔ رجب علی اور ہربچن سنگھ موت کے سناٹے سے نکل کر زندگی کی پکار کی طرف نکل آئے تھے۔ کیریوان میں مزید رہنا مناسب نہ تھا۔ دونوں کیلگلن میں کرائے کے ایک گھر میں منتقل ہو گئے جہاں ان سے پہلے انہی کی طرح کے کئی چھڑے مرد کرائے پر رہ رہے تھے۔ جس کمرے میں رجب علی اور ہربچن سنگھ کو جگہ ملی، اس میں کراچی کے معروف علاقے لالوکھیت سے آیا رجب علی ہی کی عمر کا ایک لڑکا اکبر علی اور چٹاگانگ کا مستفیض پہلے ہی مقیم تھے۔ اکبر علی سے رجب علی کی جلد ہی دوستی ہو گئی۔ رجب کی طرح اکبر علی بھی غریب گھرانے کا فرد تھا۔ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اپنا اور اپنے بہن بھائیوں کا مستقبل بنانے کے لیے وہ پردیس آیا تھا۔ رجب کی طرح اسے بھی پیسا کمانے کی چاہ بھی تھی، ضرورت بھی۔ اس گھر میں منتقل ہونے سے در و دیوار کی اہمیت واضح ہوئی۔ کیریوان میں رہنا شوق یا مجبوری تو ہو سکتی تھی، گھر میں رہنے کا نعم البدل ہرگز نہیں۔

☆☆☆

انگریزی بولنا تو رجب علی کے لیے ہنوز دلی دور است والا معاملہ تھا ہی، گوروں کی انگریزی سمجھنا تو دلی سے بھی دور کی بات تھی۔ نہ جانے کہاں سے اور کس کس طرح آوازیں نکالتے تھے۔ رجب علی کی انگریزی لغت ہنوز کام چلاؤ چند الفاظ تک محدود تھی۔ فیکٹری میں آتے جاتے لوگوں سے ہیلو، ہائے، بائے کرنا سیکھ گیا تھا اور بولنے والے کی حرکات و سکنات سے اس کا مدعا بھی کسی حد تک سمجھ جاتا۔

فیکٹری میں مرد و زن اکٹھے کام کرتے تھے۔ موسم سرما

Scanned with CamScanner

digest library.com

کی ایک دھندلی شام جب رجب اور ہربچن فیکٹری پہنچے تو ہربچن اپنے کسی گورے شناسا سے ملنے کے بعد باہر ہی رک گیا اور اس نے رجب سے کہا۔ ''تو چل، میں آتا ہوں۔''

رجب علی اندر داخل ہوا اور ہربچن کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ ڈیوٹی کا وقت ہونے میں ابھی دیر تھی۔ احاطے میں روزمرہ رونق تھی۔ رجب کی شفٹ میں اس کے ساتھ کام کرنے والا انگریز نوجوان رابرٹ فیکٹری کے احاطے میں اپنی ہی شفٹ کی ایلن نامی لڑکی کے ساتھ کھڑا چہلیں کر رہا تھا۔ ایلن اکثر رجب کو بہت غور سے دیکھا کرتی تھی۔ ہربچن کے آنے کے انتظار میں رجب فیکٹری کے احاطے میں ہی رکا کھڑا تھا۔ ایلن اور اس سے باتیں کرتے رابرٹ نے رجب کو دیکھا تو ایلن نے اس نوجوان سے کچھ کہا۔ وہ رجب کی طرف آیا اور ہیلو ہائے کے بعد ایلن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کچھ کہا۔

''یس!'' رجب علی نے اس کی بات سمجھے بغیر کہا۔

رابرٹ پلٹ کر ایلن کی طرف گیا، اس سے کچھ کہا۔ دوبارہ رجب کی طرف آیا اور پھر کچھ کہا۔ رجب صرف تین الفاظ سمجھ پایا..... سٹرڈے، فوکسٹن، سنیما!

رجب نے نوجوان پر اپنی ناسمجھی ظاہر کیے بغیر سر ہلا کر کہا۔ ''اوکے۔''

ایلن مسکرائی، اپنا ہاتھ ہلایا اور فیکٹری کے اندر چلی گئی۔ ہربچن آیا تو رجب بھی اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔ رابرٹ اور ایلن کا اس سے کچھ ذکر نہ کیا۔

ہفتہ بھر کی تھکن اتارنے کو رجب علی اور ہربچن سنگھ سنیچر کی رات لمبی تان کر سوئے۔ اتوار کا دن بھی آرام کرتے ہی گزرا۔ شدید سردی باہر نکلنے کے بجائے گھر ہی میں رہنے کا پابند کر رہی تھی۔

سوموار کو جب رجب اور ہربچن کام پر گئے تو ایلن فیکٹری گیٹ کے نزدیک ہی کھڑی تھی۔ رجب کو دیکھ کر وہ ذہنی شیرنی کی طرح غرّائی اور انگریزی میں بنتی جھگتی اس پر جھپٹ پڑی۔ ہربچن بیچ بچاؤ نہ کراتا تو شاید وہ رجب علی کو دو چار ہاتھ بھی لگا دیتی۔

''کیا قصہ ہے، کیوں غصہ ہو رہی ہے یہ تجھ پر؟'' ہربچن نے رجب کو شک سے دیکھا۔

''پتا نہیں یارا'' رجب نے لاعلمی ظاہر کی۔

''ایلن!'' ہربچن نے ایلن کو پکارا جو جارحانہ انداز میں چند قدم آگے جا چکی تھی۔

ایلن رکی اور پلٹ کر دیکھنے لگی۔

ہربچن اس کی طرف گیا۔ ''کیا، کیا ہے اس نے؟''

ہربچن نے رجب کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیوں غصہ ہو رہی تھیں تم اس پر؟'' ہربچن نے ایلن سے انگریزی میں پوچھا۔

''میں نے اسے سٹرڈے کی شام فوکسٹن میں سنیما کے باہر ملنے کا پیغام دیا تھا۔ اس نے اوکے بھی کیا تھا۔ رابرٹ گواہ ہے۔ میں سخت سردی میں تین چار گھنٹے اس کا انتظار کرتی رہی، یہ نہیں آیا۔ میرا جی چاہتا ہے قتل کر دوں اسے۔''

''پوچھتا ہوں میں اس سے، تمہارا غصہ بجا ہے۔ اوکے کیا تھا تو اسے جانا چاہیے تھا۔'' ہربچن نے ایلن کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

ہربچن پلٹ کر رجب کی طرف گیا اور ڈپٹ کر اس سے بولا۔ ''اوئے! تو نے جانا نہیں تھا اس سے ملنے تو اوکے کیوں کیا تھا؟''

''کہاں نہیں جانا تھا؟'' رجب علی سٹپٹا گیا۔

''فوکسٹن۔''

''فوکسٹن! ہاں یہ تو سمجھ میں آیا تھا میرے اور سنیما بھی..... پر مجھے کیا پتا کہ وہ ملنے کو بلا رہی تھی۔ میں نے اوکے کہہ دیا۔''

''جھلّے۔'' ہربچن نے رجب کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ ''ان کے دیس میں رہنا ہے تو ان کی زبان سیکھ لے ورنہ آج تو میں نے تجھے بچا لیا، کسی دن کسی سے بہت مار پڑے گی۔''

''تم سکھاؤ نا مجھے۔''

''!! تجھے اردو، انگریزی سب میں ہی سکھاؤں۔''

ایلن سی ہوئی انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہربچن دوبارہ اس کی طرف گیا اور اسے رجب علی کی نادانی سے آگاہ کیا۔ وہ مسکرا دی اور رجب علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''نیکسٹ سٹرڈے؟''

''سوری!'' رجب علی نے بلند آہنگی سے جواب دیا۔ اس کی کام چلاؤ انگریزی لغت میں یہ لفظ بھی تو موجود تھا۔

ایلن نے اپنا پاؤں زمین پر مارا، رجب کو غصے سے دیکھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی چلی گئی۔

☆☆☆

گھر سے خط آیا تھا۔ ریحانہ نے لکھا تھا۔ ''بھائی! تم اماں کو جو پیسے بھیجتے ہو، اماں نہ خود پر خرچ کرتی ہیں، نہ کسی دوسرے پر..... نہ میری فیس کے پیسے دیتی ہیں، نہ اسکول کے کسی اور خرچے کے..... سب آپا کرتی ہیں۔ انہوں نے کوئی ٹھیکا تو نہیں اٹھا رکھا ہمارا..... جو پیسے تم بھیجتے ہو، اماں

Scanned with CamScanner

بینک میں جمع کرادیتی ہیں۔ وہ جو پپو کے ابا نہیں رہتے ہمارے محلے میں..... ارے وہی جو بینک میں کام کرتے ہیں، ان سے اماں نے بینک میں اپنا اکاؤنٹ کھلوالیا تھا، بس اسی میں پیسے جمع کرادیتی ہیں۔ کہتی ہیں ریحانہ اور رجب کی شادی کے کام آئیں گے۔ خیر، میں نے تو شادی کرنی ہی نہیں۔ تمہاری جب ہوگی، اللہ دے گا۔ پہلے تو مجبوری تھی، اب تو تم بھیج رہے ہو پیسے، اماں کو چاہیے خرچ کریں۔ مجھے بھی دیں پڑھائی کے خرچے کے لیے۔ کبھی کاپی کی ضرورت ہوتی ہے، کبھی انک ختم ہوجاتی ہے، کبھی اسکول میں میلا بازار لگتا ہے تو ٹکٹ کے پیسے دینے پڑتے ہیں۔ اماں کو نہ بتانا کہ میں نے یہ سب لکھا ہے۔ بات کرو تو اپنے طریقے سے کرنا۔

''ہاں، بڑے بھائی، منجھلے بھائی اور ان کی بیویوں کو اب تمہاری خیر وعافیت کی بڑی فکر رہنے لگی ہے۔ آتے جاتے اماں سے پوچھے جائیں گے، رجب کا خط آیا؟ آپا کہتی ہیں چڑھتے سورج کے پجاری ہیں یہ لوگ۔

''پھر لکھ رہی ہوں، اماں کو پتا نہ چلے کہ میں نے تم سے ان کی شکایت کی ہے، ناراض ہوں گی۔ میں خط اچھا لکھنے لگی ہوں نا، دوبارہ اپنی جماعت میں اوّل آؤں گی تو شاید پھر ڈبل پروموشن مل جائے۔

''اماں نے خط لکھوایا ہے، پہلے میں علیحدہ کاغذ پر ڈرافٹ لکھتی ہوں پھر فیئر کرتی ہوں۔ اماں کے خط میں ہی یہ سب لکھ رہی ہوں مگر اماں کو بالکل معلوم نہیں۔ تم پڑھ کر پھاڑ دینا یا جلا دینا۔ کہیں تم نے رکھ لیا سنبھال کے اور اماں کو پتا چل گیا تو میری شامت آجائے گی۔ ویسے تو خیر گھر میں میرے علاوہ کون پڑھا لکھا ہے جو اماں کو پڑھ کر سنائے گا۔''

ریحانہ نے غلط لکھا تھا کہ گھر میں بس وہی ایک پڑھی لکھی تھی۔ آپا اپنے بچوں کو پڑھا رہی تھی اور آپا کی دیکھا دیکھی دوسرے بہن بھائیوں نے بھی اپنے بچوں کو اسکول بھیجنا شروع کردیا تھا اور اب تو رجب علی خود بھی اٹک اٹک کر جیے لکھ کر خط پڑھنے کے لائق ہو چلا تھا اور اسے امید تھی کہ ایک دن وہ خط لکھنے کے لائق بھی ہوجائے گا۔

☆☆☆

کینٹلین ختم ہونے کے بعد سردی کا موسم رجب علی نے اسی گھر میں گزارا جس کی مالکن مسز فرنانڈس تھی۔ اس گھر میں قیام کے دوران رجب کی اکبر علی سے خوب بنی۔ اکبر علی پڑھا لکھا، محنتی اور دور اندیش نوجوان تھا۔ انگلستان آنے کے بعد وہ ایک مرتبہ پاکستان بھی جاچکا تھا۔ اپنے گھر والوں کو ماہ بہ ماہ خرچ بھجوانے کے ساتھ اس نے اتنی رقم جمع کرلی تھی کہ کچھ رقم ادا کرکے مورگیج پر کوئی مناسب گھر خرید سکتا۔ شدید سردی کے مہینے ختم ہوتے ہی اس نے ایشفورڈ میں مکان خرید لیا۔ مسز فرنانڈس کے گھر میں مقیم کئی کرائے دار اکبر علی کے خریدے ہوئے مکان میں کرائے دار ہونے کو تیار ہوگئے۔ رجب علی بھی انہی میں شامل تھا۔ ہربچن سنگھ نے بیچلرز فیکٹری چھوڑ کر کہیں اور نوکری کرلی تھی۔

اکبر علی کی بہت سی خوبیوں کے ساتھ اس کی ایک بڑی خامی زیادہ سے زیادہ آمدن کی طلب تھی جو ساتھی مسز فرنانڈس کے گھر سے اکبر علی کے گھر میں منتقل ہوئے، ان کے علاوہ بھی اس نے کئی کرائے دار رکھ لیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر کرائے داروں سے بھر گیا۔ ہر کمرے میں گنجائش سے زائد افراد کرائے پر رہنے لگے۔ صحت وصفائی کے تدنظر ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ نے مکان مالکان کو مکان کی گنجائش کے اعتبار سے کرائے دار رکھنے کی اجازت دے رکھی تھی اور دوسرے ممالک سے بڑی تعداد میں لوگوں کی انگلستان آمد کے سبب ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ مالکان مکان کو اپنے مروجہ اصول کا پابند رکھنے کے لیے دن بہ دن چوکس ہوا جاتا تھا۔ اکبر نے اس قاعدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے گھر میں مقررہ گنجائش سے زائد افراد کرائے دار رکھ لیے تھے۔ ایک روز ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ والوں نے اکبر علی کے گھر پر چھاپا مارا۔ خوش قسمتی سے کئی افراد اس وقت گھر سے باہر تھے اور جو گھر میں موجود تھے، وہ بھی تتر بتر ہوگئے۔ کسی نے خود کو مہمان ظاہر کیا، کوئی ادھر چھپا، کوئی ادھر گیا۔ جو گھر سے باہر تھے، انہیں چھپتے چھپاتے گھر سے نکل جانے والوں سے چھاپے کی خبر ملی۔ شام تک گھر کا راستہ نہ دیکھنے کی تدبیر ہوئی۔ رجب علی بھی اس وقت کھانے پینے کا سامان خریدنے قریبی اسٹور گیا ہوا تھا۔ شام تو شام، وہ خریداری موقوف کرکے رات کو فیکٹری میں اپنی ڈیوٹی کے بعد اگلی صبح دبے پاؤں گھر پہنچا۔ وہاں اکبر علی سمیت سب منہ لٹکائے فکرمند بیٹھے آئندہ کے لائحہ عمل پر غور کررہے تھے۔ طے پایا کہ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے مروجہ قاعدے کی روشنی میں کرائے داروں کی مخصوص تعداد اپنی آمد کی سینیارٹی کی بنیاد پر اس گھر میں رہے گی۔ یعنی جو پرانے کرائے دار ہیں، وہ رہیں گے، بعد میں آنے والوں کو کہیں اور رہائش دیکھنا ہوگی۔

اکبر علی کے کرائے داروں میں مسلمان بھی تھے، ہندو

Scanned with CamScanner

digest library.com

بھی اور سکھ بھی۔ تین سکھ کرائے داروں میں سے ایک کشمیرا سنگھ سے رجب علی کی اچھی دوستی تھی اور وہ شاید اس لیے کہ خود رجب کی طرح کشمیرا سنگھ بھی مفاہمت پسند اور خوامخواہ کے تنازعات سے دور رہنے والا آدمی تھا۔

اکبر علی کے گھر سے جن کرائے داروں کی بے دخلی ملے پائی، کشمیرا سنگھ بھی اس فہرست میں آ گیا۔ وہ سخت پریشان ہوا کہ اس کی جائے ملازمت اکبر علی کے گھر سے پیدل مسافت پر تھی، بس یا ٹرین سے جانے کا جھنجٹ نہ تھا۔ رجب علی نے کشمیرا کو پریشان دیکھا تو بولا۔ ''کشمیرا بیٹھا رہ، اس کی جگہ میں کہیں اور چلا جاتا ہوں۔''

رجب علی کی بات پر چار پانچ مسلمان کرائے دار اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا۔ ''اگر رجب علی جائے گا تو ہم بھی یہاں نہیں رہیں گے۔''

اکبر علی نے ایک ساتھ پانچ چھ کرائے دار جاتے دیکھے تو پریشان ہو گیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''کشمیرا سنگھ رہے، میں کہیں اور چلا جاتا ہوں۔''

مسلمان کرائے داروں میں بڑی عمر کے مولانا عزیز بھی تھے۔ انتہائی شریف النفس، پنج وقتہ نمازی اور ساتھیوں کو ہمیشہ اچھی بات سمجھانے والے۔ اپنے ہم مذہب ہی نہیں، غیر مذہب ساتھیوں کو بھی ہمیشہ یہ سمجھاتے کہ پردیس میں کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے مقامی افراد انہیں موردِ الزام ٹھہرائیں۔ اس موقعے پر انہوں نے معاملے کو اپنی اس تجویز سے ٹھنڈا کیا کہ اکبر علی فوری طور پر کسی کرائے دار کو گھر سے بے دخل نہ کرے تاہم چونکہ یہ اصولی معاملہ ہے۔ آج تو خوش قسمتی سے کچھ لوگوں کے باہر ہونے کی وجہ سے بچت ہو گئی، کل کلاں ایسے وقت بھی ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کا چھاپا پڑ سکتا ہے جب سب لوگ گھر کے اندر موجود ہوں، لہٰذا عافیت اسی میں ہے کہ اضافی افراد کی نفری اپنی سہولت کے حساب سے کہیں اور منتقل ہو جائے۔

کشمیرا سنگھ بولا۔ ''مولانا عزیز! کہیں اور رہنے کی جگہ تو ہم کر ہی لیں گے، پر آج رجب علی نے میرے لیے جو کیا ہے، اس سے میرے دل میں اس کی عزت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس گھر میں میرے سکھ ساتھی بھی تھے مگر میری حمایت میں آواز ایک مسلمان لڑکے نے اٹھائی..... جیوندا رہ رجب!''

اکبر علی کے گھر میں مقیم زائد افراد ایک ایک، دو دو کر کے چند ہی دن میں اپنی سہولت کی جگہ مکان تلاش کر کے وہاں چلے گئے۔ کشمیرا سنگھ اور رجب کو دوسری جگہ منتقل ہونے کی ضرورت نہ رہی۔

☆☆☆

اکبر علی کے گھر میں رہتے ہوئے رجب علی کو اپنائیت ملی۔ اکبر علی سے اس نے کفایت شعاری، دور اندیشی اور کنبہ پروری سیکھی۔ ان دو برسوں میں اس نے اکبر علی کو کبھی فضول خرچی کرتے نہ دیکھا۔ سادہ کھاتا اور سادہ پہنتا۔ وہ اکثر کہتا۔ ''ایک وقت آئے گا جب دوسرے ملکوں سے انگلینڈ آنے والوں کی تعداد اتنی بڑھ جائے گی کہ اس ملک کے مقامی لوگوں کے لیے بھی سہولتیں کم پڑ جائیں گی۔ ملکہ کی حکومت لوگوں کو جو مراعات دیتی ہے، وہ گھٹا دی جائیں گی۔ دوسرے ممالک سے آنے والوں کو چاہیے کہ یہاں سے پیسا کمائیں اور اپنے ملک جا کر سرمایہ کاری کریں۔''

ان دو برسوں میں اکبر علی نے پاکستان سے اپنے دو بھائیوں اور ایک بھتیجے کو بھی انگلستان بلوا لیا۔

گھر میں نئے کرائے دار آتے اور پرانے جاتے ہی رہتے تھے۔ کشمیرا سنگھ ریڈنگ چلا گیا تھا۔ رجب علی بیچلرز میں ہی کام کر رہا تھا۔ بیچلرز میں کام کرتے ہوئے اکبر علی کا گھر اس کے لیے بہترین جگہ تھی۔ اکبر علی سے اس کی رفاقت بھی اچھی تھی۔ دونوں اپنے اپنے معاشی حالات کی بہتری کے لیے پردیس آئے تھے۔ فرق تھا تو یہ کہ اکبر علی پڑھا لکھا تھا۔ رجب علی اب انگریزی سمجھنے اور بولنے بھی لگا تھا۔ اردو میں کچا پکا خط بھی لکھ لیتا۔ ٹوٹی پھوٹی املا اور شکستہ لکھائی میں لکھا اس کا خط پڑھنے میں ریحانہ بار بار اٹکتی، غور کرتی اور جب سمجھ پاتی تو ہنسنے پر مجبور ہو جاتی۔

''شکر کر میرا بچہ خط تو لکھنے لگا، ماں کی طرح تجھ سے خط لکھوانے کی مجبوری تو نہ رہی۔'' ریحانہ کے ہنسنے پر ماں ٹوکتی۔

ریحانہ سے رجب کا خط نہایت انہماک سے سنتی آپا کہتی۔ ''نہ کبھی اسکول گیا، نہ کسی استاد سے سبق لیا، کورا گیا تھا یہاں سے..... لگن تھی اس کے دل کو خود خط لکھنے کی۔ اتنے تھوڑے وقت میں رجب اتنا بھی سیکھ گیا بہت..... مذاق مت اڑا اس کا۔'' آپا بھی ریحانہ کو ٹوکتی۔

''مذاق نہیں اڑا رہی آپا! سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کیا لفظ لکھا ہے۔ سمجھ میں آیا تو ہنسی نکل گئی۔'' ریحانہ صفائی دیتی۔

''جہاں رہے میرا بچہ، فرشتوں کی حفاظت میں رہے۔'' ماں محبت سے کہتی۔

رجب علی کو اپنا دیس چھوڑے تین سال ہونے کو آئے تھے۔ گھر سے آنے والے ہر خط میں ماں کا ایک ہی

Scanned with CamScanner

تقاضا ہوتا۔ ''تو نے جلدی واپس آنے کا وعدہ کیا تھا، بس اب گھر آجا۔''

'کیسے آجاؤں اماں! ابھی تو شروعات ہے۔ بہت کچھ کرنا ہے مجھے۔' وہ دل ہی دل میں سوچتا۔

پھر ماں کا تقاضا منت سماجت میں بدل گیا۔ ''گھر آجا میرے بچے! تجھے دیکھنے کو میری آنکھیں ترس گئی ہیں۔''

''ترس تو میں بھی رہا ہوں تمہیں اور باقی سب کو دیکھنے کو مگر زندگی بھی تو بنانی ہے اپنی اور تم سب کی بھی۔''

پھر ماں کی بیماری کے پیغام آنے لگے۔ ''حکیم کے پاس گئی تھی، نبض دیکھ کر کہنے لگا دل کمزور ہے..... دل کمزور ہوتا تو اتنے سال جیتی..... تیرے پردیس جانے سے دل کمزور ہو گیا ہے میرا..... آجا میرے لال!''

''آؤں گا اماں! تھوڑے پیسے بنالوں۔ تم لگ کر اپنا علاج کرواؤ۔ پیسوں کی فکر مت کرنا اور بھیج دوں گا۔'' اس نے ماں کو اپنے خط میں لکھا۔

''تو مجھے پیسے کا لوبھی سمجھتا ہے؟'' ماں نے گلہ کیا۔

''یہاں ان لوگوں کی عید آنے والی ہے جسے یہ لوگ کرسمس بولتے ہیں۔ کرسمس کے بعد آؤں گا۔'' اس نے ماں کو تسلی دی۔

''اب تو ان کی عید بھی گزر گئی..... کب آئے گا؟''

کرسمس کے بعد ماں نے خط لکھوایا۔

''آؤں گا..... کچھ دن اور کام کرلوں۔''

''کب آئے گا..... جب ماں نہ رہے گی۔''

اکبر علی کی ماں مر چکی تھی۔ اس کے باپ کا تقاضا اکثر پیسوں کے لیے ہوتا۔ رجب، اکبر علی سے ماں اور گھر والوں کی باتیں اکثر کرتا رہتا تھا۔ ایک روز اکبر علی اس سے بولا۔

''رجب! یار چلا جا گھر۔''

''میں یہاں اپنی زندگی بنانے آیا ہوں اور تو کہتا ہے گھر چلا جاؤں؟'' رجب نے اکبر علی کے مشورے پر اسے یوں دیکھا جیسے اکبر علی اس کا بدخواہ ہو۔

''زندگی اللہ کی رحمت سے بنتی ہے رجب! اور اللہ کی رحمت ماں کی دعا سے ملتی ہے۔ سب کچھ مل جاتا ہے یار، ماں نہیں ملتی۔'' اکبر علی کے لہجے میں دکھ تھا۔ ''میں جب یہاں آیا، میری ماں زندہ تھی۔ دو سال یہاں گزارنے کے بعد جب واپس گیا تو سب تھے، ماں نہیں تھی۔ میں ماں کی خالی چارپائی پکڑ کر بہت رویا مگر رونے سے کیا ہوتا ہے۔ ماں چلی جائے تو واپس نہیں آتی..... تو چلا جا..... ماں سے مل کر، اس کی دعائیں لے کر پھر آجانا۔'' اکبر علی کی آواز رندھ گئی تھی۔

اکبر علی کے گھر میں ایک نیا کرائے دار جلیس موٹر سائیکل کے ساتھ آیا۔ رجب علی پاکستان میں یار دوستوں کی سائیکل تو چلاتا رہا تھا۔ سائیکل کا تو اسے ایسا شوق تھا کہ کوئی دوست مرونا اسے اپنی سائیکل چلانے کو دے دیتا تو وہ اس پر اُڑا اُڑا پھرتا۔ ذرا سی دیر میں بستی کی ساری گلیوں میں چکر لگا آتا بلکہ کبھی کبھی تو ہینڈل سے ہاتھ ہٹا کر صرف پیڈلوں سے سائیکل چلاتا۔ دیکھنے والے محظوظ ہوتے۔ جلیس کی موٹر سائیکل نے رجب کے سائیکلنگ کے شوق کو ہوا دی۔ جلیس سے بے تکلفی گانٹھ کر رجب نے اس سے دو چار دن میں ہی موٹر سائیکل چلانا سیکھ لی اور دل میں اس خواہش کا بیج بو لیا کہ جب بھی حالات نے اجازت دی، موٹر سائیکل ضرور خریدے گا۔ فی الحال تو اس نے اپنی توجہ خرید کھانے پینے کی چیزوں تک محدود کر رکھی تھی۔

سنیچر کا دن تھا۔ جلیس جو ایک فاؤنڈری میں ملازم تھا اور موٹر سائیکل پر فاؤنڈری آتا جاتا تھا، ہفتہ بھر کی تھکن اتارنے کے موڈ میں بستر پر لیٹا اپنے ٹیپ ریکارڈر پر گانے سن رہا تھا۔ موٹر سائیکل نیچے کھڑی تھی۔ رجب علی شام کے وقت کھانے پینے کا سامان خریدنے کے لیے گھر سے جانے لگا تو جلیس نے اپنا بھی کچھ سودا سلف منگوانا اس کے ذمے کر دیا۔ رجب علی کو اس کی موٹر سائیکل پر جانے کا بہانہ ہاتھ آیا۔ ''سامان زیادہ ہوگا، اپنی موٹر سائیکل دے دو۔'' اس نے جلیس سے کہا۔

جلیس نے چابی اس کی طرف اچھال دی۔ دو تین اور لوگوں نے بھی اپنی فرمائشیں داغ دیں۔ کسی کو ڈبل روٹی چاہیے تھی، کسی کو انڈے اور مکھن، کسی کو سگریٹ تو کسی کو چائے کیلئے۔ رجب علی سب سے پیسے لے کر موٹر سائیکل پر جانے کے شوق میں گنگناتا ہوا نیچے اترا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور تیزی سے چلاتا اسٹور تک پہنچا، خریداری کی۔ واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک جگہ موٹر سائیکل بے قابو ہوئی۔ رجب اور سامان سمیت موٹر سائیکل بائیں جانب ڈھے گئی۔ رجب علی کی ٹانگ، گھٹنے اور بازو پر چوٹ لگی۔ بازو کا زخم گہرا تھا۔ موٹر سائیکل کو بھی نقصان پہنچا۔ جوں توں رجب علی موٹر سائیکل پر گھر پہنچا۔

ساتھیوں نے اس کے بازو کا زخم دیکھ کر کہا۔ ''یہ زخم گھر کی دوا دارو سے ٹھیک ہونے والا نہیں۔ سڑک پر گرنے ہو، زخم آئے ہیں، اسپتال جانا ضروری ہے۔''

جلیس گھبرا کر بولا۔ ''بائیک سے گرنے کا مت بتانا۔

Scanned with CamScanner

اس کی انشورنس بھی نہیں اور ٹیکس بھی ادا نہیں کیا ہے میں نے..... پھنس جائیں گے۔"

رجب علی اسپتال گیا اور اپنی گلابی انگریزی میں بتایا کہ سائیکل سے گر پڑا ہوں۔ طبی مددگار نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس کی بات کا اعتبار نہ ہو۔ رجب کی جان نکلی ہوئی تھی کہ کہیں سچ نہ اگلوالیا جائے۔ صد شکر کہ ایسا نہیں ہوا۔ زخموں کی صفائی، مرہم پٹی اور دوادارو کے بعد اسے اسپتال سے رخصت کردیا گیا۔

رجب علی نے پاکستان جانے کے لیے جہاز پر اپنی سیٹ بک کرالی۔ اکبر علی نے رجب کے ذریعے اپنے گھر والوں کو بھجوانے کے لیے کچھ چیزیں خریدیں تو اس نے بھی بھائی بہنوں کے بچوں میں تقسیم کرنے کے لیے ٹافیوں کا ایک ڈبا اور دونوں بھابیوں اور بہنوں کے لیے لیشتی بند جوتے اور ریحانہ کے لیے ایک بارکر پین بھی خرید لیا۔

جلیس نے اس سے پوچھا۔ "شادی وادی کا بھی کچھ پروگرام ہے؟"

"اماں کہتی تو ہیں۔" رجب کچھ شرماتے ہوئے بولا۔

"اپنی والدہ کو میرے گھر لے کر جانا، بتادے دوں گا تمہیں۔ میری چھوٹی بہن کالج میں پڑھ رہی ہے۔ والدہ اس کے لیے رشتہ دیکھ رہی ہیں۔ یہاں آکر وہ بھی کسی فیکٹری میں جاب کرسکتی ہے۔"

"اماں کہتی ہیں کمانا مرد کا کام ہے، عورت کا کام ہے گھر بیٹھنا اور گھرداری۔"

"پھر تو تم اپنی والدہ کو ضرور لے کر جانا ہمارے گھر۔ میری والدہ بھی عورتوں کی نوکری کے سخت خلاف ہیں۔ تمہارا رشتہ اگر میری بہن سے ہوجائے تو سمجھو ایک اچھی فیملی سے تمہارا رشتہ جڑ جائے گا۔"

"میرا رشتہ تو اماں نے میری خالہ کے گھر طے کر رکھا ہے، مہرالنساء سے۔ میری خیکرے کی مانگ ہے۔"

"پہلے کیوں نہیں بتایا تم نے؟" جلیس منہ بنا کر بولا۔

"تم نے پوچھا ہی نہیں۔"

جلیس نے اسے غصہ دیکھنے پر اکتفا کیا، منہ سے مزید کچھ نہیں بولا۔

گھر والوں کو رجب علی نے اپنے آنے کی خبر نہیں دی۔ آتے ہوئے جب سب اسے ائرپورٹ پر چھوڑنے آئے تھے تو گھر سے ائرپورٹ تک دو بسیں بدل کر جانا پڑا تھا۔ دونوں بسوں میں بھائی بہنوں کے بچوں کے ٹکٹوں کے مسئلے پر کنڈکٹروں سے تکرار ہوئی۔ ایک بس کا کنڈکٹر بولا۔

مجبوری

فلم کی ریلیز سے پہلے ہی اس کی اتنی شہرت ہوچکی تھی کہ مہینوں پہلے کی ایڈوانس بکنگ چل رہی تھی۔ فلم لگی تو پہلے شو میں ایک پچھلی قطار میں دو خواتین بیٹھی تھیں عمران کے درمیان سیٹ خالی تھی۔ انٹرول میں ایک خاتون نے بات چیت شروع کرتے ہوئے دوسری خاتون سے کہا۔ "میں نے یہ فلم دیکھنے کے لیے آٹھ مہینے پہلے بکنگ کرائی تھی۔"

دوسری خاتون بولیں۔ "عجیب اتفاق ہے۔ میں نے بھی آٹھ مہینے پہلے بکنگ کرائی تھی۔"

پہلی خاتون بیچ کی خالی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔ "لیکن نہ جانے یہ کون بدنصیب تھا جو بکنگ کرانے کے باوجود فلم دیکھنے نہیں آسکا۔"

"یہ سیٹ بھی میری ہے۔" دوسری خاتون نے غمزدہ لہجے میں کہا۔ "دوسرا ٹکٹ میں نے اپنے شوہر کے لیے لیا تھا لیکن اس دوران میں ان کا انتقال ہوگیا۔"

"اوہ..... بڑا افسوس ہوا سن کر۔" پہلی خاتون نے ہمدردی سے کہا۔ "لیکن آپ اپنی کسی دوست یا رشتے دار کو ساتھ لاسکتی تھیں۔"

"خیال تو مجھے بھی آیا تھا۔" دوسری خاتون نے تاسف سے کہا۔ "لیکن کسی کو بھی لانا مشکل تھا۔ وہ سب تو میرے شوہر کے جنازے میں شرکت کے لیے گئے ہوئے ہیں۔"

(مرسلہ: شاہانہ لیفٹ، کراچی)

تدبیر

خیر دین نے دیکھا کہ اس کی بیوی گائے کا دودھ دوہنے کے بعد گائے کو ہی پلا رہی تھی۔

"یہ تم کیا کر رہی ہو بے وقوف عورت؟" خیر دین چلایا۔

"دودھ ذرا پتلا لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا ایک مرتبہ اور گائے میں سے گزار لوں۔" خیر دین کی بیوی نے جواب دیا۔

(مرسلہ: مہتاب احمد، حیدرآباد)

digest library.com

Scanned with CamScanner

digest library.com

"ٹکٹ نہیں دے سکتے تو لشکر لے کر چڑھ کیوں جاتے ہو بس پر۔"

دوسری بس کا کنڈکٹر تو بہت ہی بے ہودہ تھا، کہنے لگا۔ "بچوں کا ٹکٹ نہیں دے سکتے تو اتنے بچے پیدا کیوں کر لیتے ہو۔"

بڑا بھائی غصے کا تیز..... اس نے کنڈکٹر کا گریبان پکڑ لیا کہ زنانے میں عورتیں ساتھ ہیں، تمیز سے بات کر۔ بیچ بچاؤ نہ کرایا جاتا تو دونوں میں بس کے اندر ہی اکھاڑ پچھاڑ شروع ہو جاتی تھی۔

رجب علی اپنے آنے کی خبر دے کر گھر والوں کو پھر اسی تکلیف سے نہیں گزارنا چاہتا تھا۔

جہاز منہ اندھیرے کراچی کے ہوائی اڈے پر اترا۔ رجب نے دو دو بسیں بدل کر گھر جانے کے بجائے ائرپورٹ سے ٹیکسی لی۔ بستی کے باہر سڑک کنارے ٹیکسی سے اترا اور اپنا سامان اٹھا کر گھر کی طرف چل دیا۔ غنیمت تھا کہ اس وقت لوگ سو رہے تھے ورنہ گھر تک شناساؤں کا ایک جلوس اس کے ساتھ ہو لیتا۔

گھر پہنچا تو ماں صحن ہی میں تھی۔ اسے دیکھ کر پہلے بھونچکا ہوئی پھر بلند آواز میں "میرا رجب آ گیا" کہتی اس کے گلے آ لگی۔ ذرا دیر میں گھر میں ہلچل مچ گئی۔ آپا، منجھلی، ریحانہ، بھائی، بھابیاں، منجھلی کا شوہر، بہن بھائیوں کے بچے، سب رجب علی کے گرد آ پہنچے۔ بھائیوں نے گلے لگایا اور اپنی آنکھیں پونچھنے لگے۔ بڑی بہنوں نے سر پر ہاتھ رکھا۔ ریحانہ گلے لگ کر ملی۔ بچے ایک کے بعد ایک آ کر اس سے لپٹتے چمٹتے رہے۔ بھابیاں اپنے بچے پیش کرتی رہیں۔ "چچا کو سلام کرو۔"

ماں نے پڑوسن کو زور سے پکارا۔ "اے مجو کی ماں! میرا رجب آ گیا۔"

جواباً مجو کی ماں سر پر اپنا دوپٹا ٹھیک کرتی ماں کو مبارک باد دینے آ گئی۔ "بہت مبارک ہو خالہ! تمہارا بیٹا آ گیا۔"

سارے محلے کو خبر مل گئی، پڑوسنیں گھر میں آ گئیں۔ رجب کے یار دوست کوئی ہاتھ منہ دھو کر، کوئی ہاتھ منہ دھوئے بغیر اس سے ملنے گھر کے باہر اکٹھے ہو گئے۔ رجب کو ان سے ملنے کے لیے دروازے پر جانا پڑا۔

"ابے لے اتو، تو پورا صاحب بن گیا۔ کیا شان ہے بھئی۔ کالی پتلون، نیلی شرٹ، گلے میں سالی ٹائی اور پیروں میں بند بوٹ..... واہ بھئی..... سالا میں تو صاحب بن گیا۔"

"ابے او انا گورا کیسے ہو گیا تو؟"

"یار! تیری تو شیو بھی آئی..... ڈاڑھی، مونچھیں صاف کرا کے آیا ہے۔"

"جگرا! شالا کیں تیرے لیے؟"

"نہیں، نہیں۔ گھر والے بنائیں گے۔"

"چل میری جان! تو سفر کی تھکن اتار لے، پھر ویسیں گے بھائی بکن کی دکان کے سامنے، اسی گلی کے نکڑ پہ۔"

ہمسائیاں متعجب تھیں کہ ابھی کی گئی میں برتن کھلنا پھرنے والا رجب ایسا نکھرا نکھرا، گورا چٹا بنکر گلابی رنگت والا بابو کیونکر بن گیا تھا۔

"اب تو میں رجب سے کہوں گی، میرے شہاب الدین کو بھی لندن پہنچا دے گورا ہونے کے لیے۔" شیدیوں کی سی سیاہ رنگت والے لڑکے شہاب الدین کی ماں نے دوسری پڑوسنوں سے کہا۔

رجب واقعی بہت بدل کر واپس لوٹا تھا۔ رنگت اس کی صاف تھی مگر اتنی نہیں۔ انگلستان کی آب و ہوا اور سنتھری فضا نے اس کی رنگت گلابی مائل کر دی تھی۔ سیاہ بال، نئی پتلون، شرٹ اور ٹائی کا اہتمام اس نے پاکستان آنے کے لیے بطور خاص کیا تھا۔

دوستوں سے مل کر گھر میں آیا تو ناشتا تیار ملا۔ آپا کے ہاتھ کا خستہ پراٹھا اور بالائی والی چائے۔ ایک بھائی کے گھر سے انڈے کا خاگینہ اور دوسرے کی طرف سے آلو کی ٹکیاں..... رجب کی موجاں ہی موجاں! منجھلی کا میاں لال پری نہ لانے پر خفا ہوا۔ رجب نے اس کا کندھا دباتے ہوئے اگلی بار اس کی فرمائش پوری کرنے کا وعدہ کیا۔

☆☆☆

رجب کے آنے کی خوشی میں ماں نے اس کی بھجوائی ہوئی بینک میں جمع رقم سے کچھ پیسے نکلوائے اور دعا درود کرا کے گئے چنے رشتے داروں اور سارے محلے والوں کی دعوت کا ارادہ کیا۔ رشتے دار تو تھے ہی کتنے، زیادہ تر ہندوستان ہی میں تھے۔ چھوٹی خالہ کو مگر دعوت کا پیغام نہ بھجوایا گیا۔ رجب کے جانے کے بعد ماں اپنے بیٹوں، بیٹیوں کو رجب سے ہرن کے رشتے کے لیے خالو کے انکار سے تو آگاہ کر ہی چکی تھی، خالہ کو دعوت نہ بھجوانے کی وجہ اب رجب کو بھی بتانا پڑی۔ اس نے کوئی خاص اثر نہ لیا۔ ہرن سے کون سا کوئی اس کا معاشقہ تھا کہ وہ اثر لیتا۔ لڑکیوں کا کوئی کال تھوڑی تھا۔ جلیس کی بہن کو دیکھا جا سکتا تھا۔

دعوت کے لیے ہانڈی پکی گھر بلا کر پلاؤ کی دیگ اور

Scanned with CamScanner

زردے کا دیگچہ اتارا گیا۔ کرائے کی دریاں اور چاندیاں منگوا کر سب کو باعزت طریقے سے کھانا کھلایا گیا۔

اس دعوت کے بعد گھر والوں کو پتا چلا کہ رجب علی پردیس میں دو سال رہ کر باہر جانے کے لیے آپا کا ادھر اُدھر سے لیا ہوا قرضہ اتارنے کے علاوہ اپنا خرچہ اٹھانے اور اماں کو ہر ماہ پیسے بھجوانے کے باوجود تقریباً بیس ہزار پاکستانی روپوں کے مساوی پونڈز لے کر آیا ہے تو سب کے منہ کھلے رہ گئے۔ اتنی رقم تو وہ یہاں کئی سال میں بھی نہیں جوڑ سکتا تھا۔ نئی کراچی میں ان دنوں بہت آرام سے دو ہزار میں مکان خریدا جا سکتا تھا۔ دو مکان خریدے۔ ایک کو کرائے پر چڑھا کر دوسرے میں شادی کر کے رہے..... مزے ہی مزے اگر رجب علی نے کہا وہ یہاں رہنے کے لیے نہیں، دوبارہ پردیس جانے کو آیا تھا۔

گھر والوں کو رجب علی کی شادی کا ہلہلا اٹھ گیا۔ خالہ کے گھر تک یہ خبر پہنچی تو خالو نے کسی رشتے دار کے ذریعے پیغام بھجوایا کہ اگر رجب کے لیے مہرن کا رشتہ چاہیے تو آ کے مگر ماں کو اپنی انا پیاری تھی۔ وہ کسی قیمت پر دوبارہ اس گھر کی دہلیز چڑھنے کو آمادہ نہ ہوئی جہاں اسے ایک بار کورا جواب دے کر دھتکار دیا گیا تھا۔

رجب علی کے لیے لڑکی کی تلاش شروع ہوئی۔ ماں نے سمجھایا کہ کسی سیدھی سادی لڑکی سے شادی کرے اور کوئی کاروبار کر کے یہیں رہے مگر اس کی ایک ہی رٹ رہی کہ واپس جائے گا، البتہ گاہے بہ گاہے پاکستان آتا جاتا رہے گا۔ اس کے ایک بار واپس آ جانے سے ماں کو بھی کچھ تسلی تھی۔

اکبر علی کا بھجوایا ہوا سامان اس کے گھر والوں کو دینے کے لیے رجب اس کے گھر بھی گیا اور جلیس کے گھر اماں کے ساتھ..... جلیس کی بہن سامنے آئی مگر اسے پسند نہ آئی۔ مہرن کے رشتے سے خالو کے انکار سے آگاہ ہونے کے بعد اس کے دل میں ایک خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کی خواہش سما گئی تھی۔ وہ خالو کو دکھانا چاہتا تھا کہ اسے ان کی بیٹی سے زیادہ خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی کا رشتہ مل سکتا تھا۔

بھابیوں نے اپنے خاندان کی لڑکیوں کے رشتے بتانا شروع کر رکھے تھے مگر رجب کی چاہ تو ایک خوبصورت لڑکی تھی جو پڑھی لکھی بھی ہو۔ اس کی بہنوں اور بھابیوں کی طرح سادہ اور گھر بیٹھی نہ ہو۔ پردیس جا کر پردے کی تو بو نہ بنی رہے، وہاں کی عورتوں کی طرح کھٹ پٹ چل سکے۔

☆☆☆

اکبر علی اور جلیس کے گھر ہو آنے کے بعد رجب نے اپنے مہربان و راہنما علیم صدیقی سے ملنا بھی ضروری سمجھا۔ وہی جنہوں نے اسے لندن جانے کی ترغیب دی تھی۔ اپنے گھر کے پتے پر اس کا واؤچر منگوایا تھا۔ پاسپورٹ بنوانے اور جہاز پر سیٹ بک کرانے کے سلسلے میں راہنمائی دی تھی۔ رجب علی ان سے ملنے گیا تو شکریے کے طور پر ان کے لیے مٹھائی کا ڈبا بھی لے گیا۔ علیم صدیقی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

"ماشاء اللہ ابھی تم تو بالکل بدل گئے۔ بہت خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر۔" انہوں نے رجب کا بازو تھپتھپایا۔

"اور یہ مٹھائی لانے کی کیا ضرورت تھی..... شادی تو نہیں ہو گئی تمہاری؟"

"نہیں، ابھی تو نہیں مگر گھر والے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔" وہ قدرے شرما کر بولا۔

"کچھ سوچ کر ہی پیچھے پڑے ہوں گے نا۔"

"اماں کہتی ہیں تجھے اکیلا واپس نہیں جانے دوں گی۔"

"واپس جاؤ گے.....؟ بہت اچھا ہے۔"

"جب تک یہاں تھا، اپنا گھر، اپنی بستی اچھی لگتی تھی۔ باہر گیا تو پتا چلا دنیا میں اور بھی بہت کچھ ہے اچھا لگنے کو۔ جہاز اڑتا ہے تو زمین پر چیزیں چھوٹی سے چھوٹی ہوتی جاتی ہیں، جہاز اترتا ہے تو چھوٹی چیزیں بڑی ہوتی جاتی ہیں۔"

"فلسفہ بیان کرنے لگے..... اچھا خیر، چائے پیو گے؟"

"نہیں، بس چلوں گا۔ آپ کو سلام کرنے اور شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔"

"شکریہ کس بات کا؟"

"باہر جانے کا رستہ تو آپ ہی نے دکھایا مجھے ورنہ میں تو ساری عمر ڈبل روٹی، انڈے بیچتا رہتا۔"

"کام کوئی بھی برا نہیں ہوتا میاں! وہاں کیا کرتے ہو؟"

"فوڈ فیکٹری ہے بیچلرز، وہاں کام کرتا ہوں۔"

"واپسی کب ہے؟"

"ابھی تو لڑکی دیکھ رہے ہیں گھر والے..... میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ لڑکی شکل صورت کی اچھی اور پڑھی لکھی ہو ورنہ میں اکیلا ہی واپس چلا جاؤں گا۔"

"ایسی کوئی بڑی اور انہونی خواہش تو نہیں تمہاری۔ سارے نوجوان یہی چاہتے ہیں کہ شادی کسی اچھی شکل صورت والی لڑکی سے کریں اور بھئی لڑکی کا پڑھا لکھا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ وہی اگلی نسل کی تربیت کرتی ہے۔ تمہاری

digest library.com

بستی کا تو مجھے نہیں معلوم لیکن یہاں ہمارے علاقے میں تقریباً ہر گھر میں پڑھی لکھی لڑکیاں صبح کو جوق در جوق اسکول، کالج جارہی ہوتی ہیں۔ کہو تو میں اپنی بیگم سے کہوں، دیکھیں تمہارے لیے کوئی لڑکی؟"

"جھگی میں رہنے والے کو مکانوں والے کب دیں گے اپنی لڑکی؟"

"ارے نہیں، ایسی بات نہیں۔ جھگیوں میں انسان نہیں رہتے کیا۔ ویسے بھی تم تو واپس انگلینڈ جاؤ گے۔ انگلینڈ کے نام پر مل جائے گی تمہیں تمہاری پسند کی لڑکی۔"

"دیکھ لیں..... واپس تو ہر قیمت پر جاؤں گا میں۔ وہاں پر میں نے اپنا خرچہ بھی اٹھایا، جانے کے لیے جو قرضہ لیا تھا، وہ بھی اتارا۔ اماں کو بھی پیسے بھیجتا رہا..... بیس ہزار روپے اپنے ساتھ لایا ہوں، حج کا زمانہ ہے نہیں ورنہ اماں کو حج بھی کرا دیتا۔ چلیں شادی ہو جائے، اماں کو حج کے زمانے میں لے جاؤں گا اللہ کے گھر۔"

"دیکھتے ہیں تمہارے لیے کوئی لڑکی۔"

"میں گھر والوں کو بتا دوں گا کہ آپ بھی دیکھ رہے ہیں میرے لیے رشتہ..... ذرا جلدی سرا کیونکہ مجھے واپس بھی جانا ہے۔"

علیم صدیقی ہنس دیے پھر بولے۔ "شادی کا ذکر چھڑتے ہی لڑکوں کو جلدی ہونے لگتی ہے۔ ایک شعر سناتا ہوں۔" علیم صدیقی دھیرے سے گنگنائے..... طے ہی ہو جاتا ہے کیسا مرحلہ دشوار ہو..... رفتہ رفتہ ہوتی ہے نزدیک منزل دور کی..... تمہیں جلدی ہے مگر ہمیں تھوڑا وقت تو دو۔"

"ٹھیک ہے۔"

"کیا سمجھے؟"

"سمجھ گیا..... اب کب آؤں آپ کے پاس؟"

"جب جی چاہے آؤ ہماری طرف..... کہیں بات بنی تو ہم خود آجائیں گے تمہاری طرف۔ گھر کا پتا سمجھا دو مجھے۔"

رجب نے انہیں بستی میں اپنے گھر کا پتا بتا دیا۔

☆☆☆

جب سے رجب کے گھر والوں، یار دوستوں اور اہل محلہ کو اس کے اس پختہ ارادے کا علم ہوا تھا کہ وہ دوبارہ انگلینڈ جانے کے لیے آیا تھا، اس کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ گھر سے باہر جو ملتا، ایک ہی سوال کرتا کہ وہ لندن کب واپس جارہا ہے۔ یار دوست اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ محفل جمانا چاہتے مگر وہ اکثر کنی کترانے کی کوشش کرتا۔ بستی کے دوستوں کی محفلوں میں اس کا جی نہ لگتا۔ ان کے پھکو مذاق اور اوچھی فقرہ بازیوں پر پہلے کی طرح نہ قہقہے لگاتا، نہ داد دیتا۔ جلیل، محبوب صاحب، ہرجن سنگھ، کشمیرا سنگھ اور جلیس جیسے لوگوں کے ساتھ رہنے سے اس کے مزاج میں شستگی آگئی تھی۔ نہ بستی کے لوگوں کی طرح اونچی آواز میں بولتا، نہ دوستوں کی طرح منہ پھاڑ کر ہنستا بلکہ گھر میں بھی کوئی اونچی آواز میں بولتا تو وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز میں ٹوکتا۔ "آہستہ.....!" اس کی موجودگی میں گھر والے دھیمی آواز رکھتے۔

دوستوں کی محفل میں شرما حضوری بیٹھتا تو کوئی ہاتھ جوڑ کر، کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر گڑگڑا کر کہتا۔ "یار، رجب! لندن میں میرے لیے بھی کوئی جگہ دیکھ۔"

"میں لندن میں نہیں رہتا۔" ایک روز رجب نے کہا۔

یار دوست چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"لندن نہیں تو پھر کہاں سے ہو کے آیا ہے تو؟" ایک دوست نے حیرت سے پوچھا۔

"بھائی! لندن ایک شہر ہے انگلینڈ کا..... جیسے ہمارا کراچی ایک شہر ہے پاکستان کا۔ یہاں سے جانے کے بعد کچھ دن میں بریڈفورڈ میں رہا۔ بریڈفورڈ بھی ایک شہر ہے انگلینڈ کا..... پھر کہیں اور، کہیں اور رہتا رہا..... اب ایک جگہ ہے ایشفورڈ، وہاں رہتا ہوں۔"

"اچھا تو، تو لندن نہیں جائے گا؟"

"اپن تو سمجھتے تھے تو لندن گیا ہے۔"

"انگلینڈ گیا ہوں۔"

"اچھا تو، تو انگلینڈی بن گیا ہے جیسے ہم لوگ پاکستانی۔" ایک دوست نے اپنا فلسفہ بیان کیا۔

"میں بھی پاکستانی ہوں بھائی!"

"کیسے؟"

"ایسے کہ میرا وطن پاکستان ہے۔"

لندن اور انگلینڈ کی وضاحت کے بعد رجب کے یار دوست اور دوسرے لوگ بھی اس سے پوچھنے لگے تھے۔

"انگلینڈ کب جارہے ہو؟"

بہن بھائیوں میں آپا تو ہمیشہ سے تھی ہی اس کی اتالیق اور راہنما، اسے ہر اچھی بری بات سمجھانے کا سہرا اسی کے سر جاتا تھا۔ اس کی ہمدردی اور دلسوزی نے اسے نہ جانے کہاں کہاں گڑھے میں گرنے سے بچایا تھا۔ اب ریحانہ سے بھی اسے ذہنی ہم آہنگی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ بھی خود رجب کی طرح کھنگھو میں یس، نو، پلیز، سوری، تھینک یو اور چند دیگر الفاظ استعمال کرنے لگی تھی۔ کبھی اردو

Scanned with CamScanner

جملے میں ایک آدھ انگریزی لفظ بھی ملا دیتی جیسے کیا پرابلم ہے۔ رجب سے اس نے چند مکمل انگریزی جملے بھی سیکھ لیے تھے۔ کسی بات پر دوسرے کو ٹوکنا ہوتا تو موقع بے موقع کہتی ''مائنڈ یور اون بزنس!'' وہی ریحانہ جو کبھی رجب کو اس کے لمبے قد کی وجہ سے کبھی غصے میں، کبھی چھیڑ چھاڑ کو لمبو اور اس کے قدرتی زردی مائل دانتوں کی وجہ سے پیلے دانت کہا کرتی تھی، اب بڑے احترام سے بھائی کہتی۔ تعلیم اگر زیور ہے تو تربیت بھی ایسا نگینہ جو انسان کی فطرت کو جلا دیتے ہیں مگر کبھی کبھی شیطان اس جلا کو جلا کر خاک کر دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

پاکستان آنے کے بعد رجب کو بستی والوں کی جو بہت سی اچھی بری خبریں سننے کو ملی تھیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ بجیا کی بڑی بیٹی کالج میں جانے کے بعد کسی لڑکے کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔

لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف بستی کے مکین جن میں رجب کے دونوں بھائی بھی شامل تھے، بجیا کی بیٹی کے فرار کا ذمے دار تعلیم کو ٹھہراتے تھے۔ تعلیم کا کیا دوش، یہ تو انسان اور شیطان کی ازلی جنگ ہے جس کا نتیجہ کبھی انسان کے بہک جانے اور کبھی اس کے وار سے بچ نکلنے کی صورت میں نکلتا ہے۔

رجب کے آنے کے بعد ایک روز یار دوستوں کی بیٹھک میں بجیا کی بیٹی کے فرار کا قصہ چھڑ گیا۔ زیادہ تر کی رائے یہ تھی کہ لڑکیوں کو پڑھانا نہیں چاہیے۔ انتہائی فضول بات تھی..... کیوں نہیں پڑھانا چاہیے لڑکیوں کو؟ تعلیم تو شخصیت کو نکھارتی ہے۔ رجب نے اپنے گھر میں ریحانہ کو دیکھا تھا۔ تعلیم سے کیسے نکھر رہی تھی وہ۔ بیٹھک میں موجود لڑکیوں کی تعلیم کا ایک حمایتی لپک کر بولا۔ ''تعلیم سے انسان، انسان ہے۔ تعلیم بنا تو وہ حیوان ہے۔'' یہ بھی انتہا درجے کی سوچ..... رجب کے گھرانے میں آپا تھی نا، چچی ان پڑھ مگر عقل، سوچ اور بصیرت کمال درجہ۔ خدا کی دین، جسے چاہے نواز دے۔

رجب علی ایک روز آپا سے بولا۔ ''آپا! تم اگر..... اچھے برے کی تمیز سکھا کر مجھے انسان نہ بناتیں تو میں آج چور، ڈاکو بنا ہوتا یا جواری، بدمعاش۔''

''رجب! چور، ڈاکو اور جواری، بدمعاش بھی انسان ہی ہوتے ہیں میرے بھائی..... بس شیطان کے سکھائے میں آئے ہوتے ہیں۔'' آپا بولی۔

بجیا کا کنبہ بیٹی کے فرار کے بعد بستی چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

رجب علی کے دونوں بھائیوں کی بیویاں ایک ہی گھر سے آپس میں سگی بہنیں تھیں۔ رجب کے لیے ان کی خواہش اور پوری کوشش یہی تھی کہ ان کے اپنے ہی کنبے سے رجب کے لیے لڑکی آئے۔ ان کی سگی بڑی بہن کی بیٹی تھی۔ اچھا ناک نقش اور تھوڑی بہت پڑھی لکھی بھی گردانی گئی۔ دوپٹا سر پر رہتا، گھر کے کام کاج اور چھوٹے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال میں ماں کے ساتھ لگی رہتی۔ اس سے شادی کے لیے رجب اور ساس نندوں کو راغب کرنے کے لیے دونوں بھاوجیں بھانجی کو اپنے گھر لے آئیں۔ اس کی اہلیت ثابت کرنے کے لیے کبھی ایک خالہ اسے کسی کام میں لگا دیتی، کبھی دوسری۔ کبھی اسے رجب کی ماں بہنوں کی طرف بھیج دیا جاتا کہ اماں کے سر میں تیل لگا دے یا آپا کا کوئی کام نبیڑ آئے۔ اس کے ہاتھ کی پکی کڑھی اور ایک روز فیرنی بھی بطور خاص رجب کے لیے اماں کی طرف بھجوائی گئی۔

ماں اور آپا کو لڑکی اپنی سادگی اور دبے لجے پن کی وجہ سے پسند تھی۔ گو وہ بھی ان کی بھانجی جنہوں نے اپنے اپنے میاں کے سوا سسرال کے کسی اور فرد سے کوئی خاص بنا کر نہ رکھی تھی۔ اماں اور آپا کا ایک ہی خیال تھا کہ شادی کے بعد رجب لڑکی کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔ سادہ لڑکی ہے، گھرداری جانتی ہے، خدمت گزار ہے۔ بیوی وہی اچھی جو شوہر کا گھر سنبھالے اور اس کی خدمت گزاری کرے۔ ماں اور آپا دونوں کی رجب علی کو یہی ترغیب تھی کہ بھائی، بھاوجوں کا پچھلا رویہ نہ دیکھے۔ اس لڑکی کے لیے ہاں کر دے تو چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو۔ دلہن کو وہ اپنے ساتھ ہی لے جائے۔ رجب علی اپنی آمادگی ظاہر کرنے ہی کو تھا کہ علیم صدیقی حسب وعدہ آ گئے۔

علیم صدیقی کی بیگم کے بقول، ان کے اپنے جاننے والوں میں رجب علی کی حسب منشا لڑکی ڈھونڈلی تھی..... خوبصورت اور پڑھی لکھی..... تین بھائیوں اور خود اپنے سمیت دو بہنوں میں سب سے بڑی۔ عمر یہی کوئی سترہ اٹھارہ سال۔ دسویں جماعت کا امتحان دے چکی تھی، نتیجہ آنے ہی والا تھا۔ باپ کا اپنا کاروبار تھا۔ ذاتی مکان تھا۔ گھر میں بجلی، پنکھوں اور ٹیلی فون تک کی سہولت موجود تھی۔ گھریلو کام کاج کے لیے ایک نوکرانی بھی صبح کو آتی اور شام کو واپس جاتی۔ مطلب، خوشحال گھرانا تھا مگر انگلینڈ کے نام پر وہ رجب علی کو بھی اپنی ناز و نعم میں پلی خوبرو اور دس جماعتیں

Digest Library.com

Scanned with CamScanner

پڑھی لڑکی دینے کو تیار تھے۔

"ہماری بیگم نے تو ان لوگوں سے بات کرلی ہے، اب تم اپنے گھر والوں کو لے کر بروکھوے کے لیے ان کے گھر پہنچو۔" علیم صدیقی نے رجب سے کہا۔

رجب نے ماں اور آپا سے بات کی۔ ماں نے کہا۔

"لڑکی گھر میں موجود ہے تو ہمیں باہر دیکھنے کی کیا ضرورت؟"

"مجھے پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرنا ہے اماں جو انگریزی بول سکے اور میرے ساتھ چل سکے۔"

"تیرے ساتھ چلنے کو لڑکی کی دو کے بجائے چار ٹانگیں ہونی چاہئیں کیا؟" ماں خفا ہوئی۔

"اوہو اماں! یہ مطلب نہیں۔"

"تو پھر کیا مطلب ہے؟"

"لڑکی تیز ہو..... یہ جو گھر میں لڑکی ہے، اس کی طرح اللہ میاں کی گائے نہ ہو۔"

"سیانے کہتے ہیں، جوتی اور بیوی آرام دینے والی ہونی چاہیے۔ سارے کام جانتی ہے یہ..... آرام دے گی تجھے۔"

"مجھے آرام نہیں، تیز لڑکی چاہیے جو گوریوں کی طرح کھٹ پٹ چلے۔" رجب بولا۔

"سیکھ جائے گی کھٹ پٹ چلنا۔" آپا نے کہا۔ "جس دیس میں آدمی رہتا ہے، آہستہ آہستہ اس کا چال چلن سیکھ جاتا ہے۔"

"آپا اوہاں سیکھنے کا ٹائم نہیں ہوتا..... پہلے سے سیکھا ہوا آدمی چلتا ہے وہاں۔"

رجب نے اماں اور آپا کو ان کی ہر بات کا جواب دے کر علیم صدیقی کی بیگم کی بتائی لڑکی کے گھر اپنے بر دکھوے کے لیے ساتھ جانے پر مجبور کردیا۔ دونوں بھاوجوں کو پتا چلا تو ان میں کھلبلی مچ گئی۔ کیا کمی تھی ان کی بھانجی میں جو باہر کی لڑکی کو دیکھنے کی تیاری کی جارہی تھی؟ انہوں نے اپنے شوہروں کے کان بھرے۔

بھائیوں نے رولا ڈال دیا۔ "یہ کوئی انوکھا ہے جس کے لیے اس کی پسند کی لڑکی دیکھی جارہی ہے۔ ہمیں تو جو لادی، ہم نے اسے عزت سے گھر بٹھادیا۔ کیا کمی ہے ہماری سالی کی بیٹی میں؟ شریف ہے، خاندانی ہے، روکھی سوکھی میں بھی گزارہ کرنے والی ہے اور سب سے بڑی بات اپنی ہے، غیر خاندان کی نہیں۔"

رجب اب پہلے کی طرح بھائیوں کے رعب میں ان کی باتیں سننے والا نہیں تھا۔ جیب گرم تھی، گوروں کے دیس سے ہوآیا تھا، سو جب ماں نے اسے بتایا کہ غیروں میں رشتہ دیکھنے پر بھائی ناراض ہورہے ہیں تو وہ بولا۔

"ناراض ہونے دو..... میں نے اپنی زندگی کا فیصلہ آپ کرنا ہے۔"

اماں اور آپا کو ساتھ لے کر رجب علی اسی طرح بن ٹھن کر جیسے وہ لندن سے کراچی آیا تھا، لڑکی کے گھر گیا۔ علیم صدیقی اور ان کی بیگم پہلے ہی وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ لڑکی والوں نے پرتکلف چائے پانی کا بندوبست کررکھا تھا۔ ٹرالی پر جسے اماں اور آپا نے بعد میں گھر جاکر چھوٹی ریڑھی کہا تھا، چائے اور لوازمات لائے گئے۔ چینی کی پلیٹوں میں کیک سے کھایا گیا۔ شیشے کے گلاسوں میں شربت اور چینی کی پرچ پیالیوں میں چائے پیش کی گئی۔ گھر میں خاصی چک دیک تھی جو رجب کے اپنے گھر میں تو خواب و خیال کی بات تھی۔ لڑکی کو دکھانے کے لیے اماں اور آپا کو بیٹھک سے گھر کے اندر بلوایا گیا۔ رجب کو تو لڑکی نہ دکھائی گئی البتہ لڑکی نے دروازے کی جھری سے رجب کو دیکھ لیا۔ گلابی مائل گوری رنگت اور پینٹ شرٹ میں ملبوس رجب علی اسے اچھا لگا۔ لڑکی کے والد نے رجب سے انگلینڈ میں اس کے کام اور رہائش کے بارے میں پوچھا۔ اندر زنانے میں لڑکی کی ماں نے اماں اور آپا سے حسب نسب کی معلومات لیں اور والد نے صلاح مشورے کے بعد جواب دینے کو کہا۔

گھر واپس آتے ہوئے رجب نے راستے میں اماں اور آپا سے ان کی رائے پوچھی تو ماں نے کہا۔

"کھاتے پیتے لوگ ہیں مگر ہیں نخرے والے..... لڑکی صورت شکل کی اچھی ہے مگر آزاد خیال۔ دوپٹا سر کے بجائے کندھوں پر ڈالے رکھا۔"

"انگلینڈ میں تو عورتیں دوپٹا سر سے اوڑھتی ہی نہیں۔" رجب نے کہا۔

"توبہ، توبہ۔ ننگے سر عورت..... لاحول ولاقوۃ!"

ماں پرانے خیال کی عورت تھی، آپا پھر کچھ روشن خیال تھی۔ رجب نے آپا سے رائے پوچھی۔

"شادی اپنے جیسوں میں کرنی چاہیے رجب! یہ جو اونچے گھروں کی لاڈوں پلی لڑکیاں ہوتی ہیں، ان کے دیدوں میں ہوا بھری ہوتی ہے۔ ہمارے جیسے گھروں کے لڑکوں کو دبا کے رکھتی ہیں۔ شوہر نہیں، اپنا زرخرید سمجھتی ہیں۔ ٹاٹ میں مخمل کا پیوند لگے تو مخمل کا پیوند الگ ہی دکھتا ہے۔"

Scanned with CamScanner

''آپا! دونوں بھابیاں کتنے اونچے گھروں سے آئی ہیں جو دونوں بھائی ان سے دب کر رہتے ہیں۔''

آپا چپ ہو رہی۔ وہ دیکھ رہی تھی رجب اب پہلے والا رجب نہیں رہا تھا، سیانا ہو گیا تھا۔ اسے بات کرنا آ گئی تھی۔ جواب دینے لگا تھا، اپنی مرضی کو اہمیت دینے لگا تھا۔

''تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔ امیر لوگ ہیں..... دیکھو ان کا فیصلہ کیا آتا ہے۔'' ماں نے کہا۔

آپ رجب علی کو چپ رہنا پڑا۔ اصل بات یہی تھی کہ اس کے اور لڑکی کے گھرانوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہاں تو ٹرالی پر عمدہ برتنوں میں چائے پانی پیش کیا گیا، اس کے اپنے گھر میں تو کنارے مڑی سلور کی تھال میں مہمانوں کو رنگ برنگی کنارے جھڑی کچی چینی کی پیالیوں میں چائے اور سلور کی رکابیوں میں کھانا پینا پیش کیا جاتا تھا۔ رجب علی دل ہی دل میں خفیف ہوا کہ اس کے گھر میں اتنی بدحالی کیوں تھی۔ لڑکی والوں کی طرف سے بظاہر تو کوئی اچھا جواب آنے کی امید نہ تھی۔

دو دن بعد ہی علیم صدیقی کے توسط سے جواب آ گیا۔ لڑکی والے رجب سے اپنی بیٹی کی شادی کر دینے کو تیار تھے۔ رجب علی تو جھوم اٹھا۔ محلے بھر میں یہ خبر گشت کر گئی کہ رجب علی کوٹھی والی لڑکی بیاہنے جا رہا تھا۔ یار دوستوں نے مبارک باد دینا شروع کر دی۔ رجب علی کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ ان دیکھی لڑکی کا چہرہ روپ بدل بدل کر اس کے تصور میں آ رہا تھا..... شاید ایسی ہو..... شاید ایسی!

بھائیوں اور بھابیوں کو بادلِ ناخواستہ رجب علی کی خوشی میں شریک ہونا پڑا۔ پہلے والی بات تھوڑی تھی۔ اب رجب علی لندن پلٹ تھا اور شادی کے بعد بیوی کے ساتھ دوبارہ عازمِ لندن ہونے جا رہا تھا۔ ریحانہ اسکول میں کوٹھیوں سے آنے والی لڑکیوں کو خوش ہو کر بڑے فخر سے بتاتی کہ اس کے بھائی کی شادی سرکاری اسکول سے دسویں جماعت کا امتحان دینے والی ان کے علاقے کی ایک لڑکی سے ہونے والی ہے۔

بعض لڑکیاں اس کی ہونے والی بھابی اور اس کے گھر والوں کو جانتی بھی تھیں۔ انہی لڑکیوں میں سے ایک نے ریحانہ کو بتایا۔ ''تمہاری ہونے والی بھابی میری پھپھو کی بیٹی کی نکلی ہے۔ میری پھپھو کی بیٹی کہتی ہے نشاط ہے بہت مغرور۔'' نشاط اس لڑکی کا نام تھا جس سے رجب کی شادی ہونے والی تھی۔

''ہونے دو، تم جلو مت۔'' ریحانہ نے نشاط کو مغرور بتانے والی لڑکی سے کہا۔

منگنی کے لیے تو وقت ہی نہ تھا۔ آٹھ نو دن میں چٹ پٹ شادی کی تیاری ہوئی۔ نشاط سے رجب علی کی شادی ہو گئی۔ رجب علی اپنی دلہن کو بازوؤں میں اٹھا کر بستی کی تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا اپنے گھر لایا جہاں ماں نے اپنا کمرا دولہا دلہن کے لیے وقف کر کے نئی چارپائی پر سرخ پھولوں والی نئی چادر بچھوا رکھی تھی۔ دلہن والے جہیز میں مسہری، سنگار میز، کپڑوں کی الماری، بستر، برتن مزید اور بھی چیزیں دینے کا ارادہ رکھتے تھے مگر رجب نے منع کروا دیا تھا۔ جب اسے اور اس کی ہونے والی دلہن کو یہاں رہنا ہی نہیں تھا تو جہیز لینے سے فائدہ۔ نشاط کے لیے شروع کے چند دنوں میں پہننے کو جو کپڑے اس نے خود بنوا دیے تھے، وہی کافی تھے۔ باقی وہ انگلینڈ جانے کے بعد وہاں کے موسم کے حساب سے اسے خرید کر دیتا۔ رجب علی کے سسرال والوں کو یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ رجب لالچی نہیں تھا۔ اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرنے والا نوجوان تھا۔

شادی کی تیاری کے دوران رجب نے اکبر علی کو خط لکھ دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد اپنی دلہن کے ساتھ واپس آئے گا لہٰذا وہ اپنے گھر کا ایک کمرا ان دونوں کے لیے خالی رکھے مگر خط کا کچھ اعتبار نہ تھا کہ کتنے دنوں میں پہنچتا لہٰذا شہر کے بڑے تار گھر جا کر اس نے اکبر علی کو فون کرنا بھی ضروری سمجھا۔ اول تو لائن مل کر ہی نہیں دی اور جب ملی تو تین منٹ کی کال گویا ہوا ہو گئی۔ بہرحال اس کا مدعا اکبر علی تک خط کے علاوہ زبانی بھی پہنچ گیا اور اکبر علی نے اپنے گھر میں ایک کمرا رجب علی اور اس کی ہونے والی شریکِ حیات کے لیے مختص کر دینے کا وعدہ کر لیا۔

نشاط سے رجب علی کی شادی کے دوسرے دن دعوتِ ولیمہ ہوئی اور تیسرے چوتھے دن چوتھی کی دعوت۔ چوتھی کی دعوت میں رجب علی کے سسرال والوں نے اس کے تمام بھائی بہنوں کو مع اہل و عیال مدعو کیا مگر وہاں عجیب بات ہوئی۔ رجب علی کی دونوں بھاوجوں کو علیحدہ علیحدہ انگیٹھیوں پر چپاتیاں پکانے کو بٹھا دیا گیا۔ بڑے بھائی نے یہ دیکھا تو اس نے مہمان ہونے کے ناتے اسے اپنی عورتوں کی بے عزتی سمجھی اور دونوں سے فوراً اٹھ جانے اور گھر چلنے کو کہا۔ نشاط بجائے شرمندہ ہونے کے، لبوے بھانے لگی کہ میرے سر والوں کی بے عزتی کی جا رہی ہے اور نئی دلہن ہونے کے باوجود اس نے نہایت بدتمیزی سے اپنے سارے گہنے

اتار کر پھینک دیے۔ رجب علی کی ماں اور بہنیں نئی دلہن کی اس بدتمیزی پر ہکا بکا رہ گئیں۔ افسوس انہیں نشاط کے گھر والوں کی اس حرکت پر بھی تھا کہ بیٹی کی جیٹھانیوں کی مہمانداری کے بجائے انہیں روٹیاں پکانے کو بٹھا دیا گیا تھا۔ رجب علی جو اپنی حیثیت سے اونچے گھرانے میں رشتہ ہو جانے کے باعث بیوی اور سسرال والوں کے رعب میں تھا، اپنے گھر والوں کی حمایت میں بولنے کے بجائے بیوی اور سسرال والوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

ماں جہاندیدہ تھی اور آپا سمجھدار۔ اس وقت تو انہوں نے کچھ نہ کہا لیکن اگلے دن جب رجب علی بیوی کو شام تک کے لیے اس کے گھر چھوڑ آیا تو آپا نے رجب سے کہا۔

"تو نے کل اچھا نہیں کیا۔ سسرال والوں کو ان کی غلطی جتانے اور بیوی کو اس کی بدتمیزی پر ڈانٹنے کے بجائے الٹا انہی کی حمایت لی۔ سیانوں کی کہاوت ہے کہ بلی کو پہلے دن ہی مار بھگاؤ تو وہ دوبارہ گھر میں پنے کی چیزوں میں منہ ڈالنے نہیں آتی۔ یاد رکھنا، تیری بیوی ساری عمر تیرے سر پر چڑھ کے رہے گی۔"

"بیوی کو سدھارنا پڑتا ہے بیٹے!" ماں نے کہا۔

رجب علی جو پہلے دن ہی بیوی کی خوبصورتی اور اداؤں کا اسیر ہو گیا تھا، اونچے گھرانے سے اس کے تعلق کے رعب میں تو پہلے ہی تھا، آپا اور اماں کے سمجھانے بجھانے پر تڑخ کر بولا۔ "وہ بیچاری کیا کرتی..... اس کے گھر والوں نے بھابیوں کو روٹیاں پکانے کو ہی تو بٹھایا تھا۔"

"تیری بھابیاں ان کی بیٹی کی جیٹھانیاں تھیں۔ ہم ان کی بیٹی کے سسرال والے تھے۔ مہمان بن کر گئے تھے ان کے گھر۔ مہمانوں کو عزت دی جاتی ہے، روٹیاں گھڑنے کون بٹھاتا ہے..... بچاریاں سیدھی سادی تھیں جو روٹیاں پکانے بیٹھ گئیں۔ ہم تو کمرے میں بیٹھے تھے، ہمیں خبر ہی نہ ہوئی ورنہ میں تو تیرے بھائی کے دیکھنے سے پہلے ہی ٹوک دیتی۔" ماں نے کہا۔

"چھوڑو اماں! بھائی کی تو عادت ہے ذرا ذرا سی بات کا بتنگڑ بنانے کی۔" رجب علی نے بے پروائی ظاہر کی۔

"ہمارا کام ہے تجھے سمجھانا..... نہ سمجھے گا تو خود ہی بھگتے گا۔"

"میں نے کون سا یہاں رہنا ہے۔ کل اس کا ارجنٹ پاسپورٹ بنے کو دے دوں گا۔ اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ سال دو سال بعد بھی اپنے گھر والوں سے ملنے آئی تو یہاں بھی سلام کرنے آجایا کرے گی۔"

"ہاہ!" ماں نے حیرانی سے رجب کو دیکھا۔ "تو، تو چار دن میں بیوی کا غلام ہو گیا۔"

"اپنے باقی دو بیٹوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"رجب! ذرا ہوش سے۔" آپا نے ٹوکا۔ "نئی بیوی کا نشہ چار دن کا ہوتا ہے۔ تو مانے یا نہ مانے، تیری بیوی کا اصل روپ دیکھ لیا ہے ہم نے..... سر چڑھی بدتمیز لڑکی ہے۔"

رجب علی خاموش رہا۔ آپا سے تکرار کا برتا نہ تھا اسے۔

شادی کے بعد رجب علی پندرہ بیس دن پاکستان میں رہا۔ اس دوران اس نے نشاط کا پاسپورٹ بنوایا۔ سسرالی عزیزوں میں چند دعوتیں کھائیں۔ دونوں بھائیوں، آپا اور منجھلی نے بھی باری باری اس کی اور دلہن کی دعوت کی۔ بیوی کے ساتھ وہ گھر سے نکلتا تو یار دوست اسے رشک سے دیکھتے۔ محلے دار کہتے۔ "رجب کی قسمت دیکھو، بڑے گھر کی لڑکی بیاہ کر لایا ہے۔ قسمت ہو تو ایسی۔ کل تک گلیوں میں رلتا پھرتا تھا، بھائیوں کی گالیاں کھاتا تھا، اب وہی بھائی اس کی عزت کرتے ہیں۔"

"روکڑا کما کے لایا ہے لندن سے..... باپ بڑا نہ بھیا، سب سے بڑا روپیہ۔" کوئی دل جلا کہتا۔

رجب علی اور اس کی بیوی کی انگلستان روانگی کا دن آیا تو رجب کے گھر والوں نے پھر پہلے کی طرح اجتماعت ائرپورٹ جانے کی تیاری کی مگر رجب علی نے یہ کہہ کر ان سب کی تیاری پر اوس ڈال دی کہ اس کے اپنے گھر والوں میں سے کوئی اسے اور اس کی بیوی کو خدا حافظ کہنے ائرپورٹ نہیں جائے گا۔ صرف اس کے سسرال والے انہیں رخصت کرنے ائرپورٹ جائیں گے۔

رجب علی بیوی کے ساتھ اڑن چھو ہو گیا۔ اس مرتبہ ماں نے اس سے کوئی وعدہ نہیں لیا۔ وہ جانتی تھی کہ رجب علی اس کا کم، بیوی کا زیادہ ہو گیا تھا۔

ہیتھرو ائرپورٹ پر پہنچنے پر رجب علی اور نشاط کا قیام اکبر علی کے گھر کے ایک کمرے میں ہوا جو اکبر علی نے حسب وعدہ ان کے لیے مختص رکھا ہوا تھا۔

خوشحال زندگی کی چاہ میں بیرون ملک جانے والے نوجوان کی مسافرت کا احوال آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے

digest.library.com
Scanned with CamScanner